خواتین ڈائجسٹ اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر پیش خدمت ہے۔
اپریل سنہ 1972ء۔ خواتین کے لیے اپنی نوعیت کے ایک منفرد اور خوبصورت پرچے کا آغاز۔
اپریل سنہ 2014ء۔ 42 واں سالگرہ نمبر۔
ایک طویل مسافت۔ اس دوران کئی اُتار چڑھاؤ آئے۔ وقت کے ساتھ زندگی بہت سی تبدیلیوں سے گزری۔ یہ اللہ تعالیٰ کا کرم، اس کی نوازش اور مہربانی ہے کہ ہم وقت کا ساتھ دے پائے اور کامیاب ٹھہرے۔
ہمیں بہت اچھے لوگوں کا ساتھ نصیب ہوا۔ بے شمار مخلص ملے۔ کبھی تعریف و توصیف کرکے حوصلہ افزائی ہوئی۔ اور کبھی خامیوں کی، کوتاہیوں کی نشان دہی کرکے رہنمائی کی گئی۔ ابتدا سے ہی خواتین ڈائجسٹ نے اپنی الگ پہچان، اپنی ایک علیحدہ شناخت بنائی جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید مستحکم ہوتی چلی گئی اور آج خواتین ڈائجسٹ ایک معیار کا نام ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی میں ہماری مصنفین کا بہت بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے لکھتے ہوئے اپنی تہذیب، روایات اور مذہب کے درمیان توازن رکھا۔ اور وقت کے تقاضوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔
ہم اپنی مصنفین کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی کامیابی کے لیے وہ بلاشبہ مبارک باد کی حق دار ہیں۔

محمود ریاض صاحب جنہوں نے خواتین ڈائجسٹ کا اجرا کیا۔ محمود بابر فیصل، محمود خاور اور بہت سی مصنفین جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام لوگوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں ابدی زندگی میں اعلا مقام سے نوازے آمین۔

خواتین ڈائجسٹ کی ایک خوش نصیبی یہ بھی ہے کہ اسے بہت مخلص، قدر شناس اور اعلا ذہن رکھنے والی قارئین کا ساتھ نصیب ہوا جو اس کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے والی نظر رکھتی ہیں۔ ان کی تعریف، تنقید اور مشورے ہماری رہنمائی کرتے رہے۔ خواتین ڈائجسٹ کے خوبصورت سلسلے ان کے مرہون منت ہیں۔
ہم اپنی قارئین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

سالگرہ نمبر 2،

طوالت کی وجہ سے مصنفین سے سروے پورا شائع نہ کرسکے۔ اس کا بقیہ حصہ آئندہ ماہ شائع ہوگا۔
قارئین سے سروے کے لیے ہم نے پچھلے ماہ سوالات دیے تھے، جس کے ہمیں بہت دلچسپ جواب موصول ہوئے ہیں۔ ان شاء اللہ مئی کے شمارے میں آپ یہ جوابات پڑھ سکیں گی۔
سائرہ رضا کا مکمل ناول لیٹ موصول ہونے کی وجہ سے شامل نہ ہو سکا۔ نگہت سیما، سمیرا حمید، عائشہ فیاض، سدرۃ المنتہیٰ اور صائمہ اکرم کی تحریریں بھی مئی کے شمارے میں شامل ہوں گی۔
اس طرح مئی کا شمارہ سالگرہ نمبر 2 ہوگا۔

اس شمارے میں،

سائرہ رضا کے مکمل ناول "اب کر میری رفوگری" نے ذہنوں میں کئی سوالوں کو جنم دیا تھا۔ بہن سحر ساجد نے اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھا اور دکھایا ہے۔ ان کا یہ طویل ناول خاص توجہ کا متقاضی ہے۔
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول — عہد الست،
- راشدہ رفعت، آمنہ ریاض اور امتل عزیز شہزاد کے ناولٹ،
- بشریٰ احمد، فاختہ رابعہ اور سمیرا عثمان گل کے افسانے،
- جیو کی نیوز اینکر — رابعہ النعیم سے ملاقات،
- گلوکارہ ثوبیہ آفریدی سے باتیں،
- رہ نوردِ شوق — نئی ابھرتی مصنفین سے سروے،
- کرن کرن روشنی — احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور دیگر دلچسپیاں شامل ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کررہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

خیر (نیکی) کے کاموں پر خرچ کرنے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔
"اور جو کچھ بھی تم خرچ کروگے اللہ تعالیٰ تمہیں اس کا بدلہ دے گا۔"

(سبا۔39)

اور فرمایا "اور جو کچھ تم خرچ کروگے تو اس کا فائدہ تمہیں ہی ہوگا اور تم جو بھی خرچ کرتے ہو، اللہ کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کرتے ہو اور تم جو کچھ بھی خرچ کروگے، تمہیں اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

(البقرہ272)

نیز فرمایا "جو مال بھی تم خرچ کرتے ہو یقیناً" اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔"

(البقرہ273)

فائدہ ...! ان آیات میں خرچ کرنے سے مراد نیکی اور اللہ کی پسندیدہ راہوں میں خرچ کرنا ہے۔ اس کی بابت ایک بات تو یہ کہی گئی ہے کہ تمہارا خرچ کیا ہوا ضائع نہیں جائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کا بہترین بدلہ (دنیا یا آخرت یا دونوں جگہ) عطا فرمائے گا۔ تاہم یہ خرچ ریاکاری اور شہرت کی غرض سے نہ ہو کیونکہ اس صورت میں ثواب کے بجائے عذاب اور رضائے الٰہی کے بجائے اس کا غضب حصے میں آئے گا۔ اس لیے یہ خرچ صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ تمہاری خرچ کی ہوئی ایک ایک پائی کا علم اللہ کو ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کا پورا پورا بدلہ عطا فرمائے گا۔

رشک

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"صرف دو آدمیوں پر رشک کرنا جائز ہے۔ ایک وہ آدمی جسے اللہ نے مال دیا اور پھر اسے حق کی راہ میں خرچ کی ہمت و توفیق بھی دی۔ اور دوسرا وہ آدمی جسے اللہ نے علم و حکمت سے نوازا، چنانچہ وہ اس کے ساتھ فیصلہ کرتا اور دوسروں کو اس کی تعلیم دیتا ہے۔"

(بخاری و مسلم)

اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی پر رشک نہ کیا جائے سوائے ان ہر دو خصلتوں میں سے کسی ایک پر یعنی ان پر رشک کرنا درست ہے۔

فوائد و مسائل

1 ۔ حسد نہایت مہلک اخلاقی بیماری ہے جو انسان کا امن و سکون برباد کر دیتی ہے۔ حسد کے معنی ہیں "کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر کڑھنا اور اس کے زوال کی آرزو کرنا۔" یہ حرام ہے اور اس سے انسان کی نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔

2 ۔ ایک اور چیز غبطہ ہے جسے اردو میں رشک کرنا کہتے ہیں۔ یہ جائز ہے اور اس کا مطلب ہے "کسی پر اللہ کا انعام دیکھ کر خوش ہونا اور یہ آرزو کرنا کہ اللہ اسے بھی یہ نعمت عطا فرمائے۔" اس حدیث میں غبطہ کو بھی حسد سے تعبیر کیا گیا ہے "یہ حسد الغبطہ ہے" مطلق حسد نہیں کیونکہ وہ تو جائز ہی نہیں ہے۔

3 ۔ بہرحال اس حدیث سے ایسے مال دار کی فضیلت واضح ہے جو اللہ کے دیے ہوئے مال کو صرف اپنی ذات ہی پر خرچ نہیں کرتا بلکہ اسے غربا و مساکین اور دین کی نشر و اشاعت پر خرچ کرتا ہے۔ اسی طرح دین کا علم حاصل کرنے والے کی فضیلت کا بیان ہے جو قرآن و حدیث کی روشنی میں لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرتا اور دوسروں کو بھی قرآن و حدیث کی تعلیم دیتا ہے۔ ہر شخص کو یہ آرزو کرنا چاہیے کہ مال کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کا وافر جذبہ بھی اسے ملے اور دینی علوم اور اس کی حکمت سے وہ بہرہ ور ہو تاکہ انبیاء کی جانشینی کا شرف اسے حاصل ہو اور اس کا حق اچھی طرح ادا کر سکے۔

وارث کا مال

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"تم میں سے کون ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ محبوب ہو؟"

صحابہ نے کہا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ و سلم! ہم میں سے ہر شخص کو اپنا مال ہی سب سے زیادہ محبوب ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "انسان کا مال تو وہی ہے جو اس نے (صدقہ و خیرات کرکے) آگے بھیجا اور اس کے وارث کا مال وہ ہے جو وہ پیچھے چھوڑ گیا۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) اس میں بڑے حکیمانہ انداز سے انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت کو اجاگر اور ذہن نشین کیا گیا ہے کہ انسان کا اصل مال تو وہی ہے جو وہ مال کی محبت کو نظر انداز کر کے اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کی راہ میں اور اس کی پسندیدہ جگہوں پر خرچ کرے گا کیونکہ روز قیامت یہی مال اس کے کام آئے گا۔ اس کے علاوہ تو اس نے کھا پی کر ختم کر دیا اور اپنے پیچھے چھوڑ گیا' جو اس کے ورثاء کے کام آگیا۔

(2) اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ انسان کو اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہو تو اسے اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرنا چاہیے۔

تھوڑا سا خرچ

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"تم آگ سے بچو اگرچہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ساتھ ہی۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ حسب استطاعت اللہ کی راہ میں تھوڑا سا خرچ کر کے بھی اللہ کی رضا حاصل کی جا سکتی ہے۔

انکار کرنا

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے کسی چیز کا سوال کیا گیا ہو اور آپ نے جواب میں فرمایا ہو۔ "نہیں۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ۔

اس میں نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے حسن اخلاق' کرامت نفس اور سخاوت کا بیان ہے کہ سائل کے سوال پر آپ صلی اللہ علیہ و سلم کی زبان مبارک سے کبھی "نہیں" کا لفظ نہیں نکلا بشرطیکہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے پاس وہ چیز موجود ہوتی بلکہ بعض دفعہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم قرض لے کر بھی سائل کی حاجت پوری فرما دیتے" یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو اس سے وعدہ فرما لیتے۔

دو فرشتے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"ہر دن جس میں بندے صبح کرتے ہیں دو فرشتے آسمان سے اترتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے "اے اللہ! خرچ کرنے والے کو (بہترین) بدلہ عطا فرما۔" دوسرا کہتا ہے "اے اللہ! روک کر رکھنے والے کے حصے میں ہلاکت کر۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل

(1) جس خرچ پر دعائے خیر کی نوید ہے اس سے مراد صدقات نافلہ و واجبہ کے علاوہ اہل و عیال اور مہمانوں وغیرہ پر خرچ کرنا ہے اور جس امساک (ہاتھ روک رکھنے) پر بددعا ہے وہ زکوٰۃ' صدقات اور مستحبات پر خرچ کرنا ہے۔ ہلاکت سے مراد مال کی ہلاکت یا بخیل کی اپنی ہلاکت بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم۔

(2) فرشتے اللہ تعالیٰ کی پاک مخلوق ہیں جو کسی صورت بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ ایسی فرمانبرداروں کی دعائیں ضرور قبول فرماتا ہے' اس لیے فرشتوں کی دعائیں ضرور لینی چاہئیں جو بغیر کسی مفاد کے خلوص کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔

خرچ کر

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ "اے آدم کے بیٹے تو خرچ کر' تجھ پر بھی خرچ کیا جائے گا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے پر خرچ کیا جائے گا" کا مطلب ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے فراخی اور بہترین بدلہ عطا فرمائے گا۔

بہترین خصلت

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم سے پوچھا۔

"کون سا اسلام بہتر ہے؟" (یعنی اس کی کون سی خصلت یا کون سی خصلت والا شخص بہتر ہے؟)

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "تم کھانا کھلاؤ' لوگوں کو سلام کرو' چاہے تم پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) کھانا کھلانے میں کسی کو صدقے یا ہدیے کے طور پر یا مہمان نوازی کے طور پر کھلانا شامل ہے علاوہ ازیں اس سے مراد ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کر دینا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ بھوکا ہے تو اسے کھانا کھلایا جائے۔ کپڑے نہیں ہیں تو اسے لباس پہنایا جائے۔ بیمار ہے تو علاج کروایا جائے۔ مقروض ہے تو اسے قرض کے بوجھ سے نجات دلائی جائے۔

(2) سلام کرنے سے مراد' کثرت سے سلام کا پھیلانا ہے۔ اس سے دلوں میں محبت پیدا ہوتی ہے اور نفرت و عداوت دور ہوتی ہے۔

چالیس خصلتیں

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"چالیس خصلتیں ہیں ان میں سے اعلا ودھ

ہے جیسے بکری کا عطیہ دینا ہے' جو شخص بھی ان خصلتوں میں سے کسی ایک خصلت پر' ثواب کی امید سے اور اس پر کیے گئے وعدے کی تصدیق کرتے ہوئے عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے اسے جنت میں داخل فرمائے گا۔" (بخاری)

فائدہ۔ منیحہ اس جانور (بکری یا اونٹنی وغیرہ) کو کہتے ہیں جو صرف دودھ یا اون لینے کے لیے عطیہ کے طور پر دیا جائے اور اس کے بعد اسے لوٹا دیا جائے۔ یہ بھی ایک احسان اور اچھی خصلت ہے۔ حدیث میں وارد شدہ چالیس خصلتوں کو بعض علماء نے اپنے اپنے طور پر شمار کیا ہے لیکن حافظ ابن حجر نے کہا ہے کہ اس میں ہر خیر کی خصلت آجاتی ہے انہیں شمار کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مبہم رکھا ہے تو پھر دوسرا اسے کیوں کر متعین کر سکتا ہے؟ علاوہ ازیں اس ابہام میں شاید یہ حکمت ہو کہ کسی بھی نیکی کے کام کو حقیر نہ سمجھا جائے' چاہے وہ کتنا بھی تھوڑا اور معمولی ہو۔

ضرورت سے زائد

حضرت ابو امامہ صدی بن عجلان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے ابن آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال خرچ کردے گا تو یہ تیرے لیے بہتر ہوگا۔ اور اگر تو اسے روک کر رکھے گا تو یہ تیرے لیے برا ہوگا۔ اور تجھے برابر سرابر روزی پر ملامت نہیں کی جائے گی۔ اور ابتدا اپنے اہل و عیال کے ساتھ کر۔ اور اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے۔" (مسلم)

سوال کرنا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسلام (کے نام) پر (یعنی نو مسلم کی طرف سے) کسی چیز کا سوال کیا گیا تو آپ نے وہ ضرور دی۔

ایک آدمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے دو پہاڑوں کے درمیان جتنی بکریاں تھیں اسے دے دیں۔ وہ اپنی قوم کے پاس گیا اور جا کر کہا۔ "اے میری قوم! اسلام قبول کرلو اس لیے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اس شخص کی طرح عطا کرتے ہیں جسے فقر کا اندیشہ نہیں ہوتا' یقیناً" ایک آدمی صرف دنیا حاصل کرنے کی غرض سے اسلام قبول کرتا لیکن تھوڑا ہی عرصہ گزرتا کہ اسلام اسے دنیا میں موجود تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہو جاتا۔ (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) اس میں مولفۃ القلوب (نومسلموں) کو تالیف قلب کے طور پر مال دینے کا جواز ہے تاکہ وہ اسلام پر پختہ ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر ابتدا میں قبول اسلام میں حصول دنیا کا جذبہ شامل بھی ہوتا تو تھوڑے عرصے بعد یہ جذبہ دل سے نکل جاتا اور وہ نہایت مخلص مسلمان بن جاتا۔ اسی حکمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے مولفۃ القلوب کو ایک مصرف زکوٰۃ بھی قرار دیا ہے' یعنی زکوٰۃ کی رقم بھی اس مد پر خرچ کی جا سکتی ہے۔

(2) بعض علماء کے نزدیک اس مد پر خرچ کرنا اب جائز نہیں ہے لیکن صحیح بات یہی ہے کہ اس مد پر قیامت تک زکاۃ کی رقم خرچ کرنا جائز ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ہے۔ اگر نومسلموں کی تالیف قلب کا صحیح اہتمام ہو تو آج بھی اس کے فوائد ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں بھی اس مد پر خرچ کرنے کی کافی ضرورت ہے۔

صبر و حلم

حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں ایک وقت وہ جنگ حنین سے واپسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ساتھ چلے آرہے تھے کہ کچھ اعرابی (دیہاتی) آپ سے چمٹ کر سوال کرنے لگے یہاں تک کہ آپ کو مجبور کرکے کیکر کے درخت کے پاس لے گئے۔ پس آپ کی چادر بھی اس (درخت کے کانٹوں) نے اچک لی (یعنی اس میں پھنس کر آپ کے

جسم سے اتر گئی۔) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر گئے اور فرمایا۔

"میری چادر تو مجھے دو۔ پس اگر میرے پاس ان خاردار درختوں کے برابر بھی اونٹ (یا چوپائے) ہوتے تو میں یقیناً" انہیں تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا' پھر تم مجھے بخیل پاتے نہ جھوٹا اور نہ بزدل۔" (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) اس میں بھی تالیف قلب کے طور پر دینے کے مسئلے کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمانہ کا بیان ہے کہ کس طرح آپ صبر و حلم کے ساتھ دیہاتیوں کی سختی اور ان کی بدوَیت کو برداشت فرماتے۔

(2) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ امام کے اندر بخل' دروغ گوئی اور بزدلی جیسی مذموم صفات نہیں ہونی چاہئیں' نیز بوقت ضرورت اپنی صفات حمیدہ کا ذکر کرنا بھی جائز ہے تاکہ جاہل لوگ بدگمانی کا شکار نہ ہوں۔ ایسے موقع پر یہ وضاحت فخر و ریا میں شامل نہیں ہوگی جو مذموم فعل ہے۔

صدقہ کی برکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"صدقے نے کبھی مال نہیں گھٹایا اور عفو و درگزر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ بندے کی عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے۔ اور جو اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ اسے ضرور اونچا کرتا ہے۔" (مسلم)

فائدہ۔ اس میں تین حقیقتوں کا بیان ہے۔

(ا) صدقے سے مال کم نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت عطا کرکے اس کی تلافی فرما دیتا ہے یا بعض دفعہ اس کا معاوضہ عطا کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں آخرت میں اس پر جو اجر و ثواب ملے گا' اس سے تو یقیناً" اس کے مالی نقصان کی تلافی ہو جائے گی۔

(ب) انسان سمجھتا ہے کہ میں عفو و درگزر سے کام لوں گا تو لوگ مجھے کمزور خیال کریں گے' اس میں میری سبکی اور توہین ہے لیکن اس حدیث میں اس کے برعکس یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ عزت میں اضافہ ہی فرماتا ہے' کمی نہیں کرتا کیونکہ معاف کرنے سے لوگوں کے دلوں میں اس کا احترام بڑھ جاتا ہے۔ یا اس عفو و درگزر پر آخرت میں اسے اجر و ثواب ملے گا' اس سے اس کے مقام و منزلت میں اور زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔

(ج) اس طرح تواضع اور فروتنی کرنے والوں کی عظمت و رفعت بھی اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے یا پھر آخرت میں انہیں بلند مرتبوں سے نوازے گا۔

صدقہ

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک بکری ذبح کی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

"اس کا کتنا حصہ باقی ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "صرف ایک دستی باقی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"سب ہی باقی ہے' سوائے ایک دستی کے۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث صحیح ہے۔)

اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے دستی کے علاوہ سب صدقہ کر دیا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ صدقہ شدہ سارا حصہ ہمارے لیے باقی رہا کیونکہ آخرت میں اس کا اجر ملے گا۔ (اور دستی باقی نہیں رہی کیونکہ اسے خود کھایا جس پر آخرت میں اجر نہیں ملے گا۔)

فائدہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خود ہی سب کچھ نہیں کھانا چاہیے بلکہ صدقہ و خیرات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کرنا چاہیے تاکہ یہ چیز آخرت میں اس کے کام آئے۔

سب مایا ہے

ابن انشا

سب مایا ہے، سب ڈھلتی پھرتی چھایا ہے
اس عشق میں ہم نے جو کھویا جو پایا ہے
جو تم نے کہا ہے، فیض نے جو فرمایا ہے
سب مایا ہے

ہاں گاہے گاہے دید کی دولت ہاتھ آئی
یا ایک وہ لذت نام ہے جس کی رسوائی
بس اس کے سوا تو جو بھی ثواب کمایا ہے
سب مایا ہے

اک نام تو باقی رہتا ہے، گر جان نہیں
جب دیکھ لیا اس سودے میں نقصان نہیں
تب شمع پہ دینے جان پتنگا آیا ہے
سب مایا ہے

معلوم ہمیں سب قیس میاں کا قصہ بھی
سب ایک سے ہیں، یہ رانجھا بھی یہ انشا بھی
فرہاد بھی جو اک نہر سی کھود کے لایا ہے
سب مایا ہے

کیوں درد کے نامے لکھتے لکھتے رات کرو
جس سات سمندر پار کی نار کی بات کرو
اس نار سے کوئی ایک نے دھوکا کھایا ہے؟
سب مایا ہے

جس گوری پر ہم ایک غزل ہر شام لکھیں
تم جانتے ہو ہم کیونکر اس کا نام لکھیں
دل اس کی بھی چوکھٹ چوم کے واپس آیا ہے
سب مایا ہے

وہ لڑکی بھی جو چاند نگر کی رانی تھی
وہ جس کی الھڑ آنکھوں میں حیرانی تھی
آج اس نے بھی پیغام یہی بھجوایا ہے
سب مایا ہے

جو لوگ ابھی تک نام وفا کا لیتے ہیں
وہ جان کے دھوکے کھاتے، دھوکے دیتے ہیں
ہاں ٹھوک بجا کر ہم نے حکم لگایا ہے
سب مایا ہے

جب دیکھ لیا ہر شخص یہاں ہرجائی ہے
اس شہر سے دور اک کٹیا ہم نے بنائی ہے
اور اس کٹیا کے ماتھے پر لکھوایا ہے
سب مایا ہے

جیو کی کم عمر اینکر

رابعہ انعم

شاہین رشید

پہلے میڈیا میں آنا اور اداکاری کرنا یا نیوز پڑھنا اور دیگر شعبوں میں برقرار رکھنا شوقیہ ہوتا تھا مگر اب شوق کے ساتھ ساتھ یہ لیڈیز کا باقاعدہ پروفیشن بن گیا ہے۔ آج نوجوان خاص طور پر اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں اور آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ اب میڈیا میں نوجوان اینکرز/ ریڈیو جوکی اور نیوز کاسٹرز کا رواج ہے اور وہ بڑی لگن کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ اور کامیابیاں سمیٹتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ نیوز ایک مشکل شعبہ ہے مگر اب اس شعبے میں بھی انٹرٹینمنٹ کی خبروں کو شامل کرکے دلچسپ بنا دیا گیا ہے یہ اور بات ہے کہ ہمارے ملک میں مسائل، پریشانیاں اور دہشت گردی اتنی زیادہ ہے کہ شگفتہ چہرے بھی سنجیدہ نظر آرہے ہوتے ہیں مگر پھر بھی ان کا کمال ہے کہ یہ اپنے آپ کو شگفتہ رکھتے ہیں۔

اپریل کے خواتین ڈائجسٹ کے سالگرہ نمبر کے لیے ایک ایسا ہی فریش چہرہ آپ کے سامنے ہے جی رابعہ انعم — ان سے خبریں نہیں بلکہ آج ان کی شخصیت کے بارے میں آپ جانیں گے۔

"جی رابعہ اعظم۔۔۔ کیا حال ہیں اور کیا ہو رہا ہے آج کل اور کس میٹنگ میں مصروف تھیں؟"

"جی حال بالکل ٹھیک ہیں اور میٹنگ تھی 2014ء۔ YIC کی ایک نئی لیڈرشپ کانفرنس ہوتی ہے اس کو میں "لیڈ" کر رہی ہوں تو بس اس کی میٹنگز چل رہی تھیں اور دیگر مصروفیات کچھ یوں ہیں کہ سینئر اینکرز چھٹیوں پر ہیں تو میری انتہائی ٹف ڈیوٹی چل رہی ہے۔ میں تقریباً ساڑھے تین بجے دوپہر کو جاتی ہوں اور رات ایک بجے واپسی ہوتی ہے۔ تو بس اس کے علاوہ کیا ہی مصروفیات ہوتی ہیں' آتے ہی سو جاتی ہوں اور صبح اٹھ کر پھر وہی ڈیوٹی' گھر والوں کے ساتھ ایک دو گھنٹے ہی گزارنے کو ملتے ہیں۔"

"مزا آرہا ہے؟"

"بہت مزا آرہا ہے کیونکہ جو کام کرنے کو دل چاہ رہا ہو وہی کام کر رہے ہوں تو پھر نہ صرف مزا آتا ہے' بلکہ تھکن کا احساس بھی نہیں ہوتا اور مجھے روزانہ کچھ نہ کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے تو میں انجوائے کرتی رہتی ہوں۔"

"کتنے سال ہوگئے؟ اور میں نے آپ کو عامر لیاقت کے رمضان المبارک کے پروگرام میں بھی دیکھا تھا' اندازہ ہوا کہ جنرل نالج بھی بہت اچھی ہے تو لگاؤ ہے؟"

"اکتوبر 2012ء کو میں نے جیو جوائن کیا تھا اور رہی میں مجھے جنرل نالج سے بہت زیادہ لگاؤ ہے اور جب میں گئی تو کافی ڈر رہی تھی کیونکہ کافی عرصہ ہو گیا تھا کسی کوئز پروگرام میں گئے ہوئے' پھر ڈر اس لیے بھی رہی تھی کہ پوری دنیا اس پروگرام کو دیکھتی تھی' ایسے میں اگر جواب نہ آتے تو لوگ کیا سوچتے کہ یہ کیسے اینکو ہیں کہ انہیں کچھ نہیں آتا ہم نے عامر لیاقت صاحب سے کہا کہ بتادیں کہ کیا پوچھیں گے مگر انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔۔۔ مگر شکر ہے کہ عزت بچ گئی۔"

"فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤ پھر نیوز پر آتے ہیں؟"

"پہلے تو میں آپ کو بتاؤں کہ میڈیا کی ہسٹری میں میں سب سے چھوٹی اینکو پرسن ہوں۔ جب میں جیو میں آئی تو لوگ حیران ہو رہے تھے کہ یہ کتنی چھوٹی ہے۔ کیونکہ نومبر 1992ء میری تاریخ پیدائش ہے اور یہاں تو یہ تصور ہی نہیں ہے کہ کوئی ماسٹرز سے پہلے نیوز کے شعبے میں آجائے' لیکن میں جب یونیورسٹی میں تھی تو میں اس فیلڈ میں آگئی تھی اور اس فیلڈ میں رہتے ہوئے میں نے اپنی پڑھائی مکمل کی ہے تو اس لحاظ سے میں سب سے چھوٹی اینکو ہوں اور یہاں سب مجھے کہتے ہیں کہ یہ ہمارا "لاڈلا بچہ" ہے وجیہہ ہوں منصور علی خان ہوں یا دیگر' سب کہتے ہیں کہ یہ ہماری چھوٹی بہن ہے اور اس کا سب کو خیال رکھنا ہے اور اب آپ کو فیملی بیک گراؤنڈ بتاؤں کہ ہم "پٹھان" ہیں' میرے والد کا تعلق پشاور سے ہے' کیونکہ میرے دادا کا تعلق پشاور سے تھا۔ ویسے امی لاہور کی ہیں اور بابا کراچی کے ہیں تو میں پنجابی' پشتو' اردو اور انگریزی بول لیتی ہوں۔"

"امی لاہور کی بابا کراچی کے تو مکسچر کیسے بنا۔۔۔ پسند کی شادی سے؟"

"نہیں نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے نانا اور دادا دونوں بہت اچھے دوست تھے اور دونوں دوستوں کے خاندانوں میں اتنی شادیاں ہو گئی ہیں کہ اب ایک ہی خاندان لگتا ہے۔ دونوں خاندانوں سے بیٹیاں آئی بھی ہیں اور گئی بھی ہیں۔ تو میرا ننھیال لاہور میں ہے اور ددھیال کراچی میں ہے۔"

"دراصل میں لوگ تو ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں۔ رشتے داریاں بھی بناتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں مہاجر' پنجابی اور زبان کی بنیاد پر جھگڑے ہیں کیوں؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہم جب کسی سے ملتے ہیں تو پہلے اس سے پوچھتے ہیں کہ آپ کا کہاں سے تعلق ہے تو ہزاروں لاکھوں میں کوئی ایک انسان ایسا ہوگا جو کہے گا کہ میرا تعلق پاکستان سے ہے۔ ہر کوئی اپنی زبان کی بنیاد رہتا ہے کہ ہم پنجابی ہیں' ہم پٹھان ہیں' جبکہ باہر کے ملکوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ تو ہم نے خود ہی اتنے فرق ڈال دیے ہیں کہ ہماری پہچان پاکستان نہیں' ہماری زبان بن گئی ہے۔ اور پھر اس پر مزید افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بڑی آسانی سے "کافر" قرار دے دیتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کو سن کر سامنے والا کتنے غصے میں آ سکتا ہے یہ چیزیں جب تک ختم نہیں ہوں گی' جب تک نفرتیں دور نہیں ہوں گی ملک میں امن و سکون نہیں آسکتا۔ میں کہتی ہوں کہ انسان سے نفرت نہ کرو' اس کے اس عمل سے نفرت کرو جو وہ کر رہا ہے' اگر اس شخص سے نفرت کرنا شروع کردیں گے تو پھر ہم اس کی بہتری کے لیے دعا بھی نہیں کرسکیں گے۔"

"لوگوں کو آپ سے یہ شکایت بھی ہے کہ آپ اچھی خبریں نہیں دیتے؟"

"بالکل شکایت ہے اور ہم ان سے صرف یہ کہتے ہیں کہ جو ہمارے ارد گرد ہو رہا ہے ہم وہی خبریں دیتے ہیں۔ اس میں فیسٹول کی خبریں بھی ہوتی ہیں اور دیگر بھی' اب اگر ایک عورت پر تیزاب پھینک دیا گیا ہے یا جلا دیا گیا ہے تو اس کی خبر کیوں نہ دیں؟ اور پھر ہم اس کی مذمت بھی کرتے ہیں کیوں کہ اب ہمیں اتنی اجازت مل گئی ہے کہ ہم اپنے کمنٹس دے سکتے ہیں اب پی ٹی وی والی خبروں والا طریقہ نہیں رہا بلکہ اب ہم اپنے جذبات کا اظہار کرسکتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں اندازہ ہے کہ ایسی بری خبروں کا بچوں پر بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ مثلاً" میں آپ کو بتاؤں کہ "ناجیہ اشعر" بتا رہی تھیں کہ ایک بار ان کی بیٹی ان کے انداز میں کچھ اس طرح خبریں پڑھ رہی تھی کہ "السلام علیکم میں ہوں ناجیہ اشعر اور ہم آپ کو بتائیں کہ ایک زوردار دھماکہ ہو گیا ہے" تو دیکھیں کہ بچوں کے ذہنوں پر کس طرح اثر ہوتا ہے ایسی خبروں کا۔"

"تو وہ بات تو ادھوری رہ گئی کہ آپ بہن بھائی کتنے ہو اور تعلیم کہاں تک حاصل کی؟"

"میرے تین بھائی ہیں اور میں سب میں چھوٹی ہوں اور اکلوتی بہن ہوں اور میرے اور میرے تیسرے بھائی میں سات سال کا فرق ہے اور امی بتاتی ہیں کہ جب ہمارا پہلا بیٹا ہوا تھا تو اس کے بعد سے تمہارے ابو کی خواہش تھی کہ بیٹی ہونی چاہیے۔ تو جب تین بیٹوں کے بعد میں پیدا ہوئی تو ابو بہت خوش تھے اور میرے ابو نے مجھ سے حد سے زیادہ پیار کیا اور کرتے ہیں' مگر ایسا پیار نہیں کیا کہ جس سے بچے بگڑ جاتے ہیں' ابو کی تربیت ایسی تھی کہ بیٹا جتنا پڑھنا ہے پڑھو' جتنا آگے بڑھنا ہے بڑھو' جو سیکھنا ہے سیکھو یعنی مجھے ہر اچھے کام کے لیے "فری ہینڈ" دیا اور مجھ میں خود اعتمادی کو کتنا چاہیے کہ بھر دیا۔ ابو نے فری ہینڈ دیا اور امی نے ہر چیز پہ نظر رکھی کہ ہوم ورک ہوا یا نہیں۔ کیا سرگرمیاں رہیں۔ کس طرح وقت گزرا وغیرہ وغیرہ اور ہر چیز کی اچھائی برائی کھول کر رکھ دی۔ پھر اس کا نتیجہ یہ رہا کہ خود اعتمادی کی وجہ سے میں اسکول کے زمانے سے ہی ایک اچھی پرفارمنگ چائلڈ بن گئی اور مجھے اندازہ ہو جاتا تھا کہ میں کیا کرسکتی ہوں اور کیا نہیں۔ تو بڑی اچھی اور بڑی بیلنس لائف گزری اور گزر رہی ہے' اور میں نے جنرل ہسٹری میں بیچلر کیا ہے اور اب ماسٹرز کا سوچ رہی ہوں۔"

"رابعہ ماشاء اللہ پیاری ہو' چھوٹی ہو' ڈراموں کے لیے فٹ ہو پھر نیوز میں کیسے آگئیں؟"

"پرفارمنگ میں میں ہمیشہ آگے رہی ہوں' لیکن بس ہمارا یہ کونسپٹ ہے کہ نیوز ریڈر کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے' اس لیے پی ٹی وی کی نیوز کاسٹرز بھی آج تک لوگوں کو یاد ہیں اور میرے گھر میں 24 گھنٹے نیوز چینل لگا ہوتا ہے تو مجھے ہمیشہ سے ہوسٹنگ اور نیوز کاسٹنگ نے متاثر کیا' نیوز کاسٹنگ میں تو میں آ گئی اب ـــــ پلان ہے کہ کوئی مارننگ شو بھی کروں گی۔ ایسا مارننگ شو جس میں لوگوں کو بہت کچھ سیکھنے کو ملے۔ نہ میں نے لوگوں کو جادو ٹونے سکھانے ہیں' نہ بتانا ہے اور نہ ہی میں نے رونا ہے اور نہ ہی ناچ

گلے کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دن کا آغاز وضو کر کے نماز پڑھ کر اچھی دعا مانگ کر کریں تو دن اچھا گزرتا ہے اور چونکہ میں خود ایسا کرتی ہوں تو مجھے نماز کی برکتیں پتا ہیں' تو میں یہی چاہتی ہوں کہ مارننگ شو ایسا ہو جس میں خواتین کو کچھ سیکھنے کا موقع ملے۔ نیوز میں بھی ہم روزانہ بہت کچھ سیکھتے ہیں' دنیا کے بارے میں' اپنے ملک کے بارے میں ۔۔۔ اب رہی بات کہ نیوز میں کیسے آئی' تو پہلے آپ کو یہ بتاؤں کہ میرے لیے اور میرے تینوں بھائیوں کے لیے بابا نے ایک بات بہت واضح کر دی تھی کہ "جو کچھ کرنا ہے اپنی محنت سے کرنا ہے' میں کسی کام کے لیے اپنا ریفرنس نہیں دوں گا' کیونکہ میں نے بھی جو کچھ حاصل کیا ہے اپنی محنت سے کیا ہے (بابا ایک مشہور بزنس گروپ میں ہیں پرائیویٹ سروس ہے اور بحیثیت منیجر کے کام کرتے ہیں) 4 ہزار سے نوکری شروع کی تھی اور آج اس مقام پر ہوں۔" تو ایک کمپنی کی طرف سے مقابلہ تھا' تین چیزوں کا ہوسٹنگ' فیشن ڈیزائننگ اور بیوٹیشن کا' میں نے ہوسٹنگ میں اپلائی کر دیا تو پورے پاکستان سے تقریباً" ساڑھے چھ ہزار لوگوں نے آڈیشن دیا تھا' میں نے بھی دیا اور میں شارٹ لسٹ ہو گئی اور میں نے اپنی امی کو بتایا میری طرح وہ بھی حیران ہوئیں اور کہا کہ ٹھیک ہے جب آپ نے جانا ہو بتا دینا ہم ساتھ چلے جائیں گے۔ شام چھ بجے آڈیشن ختم ہونے تھے اور میں سوا چھ بجے پہنچی اور اس وقت صرف پانچ لڑکیاں رہ گئی تھیں' میں بڑی مایوس ہوئی' خیر جب اندر بلایا گیا تو وہاں عائشہ خان (جونیئر) اور نیس وٹا کی مینجمنٹ بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کس طرح اپنا مارننگ شو اسٹارٹ کریں گی۔ میں نے شو اسٹارٹ کیا' بس جی بڑی تالیاں بجیں' کہنے لگیں' کس کے ساتھ آئی ہیں' میں نے کہا کہ امی کے ساتھ' انہوں نے امی کو بلا کر گلے لگایا اور کہا کہ جی آپ کی بیٹی بڑی پیاری ہے اور بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر' پھر ہم گھر آ گئے' اگلے دن کال آ گئی کہ آپ سلیکٹ ہو گئی ہیں۔

پھر شائستہ واحدی کے ساتھ میری انٹرن شپ ہوئی جو یوٹیوب میں بھی ہے میں نیس وٹا وومن آف فرینڈ کی ۔۔۔ ونر تھی بس پھر ایک راستہ مل گیا' میڈیا کے لوگوں سے ملاقات ہوئی اور پھر میں نے نیوز ون سے اسٹارٹ لیا اور تقریباً" سات آٹھ مہینے نیوز پڑھیں کام کیا' پھر مجھے اے آر وائی سے کال آ گئی اور اے آر وائی میں بھی تقریباً" ایک سال میں نے نیوز پڑھی اور پھر جیو سے کال آئی'

'یہاں سے کال آنا میرے لیے بہت بڑے اعزاز کی بات ہے اور مجھے یہ احساس ہو رہا تھا کہ میرے خواب بہت جلدی جلدی پورے ہو رہے ہیں' میں پلان بھی نہیں کرتی کہ کام ہو جاتا ہے۔ تو بس اس وقت سے اب تک جیو پر ہوں اور اب کہیں بھی جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے' جنہیں میں اسکرین پہ دیکھا کرتی تھی آج ان کے ساتھ نیوز پڑھتی ہوں تو مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"کوئی ٹریننگ ہوئی تھی نیوز کے لیے۔ خاص طور پر بریکنگ نیوز کے لیے؟"

"میری ٹریننگ کہیں بھی بہت زیادہ نہیں ہوئی' نیوز ون کے لیے بھی ایک ہفتہ ٹریننگ ہوئی کیونکہ گھر میں میں خبریں پڑھتی رہتی تھی اور پھر دیکھ دیکھ کر بھی انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے' بی بی سی کی ویب سائٹ کھول کر بھی خبریں دیکھا کرتی تھی۔ اردو کی ریڈنگ بھی اچھی تھی' پھر لگن تھی تو اللہ کا شکر ہے کہ سب کچھ آسانی سے ہو گیا اور جہاں تک بریکنگ نیوز کی بات ہے تو ایک چیز بڑی کلیئر ہے' ہمیں نیچرل رہنا پڑتا ہے' اگر ایک خبر سن کر ہمیں شاک لگا ہے تو ہم اسی "شاک" کے انداز میں انہیں پڑھیں گے۔ اب جیسے کراچی میں بم دھماکے ہوتے ہیں تو یہ خبر میرے لیے کسی صدمے سے کم نہیں' کیونکہ مجھے فوراً" اپنے گھر والوں کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ خیریت سے ہوں اس کنڈیشن میں ہمیں یہ خبر لوگوں تک پہنچانی پڑتی ہے۔ اس وقت ہمارے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ ہم اپنے گھر

والوں کی خیریت معلوم کر لیں۔ ہمیں اپنے جذبات کو ایک طرف رکھ کر لوگوں تک خبر پہنچانی ہوتی ہے۔ پھر جب پشاور میں ایسے واقعات ہوتے ہیں اور لمحہ بہ لمحہ اموات بڑھتی چلی جاتی ہیں تو سوچیے کہ ہمیں کتنی تکلیف ہوتی ہوگی۔"

"کبھی کوئی ایسی نیوز پڑھی' جس کو پڑھ کر آنسو آ گئے ہوں یا ہنسی آ گئی ہو؟"

"ہنسی آئی ہے بالکل آئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں اے آر وائی میں تھی اور نیوز پڑھ رہی تھی اور میرا جو کیمرہ مین تھا وہ کیمرے کے پیچھے سے گزر رہا تھا اس وقت میں کوئی افسوس ناک خبر پڑھ رہی تھی' وہ کیمرہ مین گزرتے ہوئے لڑکھڑا گیا تو ایک دم میری ہنسی نکل گئی۔ تب پھر میں نے معذرت کر لی۔ اور افسوس کی تو ایسی بہت سی خبریں آئی ہیں کہ بے اختیار رونا آ گیا مگر اپنے جذبات پر کنٹرول رکھا' تھر کے واقعے پر دو چہرے نے مجھے سمجھایا کہ اپنے جذبات پر قابو رکھو' میں' ناجیہ اور ثنا تو اکثر رو پڑتی ہیں۔"

"کبھی راہ چلتے یا شاپنگ سینٹر میں کوئی بات ایسی ہوئی کہ سوچ کر انجوائے کرتی ہو؟"

"ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنی امی اور بھابھی کے ساتھ کہیں جا رہی تھی تو ایک خاتون بھاگی بھاگی آئیں اور کہنے لگیں' آپ کی شادی ہو گئی' آپ کو بہت مبارک ہو' آپ وہی ہیں ناں جیو والی' میں نے اپنی امی کو دیکھا اور بے ساختہ کہا کہ نہیں میری تو شادی نہیں ہوئی' کہنے لگیں ۔۔۔ اینکر مسعود رضا سے تو ہوئی ہے آپ کی شادی' میں نے کہا نہیں ہوئی تو کہنے لگیں پھر ڈاکٹر عامر لیاقت کے پروگرام میں آپ دونوں ساتھ کیوں آئے تھے۔ لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ آپ کی فیملی ساتھ ہے اور اس طرح کے سوال نہیں کرنے چاہئیں۔"

"ہاں خیال رکھنا چاہیے ۔۔۔ ویسے کب کر رہی ہو شادی؟"

"ہنستے ہوئے' میں نے یہی سوچا ہوا ہے کہ دو سال کے اندر شادی کر لوں گی' گھر والوں نے اجازت دی ہوئی ہے کہ کوئی پسند آ جائے تو بتا دینا تو گھر والوں کی اجازت اور پسند سے کروں گی۔ ویسے اس بارے میں سوچتی نہیں کیونکہ میرے والدین نے میری زندگی کے سارے فیصلے بہت اچھے انداز میں کیے ہیں اور مزید بھی کریں گے۔"

"آپ لوگ ایک دوسرے کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں۔ یا کبھی تمہیں اپنے سینئرز سے ڈانٹ پڑی؟"

"ہر ایک کے ذمے اپنے اپنے کام ہیں کوئی کسی کے کام میں مداخلت نہیں کرتا اور سب کو پتا ہے کہ یہ میرا کام ہے' نہ میرے کام میں کوئی بول سکتا ہے نہ میں کسی کے کام میں بول سکتی ہوں۔ ہاں کبھی سینئرز میں سے کوئی ڈانٹ دے تو میں بالکل برا نہیں مانتی کہ یہ میرے سیکھنے کا پریڈ ہے۔ ہم ایک دوسرے کی غلطیاں بتاتے ہیں اور اتنا اچھا ماحول ہے کہ کوئی کسی کی بات کا برا نہیں مانتا۔"

"خبریں تو پہلے سے تیار ہوتی ہیں ایسا ہوتا ہو گا کہ آئیں' میک اپ کرایا اور خبریں پڑھنے بیٹھ گئیں ۔۔۔ ایسا ہے؟"

"ایسا نہیں ہوتا خبروں سے آدھا پون گھنٹہ پہلے جانا پڑتا ہے۔ میک اپ کرواتے ہیں اور جلدی جانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم ہیڈلائن پڑھ لیں' جتنی خبریں ہیں اسے ڈسکس کر لیں۔ بریکنگ نیوز ہے تو اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے ویسے اب تو نارمل خبریں کم اور بریکنگ نیوز زیادہ ہوتی ہیں اور یہ اچانک ہی آتی ہیں اور ہمیں ہمارے کان میں بتایا جاتا ہے' اس کے بعد سب کچھ ہمیں کرنا ہوتا ہے اور جو رپورٹر بتا رہا ہوتا ہے وہ ہم آپ کو بتا رہے ہوتے ہیں۔"

"کون سی خبریں انجوائے کرتی ہو' انٹرٹینمنٹ کی یا اسپورٹس کی؟"

"ایک گھنٹے میں مختلف خبریں ہوتی ہیں اور ایک گھنٹے میں ہمیں تقریباً" پندرہ بار اپنے ہونٹ سوئنگ کرنے ہوتے ہیں موڈ سوئنگ کرنا پڑتا ہے تو سوائے

بری خبروں کے میں ہر اچھی خبر کو انجوائے کرتی ہوں اور میں یہ بات ہر ایک سے کہتی ہوں جو کوئی مجھ سے سیکھنا چاہتا ہے کہ اپنے جذبات پر قابو رکھیں اور نمبر دو کہ آپ کو غیر جانب دار رہنا ہے۔ کسی پارٹی کی طرف اگر آپ ہیں تو ظاہر نہ کریں اور یہ چیزیں ہائرنگ سے پہلے دیکھی بھی جاتی ہیں کہ یہ اینکر جو ہم ہائر کر رہے ہیں اس کا رجحان کسی پارٹی کی طرف تو نہیں ہے۔"

"کبھی سیلبریٹی کے انٹرویوز کیے؟ اچھا لگتا ہے۔"

"بالکل کیے ہیں۔ ہمارا صبح دس بجے کا جو بلیٹن ہے اس میں ہم زیادہ تر انٹرویوز ہی کرتے ہیں۔ تو ایک بار خالد انعم آئے تھے تو سب نے خوب مزے لگائے کہ آج تو دو "انعم" مل کر بیٹھے ہیں تو میں نے فاخر نادیہ حسین کا "اسپورٹس کی شخصیات کا اے آروائی میں بھی تب بھی کیے اور یہاں ہوں تو یہاں بھی کرتی ہوں اور مجھے نیوز سے زیادہ انٹرویو کرنا اچھا لگتا ہے کہ میں "لائٹر موڈ" میں سب کے انٹرویوز کروں اور ان لوگوں کے بھی انٹرویوز کروں جنہوں نے واقعی قوم کے لیے کچھ کیا ہے اور جو اپنی محنت سے آگے بڑھے ہیں۔ تو انشاء اللہ "آن فیوچر" جب بھی موقع ملا ضرور کروں گی۔"

"آؤٹ ڈور جا کر کبھی رپورٹنگ کی؟"

"آؤٹ ڈور پروگرام بھی کافی کیے ہیں لائٹر سائیڈ سے لیں تو میں مچھلی بازار بھی گئی ہوں کہ مچھلی کیسے کاٹتے ہیں کیسے پکاتے ہیں۔ بچوں کے سمر کیمپس میں بھی گئی ہوں "ڈاکٹر چشتی انڈیا سے رہا ہو کر آئے تھے تو ان کی لائیو رپورٹنگ میں نے کی تھی اور موسم اچھا ہو تو موسم کو ضرور رپورٹ کر رہی ہوتی ہوں۔ چھت پر کھڑے ہو کر تو میرے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ تو موسم اسپیشلسٹ ہو گئی ہیں اور بہت تیز بارش اور ہوا میں رپورٹنگ کی کہ میرے اپنے گرنے کا ڈر ہو گیا تھا بہت سنبھل کے کھڑی ہوئی تھی میں تیز بارش میں موبائل کا بیڑہ غرق ہو گیا اور بال کہیں اڑ اڑ کر مجھے بھوت بنا رہے تھے اور میک اپ صاف کر کے گئی تھی کہ میک اپ اترتے ہوئے دیکھ کر لوگ ڈر نہ جائیں۔" (قہقہہ)

"کوئی نہیں ڈرے گا کیونکہ بہت پیاری ہو' ویسے خوب صورتی کا عمل دخل ہوتا ہے اس فیلڈ میں؟"

"میرے خیال میں پریزنٹیبل ہونا بہت ضروری ہوتا ہے آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہمارے یہاں کوئی بہت حسین و جمیل چہرے نہیں ہیں' بہت عام چہرے ہیں میں ہوں' ناجیہ' ماریہ' عائشہ بخش وغیرہ بس بات کرنے کا طریقہ آنا چاہیے۔ آپ کی ادائیگی' باڈی لینگویج اور آپ نے دیکھا ہو گا کہ ہمارے سارے اینکرز بہت ڈیسینٹ ہیں۔"

"ڈریسنگ آپ کی اپنی پسند کی ہوتی ہے؟"

"ڈریسنگ ہماری ڈیزائنر بناتی ہے۔ ہماری پسند کا زیادہ عمل دخل نہیں ہوتا۔ البتہ کلر کے بارے میں ہم بتا دیتے ہیں کہ یہ ہمیں پسند ہے اور ہمیں اتنا ٹائم بھی نہیں ہوتا کہ ان کاموں میں لگائیں۔ کسی ایونٹ کے لیے کپڑے چاہیے ہوتے ہیں تو ریڈی میڈ اٹھا لیتی ہوں۔"

"سیلری پیکیج ہینڈسم ہے؟"

"جی بالکل ہے' جتنی آپ کی محنت ہے اسی حساب سے آپ کو پیسے دیے جاتے ہیں اور نارمل پے منٹ ہوتی ہے۔ یعنی ہم کو بہت توجہ کے ساتھ محو ہو کے کام کرنا پڑتا ہے۔ دماغ ادھر ادھر ہٹ نہیں سکتا اگر دماغ ہٹ گیا تو پھر آن ایئر بھنڈ مار دیتا ہے آپ نے۔"

"اچھا جی ۔۔۔ اب ذرا یہ بتاؤ کہ امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

"چھوٹی سی تھی تب سے امی نے بہت ٹرینڈ کر دیا تھا کہ جی روٹی بھی پکاؤ اور جب میں آٹھویں نویں میں تھی تو تمیز کی گول روٹی پکانے لگ گئی تھی تو جب امی لاہور جاتی تھیں تو بھائیوں کو روٹی میں ہی پکا کر دیا کرتی تھی اور جہاں بھائی ہوں وہاں چھوٹی بہن کو سب کچھ سیکھ لینا چاہیے ورنہ بہت تنگ کرتے ہیں۔ اب ذرا تنگ کرنا چھوڑ دیا ہے۔ چائنیز میں بہت اچھا بناتی ہوں اور چکن کڑاہی وغیرہ۔"

"بازار کے مسالوں سے تو فائدہ ہوتا ہو گا اور مزا جا

کیسی ہو؟"

"جی بہت فائدہ ہوتا ہے اور اب بازار کے مسالوں سے بنا ہوا کھانا ہی سب کو پسند آتا ہے' جھٹ پٹ بن بھی جاتا ہے' ویسے کوکنگ شو دیکھ کر جس دن کھانا پکاؤ' کھانے کا بیڑہ غرق ہی ہوا ہے۔ اور جناب میں بہت زیادہ خوش مزاج ہوں' ہر وقت ہنستی مسکراتی رہتی ہوں اور اس کی وجہ میرے گھر کا ماحول ہے جہاں سب فریش موڈ میں رہتے ہیں۔ مجھ میں سب سے بری عادت یہ ہے کہ جب مجھے ہنسی آتی ہے تو پھر وہ رکتی نہیں ہے اور لوگ توبہ کرتے ہیں کہ کوئی اس لڑکی کو چپ کراوے "اور جناب پروفیشنل ہونے کے بعد ایک چیز سیکھی ہے کہ غصہ آئے تو خاموش ہو جاؤ' کیونکہ غصہ میں جو ہم بات کرتے ہیں بعد میں وہ پچھتاوا بن جاتی ہے اور جب مجھے پتا چلتا ہے کہ کسی نے میرے خلاف کوئی بات کی ہے تو میں بجائے غصے میں آنے کے اس بندے سے جا کر ۔۔۔ تصدیق ضرور کرتی ہوں' کیونکہ لوگ غلط بیانی سے بھی کام لیتے ہیں اور میرے ساتھ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے کہ جس نے مجھے کسی کے بارے میں کوئی بات بتائی ہے وہ اس کے الٹ ہی ہوئی ہے' تو بس پرسیپشن پہ نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ آپ خود فیصلہ کریں کہ کون انسان کیسا ہے۔"

"کہیں جاتی ہو تو پرائیویسی متاثر ہوتی ہے؟ شہرت مسئلہ بنتی ہے؟"

"اس طرح کہ آپ کہیں شاپنگ کرنے گئی ہیں کبھی آپ کا موڈ نہیں ہوتا کسی سے ملنے کا اور یا کبھی آپ بڑی جلدی میں ہوتی ہیں تو تھوڑا مسئلہ ہوتا ہے' لیکن خیر جب بھی کوئی مجھے ملتا ہے تو میں بھی خندہ پیشانی سے ملتی ہوں اور خواتین بہت عزت کے ساتھ ملتی ہیں۔ بیٹا بیٹا کر کے بلاتی ہیں اور اکثر خواتین یہ بھی پوچھتی ہیں کہ میری بیٹی بھی نیوز اینکر بننا چاہتی ہے تو وہ کیا کرے' اب وہ لفظوں میں تو بتا نہیں سکتی۔ پھر وہ کہتی ہیں کہ اپنا نمبر دے دیں۔ تو ہر ایک کو نمبر بھی نہیں دیا جا سکتا۔ تو شہرت مسئلہ بنتی ہے کہ ہر جگہ نہیں جا سکتے۔ کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ کسی چھوٹی سی جگہ پر جا کر چنا چاٹ کھالیں۔"

"اللہ کا شکر ہے جتنا اللہ نے مجھے دیا ہے' ورنہ لوگ تو تعلیم مکمل کرنے کے بعد چھ چھ سال تک جدوجہد کرتے ہیں تب کہیں جا کر انہیں کامیابیاں ملتی ہیں اور میں نے خواب جب دیکھنا شروع کیے تو مجھے ان کی تعبیر ملنی شروع ہو گئی اور میرے خوابوں کی تعبیر میں میری ماں اور میرے بابا نے میرا بہت ساتھ دیا اور اب جب میں اپنی سیلری اپنے بابا کے ہاتھ میں رکھتی ہوں تو ان کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ امی اکثر کہتی ہیں کہ یہ میرا چھوٹا بیٹا ہے تو میں کہتی ہوں کہ یہ نہ کہا کریں کیونکہ میں آپ کی بیٹی ہی ہوں۔"

"جب اتنی دعاؤں سے بیٹی مانگی ہے تو پھر بیٹی ہی رہنے دیں؟"

"نہیں نہیں امی کو تو ابھی بھی بیٹے ہی پسند ہیں۔ سب کے لیے دعا کرتی ہیں کہ اس کا بیٹا ہی ہو۔ ایک دن میں نے اپنی امی سے پوچھا کہ آپ کو بیٹی کیوں پسند نہیں ہے تو کہنے لگیں کہ ایک وجہ سے پسند نہیں ہے کہ آپ اتنی محنت اور لاڈ پیار سے پالو اور پھر اسے کسی اور کو دے دو تو میں تو نہیں دے سکتی اپنی بیٹی کسی کو۔"

"تو آخر آپ کسی کی بیٹی لے کر بھی تو آتے ہو۔"

"جی جی بالکل ۔۔۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے رابعہ انعم سے اجازت چاہی۔

زندگی کا تسلسل جاری رہتا ہے اور تخلیق کا عمل بھی۔
تخلیق۔۔۔ انسانوں پر بیتنے والی واردات کا آئینہ بھی ہے اور اپنی ذات کا اظہار بھی۔
منصور بن حلاج نے کہا ہے۔
"لکھنا بھی اظہار ہے اور اس اظہار کی توفیق اسی کو حاصل ہوتی ہے جو حقیقت کو پہچان لیتا ہے۔"
لیکن عورت پر بہت عرصے تک اظہار کے دروازے بند ہی رہے پھر اظہار کی اجازت ملی بھی تو بہت سی پابندیوں کے ساتھ۔

ڈری سہمی عورت نے جھجکتے جھجکتے قلم اٹھایا تو تہذیب، فکر اور سوچ کے نئے زاویے سامنے آئے اور اس حوالے سے جڑی خواب دیکھنے والی آنکھیں بھی تحریروں میں منعکس ہوئیں، محبتوں کے نرم کومل، مدھر احساسات فطری نسوانی دھیمے لہجے میں ہی بیاں ہوسکتے تھے۔

وقت کچھ اور آگے بڑھا عورت کو آزادی ملی تو فکروشعور کی نئی جہتیں سامنے آئیں۔ آج حقیقت کی سنگلاخ چٹانوں سے ٹکرا کر خوابوں کا ہر طلسم بکھر چکا ہے۔ آج کی تخلیق کار زیادہ حقیقت پسند ہے۔ آج دیگر میدانوں کی طرح ادب کے میدان میں بھی عورت نے خود کو منوالیا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ کوئی اچھا شعر، اچھی تحریر، اچھی کتاب پڑھ کر سوچا، کیا اس سے بہتر لکھا جاسکتا ہے؟ کیا اس سے اچھا کوئی لکھ سکتا ہے؟ پھر کوئی نئی تحریر، کوئی نئی کتاب سامنے آجاتی ہے۔۔۔ کوئی اور تخلیق کار ابھرتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ میں لکھنے والی مصنفین کی ایک کہکشاں سی ہے، بہت سے درخشندہ ستارے جگمگائے اور آسمان ادب پہ اپنی پہچان ثبت کرگئے۔ بہت سے نئے ستارے ابھر رہے ہیں، نئے نام سامنے آرہے ہیں کہ زندگی کا تسلسل جاری ہے اور اس سے جڑی کہانیاں بھی۔۔۔۔

اس بار سالگرہ نمبر میں ہم نے ان نوعمر مصنفین سے سروے کیا ہے، جنہوں نے ابھی لکھنے کا آغاز کیا ہے اور آگے مزید روشن امکانات ہیں۔

سروے کے سوالات یہ ہیں :

(1) خواتین ڈائجسٹ کے لیے پہلی تحریر بھجواتے ہوئے کیا احساسات تھے؟ وہ شائع ہوئی تو کیسا لگا؟
(2) کیا آپ کو توقع تھی کہ اتنی پذیرائی ملے گی؟
(3) خواتین ڈائجسٹ کی کن سینئر مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟
(4) ادارہ خواتین کے علاوہ دیگر کن مصنفین کو پڑھتی ہیں؟ پسندیدہ کتابیں؟
(5) لکھنے کے علاوہ دیگر مشاغل کیا ہیں؟ زندگی کے روز و شب، معمولات، تعلیم کیا ہے؟

آیئے دیکھتے ہیں ہماری مصنفین نے کیا جوابات دیے ہیں۔

ذوقِ نمو دشوق

امت الصبور

سمیرا حمید

سب سے پہلے تو میں ادارۂ خواتین اور ساری ٹیم کو مبارک باد دینا چاہوں گی۔ اور پھر میں خواتین ڈائجسٹ سے جڑے ایک ایک انسان کا خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گی۔ اسی ادارے کی بدولت آج آپ میرا نام جانتے ہیں۔ اگر میری عقل پر پردہ نہ پڑ گیا تو میں اپنے اس پہلے محسن کو

کبھی بھول نہیں سکوں گی۔
میں امثل آپی کی بھی بہت شکر گزار ہوں۔ ورنہ صرف ایک چھوٹا سا افسانہ لکھ دینے پر کون بار بار فون کرکے یہ کہتا ہے کہ شاباش اور لکھو اور لکھو۔ میں ادارے کی بہت مشکور ہوں۔

1۔ مجھے یاد ہے۔ میرے پاس ریحانہ کا فون آیا تھا۔ انہوں نے کہا سمیرا! میں کرن سے بات کررہی ہوں۔ بہت اچھے الفاظ ادا کیے انہوں نے کہانی کے لیے اور کہا کہ میں انہیں اور لکھ کردوں۔ پانچ یا دس منٹ کی اس بات میں میں سارا وقت یہ یاد کرتی رہی کہ یہ کس افسانے کی بات کررہی ہیں (کہانیاں یاد تھیں، یہ یاد نہیں تھا کون سی کسے بھیجی ہے) فون بند ہوا تو میں نے اپنے بھائی سے کہا "ادارے کی ایڈمن کافی تعریف کررہی تھیں۔" وہ ہنسنے لگا۔ پھر بہت یاد کرنے پر بھی یاد نہیں آیا۔ یاد تب آیا جب ہاتھ میں ڈائجسٹ آیا۔ میرے بھائی نے کہا "اس افسانے کی وہ تعریف کررہی تھیں؟" وہ پھر سے ہنسنے لگا۔ کہتا ہے "دل رکھ رہی ہوں گی وہ، ورنہ کہانی میں تو کچھ ایسا خاص ہے ہی نہیں۔" میں نے کہا انہوں نے کہا کہ "جملے بہت اچھے ہیں۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔ اسی کہانی کے لیے مجھے دو سال بعد جو کال موصول ہوئی، اس نے مجھے اس سے بھی زیادہ حیران کردیا تھا۔ اس ایک کہانی کو پڑھ کر ادارہ خواتین نے میرے بارے میں ایک پیش گوئی کی تھی۔ جس کے بارے میں مجھے اب معلوم ہوا۔

2۔ کہانی بھیجتے ہوئے یہ احساسات تھے کہ کچھ احساسات نہیں تھے۔ میں اتنا جانتی تھی کہ ادارۂ خواتین نوک پلک سنوار لیتا ہے۔ تو میں نے سوچا اگر نوک پلک سنوارنے لائق بھی نہ ہوئی تو میرا بہت ہی بری بات ہوگی۔۔۔ کوئی بھی کام ہو اور اگر میں ناکام ہو جاؤں تو میں یہ جان جاتی ہوں کہ ابھی اس کام کو کرنے کے قابل نہیں ہوئی۔ ابھی اور اور اور سیکھوں۔۔۔ کیونکہ ویسے بھی میرا مقصد حیات لکھنا نہیں ہے۔ آگے کی رب العزت جانیں۔

3۔ اس سوال کا جواب تو میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ کیسے بتاؤں کہ آپ سب پڑھنے والے سمجھ سکیں۔ اور میں اس لیے بھی سمجھانا چاہتی ہوں تاکہ آپ سب جان جائیں کہ ادارۂ خواتین کتنا بڑا پلیٹ فارم ہے اور میں آپی امت الصبور کی کس قدر مشکور ہوں۔ انہوں نے کیسے کیسے مجھے یہ بتایا ہے کہ کون سی کہانی کیا ہے۔ اس کی جگہ کیا ہے۔

مجھے ملک اور بیرون ممالک سے ان ان لوگوں نے اپروچ کیا، جن کے بارے میں سنا تھا، انہیں میں جانتی تھی، ایک دن میں نے میل بکس چیک کیا اور پھر سچ مچ میرا منہ حقیقت میں کھل گیا۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا۔ "ناول تو بہت پسند کیا جارہا ہے۔" اس نے کہا "کتنا؟" میں نے کہا "دیکھو! ان ان لوگوں نے نمبرز دیے ہیں۔ یہ بات کرنا چاہتے ہیں۔" کہتا ہے "واقعی؟"

"ڈائجسٹ؟" یہ سوال میں نے خود سے کیا اور یقین کریں!
یقین نہیں آیا کہ سمیرا حمید کو شان والے نے اس بے نیازی سے اتنی عزت دے دی ہے۔
اور ادارۂ خواتین کی بہت معروف مصنفین جنہوں نے کھلے دل سے میری تحریروں کی تعریف کی۔ کھلے دل سے مجھے بتایا کہ کون سا جملہ کیسا تھا کون سا کردار کیسا تھا۔ میں آپ سب کی شکر گزار ہوں بہت۔ آپ نے ایسے سراہا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔

میں چاہوں بھی تو شکریہ نہیں ادا کر سکتی نہ ادارے کا نہ قارئین کا اور رب عظیم کا تو بالکل نہیں، جس نے اپنے الفاظ پر سمیرا کا نام لکھ دیا۔ جس نے مجھ پر وہ سوچ وارد کی، جو نہ میرے گمان میں تھی نہ آسکتی تھی۔ یہ ساری پذیرائی میں قارئین اور ادارے کے نام کرتی ہوں۔

3۔ میں نے خواتین ڈائجسٹ کو ایسے باقاعدہ نہیں پڑھا جیسے ماشاء اللہ آپ سب نے پڑھا ہے۔ میری ابتدا اور طرح کی کتابوں سے ہوئی تھی۔ میرے ساتھ ایک مسئلہ رہا ہے جواب کم ہو گیا ہے کہ میں کہانی یاد رکھ لیتی ہوں، کردار، کہانی کار، نام بھول جاتی ہوں۔ لیکن عنیزہ سید اور شب گزیدہ کو نہیں بھول سکی۔ پلاٹ، کردار نگاری، لفظ بندی اور اور بس... بس ہی ہو گئی۔ ایسے پلاٹ پر عنیزہ ہی ہی لکھ سکتی تھیں۔

ادارے کی ایک اور سینئر مصنفہ جن کے ناول کے بارے میں مجھ سے میرے رابطے پوچھتے تھے "تم نے سفال گر پڑھا ہے؟"

"نہیں۔۔۔"

"ارے پڑھو۔۔۔"

میں سفال گر کی تعریف کر ہی نہیں سکتی۔ بس اتنا کہ اس نے فکشن کو ایک نئی طرز دی۔ کہانی ایسے اور ایسی بھی ہو سکتی ہے؟ یہ ان ناولوں اور کتابوں میں شمار ہوتا ہے جنہیں پڑھنے کے بعد میں نے سوچا۔ میں کیا لکھتی ہوں؟ کیا لکھ رہی ہوں؟ صفر۔۔۔

مجھے "توبہ" (صوفیہ بشیر) بہت اچھا لگا۔ توبہ میں جو انداز بیان تھا اس نے میرا دل لے لیا۔ رواقا طمہ کی "تیرے ہجر سے" کا طرز تحریر بہت مختلف تھا اور میں نے رواقاطمہ کو جتنے میرے پاس شمارے تھے کافی تلاش کیا لیکن مجھے ان کی کوئی اور تحریر نہیں ملی۔ "مسفر کی شام" میری کزن نے مجھے دی پڑھنے کے لیے اور مجھے بہت بہت اچھی لگی۔

"مرگ وفا" (آمنہ ریاض) کو پڑھ کر میں اس سارا دن گہری سوچ میں ہی رہی، مجھے ناول بہت بہت اچھا لگا۔

اب میرا ارادہ "دل دریا دہلیز" کو پڑھنے کا ہے۔ مجھے بہت برا لگتا ہے کہ میں نے یہ شاہکار ناول نہیں پڑھا۔

4 سب سے پہلی کتاب جو میں نے پڑھی وہ "تذکرۃ الاولیا" تھی۔ اور میری ذہنی، روحانی حالت الٹ گئی میری سوچ کا رخ ہی بدل گیا اور بہت اچھا بدلا۔ یہ کتاب میں نے اٹھارویں سالگرہ سے کافی پہلے پڑھی تھی۔ پھر تذکرۂ غوثیہ پڑھی اور پڑھنے کے بعد ابلیس کے بارے میں تھوڑا مختلف جانا۔ چند سالوں بعد میں نے ایک کہانی ابلیس پر لکھی، جسے بعد میں میں نے ضائع کر دی۔ تو یہ دونوں کتابیں پسندیدہ کتابوں کی فہرست میں اول نمبر پر ہیں۔ ویسے میرے لیے سب ہی کتابیں بہت خاص ہیں۔

ادب سے میری پہچان غیر ملکی کہانیوں سے ہوئی۔ میں نے اپنا ادب بعد میں پڑھا۔ بنگالی، روسی، ایرانی، ترکی، مصری، یورپ کے کئی غیر معروف ملک جن کے لکھاریوں نے کمال کا کمال کیا۔ مجھے تو حیران ہی کیے رکھا۔ سب سے پہلے میں جس کہانی کو انسانیت کے ادب کے تاج کا ایک نگینہ مانتی ہوں وہ مہاسیتا دیوی کی "دھان کے بیل" ہے۔ کہانی میں ظلم کی روایت اپنی جگہ لیکن شہیدوں کے خون سے باپ کا فصل اگانا اور پھر اس شاندار فصل کو کاٹ کر اس کے بیجوں کو ایک ایک میں بانٹ دینا اور کہانی کے آخر میں تقریر جو اس نے کی۔ ایک ایسا منظر تھا کہ میں تڑپ اٹھی۔ میرے جیسا کم علم اس کہانی کی تعریف بھی نہیں کر سکتا ٹھیک ہے۔ میں اسے پڑھنے کے بعد بہت دیر تک بالکل خاموش رہی۔ انسان کی عظمت ایسے بھی بیان کی جا سکتی ہے۔

پھر رابندر ناتھ ٹیگور کی "بیوی کا خط" مجھے بہت پسند ہے۔ اس کا لفظ لفظ انسانیت کا آئینہ ہے اور کمال کا آئینہ ہے۔

سید محمد اشرف کا "نمبردار کا نیلا" اس کے لفظ لفظ پر ہم فدا ہوئے ہیں۔ بانو قدسیہ کا "شہر کا نور" جس سے میں نے سیکھا۔ "لکھتے ہوئے کیسے ڈرا نہیں جاتا، کیسے بہادر بنا جاتا ہے۔"

اور میرا لاڈلا، چہیتا ناول جو گم ہو گیا۔ "پرانا قالین" (ابو سعید قریشی)

یہ ناول دیال سنگھ کتب خانے سے ایک عظیم اتفاق سے ہمارے ہاتھ لگا۔ انداز بیاں، بنت، الفاظ، کردار نگاری، منظر نگاری... بس جادو... جادو... ہیرے موتی جو لفظوں کی صورت حرف حرف بکھرے ہیں۔

نوبل انعام یافتہ ترکش لکھاری کی "دی نیو لائف" ایک لڑکے کی کہانی جس کی زندگی ایک کتاب بدل دیتی ہے۔ رسول حمزہ توف کی "میرا داغستان" اس میں میں ابو طالب کی ہر ہر بات پر فدا ہوں۔

پیار رنگ کالا (محمد یحییٰ) پیپسی سدھوا کی "دی واٹر" ڈن براؤن کی
The Da Vinci code، راجہ گدھ، شہر بے مثال،

دی بک ریڈر... اس کتاب کو کاش میں نے لکھا ہوتا اور جیلانی بانو کی بارش سنگ۔ یہ سب میری پسندیدہ ترین کتابیں ہیں اور آپ کو یہ قطعاً" سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ سب آپ نہیں پڑھ سکتے۔ یہ سب آسانی سے مل جانے والی کتابیں ہیں اور چند ایک کے علاوہ سب اردو زبان میں بھی ہیں۔

آج کل بابا صاحبا (اشفاق احمد) مادام باواری (Gustave Flaubert) پڑھ رہی ہوں۔

5 معمولات میرے کچھ ایسے خاص نہیں ہیں۔ بس میرا ایک معمول کبھی نہیں رہا، دن میں سونا اور فارغ رہنا۔ صبح اٹھ کر میں سب سے پہلے کھلے آسمان کے نیچے آتی ہوں۔ آسمان، بادل، ستارے، پرندے ان میں میری جان سی ہے۔ بے سکون ہوتی ہوں تو گھنٹوں آسمان تلے رہتی ہوں۔ بے سکون ہوا کریں تو رب کائنات کی اس مخلوق سے جا ملا کریں، جو کبھی منکر نہیں ہوئی۔

گھر کا ایک حصہ میرے ذمے ہے۔ مجھے اسے صاف کرنا ہوتا ہے۔ دوپہر کے برتن اور رات کی روٹیاں بھی میرے ذمے ہیں۔ ہمارے گھر میں سب اپنے اپنے کام خود کرتے ہیں۔

پھر میرا لکھنا پڑھنا ہوتا ہے۔ میں نے صحافت میں گریجویشن کی ہے۔ صحافی نہیں بننا تھا، پر جو بننا تھا اس کے لیے کچھ زیادہ ہی پیسے چاہیے تھے، جو میں اپنے والدین سے لینا نہیں چاہتی تھی تو میں نے یہ ڈگری لے لی۔ اپنی مرضی کی تعلیم اور درسگاہ کے لیے میں پیسے جمع کر رہی ہوں اور اللہ کی مرضی اور رحمت سے جلد ہی حاصل کر لوں گی۔

سارا سال ہم دو بہن بھائی (صرف دو، باقی سب کو شوق ہے جنون نہیں) پیسے جمع کرتے ہیں اور پھر بیگ میں دو کپڑے ڈال کر نکل جاتے ہیں سیاحت کے لیے۔ یہ میرا محبوب مشغلہ ہے۔

آدھا ملک دیکھ لیا ہے ان شاء اللہ باقی بھی دیکھ لیں گے۔ نئے نئے لوگوں سے ملنا اور ان کے بارے میں جاننا مجھے بہت پسند ہے۔ میں نے دکانوں کے چھوٹوں سے بہت بات چیت کی ہے۔ بہت سر کھپایا ہے ان کا۔ مری مال

روڈ پر انڈے بیچنے والی منی حنا سے میں نے چلتے چلتے اس کے بہن بھائی، اماں، ابا سب کے بارے میں سب کچھ معلوم کر لیا تھا (نہیں نہیں کہانی کار کی حیثیت سے نہیں) میں نے اس دنیا میں سب سے زیادہ دلچسپی انسان میں لی ہے۔ وہ جس بھی زمین کا، جس بھی رنگ و نسل کا ہے، میرے لیے وہ بہت خاص ہے۔ "محبت من محرم" میں برف کا پانی بیچنے والے کا ذکر میں نے بہت عقیدت سے کیا تھا۔ میں نے ایسے بچوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا تھا اور کرتی رہوں گی۔

ہم جاتے ہیں تو بہت ساری کہانیاں اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جب انسان زمین کا سفر کرتا ہے اور زمین والوں سے ملتا ہے تو وہ بہت کچھ ایسا جان جاتا ہے جو نہ کتابوں میں لکھا ہوتا ہے نہ کتابوں میں لکھا جا سکتا ہے۔ مجھے شمالی علاقوں کے لوگوں کے چہروں کی مسکراہٹ بہت پسند ہے اور میں

کئی کئی گھنٹے ان سے بات کر سکتی ہوں۔ میں نے ان میں بہت عاجزی پائی ہے، جو اب شہروں میں ختم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ باقی کے مشغلے پھر کبھی سہی۔

آخر میں، میں آپ سب سے چند باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ ایسے روبرو آ کر بات کرنے کا کم ہی موقع ملتا ہے تو میری چند باتیں سن لیں۔ اچھی لگیں تو انہیں اپنی زندگی میں ضرور لاگو کرنے کی کوشش کیجیے گا، میں بھی کوشش کرتی ہوں، ناکام ہو جاتی ہوں تو پھر سے کرنے لگتی ہوں۔

آپ کے والدین نے آپ کو گھر، غذا، بنیادی تعلیم دے دی ہے، آپ ان کا بار بار شکریہ ادا کریں اور اپنے مشاغل، مزید تعلیم اور اپنی خواہشات کے لیے انہیں تنگ نہ کریں ان پر بوجھ نہ ڈالیں۔ اپنے دماغ اور ہاتھ پیروں کا استعمال کریں۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے ہونے کا حق ادا کریں۔ قلم ـــــ علم ـــــ خود کو اس پر شروع اور ختم کر لیں۔

رب العلم کو اس کی تخلیقات سے بھی پہچانیں، علم والوں کا ایمان سب ایمان والوں پر بھاری ہے۔

آپ کا نام لوح محفوظ پر لوح محفوظ کے مالک نے بہت چاہ سے لکھا ہے آپ بہت خاص ہیں، خود کو انسان سے اشرف بنائیں اور آخر میں جس پر میں عمل کرنے کی مر توڑ کوشش کرتی ہوں۔ وہ مولانا رومی کی مثنوی شریف سے یہ نادر بات ہے۔

"سعی لاحاصل بہتر ہے نیند سے۔"

میمونہ صدف

آہم۔ مصنف کون؟ میں؟ آں ہاں۔ ابھی تک مصنف والے جذبات اجاگر نہیں ہوئے تو وقت ہوتی ہے خود کو یاد کرانے میں۔

خیر سوالوں کے جوابات کے ساتھ حاضر خدمت ہوں۔

1 ۔ پہلی تحریر "ام القبین" تھی، جو کرن میں بھجوائی، اس یقین کے ساتھ کہ بیٹا مشکل ہی ہے کہ شائع ہو اور پھر امید دلائی خود کو کہ یار اتنی بری بھی نہیں۔ مگر کہانی جب شائع ہوئی تو یہ کیا۔ نام ہی غلط شائع ہو گیا۔ لوجی میری پہلی کہانی کے ساتھ ہی یہ ہونا تھا۔ تھک گئی سب کو بتاتے بتاتے کہ بھئی میری ہی کہانی ہے۔ خوشی ہوئی تھی ویسے ہر کسی کو ہوتی ہو گی پہلی تحریر پر۔ خواتین ڈائجسٹ کی پہلی تحریر "سحر عترت" تھی۔ اکثر لوگ سوال کرتے رہے کہ یہ کیسے لکھ لی؟ مجھے تو خود معلوم نہیں کہ کیسے لکھ لی۔ اللہ کا حکم ہوا اور لکھی گئی۔

2 ۔ توقع تو تھی کہ پذیرائی ملے گی مگر اتنی نہیں تھی۔ بہت سے کزنز اور دوستوں کے باقاعدہ میسجز آئے جس میں ضرورت سے زیادہ تعریفیں تھیں۔ اکثر اسٹوڈنٹ تو ماننے سے انکاری تھے کہ یہ کہانی ان کی "میم" نے لکھی۔ بے عزتی بھی ہو گئی۔ خیر مزید حوصلہ افزائی اگلے ماہ کے خطوط سے ہوئی۔ بے شک ہر انسان کو آگے بڑھنے کے لیے حوصلہ افزائی درکار ہوتی ہے۔ تمام قارئین کا بے حد شکریہ جنہوں نے "سحر عترت" کو سراہا۔ آپ کے تمام الفاظ میرے پاس محفوظ رہیں گے۔

3 ۔ اوہ ہو۔ کیا سوال کر دیا؟ بہت سی مصنفین ہیں۔ آج کل سائرہ رضا ہی ہیں مگر جب دل اداس ہو تو "فرحت اشتیاق" کی کہانیوں سے بوجھل پن ختم ہوتا ہے۔ "نگہت سیما" وہ رائٹر ہیں جنہوں نے "جہاد بالقلم" کا حق ادا کیا ہے صحیح معنوں میں۔ اس کے علاوہ جن رائٹرز کی تحاریر سے سوچ اور زندگی بدلی وہ ہیں، عمیرہ احمد، نمرہ احمد اور بشریٰ سعید ہیں۔ "پیر کامل"، "مصحف" اور "سفال گر" کی صورت میں۔

ایک اور بہت ہی پیارا نام "تنزیلہ ریاض" کا۔ بہت کم لکھا مگر بہت اچھا لکھا۔ نجانے کہاں کھو گئیں۔ ان سب رائٹرز کی ہر ہر کتاب ـــ میرے پاس محفوظ ہے۔ جنہیں حاصل کرنے کے لیے میں راولپنڈی سے لاہور تک جا پہنچی۔ اللہ پاک ان بہنوں سے اسی طرح لکھواتے رہیں۔

4 ۔ خواتین ڈائجسٹ کے علاوہ علیم الحق حقی، ہاشم ندیم، اشفاق احمد اور ممتاز مفتی پسند ہیں۔ پسندیدہ کتابیں تو بہت سی ہیں۔ کس کس کا نام لوں۔ زاویہ، الکھ نگری، بچپن کا دسمبر۔

5 ۔ لکھنے کے علاوہ پڑھنے کے مشاغل ہیں اور کوکنگ کا بے حد شوق ہے، نئے نئے پکوان بنا کر لطف آتا ہے اور کھا کر اس سے بھی زیادہ۔ زندگی کے شب و روز تو ایک سے ہیں، یکسانیت کا شکار۔ صبح جاگ کر فجر کی نماز کے بعد بھاگم بھاگ کالج جاتی ہوں۔ پڑھنے نہیں، پڑھانے۔ سارا دن کالج میں کیسے گزرتا ہے وہ رہنے ہی دیجیے۔ گھر آ کر دوپہر میں سونا ضروری ہوتا ہے۔ بری ہے یا اچھی بس عادت ہے۔ شام میں چائے پی کر یا تو گھر کے کام کرنے میں وقت نکل جاتا ہے۔ یا پڑھنے پڑھانے کے کام ہوتے ہیں یا پھر لکھنے کا جی کرے تو لکھ لیتی ہوں۔ سونے سے قبل تھوڑی سی چہل قدمی کی اور جناب بستر پر لیٹتے ہی نیند میں۔ بورنگ ہے نا۔ مزا تب آتا ہے جب ویک اینڈ پر باجیاں آتی ہیں۔ تب تو وقت کیسے گزرتا ہے پتا بھی نہیں چلتا۔

تعلیم میری ایم ایس سی فزکس ہے اور بس۔ خوش رہیے اور خوشیاں بانٹیے۔

صدف آصف

1 ۔ خواتین اور شعاع میں لکھنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ یہ ایک بڑا پلیٹ فارم ہے۔ وطن عزیز کے نہ صرف اہم شہروں بلکہ دور دراز علاقوں میں رہنے والی خواتین بھی ان رسالوں کا مطالعہ بہت شوق سے کرتی ہیں۔ بیرونی ممالک میں بھی ان کی بہت مانگ ہے۔ اس طرح ایک مصنف کا ناول، افسانہ، کہانی اور اس میں دیا جانے والا کوئی بھی مثبت پیغام۔ اس اہم میڈیم کے توسط سے خواتین تک باآسانی پہنچ جاتا ہے۔ یوں ان کا رشتہ قارئین کے ایک بہت بڑے حلقے سے جڑ جاتا ہے۔

ہمارے قارئین کی مستند رائے کسی مصنف کو لکھنے کی اسٹیج فراہم کرتی ہیں۔ تعریف اور تنقید۔ دونوں پہلو ہی سیکھنے کے کئی موقع دیتے ہیں۔ اسی لیے میرا دل بھی تحریر بھجواتے ہوئے خطر تھا کہ چھپتی ہے یا نہیں؟

اور جب میری تحریر خواتین کی زینت بنی تو بہت زیادہ خوشی کا احساس ہوا۔ لگا اب قلم پکڑنا آہی گیا ہے۔ اس لیے میں اپنے مالک کی شکر گزار ہوں کہ اس نے میری تحریروں میں وہ اثر ڈالا جو پڑھنے والوں کے دلوں کو چھو گیا۔

2 ۔ انسان توقعات تو ہمیشہ اچھی رکھتا ہے۔ لیکن اگر وہ پوری ہو جائیں۔ تو ظاہر ہے بہت زیادہ مسرور ہوتا ہے۔ پر

میں ایک بات اور کہنا چاہوں گی۔ کہ ایک افسانے کے پیچھے مصنفہ کی محنت تو چھپی ہوتی ہے' لیکن اس کی کامیابی کا کریڈٹ اس ادارے اور اس میں کام کرنے والے تمام لوگوں کو بھی جاتا ہے۔ جو اس تحریر کو سجا سنوار کر قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

3 ۔ خواتین ڈائجسٹ کی تمام پرانی مصنفین (لکھنے کے حوالے سے کہا جارہا ہے۔ ورنہ ہماری مصنفین تو سدا بہار ہیں) بہت اچھا لکھتی رہی ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ کہنا گویا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہوگا۔ تاہم مجھے جن کی تحریروں نے بہت زیادہ متاثر کیا۔ ان میں آسیہ رزاقی' ثریا انجم' عمیرہ احمد' بشریٰ احمد' فرحت اشتیاق' رخسانہ نگار' ثمرہ بخاری' شازیہ چوہدری' نایاب ملک۔ اگر لکھتی جاؤں تو یہ لسٹ ختم ہی نہ ہوگی۔

4 ۔ میں سمجھتی ہوں ایک رائٹر کے لیے کتابیں پڑھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا لکھنے کے لیے اس کا قلم۔ میں بھی کتابوں کی شوقین ہوں۔ مجھے شاعری سے بھی بے انتہا لگاؤ ہے۔ اسی لیے ہر اچھی کتاب میری پسندیدہ کتاب بن جاتی ہے۔ سفرنامے پڑھنے کا اپنا لطف ہے۔ ان ہی اچھی کتابوں کے بہت سارے مصنفین ہیں۔ بانو قدسیہ' اشفاق احمد' ممتاز مفتی' مستنصر حسین تارڑ' بشریٰ رحمان وغیرہ وغیرہ ان کی کوئی حد نہیں۔

5 ۔ میں نے انٹرنیشنل ریلیشنز میں ماسٹرز کیا ہے' بہت سارے کورسز اس کے علاوہ کیے ہیں۔ شروع سے میڈیا سے تعلق رہا ہے۔ کئی چینلز پر کام کرچکی ہوں۔ ریسرچ اور اسکرپٹ رائٹنگ بھی کرچکی ہوں۔ اخبارات کے لیے مضمون نگاری مجھے بہت پسند ہے۔ خواتین کے مسائل پر لکھتے ہوئے جذباتی ہوجاتی ہوں (اسی صنف سے تعلق رکھتی ہوں۔ کیسے نہ دل دکھے)۔

مشاغل تو بہت سارے ہیں۔ اپنی فیملی کے ساتھ گھومنے پھرنے کی شوقین ہوں۔ کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ اسی حوالے سے نت نئے تجربات کرتی رہتی ہوں۔ اپنے گھر کو سجانے کی بھی شوقین ہوں۔

حیا بخاری

سب سے پہلے تو خواتین کو معیار اور ترقی کے کامیاب اور بھرپور بیالیس سال پورے کرنے پہ ڈھیروں دلی مبارک بادیں' نہ صرف میری طرف سے بلکہ میری تمام فیملی کی طرف سے۔

ہماری خوش قسمتی تھی کہ سخت ترین ماحول اور تمام تر پابندیوں کے باوجود ہمیں کتاب اور مطالعہ کی ہر قسم کی آزادی تھی' عمر کی البتہ ایک حد ضرور مقرر تھی اُن رسالوں کے مطالعہ کی اجازت کے لیے' مگر ابو اور امی کی اردو ادب میں دلچسپی ہی ہمارا خواتین سے رشتہ جوڑنے کا سبب بنی۔ شادی کے بعد پہلے چند سالوں تک یہ رشتہ وقتی طور پر ٹوٹ گیا مگر اس کے بعد اس رشتے میں مزید مضبوطی آگئی کیونکہ میاں صاحب کو جب اس شوق کا پتا چلا تو نہ صرف پڑھنے بلکہ لکھنے کی بھی حمایت کی۔

1 ۔ آپ کا پہلا سوال مجھے بے حد دلچسپ لگا۔ میرے پاس کچھ لڑکیاں ماسٹرز کی ٹیوشن کے لیے آتی تھیں۔ میری لکھی کہانیاں ٹیبل پہ ہی پڑی رہتیں۔ ان میں سے ایک نے میرا ناول "من الجنتہ والناس" پڑھا تو مجھے اپنی تحریریں کسی رسالے کو بھیجنے کے لیے کہا۔ میں بس اس وقت شوقیہ ہی لکھتی تھی' کبھی کوئی تحریر چھپوانے کا خیال نہ آیا۔ پھر میں نے اپنی تحریر خواتین ڈائجسٹ کو بھیج دی۔ ان دنوں میں سخت بیمار بھی تھی۔

مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے۔ سب نے میرا مذاق اڑایا تھا کہ خواتین میں صرف منجھے ہوئے لکھاریوں کو ہی جگہ ملتی ہے۔ مجھے کسی اور ڈائجسٹ میں ٹرائی کرنا چاہیے تھا۔ میں بہت پریشان بھی ہوئی مگر دل میں عہد کرلیا۔ کہ اگر میری پہلی تحریر خواتین میں نہ آئی تو لکھنا ہی چھوڑ دوں گی۔ شائع ہوئی تو وہی ہر بات پہ رو دینے والی عادت۔ مجھے فون کالز پہ جب مبارک بادیں ملیں' سب نے سراہا تو میں خوشی کے مارے پھوٹ پھوٹ کے روئی تھی۔ اس وقت میری کیا حالت ہوئی میں بیان نہیں کرسکتی۔

2 ۔ پذیرائی کی توقع تو بالکل تھی لیکن صرف اپنی امی' میاں اور چند قریبی دوستوں سے۔ لیکن جب میرے اسکول اساتذہ' میرے شہر کے لوگوں نے میرا نمبر ڈھونڈ کے مجھے مبارک باد دی اور اپنے شہر کی خواتین کی نمائندہ مانا تو

بقیہ صفحہ نمبر 276

عنیزہ سید

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم
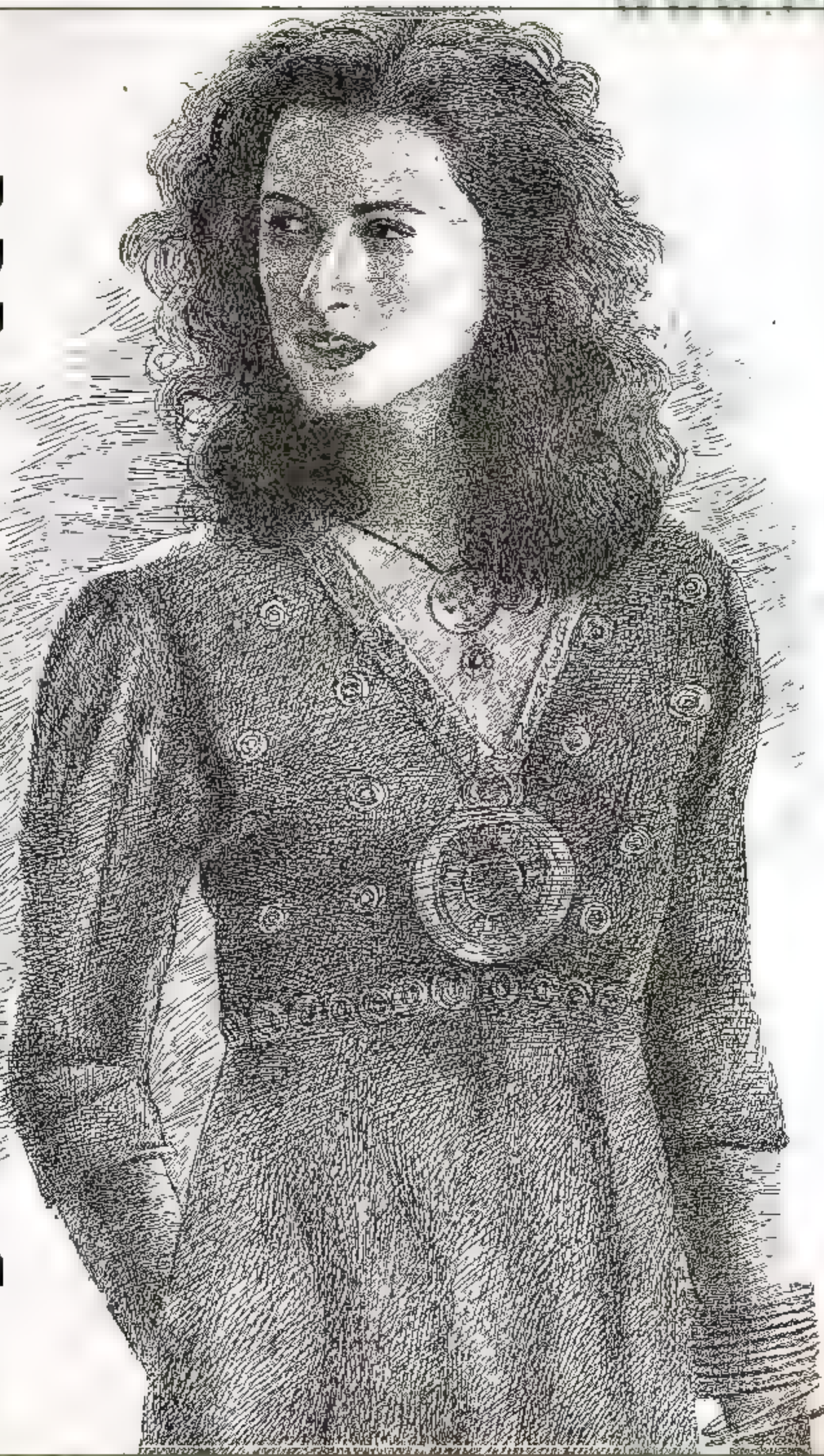
"میرا خیال ہے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم اب اس کے پیچھے جا رہے ہیں نہ ہی اس کی کوئی بات کر رہے ہیں" بلال سلطان کا لہجہ اور بات ابراہیم کے لیے حوصلہ افزا ہرگز نہیں تھی۔

"لیکن انکل! میں نے بتایا نا کہ یہ لڑکی تو ویسے ہی آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" اس نے منمنا کر ایک کوشش مزید کرنا چاہی۔

"تمہارا کیا خیال ہے، میں بہت فارغ ہوں جو جب کوئی مجھ سے ملنا چاہے میں اسے ملنے کے لیے Available (دستیاب) ہو جاؤں۔" وہ سخت اور خشک لہجے میں بولے۔

"نہیں۔ ہرگز نہیں انکل! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں" ابراہیم نے زبان پھیر کر اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا ہے کہ اسے میں اپنے مان پر لایا تھا۔" اس نے ایک جذباتی وار کھیلنے کی کوشش کی "میں نے ہی اسے یقین دلایا تھا کہ انکل میری بات کو اون کرتے ہیں کیونکہ مجھے وہ اپنے بیٹے جیسا ہی سمجھتے ہیں۔"

—۲۵—
پچیسویں قسط

"کتنے ہی مہینے گزر گئے دولہا بھائی کی کوئی خیر ہے نہ خبر۔"
"میں بھی یہی بات سوچ رہا تھا آج ظہر کے لیے وضو کرنے کے دوران۔"
(شکر ہے کبھی تم نے بھی کچھ سوچنے کی زحمت کرلی سراج سرفراز ورنہ تو ایسا لگتا ہے تمہارا دماغ بے چارہ اپنے ہونے پر ہی اشک بہاتا رہتا ہوگا)
"میری بہن بے چاری غم میں گھل رہی ہے۔ شکل گئی' آواز گئی اور اس کے ساتھ ہی شوہر اور بچہ بھی گئے' اس کی تو سمجھ میں شاید یہ بھی نہ آتا ہو کہ دن کے کس پہر کس کا غم منائے' کس کا نہ منائے۔"
"بھائی صاحب اتنے مادہ پرست' کٹھور اور سخت دل لگتے نہ تھے' مگر جو ہو رہا ہے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا ہے کہ شاید وہ ایسے ہی تھے۔"
"آہا۔ جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں اکثر۔"
"ہاں یہ بھی ہے۔"
"اب اس کا کیا کیا جائے کہ میری بہن کو ہردم لگن لگی رہتی ہے حج پر جانے کی' ادھر ادھر سے' تیرے میرے سے جو پیسہ ادھار' نقد' قرض دے رکھتا تھا' واپس مانگنے کو کہتی ہے۔ اس کے اپنے اکاؤنٹ میں جو پیسہ ہے وہ اور یہ سب پیسے جو لوگوں سے واپس مانگتی ہے۔ کیا یہ سب ملا کر حج کے سفر کا ارادہ کر سکتی ہے وہ؟؟"
"آپا جی کے لیے تو ان کا اپنا پیسہ' جو بینک میں رکھا ہے' وہی بہت ہے حج کے لیے' لیکن وہ تو ہم دونوں کو بھی ساتھ لے جا کر حج کرانا چاہتی ہیں رابعہ بیگم!"
"سوچتی ہوگی سفر کے لیے ہم سفر بھی تو ہونا چاہیے۔ کوئی ساتھ میں' ارے اس بے وفا' کٹھور' ہرجائی کو اسی لیے تو روتی ہے۔ کیسے کیسے وعدے نہ کر رکھے تھے عمر بھر ساتھ نبھانے کے اس نے۔ بس شکل سے کیا گئی۔ وہ اس سے گیا' ساتھ میں بچہ بھی اٹھالے گیا' ظالم حسن پرست' نکمے اور شکل کا عاشق' کسی کی آئی آئے کم بخت کو۔"
"بھائی صاحب ایسے دکھتے تو نہ تھے۔"
"آپ کی تو جناب سراج سرفراز صاحب عقل ہی پوری پوری ہے' دیکھ رہے ہو کیسا وہ میری بہن کو چونا لگا کر بھاگا' ساتھ میں بچہ بھی لے گیا' پھر بھی جب بات ہوتی ہے یہی کہے جاتے ہو بھائی صاحب ایسے لگتے تو نہ تھے۔"
"نہ رابعہ بیگم! چہرہ بگاڑ کر کسی کی نقلیں اتارنے سے بڑا گناہ ہوتا ہے' جہنم کی آگ آگے بڑھ کر لپکتی ہے ایسے شخص کی طرف مجھ مسکین کی نقلیں اتار کر گناہ گار مت ہوں آپ۔"
(ایک تو تمہارے وعظ سراج سرفراز' برا ہوا جو تم ایک نکاح کے صدقے میرے مجازی خدا بن بیٹھے' نہ ہوتا یہ رشتہ تو میں تمہیں بتاتی' ایسے واعظوں پر کیا حشر کر سکتی ہوں تمہارا)
"ارے اللہ توبہ! زبان ہے چمڑے کی پھسل گئی' معاف کردیں سراج سرفراز صاحب! بہتری کوشش کرتی ہوں قابو کرنے کی پھر بھی پھسل جاتی ہے' فکر نہ کریں جلد ہی قابو آجائے گی۔"
"کوئی بات نہیں رابعہ بیگم! آپ کی کسی بات کا ملال دل میں نہیں رکھتا میں' اللہ جل شانہ ہدایت عطا فرمائے آپ کو۔"
(ہونہہ' تمہارے جیسے بے علم مولوی کے ذریعے ہدایت پانے سے میں بے ہدایتی ہی اچھی ہوں)۔
"آپ کی بڑی مہربانی سراج سرفراز صاحب جو ملال دل میں نہیں لاتے۔"
"آپا بیگم کی خاص شفقت ہے جو میرے لیے آپ جیسی بی بی کا انتخاب کردیا' ورنہ میں مسکین جس کا نہ کوئی آگا نہ پیچھا' ساری عمر مولوانوں کے در پر پڑا مانگے کی روٹی کھانے والا' مسجد' مکتب سے بساط بھر ہدایت حاصل کرتا پھرتا' کبھی کسی حافظ جی سے کبھی کسی مولوی صاحب سے' کبھی کسی مولانا سے چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی دبا کے ڈنڈے

کھانے والا گرتے پڑتے عمر گزارتا آدمی' مجھ ایسے کو آپ جیسی حسین' سگھڑ سلیقہ شعار' عقلمند بی بی کا ساتھ مل جانا ہی معجزہ ہے رابعہ بی بی! مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آتا اس معجزے پر۔"
(تو میں ٹھہری ذات کی میراثن' اور یہ بے چارہ بھلے دھکے کھاتا دین اسلام کا علم حاصل کرنے والا آدمی' میری اوقات دیکھو اور اس بے چارے کی سوچ دیکھو' اس ساتھ کو معجزہ قرار دے رہا ہے۔ واہ بھئی نیلی چھتری والے! تیری شان ہے جو بندے کو سمجھا رہا ہے کہ جو تجھے ملا تیری اوقات سے بڑھ کر ہے)
"اچھا یہ سب چھوڑیں' یہ بتائیں کہ جو پیسے اب تک اکٹھے ہوئے ان سے حج کا سفر کیا بھی جا سکتا ہے کہ نہیں۔"
"میں نے پتا کروایا ہے پانی کے جہاز کے ذریعے جانے پر پیسہ کم خرچ ہوتا ہے' آپا بیگم نے فرمایا تھا اور خواہش جمع کروادو' وہ تو ایک آدھ دن میں جمع ہو جائیں گی' اللہ جل شانہ کی منظوری عطا ہوگئی تو ان شاء اللہ سفر حج اس بار ضرور مقدر بنے گا۔"
(واہ میرے مولا تیری شان' کدھر کی اینٹ اور کہاں کا روڑا جوڑ کر تو کنبے بناڈالتا ہے۔ سفر حج پر جو نے بلا لیا تو بھلا اس گروہ میں کون کون شامل ہوگا۔ ایک پیدائشی میراثن' ایک مولوانوں کی ڈیوڑھی میں پلنے والا بے نام و نشان لمڈا اور ایک وہ بے بس عورت' جس کا خاندان اونچی ناک والا' جو عیش آرام' محبت خلوص کی نرمی اور گرمی' روپیہ پیسہ سب چھوڑ کر مجبور میں آن ٹکی' واہ میرے مولا تیرے سارے ہی رنگ نرالے ہیں۔)
"جو آپ کہیں رابعہ بیگم تو میں بھائی صاحب کی تلاش میں پنڈی اسلام آباد کا قصد نہ کرلوں۔"
"اس محلے سے باہر نکل کر ماڈل ٹاؤن تک راستہ آپ کو آتا نہیں سراج سرفراز صاحب اور آپ چلے ہیں پنڈی اسلام آباد کا سفر کرنے۔ وہ بھی ایک ایسے شخص کی تلاش میں جسے ملنا ہوتا تو گم ہوتا ہی کیوں۔ بیٹھے رہیے یہیں آرام سے۔ آپ انہیں نیک دل سمجھ رہے ہیں تو یہ آپ کی حماقت ہے۔ یہ سب ایک جیسے ہیں اندر سے' بس چہرے الگ الگ سجا رکھتے ہیں خود پر' کوئی بلال سلطان کا چہرہ پہنے مظلوم' بے بس کا عاشق بنا چلا آتا ہے تو کسی نے طیفے لاٹر کا چہرہ پہن رکھا ہے۔ اندر سے سب ایک سے ہیں محسن کے اور ہوس کے پجاری' محسن اجاڑ کر ہوس پر پانی ڈال دینے تک ہی ان کی رقابت کا رشتہ قائم تھا۔ اب نہ حسن رہا نہ ہوس' دونوں پجاری سب اجاڑ کر اپنی اپنی راہ چل دیے۔ بیڑا غرق ہو جائے دونوں ٹٹ مرنوں کا' دونوں کو کسی اور کی آئی آجائے' ہم تینوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر بھاگ جانے والے کو تو طیفے سے بھی پہلے آجائے کم بخت سسک سسک کر مرے۔"
"نہ رابعہ بیگم! کسی کو بددعائیں دینا سخت گناہ ہے' بددعا ہمیشہ دینے والے کا پیچھا کرتی ہے الٹا توبہ کریں توبہ۔"
(آگ لگے تمہارے بے وقت واعظوں کو سراج سرفراز' دل کر رہا ہے چمٹا اٹھا کر تمہارے منہ پر دے ماروں کم بخت' مگر کیا کروں میری بہن کی نصیحتیں آڑے آجاتی ہیں' شوہر کی نافرمانی اور گستاخی کرنے والی عورت جہنمی ہوگئی۔ ارے منہ بند ہو جاتا ہے اس کی نصیحت پا کر کے' خود کیسا عمل کرتی ہے اس بات پر' بڑی تکلیفیں سہتی ہم پتی ہے مگر مجال ہے جو شوہر کے خلاف ایک بات بھی منہ سے نکال لے بیٹے کی موہنی صورت یاد کرکے یقیناً کلیجہ منہ کو آتا ہوگا اس کا' مگر بھاپ نہیں نکالتی منہ سے' ارے ایسی صابر عورت کا ساتھ نہ ہوتا چوبیس گھنٹوں کا سراج سرفراز تو میں دیکھتی تم کیسے مجھے یہ وعظ سناتے ہردم' جہنم کی آگ کی سنا دیتیاں سنانے والے بھیاڑ۔

☼ ☼ ☼

اس نے اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھا جو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل بولتا چلا جا رہا تھا۔ وہ ویسے ہی بہت باتونی تھا یا اس وقت ایک اضطراب کے عالم میں بے تحاشا بول رہا تھا' اسے اندازہ نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اس

وقت خود اسے بھی اپنے اندر اٹھنے والے اضطراب کو قابو میں رکھنے کے لیے کسی دھیان بٹانے والے کی اشد ضرورت تھی' خود کو آئینے میں دیکھے بغیر بھی اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ شدت غم کو قابو میں رکھنے کی کوشش میں اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور یقیناً" آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کے باوجود نظر آرہی ہوگی۔

"بھلا یہ کیسا اتفاق ہے۔" اس نے ایک بار پھر اپنے سامنے بیٹھے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "یہ شخص جو اپنا نام وودن زادے بتاتا ہے' ایرانی النسل امریکی ہے' خود میں بیک وقت دو ملکوں کی قومیت کی حامل لڑکی ہوں اور تیسرا وہ شخص ہے جو میرا بھائی تو ہے مگر اس کی قومیت بالکل ہی مختلف ہے' ہم تین لوگوں کو ایک نقطے پر ایک سانحہ اکٹھا کر رہا ہے۔ یوں کہ میں اس شخص کو اور یہ شخص مجھے بالکل نہیں جانتے' جو ہم دونوں کو جانتا ہے اور جسے ہم دونوں جانتے ہیں۔ اس کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں۔ وہ جی رہا ہے یا نہیں' وہ جی سکے گا بھی کہ نہیں۔" اس کا دل بری طرح بھر آیا اور اس بار اس نے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

سعد سلطان جو اس کا سوتیلا بھائی تھا اور جس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہنے کی اس نے ہمیشہ تمنا کی تھی مگر قدرت کی ستم ظریفی کے ہاتھوں مجبور ہو کر اسے اتنے برس اس سے دور ہی رہنا پڑا تھا' کیا کبھی اس نے سوچا تھا کہ وہی سعد سلطان' جن لوگوں میں رہتا چلا آیا تھا ان سے اپنا تعلق توڑ کر جب اس غیر ملک میں آئے گا تو اپنی شناخت کے خانے میں اس نے صرف نادیہ بلال کا حوالہ دے رکھا ہوگا۔ کسی بھی ہنگامی صورت حال میں اپنے بارے میں اطلاع دینے کے لیے صرف اس کا نمبر ہر جگہ درج کر رکھا ہوگا۔ نادیہ نے روتے روتے سر جھٹکا۔

یہ شخص وودن زادے کہتا ہے کہ وہ اپنے ملک سے' اپنے باپ سے ہر اس شخص' ہر اس چیز سے اپنا تعلق توڑ چکا تھا جو اس کے ماضی کا حصہ رہی تھی' اگر ایسا ہی تھا تو ایسا کیوں تھا۔ اس نے کچھ نہ سمجھ پاتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا' آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہتے چلے جا رہے تھے۔

"اس نے کیوں اپنے حوالے سے صرف نادیہ کا نام ظاہر کر رکھا تھا۔" مسلسل سوچنے' ذہنی دباؤ' ڈپریشن اور غم کے مارے اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔

"اس طرح مت رو چھوٹی لڑکی!" وودن زادے اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قریب آکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "وہ ابھی مرا نہیں ہے۔" اس کی اپنی آواز بوجھل ہونے لگی "اس کی چند سانسیں ابھی بھی اس کے جسم سے جڑی ہوئی ہیں' اور جب تک یہ سانسیں ہیں وہ زندہ ہے۔"

نادیہ اس کی یہ بات سن کر اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگی۔

"شاید یہ دعا کا وقت ہے۔" وودن زادے نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں نے سنا ہے کہ دعائیں قبول بھی ہو جایا کرتی ہیں۔ اگرچہ میرا یقین بہت کمزور ہے' لیکن اگر لوگ ایسا کہتے ہیں تو ہو سکتا ہے دعاؤں کو آسمانوں تک پہنچانے والے فرشتے ادھر ہی ہمارے ارد گرد کہیں موجود ہوں۔"

"تم نے تو مجھ سے بھی زیادہ تفصیل سے سنا ہے۔" نادیہ نے اپنی دبی دبی چیخوں نما سسکیوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر نے اس کی کیا حالت بتائی ہے۔" اس نے اپنا بھیگا ہوا چہرہ وودن زادے کی جانب موڑا "چوٹ اس کے سر پر آئی ہے' ضرب اس کے دماغ پر لگی ہے اور وہ کوما کی حالت میں ہے۔"

"ہاں!" وودن زادے نے سر ہلایا "لیکن ڈاکٹرز نے یہ بھی تو نہیں کہا کہ وہ بچ نہیں سکے گا' وہ اپنی کوششوں کے بارے میں پرامید ہیں۔"

"کتنے ڈاکٹرز؟" نادیہ نے یہ سوال چلانے کے سے انداز میں کیا تھا "پورے میڈیکل بورڈ میں سے صرف دو ڈاکٹرز کی یہ رائے ہے کہ اس کی جان بچ سکتی ہے۔ وہ بھی صرف اس صورت میں کہ اگر اسے اس ابتدائی امداد کے بعد جو ڈارلنگٹن میں اسے مل رہی ہے فوراً" کسی بڑے اسپتال میں لے جایا جائے اگرچہ یہ حرکت اس کی جان کے

لیے مزید خطرہ ثابت ہو سکتی ہے۔"
"ہاں تو ہم یہ خطرہ مول لینے ہی والے تو ہیں' اس کو یہاں سے لندن منتقل کرنے کے تمام انتظامات مکمل ہیں۔"
وودن زادے نے اسے یقین دلانے کے انداز میں سرہلایا۔
"نہیں۔" نادیہ کی چیخ نکل گئی' اس کے اس چلانے سے اس پارک میں جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے' موجود بیشتر لوگوں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ "نہیں تم ایسا نہیں کرو گے۔ وہ راستے ہی میں مر جائے گا۔"
"اگر سعد نے مرنا ہی ہے تو کیوں نہ بجائے اس کو یہاں رکھ کر اس کے سامنے بیٹھے ہوئے اس کی سانسوں کی گنتی کرنے کے اس کی زندگی بچانے کا خطرہ مول لیتے ہوئے یہ موت آجائے۔ اس عمل میں کم از کم کوشش کا دخل تو شامل ہو گا نا۔" وودن زادے نے حتمی لہجے میں کہا۔
"نہیں پلیز' یہ مت کرنا۔ جب تک وہ زندہ رہ سکتا ہے اُسے زندہ رہنے دو' اُسے جلدی مار دینے کی کوشش مت کرو۔"
"میں نے برا کیا جو تمہیں یہاں بلا لیا۔" وودن زادے نے یوں سر جھٹکا جیسے اسے نادیہ کے پاگل پن پر غصہ آرہا ہو۔ "بہتر ہو تا وہاں پہنچ کر تمہیں اطلاع دیتا۔"
"وہاں پہنچ کر۔" نادیہ کو بھی وودن پر غصہ آیا۔ "وہاں پہنچ کر اس کی لاش وصول کرنے کے لیے اطلاع دیتے کیا تم؟"
"لاش تو یہاں بھی تم ہی وصول کرو گی' اس مصنوعی تنفس کے ساتھ وہ چند گھنٹے اور جیتا نظر آئے گا بس' پھر تو لاش ہی باقی رہ جائے گی جسے تم ہی نے وصول کرنا ہے کیونکہ میں تو صرف اس کا اتفاقی دوست ہوں' جیسا بھی ہے خونی رشتہ تو صرف تم سے ہے نا اس کا۔" وودن زادے تیزی سے بولا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔
"رکو!" نادیہ نے اس کا بازو پکڑا' وہ متوحش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "ایسا مت کرو پلیز۔ ایسا مت کرو۔"
"میں جامد بیٹھ کر انتظار نہیں کر سکتا۔" وودن نے اپنا بازو اس سے چھڑایا۔ "مجھے کوشش کرنی ہے۔"
"ٹھہرو! مجھے ڈیڈی سے رابطہ کرنے کی کوشش کرنے دو۔" نادیہ نے التجائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"ایسا کر کے اس کی رخصت ہوتی ہوئی روح کو تکلیف دینے کے سوا کچھ نہیں کرو گی۔ اپنے باپ کے بارے میں جو گفتگو اس نے مجھ سے کی' اس میں میں نے کہیں اپنے باپ کے لیے اس کے دل میں کوئی گنجائش نہیں پائی' اپنے باپ کی وجہ سے ہی تو وہ اپنے وجود پر شرمسار رہتا تھا۔" وودن نے سختی سے کہا۔
"مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تم کیا سنا رہے ہو۔" نادیہ نے بے بسی سے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "ڈیڈی اور سعد ..." اس نے سر اٹھا کر وودن کی طرف دیکھا۔ "میں کیسے مان لوں کہ سعد ڈیڈی سے اتنا بے زار تھا۔"
"بہتر ہے کہ مان لو اور برائے مہربانی باتوں میں الجھا کر میرا وقت ضائع مت کرو' ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔" وودن نے درشتی سے کہا۔ اور وہاں سے چل دیا۔ نادیہ یوں ہی بے بس اور ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو کھاری! میں ماہ نور بات کر رہی ہوں۔"
"او ہو مہ نور باجی! تسی کتھے رہ گئے تھے جی؟" کھاری کے کانوں نے جیسے ماہ نور کا نام نہیں کوئی مژدہ جاں فزا سن لیا تھا۔
"آئی ایم سوری کھاری! میں اپنے مسائل اور معاملات میں پڑ کر تمہیں بالکل ہی بھول گئی تھی۔"

"آپ مجھ کو بھل گئے نے کوئی بات نہیں جی مہ نور باجی تسی بھن جی رابطہ تو کیں جس نے آپ نوں یاد ہے آپ ان سے وعدہ کر کے گئے تھے کہ باؤ سعد صاحب دا اگا پچھا معلوم کر کے دو گے۔" کھاری نے بے قراری سے گلہ کیا۔
"وہی آگا پیچھا معلوم کرتے کرتے تو میرا اپنا راستہ بدل گیا کھاری اور نئے راستے کے نشیب و فراز سے میں واقف ہی نہیں۔" ماہ نور عجیب سی کیفیت میں بولی تھی۔
"واہ بھئی کیا بات اے سعد باؤ صاحب دی' جس دے نال ان کا نام جڑدا ہے' اس دا ہی رستہ بدل جاندا ہے۔" کھاری کے لہجے میں طنز کی آمیزش ہوئی "وڈے پیو صاحب کے وڈے پتر صاحب جو نیں سعد باؤ صاحب' چھوٹے تے ماڑیاں (کمزور) لوکاں دے رستے ہی بدلنے نیں ناں اونہاں کے اچے بوہے (اونچے دروازے) سر چک (اٹھا) کر ویکھلے۔ ویکھلے۔"
"پتا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو کھاری!" ماہ نور نے تھوڑا الجھتے ہوئے کہا۔ "بات سنو' آج میں تمہیں ایک ضروری کام سے فون کر رہی ہوں۔"
"مینوں آپ دی تہاڈے نال ایک ضروری کم (کام) ہے مہ نور باجی' پر تسی وڈے ہو پہلے تسی حکم کرو۔"
"حکم و کم کیا کھاری! مجھے تو صرف تمہارے اس جاپانی خرگوش دوست کا کانٹیکٹ نمبر چاہیے فورا۔" ماہ نور نے کھاری کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا۔
"رضوان الحق دا نمبر؟" کھاری نے اس کی بات سن کر حیرت سے پوچھا۔
"ہاں بھئی' اس کا نمبر' چلو جلدی سے دو مجھے اس کا نمبر۔"
"مینوں زبانی تو یاد نہیں مہ نور باجی! میرے موبیل فون دے وچ اس دا نام ہے' تے نمبر بھی' اس دی نشانی رکھی میں نے اس دے نمبر دے ساتھ خرگوش دی تصویر لائی ہوئی ہے۔"
"تو پھر کیسے دو گے؟" ماہ نور نے بے قراری سے کہا۔
پھر ایک خیال سوجھنے پر اس نے کھاری کو سمجھایا۔ "تم ایسا کرو اپنی بیوی سعدیہ کے پاس لے جاؤ فون' اس سے بولو اس خرگوش کا نمبر مجھے بھیج دے' مجھے یقین ہے اسے طریقہ معلوم ہو گا نمبر بھیجنے کا۔"
"اچھا جی میں ابھی بھیجنا آں۔" کھاری نے سعدیہ کے تعلیم یافتہ ہونے پر رشک کرتے ہوئے جواب دیا۔
"او کے گڈ!" ماہ نور نے تیزی سے کہا۔ "جلدی کرنا پلیز' مجھے ارجنٹ یہ نمبر چاہیے۔" اس نے فون کان سے ہٹا لیا۔
"مہ نور باجی! میں نمبر بھیجنا آں پر میری دی تو سن لو۔" کھاری نے ماہ نور کے فون بند کر دینے کا ارادہ بھانپتے ہوئے تیزی سے کہا۔ "میں بڑا پریشان ہوں جی۔" وہ کہتا رہ گیا اور اس کے کان سے لگے فون پر ٹوں ٹوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ جلدی سے اپنا کام بتا کر ماہ نور فون بند کر چکی تھی اور اپنے دل کا حال سنانے کو بے چین کھاری ایک مرتبہ پھر دل کی دل میں ہی لیے رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فلزا کی طبیعت میں شروع ہی سے عجلت کا جو عمل دخل رہا ہے' وہ ابھی تک موجود ہے' اب یہ ہی دیکھو اس روز چھلاوے کی طرح آئی' ایک اور ادھوری المیہ کہانی بغیر نتیجہ کے سنائے آنا "فانا" غائب۔ اس کے بعد کوئی فون کیا نہ ہی خود آئی۔ طبیعت میں بے چینی پیدا کر گئی بس۔" خدیجہ نے دن میں کئی بار دہرائی بات رات کے وقت ایک مرتبہ پھر کرتے ہوئے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"انگریزی کے پرچے میں ایک حصے کا سوال ہوا کرتا تھا جسے comprihensive کہتے تھے۔" فاطمہ نے کئی بار سنی بات کو ایک مرتبہ پھر سننے کے بعد تحمل سے کہا۔

"ہاں وہی جسے اردو کے پرچے میں تفہیم کا نام دیا جاتا تھا۔" خدیجہ نے بے زاری سے کہا۔

"بالکل وہی۔" فاطمہ مسکرائیں۔ "بس وہی ایک عبارت جو کمپوزیشن یا تفہیم کی شکل میں ہوتی تھی، اسی طرح کی عبارت فلزا ہمیں سنا گئی ہے۔ اس عبارت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ذہن میں اٹھتے سوالوں کے جواب ہمیں خود دینا ہوں گے۔"

"نہیں بھئی میں مفروضوں پر مبنی جواب دینے کی قائل نہیں ہوں۔" خدیجہ کو فاطمہ کی بات سے اختلاف محسوس ہوا۔

"چلو پھر ذرا سوچ کر بتاؤ شہناز کو کس نے قتل کیا ہوگا؟" فاطمہ نے خدیجہ کے انداز سے حظ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کوئی مشکل سوال نہیں۔" خدیجہ نے یوں سر جھٹکا جیسے فاطمہ کی بات کا تمسخر اڑا رہی ہوں۔ "وہی کریمنل جو اس کا شوہر تھا وہی شہناز کا قاتل ہے سو فیصد۔"

"اگر وہ قاتل ہے تو اسے شہناز کو ڈیلیوری میں ہیلپ آؤٹ کرنے کی کوشش کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" فاطمہ نے سوال کیا۔ "دروازہ میں بیتلا تھی تو اکیلی پڑی اس کو سسکتی مرجاتی، نہ کوئی قتل ہوتا نہ کوئی قاتل بنتا۔"

"مرد کی فطرت میں ایک مخصوص کمینگی ہوتی ہے۔" خدیجہ نے کہا۔ "اس کو معلوم تھا شہناز اس کا بچہ پیدا کرنے والی تھی، اسی لیے تو بچہ ڈیلیور کراتے پہنچ گیا۔"

"اگر بچہ اس شخص کا تھا تو شہناز سے کیا اختلاف تھا اس کا جو اس کے پیدا کیے بچے کا باپ ہونے کے ساتھ اسی کا قاتل بننے کا اعزاز بھی حاصل کرنا چاہتا تھا۔" وہ فاطمہ نے ترچھی نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔

"اللہ جانے کیا اختلاف ہوگا، یہ جو کریمنلز ہوتے ہیں ان کی دوستیوں اور دشمنیوں کے اسٹینڈرڈ تو بہت ہی عجیب ہوتے ہیں بھئی۔" خدیجہ نے کہا۔

"اس سوال کا جواب فلزا کی عبارت میں موجود ہی نہیں اس لیے کہ فلزا کی عبارت میں کئی تکنیکی سقم موجود ہیں۔" فاطمہ نے یقین سے کہا۔

"تمہیں بغیر دیکھے شہناز کے شوہر کو قتل سے بری الذمہ ٹھہرانے کی کیوں سوجھ رہی ہے؟" خدیجہ نے استفہامیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔ "جبکہ مجھے تو وہ کوئی بہت بڑا فراڈیا، ٹھگ اور کریمنل قسم کا انسان لگتا ہے۔"

"میں شہناز کو جتنا جانتی ہوں اس کے مطابق شہناز کسی فراڈیے، ٹھگ اور کریمنل سے شادی نہیں کرسکتی تھی۔" فاطمہ نے کہا۔

"شہناز تو بے وقوف تھی، ناتجربہ کار اور جذباتی۔" خدیجہ نے سر ہلا دیا۔ "اتنی ہی عقل مند ہوتی تو باپ اور خاندان کی عزت کو یوں ٹھوکر مار کر چلی جاتی۔"

"اس نے وہ جو قدم اٹھایا تھا بہت سوچ سمجھ کر اٹھایا تھا، اس میں اندھی جذباتیت کا کوئی دخل نہیں تھی، وہ خوب جانتی تھی کہ وہ کیا کرنے جارہی تھی اور اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا تھا۔" فاطمہ نے خدیجہ کو یاد دلایا۔

"وہ نتیجے کی پروا نہ کرنے والی لڑکی تھی نا اسی لیے جب ایک دھوکے باز فراڈیے کی محبت میں گرفتار ہوئی ہوگی تو نتیجے کی پروا کیے بغیر اس سے شادی بھی کرلی ہوگی۔"

"وہ دھوکے باز فراڈیا ہوتا تو کیا فلزا، اس اچھی بھلی عمر میں جاکر بھی اس کے عشق میں مبتلا ہوتی، فلزا عقل کی ناقص تو کبھی نہیں تھی۔" فاطمہ کی دلیل میں وزن تھا۔

"اچھا تو پھر تمہارے خیال میں قاتل کون تھا۔" خدیجہ فاطمہ کے دلائل کی تاب نہ لاتے ہوئے بولیں۔

"جو کوئی بھی تھا قاتل 'شہناز کے شوہر کے علاوہ تھا۔ اس شخص کو قاتل قرار دینا حماقت ہوگی۔" فاطمہ نے اپنی بات پر قائم رہتے ہوئے کہا۔

"پھر فلزا نے ریڈیو پر خبر کیوں سنی کہ قاتل رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔" خدیجہ نے سوال کیا۔

"اس ملک میں کوئی بھی شخص کچھ کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا جاسکتا ہے۔ کرنسی یہاں کی پولیس کی۔" فاطمہ نے کہا۔

"گویا تم ہر حال میں اس شخص کو معصوم قرار دینا چاہتی ہو۔" خدیجہ نے تیوری چڑھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔" فاطمہ نے سرہلایا۔ "میں صرف اتنا کہنا چاہ رہی ہوں کہ کمزور اور بودے مفروضوں اور ناکافی شواہد کی بنا پر کسی کو قاتل قرار دے دینا بھی عقل مندی نہیں۔"

"کمزور اور بودے مفروضے۔" خدیجہ نے حیرت سے دیکھا۔ "تم نے فلزا کی بات دھیان سے نہیں سنی تھی کیا؟ اس کہانی کے مطابق وہاں شہناز کے علاوہ اس کا شوہر اور فلزا ہی موجود تھے' پھر شوہر اور فلزا میں سے کوئی ایک ہی قاتل ہوسکتا ہے نا' جو کنڈیشن شہناز کی وہ بتا رہی تھی اس کے مطابق وہ خود تو اٹھ کر اپنے گلے پر چھری پھیرنے سے رہی۔"

"تم بھول گئیں فلزا نے یہ بھی بتایا تھا کہ کمرے سے زور آزمائی اور دھینگا مشتی کی آوازیں بھی آئی تھیں۔"

"ظاہر ہے ایک جیتے جاگتے انسان کا گلا چھری سے کاٹے جانے کی کوشش کی جارہی ہوگی تو وہ مزاحمت تو کرے گا ہی' یقیناً" وہ شہناز کی مزاحمت کی آوازیں تھیں۔" خدیجہ نے کہا۔

"واہ۔ کیسی کامیاب ڈی ٹیکٹوز ہیں ہم' اپنے اپنے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے قیافے لڑاتے ہوئے ایک پرانی مرڈر مسٹری حل کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔" فاطمہ ہنس کر بولیں۔ "اور دونوں ہی اپنے مفروضوں سے ایک انچ ہٹنے پر تیار نہیں یہ سوچے بغیر کہ فلزا کی سنائی کہانی میں صداقت کتنے فیصد ہے۔"

"خیر یہ تو ہم بہت پہلے بھی سن چکے تھے کہ شہناز کو اس کے شوہر نے گلے پر چھری پھیر کر قتل کردیا تھا۔" خدیجہ نے کہا۔ "فلزا نے تو اس سنی سنائی کو باقاعدہ ایک سین عطا کیا اپنی باتوں میں۔"

"جو بھی ہوا بہت خوفناک ہوا۔" فاطمہ نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "اور اس پوری کہانی میں شہناز کے ساتھ جو ہوا' اس کا پس منظر تو ہمیں معلوم نہیں لیکن اس نومولود کے ساتھ جو ہوا' وہ اس سے بھی بڑی ٹریجڈی ہے وہ بچہ بچ گیا یا مرگیا۔ بچ گیا تو کدھر گیا' اب تک ہے بھی یا نہیں' کسے معلوم ہے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" خدیجہ نے سرجھکا کر فاطمہ کی بات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے کیسا سفاک شخص تھا وہ' بیوی کو قتل کردیا۔ بچہ فلزا کو پکڑا کر اس بے چاری کو باہر ہانک دیا' یہ سوچے بغیر کہ جو نا گہانی اس بے چاری پر پڑی ہے اس میں اس کا ذہن اتنا کام بھی کرسکتا ہے کہ نہیں کہ بچہ سنبھال لے۔"

"فلزا نے بچے کے ساتھ جو کیا وہ بہت لاجیکل ہے' میں تو یہ بھی اس کی بڑی ہمت سمجھتی ہوں' جو اتنا سفر اس بچے کے ساتھ کرلیا۔" فاطمہ نے کہا۔

"بس ثابت ہوا کہ اس دنیا میں انہونیاں بھی ہوتی ہیں اور کچھ لوگ اتنے ہی ظالم اور سفاک بھی ہوتے ہیں' جتنا ہم کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔" خدیجہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہانی ابھی ادھوری ہے خدیجہ! ادھوری کہانیوں کے نتیجے ہم کیسے اخذ کرسکتے ہیں' کہانی مکمل ہونی چاہیے مسٹری آف مرڈر کو حل کیے بغیر کسی شخص کو قاتل قرار دینا حماقت ہی ہوگی۔" فاطمہ نے ایک مرتبہ پھر اپنا نقطہ نظر دہرایا۔

"اور کہانی مکمل کیسے ہوگی؟" خدیجہ نے مڑ کر فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"فلزا ہی کہانی مکمل کرے گی یا پھر وہ شخص جو قاتل قرار دیا جارہا ہے۔"

"وہ شخص کہاں ملے گا؟" خدیجہ نے رک کر کہا۔

"اگر میں اس کو جانتی ہوتی تو اس تک ضرور پہنچتی اور ضرور اس سے سوال کرتی۔" فاطمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "اور اگر مجھے چند کلیوز اور مل جائیں تو شاید میں اس تک پہنچنے ہی والی ہوں۔" فاطمہ خلا میں دیکھتے ہوئے بڑبڑا رہی تھیں۔

"اللہ جانے کیا کہہ رہی ہے۔" خدیجہ نے چند لمحوں کے لیے فاطمہ کی بڑبڑاہٹ پر غور کرنے کی کوشش کی' لیکن پھر کچھ سمجھ میں نہ آنے پر شانے اچکا کر آگے چل دیں۔

☼ ☼ ☼

اسے سینٹرل لندن میں واقع نیشنل اسپتال فار نیورولوجی اینڈ نیورو سرجری میں شفٹ کردیا گیا تھا' جہاں اس کا دماغ ایک ہنگامی سرجری سے گزر چکا تھا۔

"میں اس حالت کو کوما نہیں کہہ سکتا۔ اس کا دماغ بیرونی اشارے وصول کررہا ہے اور جب تک وہ ایسا کررہا ہے' مریض کو کوما کی حالت میں نہیں قرار دیا جاسکتا۔" اس کے لیے بٹھائے گئے خصوصی میڈیکل بورڈ کے سربراہ ڈاکٹر مائیکل نے وردن زادے کو بتایا تھا۔ "تم نے خاصی عقل مندی کا ثبوت دیا جو اسے یہاں لے آئے۔" ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے وردن زادے کو داد بھی دی تھی۔ "میں جانتا ہوں ڈارلنگٹن میں اس کی سخت مخالفت کی گئی تھی' مگر خطرہ مول لیے بغیر بڑے کام سرانجام نہیں دیے جاسکتے' ہوسکتا ہے کہ تمہاری اس ہمت کی وجہ سے اس کی جان بچ جائے۔"

"میں اتنا بہادر نہیں ہوں ڈاکٹر!" وردن زادے نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے موت سے اور مردوں سے ڈر بھی بہت لگتا ہے' مجھے حادثوں سے' خون سے' چوٹوں سے بھی بہت ڈر لگتا ہے اور میں کسی بھی ایسے منظر کا سامنا کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جایا کرتا ہوں' لیکن...." اس نے یوں سرہلایا جیسے اسے خود بھی اپنے عمل کی وجہ سمجھ نہ آرہی ہو۔ "یہ لڑکا جو میرا پاکستانی دوست ہے' جواں مرگی اس پر سجتی نہیں' یہ زندگی سے اتنا بھرپور شخص ہے کہ اس کی موت کے تصور نے مجھ سے وہ سب کروا دیا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا' تم نے کبھی یاسیت میں لپٹی زندگی دیکھی ہے ڈاکٹر۔"

اس نے ڈاکٹر مائیکل کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"یوں ہوتی ہے وہ زندگی جیسے ایک دوسرے سے جڑی دو چٹانوں کے درمیان موجود ہلکی سی دراڑ میں سے کہیں ایک سرسبز شاخ باہر جھانکنے لگے اور اس سرسبز شاخ پر ایک ننھا پھول نظر آنے لگے' چٹانوں کے سخت وجود سے پھوٹتی شاخ پر جھولتے ننھے پھول کی سی زندگی سے بھرپور ہے یہ شخص' اس سرسبز شاخ کو اوپر نیچے' دائیں بائیں پھیل کر چٹانوں پر ہر طرف تن جاتا ہے' ایک پھول نے کئی اور پھولوں کو کھلنے کا راستہ دکھانا ہے یا کلی کے چٹک کر پھول بن جانے کے عمل کے دوران ہی مرجھا جانا ہے' جانتے ہو ڈاکٹر! اس شخص کو اپنے سامنے برف کے اس پہاڑ سے گرتے دیکھ کر میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی جو میں نے تمہیں بتائی۔" اس نے اپنی بھرا جانے والی آواز پر قابو کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

"میں اس بلندی سے ناواقف نہیں تھا۔" کچھ توقف کے بعد وہ گلا کھنکھارتے ہوئے دوبارہ گویا ہوا۔ "جس سے اچھل کر یہ ڈھلوان پر جا گرا تھا' میں سر کی اس چوٹ کے زاویے سے بھی ناواقف نہیں تھا' جو حادثے کے بعد اس پر پہلی نظر پڑتے ہی مجھے اپنا اندازہ کرا گئی تھی میں ایک پرانا سکی ڈائیور ہوں' میں نے سکی ڈائیونگ کے دوران

ہونے والے حادثات کی تفصیل پڑھ رکھی ہے' میں جانتا تھا کہ ایسے گرنے کے نتیجے میں آئی چوٹ کا نتیجہ کیا ہوتا ہے' کوئی بھی دوسرا شخص میرے سامنے یوں گرتا تو میں نیچے کسی کو "میری مدد کرو" کا بلاوا کبھی نہ دیتا مگر یہ شخص چٹانوں کی دراڑ میں کھلا ننھا پھول ہے' اسے پوری طرح کھلے بغیر مرجھا جانے کے لیے اکیلے نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔"

"ہوں!" ڈاکٹر مائیکل نے وودن زادے کی بات سن کر پرسوچ انداز میں کہا۔ "اس کے چہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ وودن کے جذبے سے متاثر ہو رہا تھا۔

"میری دعا ہے کہ اس کی زندگی بچ جائے۔" پھر اس نے وودن کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "اور ہم اس کے لیے پوری کوشش بھی کر رہے ہیں' اس کا ایمبولینس کے ذریعے یہاں تک زندہ پہنچ جانا ایک معجزہ ہے۔ ہمیں اس معجزے کو ہی لے کر آگے چلنا ہے' دیکھو جو ایک معجزہ مزید کو جنم دے جائے۔"

وودن نے ڈاکٹر کی بات سن کر اس پر غور کرتے ہوئے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا۔ اس کے ذہن میں مختلف قسم کے خیال آرہے تھے۔ وہ مزید کتنے دن یہاں ٹھہر سکتا تھا۔ اسپتال کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کہاں سے آنے والی تھی؟ اس چھوٹی لڑکی کو کیسے تسلی دی جاسکتی تھی جو خود پر پڑنے والی اس ناگہانی صورت حال کو دیکھ اور سن کر مسلسل گریہ زاری میں مبتلا تھی۔ ان چوبیس گھنٹوں میں اس نے کچھ کھایا تھا نہ ہی وہ کوئی بات سننے کو تیار تھی۔ وہ اس بار اس ملک میں کیا کرنے آیا تھا اور وہ اس وقت کیا کر رہا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اسے اپنی دادی کی کہی بات برسوں بعد اچانک یاد آنے لگی۔

"ہمیں اپنی قسمت کے بارے میں پہلے سے کبھی اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ ہم سے اگلے لمحے' اگلے روز' اگلے مہینے یا اگلے سال کیا کروانے جارہی ہے۔ جو کچھ ہماری تقدیر میں ہمارے لیے کرنے کو لکھ دیا گیا ہے' وقت خود بخود ہمارے قدم اس کام کی طرف موڑ دیتا ہے۔" دادی جو تقدیر پر دل سے یقین رکھتی تھیں کبھی کبھار ایسی باتیں کیا کرتی تھیں۔

"وہ دادی! آج آپ یہاں موجود ہوتیں تو یقیناً" اس واقعہ اور میرے عمل کو اپنے فلسفے کے حق میں دلیل قرار دے رہی ہوتیں۔" اس نے آنکھیں بند کرکے لمحہ بھر کے لیے مرحومہ دادی کو یاد کیا اور آہستہ قدموں سے چلتا اس طرف آگیا۔ جہاں وہ لڑکی بیٹھی اپنی ناک اور آنکھیں ٹشو پیپر سے رگڑتے ہوئے انہیں سرخ کر چکی تھی اور اب اس کے چہرے پر سوجن نمودار ہو رہی تھی۔

"دیکھو میں رونے کے فلسفے کو نہیں مانتا۔" وہ آہستہ سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "کیونکہ رونا دھونا کسی کام کو ہونے یا نہ ہونے سے روک نہیں سکتا۔ برائے مہربانی مت روؤ' تم بہت رو چکی ہو۔" اس نے نرمی سے کہا۔

اس نے سر اٹھا کر اپنی سرخ ہوتی سوجی ہوئی آنکھوں سے وودن زادے کی طرف دیکھا۔

"تم اس لیے ایسا کہہ رہے ہو کیونکہ تمہیں کھو دینے اور بچھڑ جانے جیسے الفاظ اور احساس سے شناسائی نہیں ہے۔ میں ان دونوں سے واقف ہوں' میں بچھڑی بھی ہوں اور میں نے کھویا بھی ہے' ہر رشتے سے بچھڑی ہوں' ہر رشتے کو کھویا ہے' میرے پاس تو جینے کو صرف اس ایک رشتے کا احساس باقی رہ گیا تھا صرف اس ایک رشتے کا۔" اس نے دہرایا۔

"میں نے کبھی سوچا نہ تھا کہ میں اس کو اس قدر جلد کھو دوں گی' ابھی تو میں محبت کے اس نرم احساس سے پوری طرح دوچار بھی نہیں ہوئی تھی جو میرے اس بھائی نے مجھے دی تھی اور اس نے جانے کی ٹھان لی' مجھے بتاؤ میں کیسے نہ روؤں۔ جب اس کا یہ بے جان سا وجود میری نظروں کے سامنے آتا ہے تو میرا دل پھٹ کر میری پسلیوں سے باہر آنے کو بے چین ہوتا ہے اور میرے پیٹ کی سب آنتیں آپس میں الجھ الجھ پڑتی ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے تمہارے اس واویلے اور رونے دھونے سے وہ جاتے جاتے واپس آجائے گا۔" وودن زادے نے جذبات سے عاری لہجے میں سوال کیا۔

نادیہ نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال سنہری تھے اور آنکھیں ہلکی سبز' اس کے چہرے پر سنہری داڑھی بھی موجود تھی' وہ ایک مکمل امریکی نظر آتا تھا۔ اس کے ایرانی آباؤاجداد اس کے چہرے مہرے پر کوئی اثر نہ چھوڑ سکے تھے۔

"تم امریکی ہوتے ہی سرد مزاج' بے مہر اور لاپروا ہو۔" نادیہ نے کہا۔ "میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں' میں نے زندگی کے کئی سال تمہارے ہی بھائی بندوں کے درمیان گزارے ہیں۔ زندگی اور موت جو کسی دوسرے کی ہو' اس سے تم لوگوں کو کوئی مطلب نہیں ہوتا' ہاں تمہاری اپنی ہو تو تم ایک کو بچانے اور دوسرے سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہو۔ تمہیں کیا پتا رشتے اور رشتوں کا احساس کیا چیز ہوتا ہے۔"

وودن نے ہونٹ بھینچ کر اس لڑکی کو دیکھا۔ جس کے بال سیاہ اور آنکھیں نیلی تھیں۔ اس نے سر پر اسکارف لپیٹ رکھا تھا اور سیاہ پینٹ پر سرمئی لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس کی رنگت سرخ و سفید تھی' وہ بھی سوائے بالوں کے کہیں سے مشرقی لڑکی نہیں دکھ رہی تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو' لیکن مفروضوں کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے اگر حقیقت کو سمجھ لیا جائے اور اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہا جائے تو زندگی مشکل سے بچائی جاسکتی ہے۔" وودن کو خود بھی محسوس ہوا کہ وہ ایک بودی دلیل دے رہا تھا۔

نادیہ نے جواباً "کچھ نہیں کہا' وہ وہاں بیٹھ کر صرف روتی رہی۔ اس کا دل غم سے پھٹنے کو تھا۔ سعد کے ساتھ حادثے اور حادثے کے بعد اس کی حالت نے اس کی دنیا میں اندھیرا کردیا تھا اور اس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے اس کے ذہن پر صرف ایک خیال چھایا ہوا تھا کہ بس کچھ ساعتوں کی بات تھی کہ زندگی رخصت ہوا چاہتی تھی' ایک انتہائی غیر متوقع اور المناک صورت حال کے ردعمل میں جو اس کی حالت ہو رہی تھی۔ وہ غیر منطقی ہرگز نہیں تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے دنیا کے آخری کنارے پر واقع موت کے کسی جزیرے پر وہ تنہا جلاوطن کردی گئی ہو۔ وودن زادے کی تسلیاں اور دلائل اس کے کسی کام نہیں آرہے تھے۔ وہ آنے والے ایک ایک لمحے سے خوف زدہ تھی اور اس خوف نے اس کا دل بٹھا رکھا تھا۔

وودن اس کو ہر طرح سے پرسکون کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اسپتال کی عمارت سے باہر جاچکا تھا۔ اور وہ وہیں بینچ پر تنہا بیٹھی رو رہی تھی۔ اس کی نظریں سامنے دیوار پر لگے وال کلاک پر لگی تھیں اور کلاک کی منٹ بتانے والی سوئی کی ہر جنبش پر اس کا کلیجہ منہ کو آتا محسوس ہوتا تھا۔ اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے اسے اپنے کوٹ کی جیب میں رکھے فون کے بجنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے جیب سے فون نکال کر نظروں کے سامنے کیا۔ یہ ڈاکٹر رضا حسین کی کال تھی۔ وہ اس سے ملنے کے لیے آنے والے تھے۔

☼ ☼ ☼

"میرا نام عبدالودود ہے سائیں جی۔" اختر کے بالکے نے اس کی جھونپڑی میں بچھی چٹائی پر اختر کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم خوش قسمت ہو کہ جس کے بندے ہو اس کے بندے ہونے کا اعتراف تمہارے نام میں ثبوت کے طور پر موجود ہے۔" اختر نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"آپ مجھے جانتے ہو سائیں جی' جانتے ہو نا!" عبدالودود نے سوال کیا۔

"مخلوق خدا کی خدمت کرنے والے کو اپنی شناخت کے بارے میں کوئی شک ہونا تو نہیں چاہیے۔" اختر نے زمین پر دھری گڑگڑی اٹھائی۔

"شاید آپ صحیح کہہ رہے ہو سائیں جی۔" عبدالودود نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے یہاں آئے ایک برس سے اوپر کچھ دن ہوچکے ہیں۔ میں اپنے کام میں مصروف رہتا ہوں اور جو میری نظروں کے سامنے سے ہوتے ہوئے گزرتا ہے۔ اس کا مطلب جاننے کی کوشش کرتا ہوں سائیں جی۔"

"بہت اچھا کرتے ہو' مطلب جاننے کی کوشش ہی سے تو راستہ ملتا ہے۔" اختر نے گڑگڑی کا کش لگایا۔

"میں نے اس سے پہلے بھی چند آستانوں میں وقت گزارا ہے' وہاں بھی میں مطلب جاننے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ اور میری اس کوشش نے میرا دل ایسی ہر جگہ سے اٹھا دیا۔" عبدالودود نے گردن جھکاتے ہوئے کہا۔ "پتا نہیں کیوں مجھے ہر ایسی جگہ پر ڈھکوسلہ نظر آیا' فریب نظر اور لوٹ ٹھگی دکھائی دی۔ میں کوئی عالم ہوں نہ عالم کی سی نظر رکھتا ہوں' اگر میری سوچ میرا گمان ہے تو اللہ مجھے معاف کرے جی۔"

"کاروبار دنیا ہی ہے' پیٹ بھرنے کے ذرائع ہیں سب۔" اختر نے عبدالودود کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"لیکن یہاں کی جی۔" عبدالودود نے جھونپڑی کے فرش پر بکھرے تنکوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "یہاں کی پتا نہیں چلتی جی' یہاں کی بات کی سمجھ مجھے ابھی تک نہیں آئی۔"

"ادھر بھی تو یہ ہی کچھ ہے نا' ڈھکوسلہ' دھوکا ٹھگی۔" اختر مسکرایا۔

"نہیں جی!" عبدالودود نے سر ہلایا۔ "ادھر وہ بات نظر نہیں آئی۔"

"پھر کیا نظر آتا ہے۔" اختر نے پوچھا۔

"کچھ ایسا بھی نظر نہیں آتا جی' جس کی وجہ سے میں ادھر ٹھہرا ہوں" عبدالودود نے سر جھکا کر کہا۔

"تم دیکھنا کیا چاہتے تھے' دیکھنا کیا چاہتے ہو؟" اختر نے کہا۔

"میں جی!" عبدالودود نے اختر کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ "میں کسی ایسے کی تلاش میں ہوں جس کے فیض نظر سے میری ماہیت قلب ہوجائے۔"

"اچھا!" اختر نے اس کے جملے پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "پھر تو بچہ جی تم بہت مایوس ہوتے ہوگے یہاں اتنا عرصہ گزارنے کے دوران۔"

"پتا نہیں جی۔" عبدالودود نے سر ہلایا۔ "میری سمجھ میں بات نہیں آئی جی' جب یہاں لوگوں کا ہجوم دیکھتا ہوں تو ذہن کچھ کا کچھ ہوجاتا ہے' آپ کو کسی سے کہتے بھی نہیں سنا' پھر بھی نجانے کدھر کدھر سے لوگ لنگر سے بھری گاڑیاں ادھر لے آتے ہیں اور جنگل میں منگل ہوجاتا ہے' میں نے بڑی بڑی گاڑیوں والے سوٹ بوٹ پہنے آدمیوں کو ادھر آپ کے پاس آتے دیکھا ہے' لیکن جھونپڑی سے نکلتے ہوئے نہ تو کسی کے ہاتھ میں کوئی تعویذ ہوتا ہے' نہ دھاگا' نہ آپ کوئی دم درود کرتے ہیں۔ نہ آپ دوا دیتے ہیں' پھر بھی آنے والا آدمی چہرے سے پریشان نظر آتا ہے اور جانے والا پرسکون۔ جب آپ کو دیکھتا ہوں تو تذبذب میں پڑجاتا ہوں' نہ کوئی چلہ نہ گیان' سادہ نماز اور تسبیح' ہاں رات بھر لالٹین جلائے آپ کو قرآن پاک کی تلاوت کرتے ضرور سنتا ہوں' تہجد بھی پڑھتے ہوں شاید' مگر یہ سب تو ایک عام مسلمان بھی کرتا ہی ہے' پھر آپ کے پاس لوگ کیوں آتے ہیں' یہاں لنگر کہاں سے آتا ہے' مخلوق کیوں جمع ہوجاتی ہے۔"

عبدالودود کے چہرے سے اس کے دل کی الجھن ہویدا تھی۔ اس نے دیکھا۔ اس کی بات سن کر سائیں اختر مسکرا رہا تھا جبکہ اسے ڈر تھا وہ سائیں اختر کو ناراض کرچکا تھا۔

"نماز' روزہ' تسبیح' تہجد' قرآن۔" اختر نے بلند مگر نرم آواز میں کہا۔ "تو انسان اپنے لیے کرتا ہے' اس سے اس کا

اللہ راضی ہوتا ہے۔ نہیں راضی ہوتا۔ راضی ہوتا ہے تو اس پر کیسے کیسے نظر کرم کرتا ہے یہ اس کا اور اس کے اللہ کا معاملہ ہوتا ہے۔ یہ بندے کی خصوصیات قرار نہیں دی جاسکتیں کیونکہ بندہ تو پیدا ہی اس مقصد کے لیے ہوا کہ وہ اپنے رب کو کتنا اور کیسے پہچانتا ہے پہچان جائے تو تسلیم و رضا کا اظہار کیسے کرتا ہے۔"

"پھر یہ بھی تو بات ہے۔" عبدالودود نے بے چینی سے کہا۔ "اگر یہ تسلیم و رضا کا عام اظہار ہے جو سب کرتے ہیں تو پھر وہ خاص بات کیا ہے جو مخلوق خدا کو ادھر آپ کے ڈیرے پر لے آتی ہے اور ان سے یہ کہلواتی ہے کہ آپ کو نظر عطا ہو چکی۔"

"نظر بچہ جی!" اختر نے ہاتھ سے گڑگڑی زمین پر رکھتے ہوئے کہا اور بازو گھٹنوں کے گرد باندھ لیے۔ "نظر کی تعریف کیا ہے، کچھ پتا ہے؟"

"نہیں سائیں جی!" عبدالودود نے سر ہلایا "آج تک نظر کا فلسفہ ہی تو سمجھ نہیں آیا۔"

اختر نے مسکراتے ہوئے سامنے دیکھا۔ پھونس کی جھونپڑی کی دیواروں میں درازیں تھیں جن سے چھن کر اندر آتی سورج کی کرنوں میں گرد کے ذرات چمکتے تھے۔ یوں جیسے سونے کے ذرے چمکتے ہوں۔ اختر آنکھیں سکیڑ کر کچھ دیر ان چمکتے ذرات کو دیکھتا رہا اور پھر عبدالودود کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"انسان کا ایک وصف یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز پر ارتکاز کرلیتا ہے تو اس چیز میں ماسٹرز ڈگری حاصل کرلینے کی صلاحیت بھی اسے عطا ہو جاتی ہے اب وہ اس صلاحیت عطا ہو جانے کے باوجود کوشش ترک کرکے کام ادھورا چھوڑنے کے بعد کسی اور چیز پر ارتکاز کرلیتے ہیں۔ بچہ جی! یہ تو تمہیں علم ہی ہوگا کہ کسی مضمون میں اعلا ترین ڈگری لے لینے والے اور اس میں کوئی دلچسپی نہ رکھنے والے کا علم ایک برابر نہیں ہو سکتا۔ اس فقیر نے۔" اختر نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ علت اور معلول کے سلسلے پر ارتکاز کرنے سے اپنی کوشش کا آغاز کیا۔ ایک لافانی طاقت کے ہونے کا اعتراف اور اس کی قدرت کے نظارے علت و معلول کا سلسلہ ہیں۔ فقیر نے سبزہ زاروں تک کا سفر کیا، پہاڑوں کی بلندیوں کو ناپا، میدانوں اور صحراؤں میں گھوما، دریاؤں اور سمندروں کا مشاہدہ کیا۔ ہر طرف اس لافانی طاقت کی قدرت کی کار فرمائی نظر آئی، ہر چیز اپنے خالق کی صناعی کا عکس بن کر نظر آئی۔ ارتکاز کی بات ہے نا بچہ جی۔"

اس نے ایک بار پھر عبدالودود کی طرف دیکھا جو بغور اس کی بات سن رہا تھا۔

"فقیر کا ارتکاز نہیں ٹوٹا، اپنے سبجیکٹ میں ماسٹرز ڈگری کی دھن سوار ہوگئی اور اس ڈگری کو حاصل کرنے تک کے درمیان کے عرصے میں وہ بس اتنا جان پایا کہ "کن" کا فرمان صرف اسی طاقت کی طرف سے ہی جاری ہو سکتا ہے۔ فیکون کا نظارہ اس کی تخلیق کرتی ہے، مگر یہ "کن" کو کبھی غیر منطقی پایا نہ ہی "فیکون" کو۔ گویا علت کے بغیر معلول کا ہونا ممکن نہیں، اسی چیز پر غور کرتے کرتے معلوم ہوا کہ جب علت غیر منطقی نہیں تو معلول بھی ال لوجیکل نہیں ہو سکتا، لافانی طاقت کی قدرت کا ایک مظہر اس کی تخلیق میں سے اعلی ترین یعنی "انسان" فقیر کی ریسرچ کا اگلا موضوع بن گیا، فطرت، قدرت اور انسان پر غور کیا تو ایکشن اور ری ایکشن کی تھیوری سمجھ آنے لگی، کسی ایکشن پر انسان اپنی جبلت کے مطابق کیا رد عمل ظاہر کرے گا، معاملہ فہم پر کھلنے لگا، تجربے کی پٹاری بھی ساتھ ساتھ زرخیز ہو رہی تھی، یہیں وہ نظر عطا ہونے لگی جو دیکھتی تھی۔ کسی عمل کا رد عمل کیا اور کب جاکر ہوگا چہرے اور چیزوں پر ابھرتے تاثر دلوں کے حال سناتے نظر آنے لگے، غور کرنے پر معلوم ہوا نظر کو فیاض کی صفت عطا ہو رہی ہے، نبض پہ نظر کا ارتکاز ہو جانے سے دل کا حال جان لینا مشکل نہ رہ گیا، سفر طویل مگر ثمر آور ثابت ہونے لگا، بس یونہی جیسے ایک دو تین سیکھنے والا بچہ وقت کے ساتھ ساتھ ریاضی کے مضمون پر ارتکاز کرنے اور ارتکاز کے نتیجے میں ماہر ریاضی دان بن جائے بس یہ ہی۔" اختر نے رک کر عبدالودود کی طرف دیکھا۔

"بس یہ ہی وہ نظر ہے جو برسوں خاک چھانتے رہنے کے بعد سونے کی ڈلی کی طرح چھلنی کے اوپر رہ گئی۔ گویا ہاتھ آ گئی ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کا شوق چرایا تو محسوس ہوا دنیا میں دل لگا کر واردات کا حصول ناممکن ہے' دل کی اپنی جو دنیا ہے اس میں دل لگایا جائے' سو دنیا کی گہما گہمی سے رخصت ہو کر یہاں اس کٹیا میں بسیرا کر لیا' حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے والے' مسائل سے پریشان حال' شور ہنگامے سے فیڈ اپ ہوئے لوگوں کا گزر جو ادھر سے ہوا تو ضعیف الاعتقادی نے انہیں راستہ دکھا دیا۔ حقیقت سے فرار' مسائل سے نجات' کتھارسس کی خواہش و تسلی کے چند بول سننے کی آرزو۔ فقیر کو اللہ کے ان بندوں سے کوئی غرض نہ تھی' کوئی لالچ نہیں تھا' پہلے پہل کٹیا میں آئے مہمان سمجھ کر آؤ جی' بیٹھو جی کہنا شروع کیا' پھر لوگوں کی باتیں سننے اور ان پر غور کرنے کی عادت پڑنے لگی' برسوں کی چھنی خاک میں سے چھلنی کے اوپر رہ جانے والی سونے کی ڈلی کام آنے لگی' توفیق بھر حل ان کے مسائل کا سمجھ میں آنے لگا' ایک دو کے مسئلے حل ہو گئے' پھر چل سو چل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ فقیر نے تشہیر کی نہ گھر گھر دستک دے کر کسی کو خود سے متعارف کروایا۔ مخلوق خدا آپ سے آپ ادھر آنے لگی پھر تو گویا ڈیوٹی لگ گئی' ان کی سننی ہے ان کو تسلی دینی ہے' کائنات کے جن رازوں اور اسرار سے پردہ فقیر کی نظر سے اٹھا' ان کی کچھ خبر انہیں بھی سنانی ہے۔ یوں یہ سلسلہ کسی کے شروع کیے بغیر ہی شروع ہو گیا۔ فقیر نہیں جانتا۔ کس کس کے من میں آتی ہے' اور وہ مخلوق خدا کی بھوک مٹانے کا سامان لیے یہاں چلا آتا ہے' وہ مخلوق جس کو بھوک مٹانی ہوتی ہے وہ کدھر سے یہاں آتی ہے اور بعد میں کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ فقیر جانتا ہے کہ سوال کرنا' جاننے کی خواہش کرنا کہ یہ سب سلسلہ کیسے چل رہا ہے حماقت ہے۔ جو چلا رہا ہے' جو سبب بنا رہا ہے اس نے جو کام فقیر کے ذمے لگایا ہے فقیر کو صرف وہی کرنا زیب دیتا ہے۔"

"ہوں!" اختر کے خاموش ہو جانے پر عبدالودود چونکا اور پھر اختر کی طرف دیکھنے لگا۔ "مگر وہ کشف القلوب' وہ آنے والے وقت کے بارے میں پیش گوئیاں؟" اس نے سوال کیا۔

"ساری بات سنا دی پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟" اختر نے گڑگڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں نے ارتکاز کی بات کی ہے بچہ جی" اس نے گڑگڑی کی بجھتی آگ میں پھونک مارتے ہوئے کہا۔ "کشف القلوب اور پیش گوئیاں تو ٹرمنولوجی ہے پیچیدہ امراض کی کیس اسٹڈی کے بعد میڈیکل سائنس سے وابستہ افراد اپنی فائنڈنگ کرتے ہیں کہ نہیں' اپنی رائے دیتے ہیں یا نہیں کہ مرض کہاں کہاں کتنا اثر چھوڑ سکا اور وہ مریض کے ساتھ کیا کرنے والا ہے" اس نے عبدالودود کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جی ہاں!" عبدالودود نے سر ہلایا۔

"بس ایسے ہی ہے' وہ جسم کے عوارض کے ماہر ہوتے ہیں' فقیر کے ارتکاز نے اسے روح اور دل و دماغ کے عوارض پر مہارت عطا کر دی' کسی انسان کو آگ پکڑ لے تو تم بھی پیش گوئی کر لو گے کہ وہ جل جائے گا' کتنا جلے گا' اور جلنے کے بعد ٹھیک ہو سکے گا یا نہیں' یہ ہی فقیر کا تجربہ اور پی ایچ ڈی کی ڈگری ہے۔ لوگ اسے پہنچا ہوا... کشف القلوب... اللہ والا" کچھ بھی نام عطا کر دیں۔ بات صرف اتنی سی ہے جو میں نے سنائی۔ پریشان حال' مسائل کے مارے انسانوں کو اگر میرے چار لفظوں سے تسلی ہو جاتی ہے تو یہ بھی تو اسے ذات کا کرم ہے نا جس نے مجھے ان لوگوں کے لیے یہاں لا بٹھایا ہے۔ میں خود تو آ کر نہیں بیٹھ گیا نا۔ میں نے کسی عبدالودود کو کسی رحیم بخش کو کسی دوسرے بالکے کو بلا کر یہ نہیں کہا کہ بچہ جی یہاں بیٹھ جاؤ اور مخلوق خدا کے لیے لنگر پکاؤ۔ سارے عبدالودود اور رحیم بخش اسی کے حکم پر یہاں آتے ہیں' کیا پکاتے ہیں' کس کو کھلاتے ہیں۔ فقیر نے تو کبھی اس کا بھی سوال نہیں کیا' فقیر تو صرف فیکون کا نظارہ کر رہا ہے۔" عبدالودود ایک بار پھر اپنی محویت سے باہر نکلا اور جھرجھری لے کر سیدھا ہوا۔

ہوگ خود کو پیر کہتے ہیں آپ فقیر بولتے ہو' کسی کاغذ پر تعویذ اور دھاگے پر دم کر کے تسلی دیتے ہیں' آپ لفظوں کے جادوگر ہو۔ شاید میں بھی سمجھ نہ پاؤں۔" اس نے سر ہلایا۔

"سمجھ میں نہیں آتا تو اپنا راستہ کھوٹا مت کرو۔" اختر نے کہا۔ "شاید جو تم کرنا چاہتے ہو' جو بننا چاہتے ہو' وہ تمہارا راستہ ہی نہ ہو۔"

"آپ بتائیں کہ یہ میرا راستہ ہے یا نہیں۔" عبدالودود نے سوال کیا۔ "آپ کو تو علم ہو جاتا ہے نا!"

اختر بے اختیار ہنس دیا۔ "دیکھا تم بھی میرے لفظوں کی جادوگری میں پھنس رہے۔ تمہیں بھی وہم ہو گیا کہ مجھے پتا چل جاتا ہے۔"

"پھر بھی۔" عبدالودود نے اصرار کیا۔

"راستہ تو تمہارا ہے ہی جب ہی تو بجائے بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھنے کے' ڈیروں اور کٹیاؤں کے دھکے کھاتے پھر رہے ہو مگر دل پاور کی کمی ہے' گمان اور بدگمانی کے درمیان پھنس جاتے ہو' راستہ دشوار ہے' قدم من من بھر کے ہونے لگتے ہیں' راستہ کھوٹا ہونے لگتا ہے' لیکن اگر قوت ارادی ہے اور ہر حال میں سفر کر لینے کا عزم ہے تو ایک نہ ایک روز پا جاؤ گے۔ کیونکہ سو میں سے پانچ ہوتے ہیں جنہیں یہ راستہ پکڑنے کا خیال آتا ہے' اور یہ خیال ڈالتا کون ہے دل میں' وہی پاک ذات جو بندوں کو خود منتخب کرتی ہے۔ دعا کرو یہ انتخاب رحمت بنے تمہارے لیے آزمائش نہ بنے۔"

"اور جو اگر مجھے نظر عطا ہو جائے تو کیا کروں۔"

"پھر نیت صاف رکھنا پڑے گی' نظر عطا ہو جانا اور نظر عطا ہو جانے کا دعوا کرنا دو مختلف واردتیں ہیں بچہ جی! جہاں صرف دعوا ہوتا ہے وہیں ڈھکوسلے' شعبدہ بازیاں اور ٹوٹکے جنم لیتی ہیں۔ میں نے کہا نا راستہ دشوار بہت ہے۔"

"ہوں۔" عبدالودود نے سر ہلا دیا۔ "گویا آپ کے کشف اور آپ کی پیش گوئیاں نباض کے سے وصف ہیں' آپ کی باتیں فزیکل ہیلنگ کی طرح اسپریچوئل ہیلنگ کا اثر رکھتی ہیں۔ وہ دوا دیتے ہیں آپ دعا دیتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر ہیں' میڈیکل کے مختلف شعبوں کے اسپیشلسٹ ہیں' آپ سائیکاٹرسٹ ہیں۔"

"فقیر سائیکاٹرسٹ نہیں ہے' فقیر تو صرف سائیں ہے بچہ جی فقیر سائیں اختر ہے۔"

"میں اب اٹھتا ہوں جی' مجھے دوپہر کا لنگر پکانا ہے۔" عبدالودود نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آج تم نے "ارتکاز" کے معنی جان لیے بچہ جی' اب خود سے پوچھ لینا کہ کر بھی سکتے ہو یا نہیں۔" اختر مسکرایا اور گڑگڑی کے کش لگانے لگا۔

☆ ☆ ☆
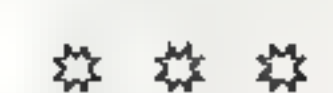
"اتنے برسوں سے وہ اس لڑکی کو لک آفٹر کر رہا تھا' آخر اس میں اس کا کیا انٹرسٹ تھا؟" بلال سلطان نے ابراہیم سے پوچھا' جو بے یقینی سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں سعد سلطان کے اکاؤنٹس کی تفصیل جاننے کی کوشش میں مصروف دیکھ رہا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں۔" اس نے تھوک نگلتے ہوئے بے نیاز بننے کی کوشش کی۔ "وہ اسے اچھی لگتی ہو شاید۔"

"خیر اس کی وجہ یہ تو ہرگز نہیں ہے' یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔" بلال سلطان نے ایک فائل کھولتے ہوئے کہا اور ناک پر عینک جمائی۔ "مجھے ایسا نظر آ رہا ہے کہ خاصی تگڑی ہیلپ ہوتی رہی اس کی۔"

"مے بی" ابراہیم نے شانے اچکائے "اس لڑکی کے بارے میں میں نے بھی اسی روز جانا تھا جس روز میں نے

اسے اس کے گھر میں جاتے دیکھا تھا۔"

"اور جس گھر کی صورت حال اور سعد کا تعلق اس گھر سے دیکھتے ہوئے تم نے اسے اس کی بیوی قرار دے دیا تھا اور اس کی کیئر ٹیکر کو سعد کی ساس سمجھے تھے۔" بلال نے طنزیہ نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"پکچر تو کچھ ایسی ہی تھی" اس کے علاوہ کیا اندازہ لگایا جاسکتا تھا اسے دیکھ کر۔" ابراہیم نے کہا۔

"گدھے ہو تم" بلال سلطان بلند آواز میں بولے "بچپن سے اس کے ساتھ رہے ہو پھر بھی اتنا نہیں جان سکے کہ کس سے اس کا کیا تعلق ہوسکتا ہے۔"

"وہ جتنا ان پری ڈیکٹیبل ہے اس سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے۔" ابراہیم کو اب بلال کے مزاج سے ڈر نہیں لگتا تھا اب وہ کچھ کچھ انہیں سمجھنے لگا تھا۔

"وہ جتنا بھی ان پری ڈیکٹیبل ہو، تمہیں اتنا تو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ ساس اور بیوی کا انتخاب کرتے ہوئے کن کن باتوں کو مدنظر رکھے گا۔" بلال نے سر جھٹکا۔ "مجھے دیکھو" پھر انہوں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "ساری عمر ہم ایک دوسرے سے نارتھ اور ساؤتھ پول جتنے فاصلے پر رہے" مگر میں اس کے مزاج سے اتنا واقف ہوں کہ اس کے ماتھے پر پڑا ہوا ایک بھی بل دیکھ کر اس کی وجہ جان سکتا ہوں۔"

"تو پھر آپ کو اس رات اندازہ کیوں نہیں ہوا کہ وہ یہاں سے چلے جانے کی ٹھان بیٹھا ہے اور اگلی صبح وہ آپ کی ہدایت کے مطابق آپ کے آفس نہیں جائے گا بلکہ پہلے سے کنفرڈ ٹکٹ پر دبئی کی طرف اڑ جائے گا۔" ابراہیم نے اپنے تئیں ان پر زوردار وار کیا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو میں اس کی باڈی لینگویج میں غیر معمولی تبدیلی نہیں دیکھ پایا تھا۔" بلال نے اپنی طرف آتے وار کے ہلکے وزن پر طنزاً مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کچھ ایسا کرنے جارہا تھا جس کی توقع مجھے اس سے نہیں تھی' لیکن وہ اپنے جذبات اور حواس پر کمال قابو رکھتا ہے' وہ مجھے اور میرے اندازوں کو ٹھنڈی مار دے گیا' میں اس کی ٹائمنگ کا اندازہ نہیں کرسکا۔"

"دیکھا۔" ابراہیم ان کے اس اعتراف کو اپنی کامیابی سمجھ کر بغلیں بجانے لگا۔ "وہ آپ کو ہمیشہ ہی جل دے جاتا رہا ہے' آپ اسے کبھی بھی پکڑ نہیں سکے' مان لیں۔"

"الفاظ کے ہیر پھیر کی ہی بات ہے" بلال نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا "وہ مجھے جل دے جاتا رہا یا میں دانستہ جل کھاتا رہا۔ شاید تم نہیں سمجھو گے" انہوں نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"اب کرنا کیا ہے آپ نے" ابراہیم نے ان کے سامنے بکھرے کاغذات پر نظر ڈالی "ساری مائیوں' بابوں' لڑکے' لڑکیوں' اداروں' بیماروں کی فہرست تو آپ دیکھ چکے جن کی طرف رقم اس کے مختلف اکاؤنٹس سے جاتی رہی ہے' اب آگے کیا کرنے والے ہیں آپ آخر' ان سب کو کوئی سزا دینے والے ہیں یا یہ فرمان جاری کرنے والے ہیں کہ اب تک جو رقم ان پر خرچ ہوئی' وہ واپس کریں۔"

"تمہارے باپ نے نا' تمہارے ساتھ بڑی زیادتی کی۔" بلال سلطان نے بکھرے کاغذات اکٹھے کرتے ہوئے کہا۔ "اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے تم اس کی آنکھ کا تارا بن گئے' ایک ایسا تارا جس کے بارے میں اس نے سوچ لیا کہ وہ صرف فوڈ پائپ سے طاقت لے کر چمک سکتا ہے۔ سو اس نے تمہیں سوائے کھلانے اور کسرتیں کرانے کے دوسری کسی خوبی کی طرف دھیان نہیں دیا' سنا ہے تمہارے کچن میں کوکنگ آئل اور بناسپتی گھی کا داخلہ ممنوع ہے؟" انہوں نے ایک اچٹتی نظر ابراہیم پر ڈالی۔

"ڈیڈی کے خیال میں دیسی گھی' پیور اور نیچرل ہوتا ہے۔" ابراہیم نے کہا۔

"ہوں۔" بلال نے سر ہلایا۔ "بس اسی نیچرل اور پیور گھی کی چربی چڑھ گئی ہے تمہارے دماغ پر' جسم کو کسرت

کے ہاتھوں حرکت مل جاتی ہے اور وہ استعمال بھی ہوجاتا ہے' لیکن دماغ کی ایکسرسائز جم میں نہیں ہوتی نا' اس کے لیے جو ٹیڈمل استعمال ہوتی ہے بدقسمتی سے وہ تمہاری پہنچ سے باہر ہے۔"

ابراہیم نے لمحہ بھر کے لیے بلال کی بات سمجھنے اور اس پر غور کرنے میں صرف کیا' لیکن پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے شانے اچکا لیے۔

"یہ وہ لسٹ ہے جس میں ان لوگوں کے نام شامل ہیں جن کو باقاعدگی سے رقم جاتی تھی۔" بلال نے اس کی حالت پر مسکراتے ہوئے ایک لسٹ اس کے سامنے رکھی۔

"جی!" ابراہیم کی نظروں کے سامنے بھتہ وصول کرنے والوں کی فلموں میں دیکھی شکلیں گھوم گئیں۔

"اب ان لوگوں تک رقم میرے ایک اسپیشل اکاؤنٹ سے جایا کرے گی' بلا تعطل اور اس عمل کو تم خود مانیٹر کرو گے۔" بلال نے ابراہیم کی توقعات کے برعکس کہا۔ "مجھے امید ہے تم اپنے دوست کی خاطر اتنی ذمہ داری تو لے ہی سکتے ہو۔" یہ آخری بات انہوں نے نیچی آواز میں کہی تھی۔

ابراہیم نے بے یقینی سے سر ہلاتے ہوئے لسٹ ان کے ہاتھ سے پکڑلی۔

"ظہیر صاحب سے مل لو اس سلسلے میں۔" انہوں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں تم خاصے مصروف لڑکے ہو' لیکن تمہاری دوستی کے جو جذبات انوالوڈ ہیں اس کے کاموں میں تم سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں۔"

"ڈونٹ یو وری۔" ابراہیم نے سنجیدگی سے کہا "لیکن ایک بات ضرور بتادیں" آپ ایموشنل ہو رہے ہیں یا کمزور؟"

"ہاہا" بلال نے ابراہیم کے سوال کے جواب میں قہقہہ لگایا "میں صحیح کہتا ہوں کہ تم احمق ہو' گدھے ہو۔" انہوں نے رک کر گہرا سانس لیا "اتنا بھی نہیں جانتے کہ جو ایموشنل ہوتا ہے وہی کمزور بھی ہوتا ہے۔"

ان کی آواز کپکپانے لگی تھی یا ابراہیم کو ایسا محسوس ہوا تھا' ابراہیم دیر تک سوچتا ہی رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

"سعدیہ باؤ! میں مہ نور باجی کے نال وعدہ کر بیٹھا تھا کہ اوہناں نوں بھائی رضوان الحق دا نمبر بھیجوں گا" آپ میری گل منو' اوہناں نوں بھیج دیو۔" کھاری نے سعدیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"پتا نہیں کیوں کھاری! مجھے ایسا لگتا ہے آج کل تمہارا دماغ صحیح کام نہیں کررہا۔" سعدیہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ کھاری سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"کبھی تمہیں وہم ہونے لگتا ہے کہ تم ان سعد باؤ صاحب کے بھائی ہو' کبھی تم کہتے ہو ماہ نور باجی محمد رضوان الحق کا نمبر مانگ رہی تھیں۔"

"تے میں دو ناں ہی گلاں غلط تے نئیں کروا۔" کھاری نے کہا "دو گل وی صحیح سی تے ایہہ گل وی صحیح اے۔" اس نے ہوا میں انگلی لہراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اچھی طرح پتا ہے کھاری' اماں سعد باؤ صاحب کی اگلی پچھلی سب سے واقف ہیں۔" سعدیہ نے رسان سے اسے سمجھانا شروع کیا "انہیں پتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے ہیں" ان کی اماں مرچکیں' اب مرنے کے بعد تو وہ بچہ پیدا کرنے سے رہیں' پھر تم کدھر سے ٹپک پڑے۔"

"مینوں رب دی سوں (قسم) میں جھوٹ نہیں بول دا سعدیہ باؤ' مینوں خود چوہدری صاحب تے اوس بوجھل بائی نے دسیا سی۔" کھاری روہانسا ہوگیا۔

"چلو میں نے مان لیا کہ انہوں نے تم سے دل پشوری کرلی' مگر تم خود کو دیکھو' اماں کی سنائی کہانی جانتے ہوئے بھی

بغیر سوچے سمجھے ان کی طرف دوڑ پڑے 'تمہیں پتا ہے مجھے کتنی بے عزتی محسوس ہوئی جب تم اماں کے سامنے جھوٹے پڑے۔"

کھاری پر گھڑوں پانی پڑ گیا' سعدیہ کے چہرے پر جو دکھ اسے نظر آرہا تھا اسے لگا سب اس کی ذات کی وجہ سے تھا۔

"میں کسے توں کس طرح یقین دلاواں سعدیہ باؤ!" وہ بے بسی سے بولا "میرے کن وجدے نہیں ناں میں خواب دیکھیا۔" اسے اپنا آپ لاچار لگنے لگا۔ "اس نکی ہی میں بن چپ ہاں۔" اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی "میں چوہدری صاحب تے اڈیکدا ہوں' آپی جدوں آن کے دودھ پانی دو کھرا کردیں گے۔"

"بس پتا نہیں کیوں" سعدیہ نے سر ہلایا "پتا نہیں کیوں کھاری! میرا دل چاہتا ہے کہ کچھ ایسا ہو جائے جو تم سب لوگوں سے مختلف نظر آؤ ممتاز ہو جاؤ مگر تم اپنے حال میں مست اس سے باہر نکلتے ہو نہ اوپر جانے کی خواہش کرتے ہو۔"

"نا سعدیہ باؤ نا!" کھاری نے اس کی بات سن کر گردن دائیں بائیں گھمائی "میں مر جاواں پر ممتاز کدی نا بناں' یاد نئیں پچھلے ورہے (پچھلے سال) گجراں دی رانی توں کنڈھ کے لے گیا سی ممتاز "توبہ میری توبہ" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ توبہ رب نہ کرے میں ممتاز ورگا ہو جاواں سارا پنڈ لعنت لعنت کروائے ہن وی ممتاز نوں۔"

"ہائے کھاری!" سعدیہ نے اپنا سر پکڑا "تم بات کا کیا سے کیا بنا دیتے ہو۔"

"میںوں پتا ہے سعدیہ باؤ! میں کم عقلا تے بے وقوف آں۔" کھاری کو سعدیہ کی بے چارگی پر افسوس ہونے لگا "میں آکھیا سی تہانوں میں ایس قابل نئیں پر تسی مانے ہی نئیں۔"

"مت کرو ایسی باتیں" سعدیہ جھنجلا کر بولی۔ "بات تمہاری سمجھ میں آتی نہیں اور تم اپنی نااہلی کے دکھڑے رونے لگ جاتے ہو۔"

"اچھا نہیں کرداباتیں' پر تسی ماہ نور باجی نوں......"

"ہائے میرے اللہ کھاری!" سعدیہ نے ایک بار پھر سر پکڑ لیا۔ "بھلا بتاؤ ماہ نور باجی کو تمہارے اس دوست کا نمبر مانگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم نے خواب دیکھا ہوگا۔"

"نہیں دیکھا خواب" کھاری بے بسی سے بولا "اچھا چلو خواب ہی سہی تسی نمبر گھل دیو ماہ نور باجی نوں۔" پھر وہ مصالحت آمیز انداز میں بولا۔

"اچھا رکھ جاؤ یہاں فون' میں بھیج دیتی ہوں ابھی۔" سعدیہ نے کہا' کھاری نے اس کے موڈ کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے فون بستر پر رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"رب سوہنے کے کرم سے حج بیت اللہ تو ہو گیا' کیسا اس نے پہلی بار میں ہی بلاوا دے دیا نہیں تو لوگ کتنے کتنے سال درخواستیں دیتے رہ جاتے ہیں بلاوا نہیں آتا۔"

"میری تو آنکھیں خشک نہیں ہوتیں رابعہ بی بی' سوچتا ہوں تو خواب سا لگتا ہے میں اور بیت اللہ کو نظروں کے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ میں اور طواف کرتے ہوئے اللھم لبیک کی پکار ڈال رہا ہوں' میں اور مسجد نبوی میں نوافل ادا کر رہا ہوں' اپنا قد بت دیکھتا ہوں تو ایسی عظیم رحمت کے سامنے بڑا ہی چھوٹا لگتا ہے جی' آپا جی کی مہربانیوں کی حد نہیں جو ہم ایسے ادنیٰ لوگوں کو ہمراہ لے گئیں۔"

"کہہ تو تم ٹھیک رہے ہو سراج سرفراز! میری بہن کی خدمت گزاری نے تمہارا قد رحمت کے قابل بنا دیا۔"

"کیا سوچنے لگیں رابعہ بی بی! آپا جی سے ملاقات تو کروا دیں۔"

"ہائے کیا ملاقات کروا دوں' جب سے واپس آئی ہے منہ سر لپیٹے بیٹھی ہے' کہتی ہے جو دولہا بھائی کا دیا جمع کر کے بیٹھی تھی وہ حج کے اخراجات پر لگا دیا' اب جو بینکوں میں باقی ہے اس آمدن کا ذریعہ نظروں میں حرام ہوا' نہ اس سے خریدا ہوا رزق گھر میں داخل ہونے دے گی' نہ ہی کوئی اور ضرورت زندگی۔"

"فیصلہ تو معقول ہے آپا جی کا' مگر گزر بسر کیسے ہوگی' مالک مکان تو پچھلے مہینے کا کرایہ ملا کر کل دو مہینوں کا کرایہ طلب کر رہا ہے' اوپر سے گھر میں کچھ کھانے کو ہے نہیں۔"

"میں نے اسے یہ ہی بتایا' بولی بھوکے مر جائیں گے تو کیا ہوا' اللہ کا گھر دیکھ آئے' اپنے گناہوں کی بخشش کی دعائیں مانگ آئے' آگے ہماری قسمت ہے' لیکن یہاں اب اگر بھوکے مرتے ہیں تو مر جائیں۔ اس مال کا آنا بھی استعمال نہ ہوگا۔"

"یہ تو بڑی مشکل ہو گئی رابعہ بی بی! پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے اب تو۔"

"واہ سراج سرفراز! تمہاری سوچ پیٹ سے شروع ہو کر پیٹ ہی پر ختم ہو جاتی ہے اور کیا فرماتے تھے' مکہ مدینے کی تو خاک دیکھ کر ہی بھوک مٹ جاتی ہے۔"

"مجھے ایسے طنز سے کیا دیکھ رہی ہیں رابعہ بی بی! بندہ بشر ہوں' جیتے جی بھوک تو لگے گی ہی۔"

"بھوک لگتی ہے تو اسے مٹانے کا سامان کرنے کے لیے ہی اللہ نے ایسا بڑا جثہ عطا کیا ہے' اسے استعمال کرنا بھی کبھی شروع کریں گے یا یوں ہی ایک جگہ سے اٹھا دوسری جگہ رکھتے رہیں گے۔"

"بھائی صاحب کی بھی کوئی خیر خبر نہیں ملی اب تک' اب تو یقین ہونے لگا ہے چھوڑ چھاڑ گئے آپا جی کو' ظلم کیا بڑا ہی ظلم کیا انہوں نے' بچہ بھی لے گئے اور آپا جی کا مڑ کر پتا بھی نہیں کیا' ثابت ہوا صرف شکل کے ہی پرستار تھے۔"

"کیا میری بات گول کر دی تم نے سراج سرفراز' کام کرنے کی بات سن کر تو تمہارا دل چاہتا ہے جھوٹ ہی ہو جو سنا ہے' لگے بھائی صاحب کو باتیں سنانے اب کہو گے ارے وہ تو میرا بھائی بیچارہ نہ جانے کدھر راستے میں رہ گیا' ایسا تھا ہی نہیں جیسا ثابت ہو رہا ہے۔"

"رابعہ! ایک کام کرو۔"

"ارے تم کیوں کمرے سے باہر آ گئیں' مجھے آواز دے لی ہوتی۔"

"یوں کمزور ہو جانے کے بعد تو آپا جی کی شکل اور بھی بھیانک لگنے لگی اللہ معاف کرے' شکر ہے مجھے دیکھ کر فوراً" چادر منہ پر کر لی' میری بھی بے دھیانی ہی میں نظر پڑ گئی' اب تو یہ محرم نامحرم والے چکر میں بھی پڑ گئی ہیں' اللہ جل شانہ جب بھی سیدھی راہ دکھا دے۔"

"میری بات غور سے سنو رابعہ اور سراج' جو عجوہ کھجوریں اور آب زم زم کا ذخیرہ ساتھ لائے ہیں' اور وہ تسبیحاں جو آب زم زم میں بھگو کر سکھائی تھیں وہ کدھر ہیں؟"

"سب اندر رکھی ہیں بڑے اٹیچی کیس میں۔"

"لاؤ مجھے دو اور باہر گلی کی طرف والے کمرے کا دروازہ کھول دو' رابعہ تم اور میں وہاں بیٹھ کر وہ کھجوریں اور تسبیحاں فروخت کریں گے۔"

"کیا وہ کھجوریں اور تسبیحاں' انہیں کون خریدے گا؟"

"ہیں بہت اللہ کے پیارے اس جہان میں' جن کی پہنچ ابھی ادھر تک نہیں ہے۔ اللہ کے دیوانوں اور متوالوں کے لیے ان سوغاتوں سے بڑھ کر کیا بڑی سوغات ہوگی۔ چند دنوں کے لیے دو وقت کی روٹی کا تو انتظام ہو ہی جائے گا۔"

"کیا سوچ رہی ہو' جاؤ جو میں کہہ رہی ہوں وہ کرو۔"

"ہاں ہاں۔"

"اللہ کے پیارو' شمع نبوت کے متوالو' یہ عجوہ کھجوریں ہیں اور آب زمزم میں بھگوئی تسبیحاں' دنیا میں ان سے بڑی سوغات کوئی دوسری نہیں' لے جاؤ جس جس کو توفیق ہے' دھن دولت' دنیا میں برکت پاؤ گے۔"

"عجوہ کھجوریں اور آب زم زم میں بھگوئی تسبیحاں۔"

چار بکیں' دس بکیں' پندرہ بک گئیں۔

"اللہ تیرا شکر' رزق حلال کا سامان ہوا کچھ تو۔"

☼ ☼ ☼

"ڈاکٹر کہہ رہا ہے' میرا مطلب ہے وہ ڈاکٹر مائیکل' یعنی وہ کہہ رہا ہے کہ" نادیہ کے جذبات اور حواس بدحالی کی جس اسٹیج سے گزر رہے تھے' اس اسٹیج پر کھڑے وہ کسی ایسی خبر پر جو غیر متوقع تھی اور اچانک بھی اسی طرح ردعمل ظاہر کر سکتی تھی جیسے کر رہی تھی' اس کے منہ سے ٹھیک سے بات نکل پا رہی تھی نا ہی وہ' بات کہہ پا رہی تھی جو کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں میں بھی تمہیں یہ ہی بتانے آیا تھا۔" وودن زادے نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا' وہ پرسکون نظر آ رہا تھا اور ترحم بھری نظروں سے نادیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے ان چند دنوں میں ہی اس لڑکی کو جس سے وہ بالکل ناواقف تھا نارمل حالت سے ٹوٹتے' بکھرتے اور مر مر کر جیتے دیکھا تھا۔ وہ اس کے ہر ہر عمل' حرکت اور جنبش کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ کسی بھی تعلق اور رشتے کے حوالے سے عورت کا یہ وہ روپ تھا' جس سے وودن زادے ناشناس تھا۔ وہ نادیہ بلال سے متاثر ہو رہا تھا اور اسے یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا کر سکتا تھا۔

"ڈاکٹر مائیکل نے مجھے بھی یہ ہی بتایا ہے کہ وہ معجزانہ طور پر خطرے سے باہر ہے' وہ دواؤں کو قبول کر رہا ہے اور دواؤں نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا ہے۔" وودن نے اسی پرسکون انداز میں کہا' جبکہ اس کا دل بھی بالکل اسی کیفیت سے گزر رہا تھا' جس کا مظاہرہ نادیہ کر رہی تھی۔

"میں کتنی احمق تھی' کتنی بے وقوف' جو اس کو یہاں لانے کے تمہارے فیصلے پر چلاتی چلی جا رہی تھی۔" نادیہ نے اپنے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ وودن نے دیکھا یک لخت اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں زندگی کی جوت نظر آنے لگی تھی' اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل کر چمکنے لگا تھا۔ وودن نے دھوپ چھاؤں کی سی یہ کیفیتیں پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے سعد سلطان کی قسمت پر رشک آنے لگا' وہ رشتوں سے مایوس' رشتوں سے تعلق توڑ کر یہاں آیا تھا' مگر رشتے تو یہاں بھی موجود تھے۔ دوستی کا رشتہ' خون کا رشتہ وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔

"میں زندگی کے اور موت کے فلسفوں کے بارے میں زیادہ جانتا ہوں نہ ہی اس پر کوئی عالمانہ بیان دے سکتا ہوں۔" اس نے کہا "لیکن میں اسے سامنے رکھ کر اس کی سانسیں گنتے ہوئے' اس پر ایک ٹک نظریں جمائے اس کی موت کا انتظار کرتے بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا' موت سے ہارنا ہی تھا تو کیوں نہ زندگی کی فتح کی کوشش کرتے ہوئے ہارا جاتا' میں یک طرفہ جنگ لڑنے کا قائل نہیں ہوں' مجھے خطرہ مول لینا ہی تھا۔"

"تم اتنے ہی جنگجو ہو تو اسے کیوں منع کرتے رہے' وہ سب سے بلند سمٹ پر جا کر کی اٹنگ نہ کرے۔" نادیہ نے روتے روتے ذرا سا مسکرا کر کہا' اس کے دل پر پڑا منوں بوجھ ڈاکٹر مائیکل کی دکھائی امید کی ایک کرن نے پل بھر میں

بٹا دیا تھا۔ آگے کیا ہونے والا تھا وہ نہیں جانتی تھی' مگر اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا وہ پوری دنیا کے لوگوں سے زیادہ شاد اور مطمئن تھی۔

"میں بے سبب' بلاوجہ اور احمقانہ خطرے مول لینے کا بھی قائل نہیں ہوں' مہم جوئی کے نام پر موت سے ہاتھ ملانے اور اس سے بچ نکلنے کا دعوا کرنا حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں اور تمہارے بھائی نے یہ حماقت میری نظروں کے سامنے کی۔"

"میں نہیں جانتی' میری سمجھ میں نہیں آتا اس نے ایسا کیوں کیا' جو کچھ تم بتاتے ہو جو اس نے تمہیں بتایا میں نہیں جانتی اس کی بھی کیا وجہ تھی' ڈیڈی اور سعد ایک دوسرے سے جو دونوں پولز جیسے فاصلے پر۔" نادیہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اس سے زیادہ حیرت انگیز بات کوئی دوسری ہو نہیں سکتی' سعد کے لیے تو ڈیڈی نے' سعد ہی تو وہ انسان ہے ڈیڈی نے سب کو چھوڑ کر جسے پایا تھا' سعد اور ڈیڈی کے درمیان اتنے فاصلے کیسے پیدا ہو گئے میں شاید کبھی سمجھ نہ پاؤں۔"

"میں نہیں جانتا کہ تاریخ کیا ہے' جو اس نے مجھے بتایا وہی میں نے مختصراً" تمہیں بتا دیا۔ وہ کسی بھی صورت پیچھے رابطہ نہیں کرنا چاہتا تھا' شاید وہ ان چاہی حقیقتوں سے نظریں چراتا ہی یہاں آیا تھا اور انہی حقیقتوں سے فرار حاصل کرنے کے لیے اس نے وہ احمقانہ خطرہ مول لیا جس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔"

"جو بھی ہوا' جو بھی گزرا!" نادیہ نے سب سن کر سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ جن لمحوں کو گزر جانا تھا وہ گزر چکے' اب وقت بدل چکا ہے' نیا وقت آچکا ہے' سعد ابھی زندہ ہے' وہ خطرے سے باہر ہے' اس کا جسم دواؤں کو قبول کر رہا ہے اور دوائیں اس کے جسم پر اثر بھی کر رہی ہیں۔ میں نے جن معجزوں کے بارے میں پڑھ رکھا ہے ان میں سے ایک معجزہ میری نظروں کے سامنے ہو رہا ہے اور ابھی میں صرف اس معجزے کو دیکھ لینے کی خوشی منانا چاہتی ہوں۔"

وودن زادے نے دلچسپی سے اس خوشی سے پاگل ہوتی لڑکی کی طرف دیکھا۔

"تمہارے پاس اس روز جو شخص آیا تھا' جس نے تم سے کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کیں اور جس کے چلے جانے کے بعد تم نے سجدوں اور عبادتوں کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کیا وہ کون تھا اور اس نے تم سے کیا کہا تھا۔" وودن نے پوچھا۔

"وہ ڈاکٹر رضا حسین ہیں۔" نادیہ اپنے فون پر کوئی نمبر ملاتے ملاتے رکی۔ "اور انہوں نے مجھ سے صرف اتنا کہا تھا غم میں گھبرا کر اس کو کیوں بھول گئیں نادیہ' جس کو پانے کے لیے تم مجھ تک پہنچی تھیں۔"

"جس کو پانے کے لیے تم اس تک پہنچی تھیں؟" وودن نے نادیہ کے الفاظ دہرائے اور پھر کچھ نہ سمجھنے کے سے انداز میں نادیہ کی طرف دیکھا۔

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے۔" نادیہ نے کہا اور فون کان سے لگا لیا۔

"وہ زندہ ہے' وہ بچ گیا ہے' آپ نے مجھے بروقت یاد دلا دیا کہ میں غم میں گھبرا کے بھول رہی ہوں جو زندگی عطا کرتا ہے' وہی جو مرنے کے بعد بھی مُردوں کو اٹھانے کی طاقت رکھتا ہے۔ میں بھول بیٹھی تھی' مایوس ہو چکی تھی لیکن پھر اسی نے آپ کو مجھ تک بھیجا' مجھے یاد دلانے کے لیے کہ وہ ہے' وہ جو عظیم ترین طاقت ہے۔"

نادیہ فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے بھی جذباتی ہو رہی تھی' روتے ہوئے لرزتی کانپتی آواز میں بول رہی تھی اور وودن اس کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

"وہ ہے' وہ جو عظیم ترین طاقت ہے۔" وودن نادیہ کے الفاظ پر غور کر رہا تھا۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں)

سمیرا عثمان

"مریم جاؤ جا کر دھلے ہوئے کپڑے سمیٹ لو بارش آنے والی ہے۔" زبیدہ بیگم نے کٹی ہوئی پالک سمیٹتے ہوئے اسے آواز دی۔

"اوہو کیا مصیبت ہے اماں! میرا ٹیسٹ ہے' مجھ سے نہیں سمیٹے جاتے یہ کپڑے' کبھی یہ کرو' کبھی وہ کرو۔" وہ جھلائی ہوئی تھی اس لیے بے مروتی سے جواب دے دیا۔ زبیدہ بیگم نے گردن موڑ کر گھورا بھی' مگر مجال ہے جو وہ ٹس سے مس ہو جائے۔

"کوئی پتھر کوٹنے کو نہیں کہا ہے جو اتنے نخرے کر رہی ہو۔" انہیں غصہ آگیا' وہ بھی ڈھیٹ تھی' بے نیازی سے کندھے اچکائے اور کتاب پر جھک گئی۔

"آج کل انوکھی پڑھائیاں ہیں' بس کتابوں میں سر

بیٹھے رہو' ہم نے بھی پڑھی ہیں بارہ جماعتیں' ساتھ گھر بھی سنبھالا اور بہن بھائی بھی' ہر ہنر میں طاق اور سلیقہ مند ہوا کرتی تھیں اس زمانے کی لڑکیاں' اپنے جہیز کے کپڑے خود سلائی کیے' چٹائیاں بنائیں' لحافوں میں ڈورے ڈالے' سویٹر بنے' دوپٹوں پر سلمیٰ ستارے لگائے۔"

"اماں۔" مریم نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

"اتار لاتی ہوں کپڑے۔" مزید لیکچر سننے سے اچھا تھا وہ کپڑے ہی اتار لائے۔ برا ہوا جو اسی وقت تائی اماں چلی آئیں۔

انہیں اماں کو ساتھ لے کر کسی کی عیادت کو جانا تھا۔

"آپا اگر کل کسی وقت چلیں ابھی تو یہ کام کا وقت ہے' میں کھانا بنا رہی ہوں۔" اماں نے جانے سے معذرت کی اور تائی اماں نے منہ میں انگلی دبالی۔

"نوجوان جہان لڑکی کے ہوتے ہوئے ابھی تک تم نے چولہا چوکی سنبھال رکھی ہے؟ اسے کب سکھاؤ گی؟ اب انعم کو ہی دیکھ لو اس عمر میں سارا گھر سنبھالا ہوا ہے مجال ہے جو مجھے کسی کام کو ہاتھ بھی لگانے دے۔ بڑی گنوں والی ہے میری انعم' بس اللہ نصیب اچھا کرے۔"

انعم نامہ شروع ہو چکا تھا۔

"اب انعم گھر بیٹھ کر جھاڑو پونچھا نہیں کرے گی اماں تو کیا کرے گی؟" اماں کی جرح پر اس نے ناگواری سے کہا تھا۔

"تم نے اپنی تائی کا سوٹ دیکھا تھا' انعم نے سلائی کیا تھا اور کل جو اس نے کوفتے بھیجے تھے' کس قدر لذیذ تھے اور تمہیں ابھی تک سوئی میں دھاگا ڈالنا نہیں آتا' چائے تک تو بنا نہیں سکتیں تم۔" زبیدہ بیگم سخت کبیدہ خاطر تھیں۔ مریم نے دانت پیس ڈالے' انعم سے اس کی اچھی دوستی تھی مگر اس وقت جی چاہ رہا تھا اس کا سر پھاڑ ڈالے زندگی اجیرن کر دی تھی اس کی سلیقہ مندی نے تو۔

"اماں! وہ میٹرک میں دوبار فیل ہو چکی ہے اور ایسی کم پڑھی لکھی لڑکیاں جھاڑو' برتن' کپڑے' سلائی اور امور خانگی ہی سرانجام دے سکتی ہیں' باہر تو ان کو نوکری ملتی نہیں سو گھر میں نوکر بن جاتی ہیں' میں بی ایس سی ٹاپر' اپنے ادارے کی فعال اور سرگرم اسٹوڈنٹ۔ نصابی غیر نصابی سرگرمیوں میں نمبر ون' آپ کو میری ان خوبیوں پر فخر نہیں ہوتا اب اتنی پڑھی لکھی لڑکی ماسیوں جیسے کام کرتی اچھی لگے گی بھلا۔"

زبیدہ بیگم نے ماتھے پہ ہاتھ رکھا اور کچن کی سمت بڑھ گئیں یہ لڑکی تو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ مزید گھنٹہ برباد کرنے سے اچھا تھا وہ کھانا خود ہی بنالیں۔

☆ ☆ ☆

اس کے امتحان ہو گئے تو زبیدہ بیگم اس کے سر ہو گئیں۔

"اب تو پڑھائی کا بہانہ ختم ہوا نا' آج سے کچن میں میرے ساتھ کام کرواؤ گی۔"

"او ہو اماں! امتحانوں کی تھکاوٹ تو اتر جانے دیں نا۔" اس نے برا سا منہ بنایا اور سر تا پا چادر تان لی۔

ابھی کل ہی تو انعم کہہ رہی تھی۔

"کہاں ہوتی ہو آج کل' ذرا جو تمہیں فرصت ہو کہ کم از کم مجھے منگنی کی مبارک باد ہی دے دو۔" اس کا منہ خوب پھولا ہوا تھا۔

"محترمہ منگنی میں' میں بذات خود شریک تھی پھر بھی مبارک باد۔" وہ مزے سے بیٹھی فرنچ فرائز کھا رہی تھی ساتھ ساتھ اس کا پسندیدہ ٹاک شو چل رہا تھا۔

"میری چیزیں بھی نہیں دیکھیں تم نے؟" انعم کو اس بے نیازی پر غصہ آیا مریم نے نظریں اٹھا کر اسے جانچا۔

"ہوں' سویٹر اچھا ہے تمہارا۔"

"ہاں' یہ تو میں نے خود بنایا ہے۔"

"کیا؟" مریم کی آنکھیں ابل پڑیں چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور اس کی گردن دبوچ لی۔

"خبردار جو یہ انکشاف اماں کے سامنے کیا تو۔ کل ہی میرے ہاتھ میں اون کی سلائیاں تھما دیں گی۔" وہ روہانسی ہو گئی تھی۔ انعم کا قہقہہ نکل گیا۔

"ویسے کچھ غلط بھی نہیں کہتیں تمہاری اماں۔"

"بکومت۔"

"کتنا مزہ آئے گا جب کل سے تم آنٹی کے ساتھ کچن میں ٹماٹر' مرچ اور ادرک' لہسن کے ساتھ سر کھپایا کرو گی۔ ادھر سے فارغ ہو کر باقی وقت کپڑے' برتن' صفائی کے نام ہوگا اور پھر بھی فرصت کے کچھ لمحات میسر آجائیں تو میرے پاس آجانا میں تمہیں سویٹر بننا تو سکھا ہی دوں گی۔" ایک جھٹکے سے اس نے چادر اتاری اور اخباروں کا ڈھیر لے کر بیٹھ گئی۔

"اس انعم کے تو مزے نہیں آنے دوں گی اماں کو ٹالنے کا ایک ہی راستہ ہے کہیں اچھی نوکری مل جائے۔"

☆ ☆ ☆

اماں کی لاکھ مخالفت کے باوجود اسے ایک اچھی نوکری مل گئی تھی ان ہی دنوں انعم کے سسرال سے اس کے لیے ایک رشتہ آگیا وہ تو جی بھر کر جز بز ہوئی البتہ انعم خوب کھلکھلا رہی تھی۔

"کتنا مزہ آئے گا مریم! جانتی ہو ہمارے اور چچا سسر کے گھر میں بس ایک ہی دیوار ہے اور ان کا بیٹا کمال کا ڈیشنگ ہے۔ ایک ساس' ایک دیور' دو نندیں' جن میں سے ایک شادی شدہ ہے۔ آنٹی نے تمہیں منگنی میں دیکھا تھا' لیکن مجھے تو لگتا ہے آنٹی سے زیادہ ان کے بیٹے کی نظریں تھیں تم پر۔" اس کی گوہر افشانیاں جاری تھیں۔ مریم نے کشن کھینچ کر مارا۔ کم بخت سسرال میں بھی اس کے ساتھ تھی مگر خیر یہاں تو اس کا پلڑا بھاری تھا۔

وہ انعم سے زیادہ خوب صورت اور پڑھی لکھی تھی اور پھر ان کی مالی حیثیت بھی زیادہ مضبوط تھی' سو اس کی ہر چیز انعم سے زیادہ قیمتی اور خوب صورت ہو گی۔ وہ دل میں سوچ کر مسرور ہوئی۔

اور انعم یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ اب اس کی

پیاری دوست ہمیشہ اس کے ساتھ رہنے والی تھی۔ اس کے ابا اماں نے رسماً سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا اور پھر ہاں کردی تھی۔

دونوں گھروں میں شادی کا ہنگامہ جاگ اٹھا تھا۔

انعم کی شادی کے ایک ماہ بعد کی اس کی شادی تاریخ رکھی گئی تھی۔ اماں خوش ہو رہی تھیں کہ چلو اچھا ہے پہلے انعم اس خاندان میں دلہن بن کر جارہی تھی۔

اس نے اور انعم نے شادی کی شاپنگ مل کر کی تھی اس کا لہنگا' زیور' سال تک کہ اس کا منگیتر بھی انعم کے منگیتر سے زیادہ ہینڈسم اور پڑھا لکھا تھا وہ ہمیشہ سے ہی اپنا اور انعم کا موازنہ کرتی تھی' لیکن اس کے اندازے اماں کے خیالات سے یکسر الگ ہوا کرتے تھے۔

☆ ☆ ☆

سسرال میں اس کا خوب والہانہ استقبال ہوا تھا اچھی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی فیملی تھی۔

ابتدائی چند روز دعوتوں کی نذر ہوگئے' روز صبح سویرے بن سنور کر عادل کے ساتھ مختلف جگہوں پہ وقت گزارنا بہت اچھا لگ رہا تھا' وہ اس کی رفاقت میں بے پناہ خوش تھی عادل بہت محبت کرنے والا سلجھا ہوا شوہر ثابت ہوا تھا۔

لیکن آج صبح سے وہ پریشان تھی آج اسے رسم کے مطابق میٹھا بنانا تھا وہ اندر ہی اندر خوف زدہ تھی کہ اب کیا ہوگا۔ مگر بھلا ہو اس کی ساس کا میٹھے میں محض اس کا ہاتھ ہی لگوایا۔

"اماں ایسے ہی ہر وقت مجھے ڈرایا کرتی تھیں اب دیکھو نا یہاں تو کپڑے' برتن' صفائی' کام کے لیے ملازمہ موجود ہے' عادل سے کہوں کی ایک کھانا پکانے والی بھی رکھ لیں۔"

لیکن اس کی نوبت ہی نہ آسکی رات کے کھانے کی میز پر اس کی ساس نے اسے اگلے روز ناشتا بنانے کا کہا تھا۔

اس کی بڑی نند بھی اپنے شوہر کے ہمراہ موجود تھی۔
"بھابھی پراٹھے بالکل انعم بھابھی کے پراٹھوں جیسے ہونے چاہئیں خستہ اور بل دار' قسم سے کیا مزے کے پراٹھے بناتی ہیں کہ بندہ دو کی جگہ چار کھا جائے۔" ندا تھی اس کی چھوٹی نند۔

"ہاں بھئی وہ تو ہر ہنر میں طاق ہے۔ وہ پچھلے اتنی پیاری بیل کاڑھ کر دی تھی اس نے' میری ساس کو بہت پسند آیا وہ دوپٹہ اور وقاص تو ابھی تک اس بریانی کا ذکر کرتے ہیں' جو پچھلے دنوں تایا ابا کے گھر میں کھائی تھی۔"

"بہت سلیقہ مند لڑکی ہے آتے ہی سارا گھر سنبھال لیا' آپا تو آج کل بس تخت پر بیٹھ کر حکم چلاتی ہیں۔" اس کی ساس بھی ان متاثرین میں سے تھیں۔

انعم۔۔۔ انعم وہ آج پھر سے اس کے مدمقابل آن کھڑی ہوئی تھی۔

"ہاں تو بھابھی بھی تو ان کی کزن ہیں ان سے کم تو نہیں ہوں گی۔" اسد نے اپنے انداز میں اس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

"اسی لیے تو بیاہ کر لائی ہوں کہ انعم کی چچا زاد ہے۔" اس کی ساس نے اصل وجہ بتا کر قہقہہ لگایا تھا۔

"بھابھی کل آپ قورمہ بنائیے گا میں بھی ذرا صبا کو بتاؤں وہ جو ہر وقت اپنی بھابھی کی تعریف میں رطب اللسان رہتی ہے اسے بھی پتا چلے کہ میری بھابھی صرف شکل و صورت اور تعلیم میں ہی نہیں' سلیقے میں بھی نمبرون ہیں۔" فرمائشوں پر فرمائشیں ہو رہی تھیں۔

اس کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔

وہ خاموش بیٹھی ہونق بنی بس سب کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

بس نہیں چل رہا تھا کہ جادو کی چھڑی گھما کر اس منظر سے غائب ہو جائے' اس کی خوب صورتی' اس کی تعلیم اس کا قیمتی جہیز سب جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہاں اگر کچھ تھا تو انعم کی سلیقہ شعاری' اس کی ہنرمندی۔ اس کا سگھڑاپا اور ان سب کاموں میں وہ زیرو تھی تو سسرال میں اس کی حیثیت بھی زیرو ہونا تھی۔

❀

بشریٰ احمد

شادی کے بعد سسرال میں بہو کا وہ پہلا دن جو کچن میں گزرتا ہے بہت گھبراہٹ طاری کرنے والا ہوتا ہے۔ میکے میں سینکڑوں بار کیے گئے کام اس نئی جگہ پر کرنا بہت مشکل مرحلہ لگ رہا ہوتا ہے۔ یہی مشکل آج انوشہ کو درپیش تھی اس کی شادی کو آج بارہ دن ہونے کو آئے تھے۔ ان دس بارہ دنوں میں سسرال والوں نے حتی المقدور اس کے چاؤ چونچلے اٹھائے تھے۔ لیکن اب شاید ان کی حد ہو چکی تھی سو بارہویں صبح جب سب ناشتے کے لیے دسترخوان پر بیٹھ گئے اور انوشہ نے اپنی ساس کے ہاتھ کا بنا ناشتہ دسترخوان پر چن دیا تو ناہید بیگم (ساس) نے لہجے میں نقاہت طاری کرتے ہوئے انوشہ کو مخاطب کیا تھا۔

"بس بہو! اب میری ہمت تو جواب دے گئی ہے۔ طبیعت خرابی کے باوجود آج تو میں تمہارا خیال کرتے ہوئے کچن میں چولہے کے آگے جا کر کھڑی ہو گئی کہ ابھی سے نئی دلہن کو کیا کام پر لگاؤں لیکن بھئی اب تم جانو اور تمہارا کام۔ جوڑوں کے درد نے تو میرا ایسا پیچھا پکڑ رکھا ہے کہ پانچ منٹ کھڑا رہنا محال لگتا ہے۔ کچن تو آج سے تمہارے سپرد۔"

"ٹھیک ہے امی! میں تو آپ سے خود ہی کہنا چاہ رہی تھی کہ آپ کی طبیعت صحیح نہیں رہتی آپ آرام کیا کریں۔ میں سارے کام سنبھال لوں گی۔" انوشہ نے پورے خلوص سے انہیں یقین دلایا تھا۔

"ہاں اپنے گھر میں بھی تو سارے کاموں کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہی تھی۔ یہاں تو پھر صفائی کے لیے ماسی آتی ہے۔ کام ہے ہی کیا ہمارے گھر میں۔" ناہید بیگم نے لاپروا سے انداز میں جتایا تھا انوشہ خاموش رہی۔

اتنا تو اسے ان بارہ دنوں میں اندازہ ہو گیا تھا کہ اس گھر میں ہر وقت ہونے والی چخ چخ کی بڑی وجہ یہ کام ہی ہوتا تھا۔ عماد اس کا شوہر بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس سے چھوٹے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ عماد اور اس سے چھوٹے عادل کو تو اپنے کام خود کرنے کی عادت تھی۔ خود کپڑے استری کر لیے۔ میلے کپڑے واشنگ مشین کے پاس رکھی ٹوکری میں ڈال دیے۔ ماسی مشین لگا دیتی تھی مگر اگلے دو تین دن تک کپڑے تاروں پر ہی سوکھتے رہتے۔ ناہید بیگم کبھی تو بیٹیوں پر چیختی چلاتیں کہ چھت پر سے دھلے کپڑے اتار لائیں۔ بیٹیاں نہ سنتیں تو ملازمہ کو کہتیں مگر وہ بھی ان ہی کے گھر کی ماسی تھی مزاج ان لوگوں جیسا ہی پایا تھا حد سے زیادہ سست کاہل اور کام چور صاف انکار کر دیتی۔

"بی بی جی کپڑے دھونے کے پیسے دیتی ہیں آپ اتار کر لانے اور تہ لگانے کے تھوڑی دیتی ہیں۔"

"اے کم بخت تہ لگانے کو کب کہہ رہی ہوں۔ صرف کپڑوں کی گٹھڑی باندھ کر اتار کر لا دے۔ مجھ سے سیڑھیاں چڑھی جاتیں تو کیوں کہتی تجھے۔" ناہید بیگم دانت پیستے ہوئے کہتیں۔

ملازمہ طوعاً کرہاً دھلی ہوئی بیڈ شیٹ میں کپڑوں کا گٹھڑ بنا کر برآمدے میں بچھے تخت پر پٹخ دیتی پھر وہ گٹھڑ وہیں رونق افروز رہتا۔ عماد اور عادل اس میں سے اپنے کپڑے چھانٹ کر استری کر لیتے تیسرے نمبر والا حماد شازیہ اور ناجیہ پر رعب جما کر ان سے کام کروانے کی کوشش کرتا ناجیہ، شازیہ نہ تو رعب میں آتیں نہ اس کا کام کرتیں۔ وہ بہنوں پر چیختا چلاتا بہنیں بڑے دونوں بھائیوں کی مثال دیتیں کہ آخر وہ بھی تو اپنے کام خود کر لیتے ہیں۔ دونوں بہنوں کا آپس میں کسی بات پر اتفاق مشکل سے ہی ہوتا تھا۔ لیکن جب حماد سے دو بدو لڑنے اور بحث کرنے کا وقت ہوتا تو دونوں مل کر اور جم کر مقابلہ کرتیں ان کی چخ چخ سے تنگ آ کر یا تو عادل اور عماد اپنے ساتھ حماد کا بھی کام کر دیتے وہ گھر پر نہ ہوتے تو ناہید بیگم بکتی جھکتی حماد صاحب کے کام نمٹاتیں۔ ناشتہ ہفتے میں تین چار بار بازار سے آتا تھا۔

حامد صاحب پورے گھر میں واحد سحر خیز بندے تھے۔ صبح فجر کے لیے اٹھتے تو عادتاً ناہید بیگم کو بھی نماز کے لیے جگانے کی کوشش کرتے۔

"اٹھتی ہوں میاں! رات کے پچھلے پہر تو جا کر نیند آئی ہے ساری رات جسم میں درد ہوتا رہا ہے۔" ناہید بیگم کہہ کر کروٹ لے لیتیں۔ حامد صاحب بھی شریف شخص تھے بیوی کو جتانا چاہتے تو جتا سکتے تھے کہ بیوی رات کو تمہارے خراٹوں سے نیند تو میری ڈسٹرب ہوتی ہے لیکن انہیں پتا تھا کہ ان کا اتنا سا کہنا بھی ناہید بیگم کو چراغ پا کر دے گا۔ وہ کافی تنک مزاج خاتون تھیں۔ حامد صاحب کی صلح جو طبیعت کی وجہ سے دونوں میاں بیوی کی اچھی نبھ رہی تھی۔ حامد صاحب نماز پڑھ کر واک پر نکل جاتے اور واپسی پر کبھی نان چنے کبھی نہاری تو کبھی حلوہ پوری لے آتے خود بھی ناشتہ کرتے اور بچوں کو بھی آواز دے کر بلا لیتے۔

عماد تو آفس جانے سے بمشکل بیس منٹ پہلے اٹھتا تھا نہ اس کو اتنا بھاری ناشتہ پسند تھا۔ وہ بنا ناشتہ کیے ہی

گھر سے نکلتا تھا۔ آفس جا کر چائے بسکٹ سے گزارہ کر لیتا۔ لنچ بھی آفس کینٹین سے ہی کرتا تھا۔ عادل، حماد اور ناجیہ، شازیہ وہ ریڈی میڈ ناشتہ بہت شوق سے کرتے بلکہ ناہید بیگم بھی جاگنے کے بعد میاں کا لایا ہوا ناشتہ مزے سے کرتی تھیں۔ بازار کے کھانے کھا کھا کر ان کا وزن بڑھتا جا رہا تھا۔ بیماریاں واقعی ان کی جان کو چمٹی رہتی تھیں لیکن وہ ان عورتوں میں سے تھیں جو بیماریوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تندرستی کی حالت میں بھی خود پر زبردستی بیماری طاری رکھتی ہیں۔ گھر میں روپے پیسے کی کوئی تنگی نہ تھی مگر سلیقے کا فقدان تھا۔ صفائی ستھرائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی رکھی ہوئی تھی بلکہ اکثر ناہید بیگم فالتو پیسے دے کر اس سے برتن بھی دھلوا لیتی تھیں۔ انہیں بس دوپہر کا کھانا بنانا ہوتا تھا۔ کھانا وہ وافر مقدار میں پکاتی تھیں دو وقت کھا کر جو بچ جاتا وہ فریز کر دیتیں۔ دو تین دن بعد وہی سالن دوبارہ گرم کر کے کھا لیا جاتا۔ رات کی روٹی بنانے کی باری مقرر تھی ایک دن ناجیہ تو ایک دن شازیہ ناک منہ چڑھا کر وہ یہ کام کر ہی لیتیں۔

سب سے بڑا عماد پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہوا تو ناہید بیگم کے دل میں بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی خواہش بیدار ہوئی۔ خاندان میں سب بچیاں عماد سے کافی چھوٹی تھیں ان کا جوڑ عادل یا حماد سے تو بن سکتا تھا مگر عماد سے نہیں سو عماد کے رشتے کے لیے محلے کی ہی رشتہ کروانے والی خالہ جی سے مدد لی گئی۔ دو چار رشتے دیکھنے کے بعد ناہید بیگم کا جی انوشہ پر آ گیا وہ متوسط گھرانے کی خوب صورت اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ سلجھی ہوئی فیملی سے تعلق تھا۔ انوشہ کے والد لائبریرین تھے۔ اس کی امی شہر کے اچھے پرائیوٹ اسکول کی وائس پرنسپل تھیں۔ انوشہ چار بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی۔ تعلیم سے فارغ ہوئی تو سوچا تھا جاب کر کے والدین کا ہاتھ بٹائے گی۔ مگر والدین کی خواہش تھی کہ مناسب بر ملے تو بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے اس کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ عماد کا رشتہ آیا تو انوشہ کے والدین کو یہ رشتہ کافی معقول لگا۔ عماد خوش شکل لڑکا تھا۔ پڑھا لکھا اور برسر روزگار تھا اس کے آفس سے اس کے بارے میں رائے لی گئی تو لوگوں نے اسے محنتی اور شریف بتایا اور سب سے بڑھ کر اس کے والد حامد صاحب انوشہ کے ابو کو بہت سلجھے ہوئے اور معقول لگے۔

ہر طرح کی چھان پھٹک اور سوچ بچار کے بعد انہیں ہاں کر دی گئی۔ تین مہینے کے اندر اندر انوشہ عماد کے سنگ رخصت ہو کر سسرال پہنچ گئی۔ بحیثیت جیون ساتھی عماد اسے بہت پسند آیا تھا اس کے ماں باپ نے یقیناً "اس کے لیے بہترین شخص چنا تھا اور جہاں تک سسرال کا تعلق تھا امی نے اسے سمجھا کر بھیجا تھا کہ کسی بھی لڑکی کا سسرال آئیڈیل نہیں ہوتا۔ لڑکی اپنی سمجھ داری اور معاملہ فہمی سے کام لے کر سسرال میں اپنے لیے خود آسانیاں پیدا کر سکتی ہے اور یہی لڑکی کی صلاحیتوں کا اصل امتحان ہوتا ہے۔ انوشہ کو اپنے ماں باپ کی دعاؤں' ان کی تربیت اور سب سے بڑھ کر اپنے اللہ پر بھروسہ تھا اسے یقین تھا کہ بہت جلد سسرال کی اجنبی سرزمین پر وہ اپنے قدم مضبوطی سے جما لے گی۔ شادی کے تیسرے دن سے ہی اس نے گھر والوں میں گھل مل کر چھوٹے چھوٹے کام کرنا شروع کر دیے تھے۔ شروع شروع میں ساس نندیں مروت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے کاموں سے روکتی تھیں۔ دور دراز سے آئے ہوئے کچھ مہمان بھی ابھی تک گھر میں مقیم تھے سو ہفتہ دس دن تو اسے دلہنوں والا پروٹوکول دیا گیا۔ مہمان رخصت ہوئے تو نئی دلہن کے چاؤ چونچلے اٹھانے کے ارمانوں کی شدت میں بھی خاطر خواہ کمی آئی اور آخر بارہویں دن تو اسے کچن کا چارج دے ہی دیا گیا۔

☆ ☆ ☆

انوشہ نے تو سکون کا سانس لیا تھا کیونکہ فارغ بیٹھنے کی اسے عادت بھی نہ تھی اور جب گھر میں کاموں کے لیے ہنگامہ برپا ہوتا تو اسے خواہ مخواہ ہی اپنا آپ قصور وار لگنے لگتا اس کے میکے میں کاموں کے لیے کبھی

ملازمہ نہیں رکھی گئی تھی اس کی امی بھی ورکنگ وومن تھیں لیکن ہر کام بہت نظم و ضبط اور سلیقے سے انجام پاتا تھا۔ انوشہ نے بھی بہت چھوٹی عمر میں ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا تھا۔ بہن کی دیکھا دیکھی چھوٹی لائبہ نے بھی از خود گھر کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ مل جل کر کام نمٹایا جاتا تو ہر کام فٹافٹ پایہ تکمیل کو پہنچتا مگر یہاں سسرال میں معاملہ مختلف تھا وہ ایک بار کچن میں گھسی تو کسی اور نے جھانکنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی حالانکہ وہ کچن میں پہلی بار کام کر رہی تھی۔ بے ترتیب کچن میں اسے چیزوں کے صحیح ٹھکانوں کا علم ہی نہ تھا۔ وہ واقعی پریشان اور نروس ہو رہی تھی اور شاید اسی گھبراہٹ میں مصالحوں کا تناسب کچھ گڑبڑ ہو گیا تھا۔ پہلی بار وہ جتنا اچھا بنانا چاہ رہی تھی ویسا ہرگز نہ بن سکا تھا ہاں بہت برا بھی نہ تھا بس گزارے لائق تھا لیکن ناہید بیگم نے کھانا کھاتے ہوئے طنز کر ڈالا تھا۔

"تمہارے گھر میں جب بھی کھانا کھایا بہو یہی بتایا جاتا تھا کہ تم نے بنایا ہے سچ سچ بتانا اماں بناتی تھیں یا بازار سے آتا تھا۔" انہوں نے بظاہر ہنستے ہوئے پوچھا تھا لیکن انوشہ پانی پانی ہو گئی۔ اگلے روز اس نے بہت دل لگا کر کھانا پکایا تھا اور اس دن کھانا واقعی زبردست بنا تھا لیکن اس دن سب نے چپ کر کے کھانا کھا لیا۔ تعریف کے دو بول تک نہ بولے اور جب وہ کھانے کے بعد دستر خوان سمیٹ رہی تھی تب حامد صاحب نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"بیٹا! اب گرم گرم چائے بھی پلا دو لیکن جتنا مزیدار کھانا کھلایا ہے چائے بھی ایسی ہی لاجواب ہونی چاہیے۔" اتنی سی حوصلہ افزائی پر انوشہ کا دل کھل اٹھا تھا۔

"ابھی بناتی ہوں ابو۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔ چہرے پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی اور ناہید بیگم سے یہ مسکراہٹ ہضم نہ ہوئی۔ میاں پر جی ہی جی میں غصہ بھی آیا ان کی شادی کو تیس برس ہونے کو آئے تھے میاں جی نے آج تک کسی کھانے کی تعریف میں ایک لفظ نہ کہا تھا اور بہو کو دوسرے ہی دن سر پر چڑھایا جا رہا تھا۔ انہوں نے شوہر کے فقرے کا اثر زائل کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"چاولوں میں معمولی سی کسر رہ گئی تھی بہو! آج تو تمہارا دل رکھنے کو چپ چاپ کھا لیا۔ آئندہ ذرا خیال رکھنا۔ دوائیاں کھا کھا کر میرا معدہ ویسے ہی بگڑا رہتا ہے۔ کھانے میں ذرا سی بھی اونچ نیچ ہو جائے تو معدے میں درد بڑھ جاتا ہے۔"

ناہید بیگم نے کھانے میں سے نادیدہ نقص ڈھونڈ نکالا تھا اور حالانکہ چاولوں میں ذرا سی بھی کمی نہیں رہی تھی۔ کھلے کھلے چاولوں والا خوش ذائقہ پلاؤ بنا تھا پھر بھی انوشہ نے فرمانبرداری سے کہہ دیا تھا کہ آئندہ وہ اس بارے میں خیال رکھے گی اور آئندہ جب چاول ذرا ڈھیلے رکھے تو ناجیہ، شازیہ نے خوب مذاق اڑایا۔

"یہ کیسا حلیہ بنا کر رکھ دیا ہے چاولوں کا۔ ہم کوئی بیمار ہیں جو ایسی کھچڑی کھائیں۔" خفت سے انوشہ کا منہ سرخ ہو گیا۔ مگر وہ خاموش رہی تھی۔ لیکن ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔ وہ جتنا مرضی دل لگا کر کھانا پکاتی ناہید بیگم کوئی نہ کوئی نقص نکال ہی لیتیں تنگ آ کر اس نے ماں سے اس بارے میں مشورہ طلب کیا۔

"بیٹا تم ان سے طریقہ پوچھ کر کھانا بنایا کرو۔"

زہرت نے پیار سے سمجھایا تھا۔

"امی! پلیز ڈانٹیے گا مت کہ میں اپنی ساس کی برائی کر رہی ہوں لیکن انہیں پکانا بالکل نہیں آتا اب تک ان کے ہاتھ کی بنی جو بھی چیز کھائی ہے انتہائی بے ذائقہ ہوتی ہے۔ ان کے طریقے سے پکانے لگی تو میں خود کھانا پکانا بھول جاؤں گی۔" انوشہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"میں نے یہ کب کہا بیٹا کہ تم ان کے طریقے کے مطابق پکایا کرو۔" زہرت ہنسی تھیں۔ انوشہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر ماں کو دیکھا۔

"ابھی آپ نے مجھ سے یہی تو کہا ہے امی۔" اس نے انہیں یاد دلایا۔

"میں نے صرف یہ کہا کہ تم ان سے طریقہ پوچھ کر کھانا پکایا کرو یعنی صرف پوچھنے کی حد تک پکاؤ اسی طریقے سے جو تمہیں خود مناسب لگے۔" زہرت نے بات کی وضاحت کی مگر انوشہ کا دماغ چکرا گیا تھا۔

"دیکھو بیٹا بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنا اختیار تو دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں لیکن کوئی ان کی ذمہ داری کو ان سے بہتر انداز سے نبھائے تو لاشعوری طور پر وہ یہ بات برداشت نہیں کر پاتے اور بلاوجہ کی تنقید شروع کر دیتے ہیں جہاں تک میں سمجھ پائی ہوں تمہارے ساس نے تمہیں کچن کا چارج دے تو دیا ہے لیکن یہ بات کبھی کبھار انہیں بے اطمینانی میں مبتلا کر دیتی ہے بس یوں سمجھ لو کہ اپنی راجدھانی میں کسی اور کی شراکت برداشت کرنا مشکل کام ہوتا ہے تم ایسا طرز عمل اپناؤ کہ وہ تمہیں اہمیت ملنے پر خود کو غیر اہم نہ سمجھنے لگیں بلکہ انہیں باور کرواؤ کہ گھر میں ان کا وجود اب بھی بہت ضروری اور اہم ہے اور تم بھی اپنے کاموں میں ان کی رائے کی محتاج ہو۔ مجھے امید ہے کہ پھر وہ تمہارے کاموں میں نکتہ چینی نہیں کریں گی اور اگر ان کی روش برقرار رہی تو پھر کوئی اور ترکیب لڑائیں گے۔"

زہرت نے بشاش لہجے میں بیٹی کو تسلی دی تھی لیکن کوئی اور ترکیب لڑانے کی ضرورت محسوس ہی نہ ہوئی ماں کی ترکیب کارگر رہی تھی انوشہ دل سے ان کی عقلمندی کی قائل ہو گئی۔ کھانا پکانے سے پہلے انوشہ ساس سے ایک بار طریقہ پوچھ لیتی۔ اس طریقے میں اپنی مرضی کی رد و بدل کے ساتھ کھانا پکاتی تھی اور اگر کوئی تعریف کرتا تو فراخدلی سے کریڈٹ ساس کو دے دیتی۔

"امی سے پوچھ پوچھ کر پکایا ہے۔" ناہید بیگم یہ جواب سن کر مطمئن ہو جاتی تھیں۔ اسی طرح روزمرہ زندگی میں بہت سے چھوٹے بڑے معاملے ایسے تھے جو انوشہ نے سمجھ داری سے نمٹائے تھے۔ اب اس کی شادی کو تین برس ہونے کو آئے تھے۔ مجموعی طور پر اس کے سسرال والوں سے تعلقات خاصے خوشگوار تھے یہ سب اس کی سمجھ داری اور معاملہ فہمی کی وجہ سے ممکن ہوا تھا لیکن جب کبھی آس پڑوس میں کسی بہو اور سسرال والوں کی کھٹ پٹ کا پتا چلتا تو ناجیہ، شازیہ مسکراتے ہوئے اسے جتانے بنا نہ رہتیں۔

"دیکھ لیں بھابھی قدر کریں ہماری۔ کتنے اچھے ہیں ہم آج تک ہماری معمولی سی بھی نوک جھونک نہیں ہوئی۔" میگزین پڑھتی ہوئی ناجیہ نے مسکراتے ہوئے اسے مخاطب کیا اور وہ جو کل اس کے کالج فنکشن کے لیے ایمرجنسی میں سوٹ سلائی کر رہی تھی مسکراتے ہوئے اس کی بات سے اتفاق کیا تھا۔

"واقعی میں بہت لکی ہوں جو اتنا آئیڈیل سسرال ملا۔" پاس بیٹھی ناہید بیگم بھی مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیتیں۔

"اچھا بھابھی! کل کے فنکشن کے لیے مجھے آپ کا سلور سینڈل بھی چاہیے۔" ناجیہ کو اچانک یاد آیا تھا کہ اس سوٹ کے ساتھ سلور سینڈل اچھا لگے گا۔

"وہ پرسوں شازیہ اپنی سہیلی کی سالگرہ میں پہن کر گئی تھی تم لوگوں کے کمرے میں ہی ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔ ناجیہ نے سر ہلا دیا تھا۔

"کیا ضرورت ہے اتنا تیار ہو کر کالج جانے کی۔ کم بخت پتا بھی ہے نظر لگ جاتی ہے تجھے۔"

ناہید بیگم نے بیٹی کو ٹوکا تھا۔ ناجیہ اک ادا سے ہنس پڑی تھی انوشہ نے سر اٹھا کر نند کو دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہ تھا کہ ناہید بیگم کے سب بچے خوب صورتی کی تعریف پر پورا اترتے تھے مگر ناجیہ پر تو آج کل انوکھا روپ چڑھ رہا تھا۔ شاید جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی لڑکیوں پر عجیب نکھار آ یوں آپ اترا آتا ہے اور جو پہلے سے ہی حسین ہو اس کا حسن تو آنکھوں کو مزید خیرہ کرنے لگتا ہے پھر ناجیہ کے پاس فارغ وقت بھی بہت تھا وہ رنگت نکھارنے اور خوب صورتی بڑھانے کو مختلف ٹوٹکے آزماتی رہتی تھی وہ کہیں جانے کو تیار ہوتی تو ناہید بیگم اس پر پڑھ پڑھ کر پھونکتی رہتیں اور یہ ناجیہ کی خوب صورتی ہی تھی کہ بی اے پاس کرنے

سے پہلے ہی اس کا اتنا اچھا رشتہ آگیا کہ گھر والوں کو ہاں کرتے ہی بنی۔ عدنان ناجیہ کی خالہ کے جیٹھ کا لڑکا تھا خالہ تو عرصہ دراز سے سعودیہ مقیم تھیں مگر انہوں نے فون پر اپنے جیٹھ کے بیٹے کی تعریفوں میں قلابے ملا دیے۔ عدنان بی اے پاس تھا اور اپنے والد کے ساتھ ان کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا' اچھی خاصی خوشحال فیملی تھی پھر دیکھے بھالے لوگ تھے رسمی طور پر سوچنے کی مہلت لینے کے بعد انہیں ہاں کہلوا دی گئی حالانکہ ناجیہ نے تھوڑا بہت شور مچایا تھا کہ کم از کم اسے بی اے تو مکمل کر لینے دیا جائے لیکن اس کے گالوں پر پھوٹتی شفق بتا رہی تھی کہ یہ احتجاج محض دکھاوٹی ہے اور ویسے بھی پڑھائی میں اس کا دماغ چلتا بھی کم ہی تھا سو ساری کتابیں الماری میں بند کر کے وہ ذوق و شوق سے شادی کی تیاری کرنے لگی۔

انوشہ پر آج کل دہری ذمہ داری تھی۔ ناجیہ کے ساتھ بازاروں کے چکر لگتے کہ ناہید بیگم کے جوڑوں کے درد کی وجہ سے ان کا چلنا پھرنا محال تھا بازار سے واپس آکر ناجیہ تو خوشی خوشی گھر والوں کو اپنی شاپنگ دکھانے لگتی اور انوشہ کچن کی راہ لیتی یہ غنیمت تھا کہ دو سالہ ریان دادا' دادی سے مانوس تھا وہ انوشہ کو زیادہ نہ ستاتا تھا۔ دادا' دادی' پاپا' چاچو' پھوپھو ان سب کی گودوں سے ہوتا ہوا وہ سونے کے لیے انوشہ کی گود میں آتا تھا۔ کاموں کی زیادتی کی وجہ سے کبھی کبھار تو انوشہ بیٹے کے ساتھ لاڈ پیار کرنے کو ترس جاتی تھی کبھی ماں سے اس بارے میں شکایت کرتی وہ پیار سے سمجھاتیں۔

"کاموں سے ہونے والی تھکاوٹ تو رات کو سو کر اتر جاتی ہے بیٹا۔ ہر صبح تم تازہ دم ہو کر بیدار ہوتی ہو شکر کرو اس گھر میں تمہیں کوئی ذہنی ٹینشن نہیں ہے پھر کچھ عرصے کی بات ہے تمہارے دیوروں کی بھی شادی ہو جائے گی دیورانیاں آئیں گی تو کاموں کا بوجھ تم پر سے کم ہو جائے گا۔"

نزہت اسے مطمئن کرنے کی کوشش کرتیں۔ وہ بھی ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیتی لیکن دیوروں سے پہلے ان سے چھوٹی نند کی شادی ہونے جا رہی تھی اور اس شادی نے تو اسے بری طرح تھکا ہی ڈالا تھا اس روز بھی وہ عماد اور ناجیہ کے ساتھ جیولر کے پاس گئی تھی گھر واپس لوٹی تو پتا چلا ناجیہ کی نند اس کی چوڑیوں اور جوتے وغیرہ کا ناپ لینے آنے والی ہے ناجیہ کو اپنی تیاری کی فکر دامن گیر ہوئی وہ جھٹ اپنے کمرے میں بھاگی پر تکلف لنچ تیار کرنے کی ذمہ داری انوشہ کے کندھوں پر آن پڑی لیکن شکر ہے ہر کام مناسب وقت پر اور بہت اچھے طریقے سے پایہ تکمیل کو پہنچا اور جب ناجیہ کی نند نے کھانے کی دل کھول کر تعریف کی تو انوشہ کو لگا اس کی محنت وصول ہو گئی۔

"واقعی بہت ذائقہ ہے بھابھی آپ کے ہاتھ میں آپ کے ہاتھ کی بنی ہر چیز لاجواب ہوتی ہے۔" ارم نے بلا مبالغہ چوتھی بار یہ فقرہ دہرایا تھا۔

"بھابھی واقعی مزے کا پکاتی ہیں لیکن طریقہ امی سے ہی پوچھتی ہیں۔ بس یوں سمجھیں کہ ریسپی امی کی اور محنت بھابھی کی۔" ناجیہ نے مسکراتے ہوئے اپنی نند کو آگاہ کیا۔ انوشہ نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے محنت کا کریڈٹ تو دے ہی دیا گیا۔

"ویسے آج کل کھانا بنانا زیادہ مشکل کام نہیں رہا۔ ٹی وی پر اتنے کوکنگ شوز آتے ہیں۔ انہیں باقاعدگی سے دیکھ لیں تب بھی اچھی خاصی کوکنگ آجاتی ہے۔" سب سے چھوٹی شازیہ نے بھی مدبرانہ انداز میں گفتگو میں حصہ لیا۔ باقاعدگی سے کوکنگ شوز دیکھنے والی اس لڑکی کو صرف چائے بنانی آتی تھی اور حد تو یہ تھی کہ کوئی اسے چائے بنانے کا کہہ دیتا تب بھی وہ سو نخروں کے بعد چائے بناتی تھی۔ بات کوکنگ شوز سے ٹی وی ڈراموں کی طرف مڑ گئی تھی۔ انوشہ ان لوگوں کی طرح فارغ نہیں تھی سو انہیں باتوں میں مشغول چھوڑ کر برتن سمیٹنے لگی۔

☼ ☼ ☼

اللہ اللہ کر کے ناجیہ کی شادی کے ہنگامے ختم

ہوئے اور وہ پیا دیس سدھار گئی اس کی شادی کے بعد انوشہ نے سکون کا سانس لیا تھا۔ بہت عرصے بعد اسے ایسی اطمینان بھری فراغت میسر تھی حالانکہ روزمرہ کے کاموں کی ذمہ داری ابھی بھی اس کے سر تھی لیکن شادی کے ہنگاموں میں تو اسے سر کھجانے اور منہ دھونے کی فرصت بھی نہ ملتی تھی اس کے مقابلے میں روٹین کے کام اب اسے کوئی مسئلہ ہی نہ لگتے تھے ہاں تین چار دن بعد ناجیہ اپنے میاں کے ساتھ میکے کا رخ کرتی تو شام کی چائے اور اکثر رات کے کھانے پر خوب اہتمام ہوتا ایسے میں انوشہ کی مصروفیت بڑھ جاتی لیکن اسے پتا تھا کہ یہ سب شادی کی شروع شروع کی باتیں ہیں پھر لڑکیاں اتنے تواتر سے میکے کب آپاتی ہیں۔ ناجیہ بھی اپنے گھر کی بڑی بہو تھی شادی کے دو ہفتے بعد اس سے کھیر پکوائی کی رسم پوری کروائی گئی تھی۔ اس دن ناجیہ بار بار ماں کو فون کھڑکا رہی تھی۔ سسرال میں پہلی بار کچھ پکاتے ہوئے وہ بہت گھبرا رہی تھی پھر وہ کھانا پکانے میں بالکل بھی ماہر نہ تھی۔ شادی سے پہلے جب کبھی کبھار ناہید بیگم اسے سسرال کا ڈر اوا دے کر کچن کا رخ کرنے کا کہتیں تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔

"موبائل فون زندہ باد امی۔ جب بھی کچھ پکانا ہو گا آپ کو فون کر کے ترکیب پوچھ لوں گی۔" اور آج واقعی ایسا ہی دن آگیا تھا۔ کھیر کے ساتھ ساتھ اسے دوپہر کے کھانے کی بھی تیاری کرنی تھی۔ ناہید بیگم نے بیٹی کو پکانے کا طریقہ بھی بتا دیا اور اجزائے ترکیبی کے تناسب سے بھی آگاہ کر دیا۔ پاس کھڑی انوشہ کا جی چاہا کہ وہ ساس کے ہاتھ سے فون لے کر خود بھی ناجیہ کو گائیڈ کر دے۔ ناہید بیگم نے تو عرصہ دراز سے کچن میں جانا ہی چھوڑ دیا تھا وہ اپنے اندازوں کی بنا پر بیٹی کو جو کچھ بتا رہی تھیں انوشہ جانتی تھی کہ ناجیہ اس طریقے سے ہرگز اچھا نہ پکا سکے گی۔ اس سے پہلے وہ کسی بہانے ساس سے فون لے کر ناجیہ سے بات کرتی ناہید بیگم نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

"بہو میرے سر میں تیل کی مالش تو کر دو۔ تھوڑی دیر میں نہاؤں گی میں۔" ناہید بیگم نے اسے مخاطب کیا۔ وہ تابعداری سے ساس کا حکم بجا لائی۔ ان کے سر میں تیل لگا کر ان کے کپڑے پریس کیے اتنے میں عادل کے کچھ دوست آگئے۔

"بھابھی پلیز چائے کے ساتھ کچھ اور ہو سکے تو بنا دیجیے۔ آج بہت عرصے بعد عدیل اور ذیشان آئے ہیں۔" عادل نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے جھٹ پٹ آلو ابلنے کے لیے رکھ دیے۔ اتنی جلدی تو آلو کے کٹلس ہی بن سکتے تھے۔ فریج میں پڑے مٹھائی کے ڈبے میں سے چار پانچ رس گلے برآمد ہو گئے۔ چھوٹی سی پلیٹ میں وہ سجا دیے بسکٹ' نمکو' چائے اور کٹلس ٹرے میں سجا کر عادل کو آواز دے کر بلایا۔

"تھینک یو بھابھی' تھینک یو سو مچ۔" وہ بھابھی کی کوئیک سروس پر ممنون ہوتے ہوئے بولا انوشہ مسکرا دی۔ ناجیہ کو فون کرنے کی بات ذہن سے ہی نکل گئی۔ شام کو ناجیہ کا فون آیا تو اس کا موڈ سخت آف تھا۔

"امی! پتا نہیں آپ نے کیسا طریقہ بتایا تھا۔ مجھ سے کوئی بھی چیز ڈھنگ کی نہیں بنی سسرال میں پہلا امپریشن خراب پڑ گیا۔" اس نے ماں سے خفگی کا اظہار کر کے فون بند کر دیا۔

"ارے سن تو سہی۔" ناہید بیگم کہتی ہی رہ گئیں۔ خود نمبر ملانے کی کوشش کی مگر شاید ناجیہ نے موبائل ہی آف کر دیا۔

"بھول چوک خود سے ہو گئی ہو گی۔ نام لگا رہی ہے ماں کا۔" ناہید بیگم دیر تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔ دو دن بعد ناجیہ پھر فون پر ماں سے کسی ڈش کا طریقہ پوچھ رہی تھی پتا نہیں پچھلا تجربہ بھول گئی تھی یا ماں سے پوچھے بنا کوئی چارہ ہی نہ تھا آج انوشہ ناہید بیگم کے پاس نہ تھی ورنہ وہ ضرور ان کے ہاتھ سے موبائل لے کر ناجیہ کو صحیح طریقہ بتا دیتی۔

شام کو عدنان اور ناجیہ آگئے تھے۔ عدنان تو چائے پیتے ہی جانے کے لیے اٹھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے ناجیہ میں رات کو تمہیں پک کر لوں گا۔" اس نے بیوی کو مخاطب کیا۔

"آپ اتنی جلدی کہاں چل دیے عدنان بھائی۔"

انوشہ نے عدنان کو اٹھتے دیکھ کر پوچھا۔

"بس بھابھی ایک دوست کے ہاں جانا ہے سب دوست وہاں اکٹھے ہیں میرا انتظار کر رہے ہیں۔" عدنان نے بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے لیکن رات کے کھانے پر ہم آپ کا انتظار کریں گے۔" انوشہ نے آداب میزبانی نبھائے۔

"بہت شکریہ بھابھی۔ آپ کے ہاتھ کا کھانا چھوڑنا تو حماقت ہی ہے لیکن آج میں اس حماقت پر مجبور ہوں کھانا دوستوں کے ساتھ ہی کھاؤں گا آپ کے ہاتھ کا کھانا پھر کبھی کھائیں گے۔" وہ شگفتگی سے مسکراتے ہوئے رخصت ہوا تھا۔

انوشہ کچھ دیر تو سب کے ساتھ ناجیہ کے پاس بیٹھی تھی پھر اٹھ کر کچن میں چلی گئی بے شک عدنان نے رات کا کھانا یہاں نہیں کھانا تھا لیکن ناجیہ تو موجود تھی اور گھر کی نئی بیاہی بیٹی کو دال سبزی تو نہیں کھلائی جاسکتی تھی کچھ نہ کچھ اہتمام تو ضروری تھا وہ فریج کھول کر چیزوں کا جائزہ لینے لگی۔ فریزر میں چکن موجود تھا اس نے چکن کڑاہی بنانے کا سوچا تھا پھر خیال آیا ناجیہ سے پوچھ ہی لے کہ اس کا کچھ اور کھانے کو جی تو نہیں کررہا لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے ہی اسے ٹھٹک کر رکنا پڑا تھا۔ ناجیہ دھواں دھار انداز میں رو رہی تھی۔

"سچ امی! میں بتا نہیں سکتی آج کتنی انسلٹ ہوئی میری۔ پورا گھرانہ اکٹھا تھا کھانے کی میز پر میرے ہاتھ کا کھانا کھا کر ہر کسی نے اپنے الگ ہی کمنٹس دیے بظاہر سب مذاق کررہے تھے لیکن شرمندگی کے مارے میرا برا حال ہو رہا تھا۔ آپ کو جانے مجھ سے کیا پرخاش ہے جو مجھے ایسے الٹے سیدھے طریقے بتا دیتی ہیں۔ پہلی بار میں نے سوچا تھا مجھ سے ہی بھول چوک ہوئی ہوگی آج تو میں نے آپ کو فون کیا تو نوٹ بک ساتھ رکھی تھی۔ جو کچھ آپ بتاتی گئیں میں نوٹ کرتی رہی اور اس کے مطابق کھانا پکایا جو اتنا بدمزہ اور برا بنا۔" ناجیہ سوں سوں کرتے ہوئے بولی تھی۔ ناہید بیگم بیٹی کی بات سن کر کچھ خفیف سی ہوگئی تھیں۔

"میں ماں ہوں تیری یا دشمن کیوں غلط بتانے لگی تجھے تو بھلا بتاؤ بلاوجہ مجھ پر بگڑ رہی ہے۔" انہیں غصہ سا آگیا تھا۔

"تو ناجیہ! تم امی سے کیوں پوچھتی ہو۔ امی تو آؤٹ آف پریکٹس ہو رہی ہیں تم انوشہ بھابھی سے پوچھ لیا کرو نا۔" عادل نے بہن کو مخاطب کیا تھا اور انوشہ جو کمرے میں جانے کا سوچ ہی رہی تھی اپنا ذکر آنے پر غیر ارادی طور پر پھر رک گئی۔

"بھابھی بھی تو امی سے ہی طریقہ پوچھ کر پکاتی ہیں۔ امی انہیں تو لاجواب ترکیبیں بتاتی ہیں اور مجھے جانے کیوں ٹھیک سے کچھ نہیں بتاتیں۔" اس کی خفگی اپنی جگہ برقرار تھی۔ حماد جو بہن بھائیوں میں سب سے منہ پھٹ اور بدلحاظ تھا اس سے مزید ضبط نہ ہو سکا تھا۔

"انوشہ بھابھی کی شادی کو تین برس ہونے کو آرہے ہیں ناجیہ اور تمہاری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہوگی کہ تمہیں یاد ہی نہ ہو کہ تین برس پہلے اس گھر میں کھانا وغیرہ بننے کی کیا روٹین تھی اور کتنا لاجواب کھانا بنتا تھا۔ اکثر بازاری کھانا کھاتے تھے ہم اور امی ایک دن پکا کر تین دن تک ہمیں وہی کھلاتی تھیں شاید اسی لیے ہم سب باہر کے کھانے کو ترجیح دیتے تھے۔ گھر کا ذائقہ دار کھانا کیا ہوتا ہے اس بات کا ہمیں عماد بھائی کی شادی کے بعد پتا چلا اور تم جو آج بلاوجہ روتی دھوتی میکے آئی ہو اپنے اندر کچھ برداشت پیدا کرو۔ تمہیں تو انتہائی بدمزہ کھانا پکانے پر باتیں سننی پڑیں جبکہ بھابھی کو تو اچھا پکانے کے باوجود تنقید کا نشانہ بننا پڑا تھا۔ بھابھی عقلمند تھیں طریقہ امی سے پوچھ کر اپنی مرضی کا پکانے لگیں امی بھی خوش اور ہم سب بھی خوش یہ ہوتا ہے عقل کا درست استعمال مگر تم میں عقل ہو تب نا۔"

حماد نے صورت حال کا کیسا بے لاگ تجزیہ کیا تھا۔ باہر کھڑی انوشہ دیور کی بات سن کر حیران رہ گئی اسے ہرگز اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنا باریک بین ہوگا۔ ناہید بیگم بیٹے کی بات سن کر خفگی سے کچھ بولنے ہی لگی تھیں کہ حامد صاحب بول پڑے۔

"حماد صحیح کہہ رہا ہے ناجیہ! تمہیں ماں کے بجائے اپنی بھابھی کی رہنمائی درکار ہے صرف کھانا پکانے کے معاملے میں نہیں بلکہ سسرال میں کس طرح ایڈجسٹ ہوا جاسکتا ہے وہ تمہیں بہتر طور پر گائیڈ کرے گی بیٹا! جس طرح تمہارا بھرا پرا سسرال ہے اسی طرح انوشہ پر بھی بھرے پرے سسرال کی ذمہ داری پڑی تھی اور وہ یہ ذمہ داری بطریق احسن نبھا رہی ہے۔ اس پر اس بچی کی مزید یہ اچھائی کہ ہر آئے گئے کے سامنے تسلیم کرتی ہے کہ اس کا سسرال ایک آئیڈیل سسرال ہے جبکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ خود ایک آئیڈیل بہو ہے تمہیں اپنی بھابھی سے سبق لینا ہوگا کہ وہ کس طرح خود سے وابستہ تمام رشتوں کو خوش اسلوبی سے نبھا رہی ہے۔" حامد صاحب بول رہے تھے اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی انوشہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کبھی کبھار اس کے دل میں خیال آتا تھا کہ سسرال کی خدمت کرتے کرتے وہ اپنی ذات کی نفی کر رہی ہے اور اسے اس مشقت سے کیا حاصل ہوگا سسرال والے تو پھر بھی اسے کریڈٹ نہ دیتے تھے گھر میں امن و سکون کی فضا کا سارا کریڈٹ خود لے لیتے تھے لیکن آج دیور اور سسر کی بات سن کر احساس ہوا کہ سسرال میں بھی اس کے قدردان موجود ہیں۔

"انوشہ بھابھی نے تو واقعی مثالی بہو بن کر ہماری آنے والی بیویوں کے لیے مشکل پیدا کردی ہے آج کل کی لڑکیوں میں اتنا استعمنا کہاں کہ وہ گھر بھر کی ذمہ داریاں اتنی خوش اسلوبی سے نمٹائیں ہماری بیویوں کا موازنہ انوشہ بھابھی سے ہوگا اور نمبر انوشہ بھابھی کے ہی زیادہ ہوں گے۔"

عادل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انوشہ بھیگی پلکوں اور مسکراتے لبوں کے ساتھ واپس کچن میں پلٹ گئی۔ کچن کے کام نمٹاتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں پہلے سے کہیں زیادہ پھرتی تھی۔ رات کے کھانے پر اس نے چکن کڑاہی کے ساتھ مٹر پلاؤ اور فروٹ ٹرائفل بھی بنایا تھا۔ سب نے سیر ہو کر کھانا کھایا تھا اور کھانے کے بعد ناہید بیگم نے اسے مخاطب کیا۔

"بہو! ذرا ناجیہ کو بھی طریقہ سمجھا دینا۔ میں تو سب بھول بھال گئی ہوں ورنہ اس سے بھی مزے کی کڑاہی بنالیتی تھی میں۔"

"ٹھیک ہے امی! میں بتادوں گی۔" انوشہ نے تابعداری سے گردن ہلائی پھر فاٹافٹ برتن سمیٹنے لگی۔

"برتن شازیہ سمیٹ لے گی بھابھی! بلکہ آپ اسے اپنے ساتھ کام پر لگایا کریں۔ بندہ کام کا عادی نہ ہو تو سسرال جاکر مشکل پیش آتی ہے۔" ناجیہ نے اسے مخاطب کیا۔ شازیہ نے کھا جانے والی نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔

"ارے نہیں ناجیہ! شازیہ بے چاری کو ابھی کیا کام پر لگاؤں۔ کام سیکھنے کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔" انوشہ نے مسکرا کر شازیہ کو دیکھا۔ شازیہ نے خوش ہو کر تائید میں گردن ہلادی۔

انوشہ برتن سمیٹ کر کچن میں چلی آئی پہلے بکھرا کچن سمیٹا تھا پھر جلدی جلدی برتن دھونے لگی ناجیہ کے مشورے پر عمل کرکے شازیہ سے کام کروانے کا مطلب اس کے چہرے کے بگڑے زاویے برداشت کرنا تھے اس سے آسان کام اسے خود برتن سمیٹنا اور دھونا لگا تھا۔ ایک نا ایک دن شازیہ کو بھی پیا دیس سدھارنا تھا اور سسرال میں امن و سکون سے رہنا ہو تو کام بھی کرنے پڑتے ہیں اور کمپرومائز بھی۔ ناجیہ شازیہ نے جانے جسمانی آرام کو ترجیح دینی تھی یا ذہنی سکون کو اسے بہرکیف گھر کا امن و امان اور ذہنی سکون عزیز تھا۔ ڈھیروں ڈھیر برتن دھو کر اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے بنائی کچن میں کافی دیر کھڑے ہو کر کام کرنے کی وجہ سے کمر میں درد ہو رہا تھا۔

بیڈ روم میں آکر اس نے چائے کے ساتھ پین کلر لی۔ ریان اپنے پاپا کی گردن میں باہیں ڈالے گہری نیند سو رہا تھا۔ اس نے محبت بھری نگاہ سوتے ہوئے شوہر اور بیٹے پر ڈالی پھر خود بھی ان کے پہلو میں لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ جلد ہی وہ نیند کی وادی میں اتر گئی تھی۔

مطمئن اور پرسکون نیند۔

☆

شفا نے لودھی صاحب کی طرف دیکھا اور گھبرا گئی۔ ان کی رنگت غیر معمولی حد تک زرد ہو رہی تھی۔

"ابا۔۔۔ آپ ٹھیک ہیں نا۔۔۔ میرا مقصد آپ کو ہرٹ کرنا نہیں تھا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔" انہوں نے بامشکل کہا۔ شرمساری کے احساس نے انہیں بے کل کر دیا تھا۔

"چلو گھر چلتے ہیں۔" انہوں نے اٹھنے کی کوشش میں اپنی چھڑی پر زور ڈالا لیکن ان کی آن آنکھوں میں اندھیرا اچھل گیا اور وہ اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکے۔

"ابا!" انہیں گرتا دیکھ کر شفا کے اپنے ہاتھوں پیروں سے جان ہی نکل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

شوٹنگ ختم ہوتے ہی تقی اور اس کا کریو کے سارے ممبرز گھومنے پھرنے نکل جاتے تھے۔ وہاں سیاحوں کی دلچسپی کا خوب اہتمام تھا۔ سو ہر روز نت نئے تجربے ملتے۔ تقی کا لطف دوبالا ہو رہا تھا۔

مہک سے اس کا فون پر مسلسل رابطہ تھا۔ شفا سے بھی رابطہ تھا۔ کیوں تھا' یہ اب تک تقی نہیں سمجھا۔ صرف یہ ہوتا تھا کہ اسے بات بے بات شفا یاد آجاتی اور وہ فون اٹھا کر اسے میسج کرنے لگتا۔ دراصل ایک انسان کے ساتھ رہتے رہتے اس کی عادت ہو جاتی ہے۔ شفا بھی اس کی عادت میں شامل ہو گئی تھی' ورنہ تو کوئی بات نہیں تھی۔

ایک روز جب وہ بہت دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا تو اسی نتیجے پر پہنچا۔

زیادہ عجیب بات تب ہوتی' جب وہ جلدی میں مہک کا ایس ایم ایس بھی شفا کو کر دیتا یا شفا کے ساتھ کی جانے والی باتیں مہک کو بتا رہا ہوتا پھر پچھتاتا۔ شفا اسے غلطی کا احساس دلاتی اور مہک خفا ہو جاتی۔ اس روز بھی تقی بے زار ہو تا فون آف کر کے باہر آ گیا۔

ایسے ہی بے زار بے زار پھر رہا تھا کہ کسی سے ٹکرانے سے سامنے والے لڑکے کے ہاتھ میں پکڑی بیساکھی گر گئی۔ تقی نے معذرت کرتے ہوئے بیساکھی اٹھا کر دی۔ دونوں طرف سے معذرت کا تبادلہ ہوا۔ وہ اچھا خوش شکل لڑکا تھا۔ شکل سے انگریز سا لگتا تھا۔ تقی کو ذرا دکھ بھی ہوا کہ معذور تھا۔ بہرحال سرسری اور تکلفاً جملوں کے تبادلے کے بعد دونوں اپنی اپنی راہ کو چل دیے۔ یہ کھلا سا کوئی بازار تھا۔ گھومتے پھرتے پھر آمنا سامنا ہوا تو مسکراہٹوں کا دوبارہ تبادلہ ہو گیا۔

اگلے روز جب دونوں پھر آمنے سامنے آ گئے تو اسی نے کہہ دیا۔

"قسمت ہمیں بار بار ملوا رہی ہے۔ ہو نہ ہو' اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے۔" اس کا انداز خوش گوار سا تھا' تقی کھل کر ہنس دیا۔

"تم قسمت کے رازوں پر یقین رکھتے ہو؟"

"قسمت کے رازوں پر تو پتا نہیں لیکن قسمت پر ضرور یقین رکھتا ہوں۔ بائے دا وے آئی ایم روحیل۔" اس نے مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھایا تقی کا ذہن جاگ اٹھا۔

"روحیل۔ اوہ۔ تقی!"

"نائس ٹو میٹ یو تقی!" وہ ہاتھ گرم جوشی سے ملا کر آگے بڑھ گیا۔ تقی وہیں کھڑا کڑیاں جوڑتا رہا۔ اب دنیا میں اس نام کا ایک ہی تو شخص نہیں ہو سکتا تھا۔ وشمہ کے بھائی روحیل سے بھی بچپن میں وہ مل بھی چکا تھا لیکن اس ملاقات کا عکس اتنا دھندلا تھا کہ شناخت کرنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔

اگلی ملاقات شاپنگ مال کی لفٹ میں ہوئی' جو فنی خرابی کی وجہ سے بند ہو گئی تھی۔ انہیں کچھ دیر اکٹھے ہو کر انتظار کرنا پڑا۔ تقی جان بوجھ کر اس سے کرید کر سوال کرنے لگا۔

"کیا تمہارا تعلق پاکستان سے ہے؟ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ میرا ایک بچپن کا دوست تھا۔ اس کی شکل تم سے بہت ملتی تھی اور اتفاق کی بات دیکھو کہ اس کا نام بھی روحیل ہی تھا۔ ہاں۔ لیکن وہ معذور نہیں تھا۔"

"میں بھی بچپن سے معذور نہیں ہوں۔ پاکستان گیا تھا۔ وہیں سے یہ سوغات ساتھ لے کر آیا ہوں۔ یار! بلائے برطرف' میں بھی پاکستانی ہوں لیکن یہ وہ حوالہ ہے' جس پر مجھے ہمیشہ شرمندگی رہی ہے۔ پاکستان ایسی جگہ نہیں ہے کہ وہاں جا کر رہا جائے۔ جس کی قسمت خراب ہو' وہی اب وہاں جا کر رہے۔ میں تو مر جاؤں تب بھی دوبارہ وہاں نہ جاؤں۔ اتنی گندگی ہے وہاں' اتنی آلودگی ہے کہ میں۔۔۔ نہانے جاؤ تو پانی نہیں آتا۔ پنکھا چلاؤ تو لائٹ چلی جاتی ہے اور ٹریفک کا سسٹم کتنا خراب ہے۔ اپنی بہن وشمہ کے بیٹے کو بچاتے ہوئے ہی تو میں اپنی ایک ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ اور پھر مجھے وہاں ایک لڑکی ملی ساہر۔ خوبصورت تو بہت تھی لیکن اتنی کرپٹ کہ کچھ باتوں پر تو میں بھی حیران رہ جاتا تھا۔ اس کے پیچھے میں نے اپنا اتنا وقت برباد کیا کہ کیا بتاؤں۔" وہ بہت ہی دل جلا کر بیٹھا ہوا تھا۔ تقی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس نے دائیں ہاتھ کی مٹھی اس طرح ہونٹوں پر رکھی ہوئی تھی کہ آدھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ تاثرات دیکھنا مشکل تھا۔

"کیسے وقت برباد کیا؟"

"یار! اس کے ہزبینڈ کی بہن تھی' جس سے ساہر بدلہ لینا چاہتی تھی تو اس نے مجھے کہا کہ میں اس کو ٹریپ کروں۔ مجھے اس لڑکی میں تو اتنا انٹرسٹ نہیں تھا لیکن ساہر میں تھا۔ میں نے سوچا چلو جب تک پاکستان میں ہوں۔ تھوڑا دل بہلانے کا بندوبست ہی کر لیا جائے۔ اسی چکر میں بلکہ ساہر کے چکر میں اس لڑکی کے پیچھے پڑا رہا حالانکہ وہ لڑکی ذرا دوسری ٹائپ کی تھی۔ مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا کہ مجھے اس کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں جتنا بھی برا سہی لیکن عورت کے معاملے میں ایک اصول بنا کر رکھا ہے' جو خود آئے اس سے فائدہ حاصل کرو۔ مجھے بھی ساہر سے فائدہ اٹھا کر نکل جانا چاہیے تھا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کہا تھا روحیل! قسمت ہمیں بار بار ملوا رہی ہے تو اس کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے۔" تقی نے گہری سانس بھر کر کہا۔

"اچھا۔ اور وہ راز کیا ہے؟" روحیل مسکرایا۔

"بتاتا ہوں۔ لیکن پہلے تم ذرا ادھر آنا' مجھے لگ رہا ہے تمہاری ناک پر کوئی کیڑا چپکا ہوا ہے۔"

روحیل لاشعوری طور پر ذرا سا آگے ہوا اور پہلا گھونسا اس کی ناک پر پڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

ساہر نے والٹ اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ کر زپ بند کی اور ذرا سستانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

ہدیہ کے اسکول سے آنے میں ابھی کچھ وقت باقی تھا اور وہ اس کی واپسی تک تھوڑا آرام کر لینا چاہتی تھی۔ عادل کو وہ سلا چکی تھی۔ ہدیہ آجاتی تو آج اس کا اسی کی طرف جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن اس وقت وہ اتنا تھک چکی تھی کہ اب سارا پروگرام کینسل کرنے کا خیال آ رہا تھا۔

بلکہ آج کی ہی کیا بات' وہ اکثر ہی تھک جاتی تھی۔ کام والی اکثر بتائے بنا چھٹی کر لیتی تو اسے سارے گھر کا کام خود ہی سمیٹنا پڑتا۔ ساتھ میں ہدیہ اور عادل کی ذمہ داری الگ۔ شفا کی موجودگی میں کم سے کم اسے اس بات کی طرف سے بے فکری رہتی تھی۔ کام والی نہ بھی آتی تو شفا خود ہی سب سمیٹ دیتی۔ بنا کہے کھانا بنا دیتی۔ صرف یہی نہیں ہدیہ اور عادل کو بھی سنبھال لیتی تھی۔

شفا کا خیال آتے ہی اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ یہ وقت بے وقت شفا نا جانے کیوں یاد آنے لگتی تھی۔

سر جھٹک کر اس کے خیال سے پیچھا چھڑایا۔ بارہ بج چکے تھے۔ ہدیہ کچھ دیر میں آ ہی جاتی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ فرائنگ پان چولہے پر رکھا اور نگٹس فرائی کرنے لگی۔

بارہ بج کر بیس ہو گئے۔ ہدیہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ کچن سے نکل کر اس نے عادل کو دیکھا۔ اسے سکون سے سوتا پا کر وہ گیٹ پر آ گئی۔ ہدیہ کی وین کے آنے سے پہلے وہ ہر روز گیٹ پر آ جایا کرتی تھی۔ اسے گیٹ پر کھڑے کچھ دیر گزر گئی۔ ساہر کو احساس ہوا اب زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔ وہ اندر سے اپنا سیل فون

اٹھالائی اور ڈرائیور کو فون کرنے لگی۔ اس سے پہلے ہدیہ جس وین میں جاتی تھی اس کے ڈرائیور کو عمیر جانتے تھے۔ اسی وین میں شفا بھی اسکول کالج جایا کرتی تھی۔ چونکہ پرانا آدمی تھا' سو جان پہچان بھی ہو گئی تھی لیکن شفا کے بعد اس نے بھی کسی معمولی سی بات کا بہانہ بنا کر آنا چھوڑ دیا تو ساہر نے نئی وین کا بندوبست کرلیا۔ وہ دراصل شفا کے بارے میں سوال بہت پوچھتا تھا۔

ساہر نے اسے خود ہی ہٹا دیا لیکن عمیر کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہدیہ کی ذمہ داری اٹھا سکیں اور ساہر کے لیے بھی مشکل ہو رہا تھا کہ روز روز ہدیہ کو لانے لے جانے گھر سے نکلے' سو اس نے نئی وین لگوالی۔ وین کا وہ ڈرائیور بھی بھلا آدمی معلوم ہوتا تھا اور ان ہی کی لین کے پہلے گھر سے ساہر نے اسے بچوں کو پک کرتے دیکھا بھی تھا۔ وہ ڈرائیور کو فون کرنے لگی۔ لیکن کئی بار بیل جانے کے بعد بھی کال ریسیو نہیں کی گئی۔ اس نے دوسری بار کال ملائی تو کاٹ دی گئی اور تیسری بار میں نمبر ہی آف کر دیا گیا۔

اب ساہر کو صحیح معنوں میں پریشانی لاحق ہوئی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تو ضرور تھی۔ فکرمندی میں اسے پہلا خیال عمیر کا آیا۔ اس نے عمیر کا نمبر ملایا لیکن اگلے ہی پل خود ہی کال منقطع کر دی۔ اسے عمیر کو پریشان نہیں کرنا چاہیے۔

اگلا خیال آتے پر وہ اندر سے گیٹ کی چابی لے آئی۔ احتیاطاً "عادل پر ایک نظر ڈالی۔ گیٹ سے باہر آکر اس نے گیٹ کو لاک کر دیا۔

☼ ☼ ☼

روحیل اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ بوکھلا ہی گیا۔ اس کے چہرے پر پے در پے گھونسے پڑے تھے۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔ مجھے مار کیوں رہے ہو؟" اس نے اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کیونکہ تمہاری قسمت میں ہی مار کھانا لکھا ہے بیٹا!" تقی اسے مارتے ہوئے خود بھی ہانپ گیا تھا لیکن ذرا دیر کو سانس بحال کر کے اس نے ایک اور زوردار تھپڑ اسے رسید کیا۔

"اب تک جتنا میں نے تمہیں مارا' وہ سب تو تمہید تھی۔ یہ تھپڑ اس لیے کیونکہ تم نے ساہر کے بارے میں برے انداز سے بات کی۔"

"کیا؟" روحیل پہلے تھپڑ سے نہ سنبھلا تھا کہ دوسرا اس کے بائیں گال پر پڑا۔

"یہ دوسرا تھپڑ اس لیے کیونکہ تم نے شفا جیسی معصوم لڑکی پر تہمت لگائی۔"

تقی نے اسے گریبان سے پکڑ کر گھسیٹا اور پے در پے دو تھپڑ مزید رسید کیے۔ یہ تھپڑ پچھلی ہر ضرب سے زیادہ شدید تھے۔

"یہ کس لیے؟" روحیل منمنایا۔

"یہ اس لیے کیونکہ تم نے میرا وقت برباد کیا۔ دنیا کو موقع دیا کہ مجھ پر انگلی اٹھائے۔ اور مجھے میرے ابا کی نظروں میں گرا دیا۔"

"تت۔ تم... ہو کون؟" روحیل ششدر ہی رہ گیا تھا۔

"ساہر کا بھائی۔ شفا کا شوہر۔ اور تمہارے لیے موت کا فرشتہ۔"

یہ والا گھونسا روحیل کی ناک پر لگا۔

☼ ☼ ☼

ڈور بیل بجا کر ساہر انتظار کرنے لگی۔ بے چینی سے اس کا برا حال تھا۔ تیسری بیل پر دروازہ کسی خاتون نے کھولا تھا۔

"السلام علیکم۔" ساہر نے بے صبری سے اپنا تعارف کروایا۔

"مجھے آپ کے بچوں کی اسکول وین کے بارے میں پوچھنا تھا؟"

"اسکول وین؟" وہ خاتون حیران ہوئیں۔ "میرے بچے تو وین میں نہیں جاتے۔ آپ نے میری نند کے بچوں کو دیکھا ہوگا' پچھلے دنوں وہ ہماری طرف آئے ہوئے تھے۔"

"جی ہو سکتا ہے وہی ہوں۔" ساہر نے جلدی سے کہا۔ "کیا آپ کی نند کے بچے واپس آگئے ہیں؟ دراصل میری بیٹی بھی اسی وین سے جاتی ہے لیکن وہ ابھی تک واپس نہیں آئی۔ میں ڈرائیور کو کال بھی کر رہی ہوں لیکن اس کا فون بند جا رہا ہے۔"

"بیٹی! دراصل میری نند تو کچھ روز کے لیے آئی ہوئی تھیں تو ہمیں اس کے بچوں کے لیے وین لگوانا پڑی۔ اب تو اس وین کو ہٹا بھی دیا ہے۔"

یہ بات سن کر ساہر کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔

"آنٹی! آپ کے پاس وین ڈرائیور کا کوئی اور نمبر ہوگا؟" اس نے بے چینی سے پوچھا لیکن ان خاتون کے انکار پر اس کا بچا کھچا حوصلہ بھی جاتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ناچار اسے عمیر سے بات کرنا پڑی۔

☼ ☼ ☼

لودھی خاندان پر قیامت ٹوٹی تھی۔

اچھے خاصے ابا آئی سی یو میں پہنچ گئے۔ دل کے تین والو بند تھے۔ عرصہ دراز سے وہ ذیابیطس کے مرض میں بھی مبتلا تھے لیکن میٹھا کھانے کے اتنے شوقین تھے کہ گھر والوں کو بھنک بھی نہ پڑنے دی۔ ڈاکٹر نے بتایا گردے کمزور ہو چکے ہیں۔ واضح طور پر کچھ بھی بتانا مشکل ہے۔

رضی نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا لیکن امی اور جری کا برا حال تھا۔ وہ بے چارہ اکیلا اسپتال کی بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ شفا گھر میں امی اور بہن کی دیکھ بھال میں لگی تھی۔ کئی بار سوچا تقی کو بتا دے لیکن رضی نے منع کر دیا۔

"اس کے لیے یوں ایک دم اٹھ کر پاکستان آنا مشکل ہوگا۔ نہ پہنچ سکا تو پریشان ہوتا رہے گا۔"

اسے باپ کے ساتھ ساتھ بھائی کی بھی فکر تھی۔

شفا کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ بتانا چاہتی تھی لیکن تذبذب میں پڑی تھی۔ پھر اس روز تقی کا اچانک فون آگیا۔ اب تک وہ کسی نہ کسی طرح بات کرنے سے گریز کر رہی تھی لیکن جانے کیا ہوا کہ فون اٹھا لیا۔

"کتنی دیر سے فون کر رہا ہوں یار! کہاں تھیں تم؟" وہ بہت پرجوش لگ رہا تھا۔

"مجھے کہاں جانا ہے۔ یہیں تھی۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے؟" وہ ٹھٹک کر بولا۔ شفا چونک گئی۔

"کچھ نہیں۔ بس تھوڑا سا فلو۔" اس نے بات بنائی۔

"جھوٹ بول رہی ہو نا۔" تقی نے ترنت کہا۔

شفا دوبارہ چونکی۔ اس کے صاف لہجے سے بھی تقی کو بھنک لگ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہے۔

"مجھے بتاؤ شفا! کیا ہوا ہے۔ تم کیوں رو رہی ہو' دیکھو' اب جھوٹ مت بولنا۔" اس نے رعب سے کہا تھا۔

شفا نے دو تین گہرے سانس لیے کہ کسی طرح بات کو سنبھال لے لیکن حلق میں جو آنسوؤں کا گولہ پھنسا تھا' وہ نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"تقی! ابا۔" بوجھل لہجے میں وہ بس اتنا ہی بول پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

عمیر ساہر کی پہلی کال پر ہی گھر آگئے تھے۔

ڈرائیور کو مسلسل فون کرنے پر ناکامی کی صورت میں انہوں نے اسکول جانے کا فیصلہ کیا لیکن اسکول سے بھی انہیں کوئی خاطر خواہ جواب نہیں ملا تھا۔

"چوکیدار نے ہدیہ کو خود اسی وین میں سوار کروایا تھا جس میں پچھلے ڈیڑھ مہینے سے وہ جا رہی ہے۔ اور مسز عمیر نے خود اس وین والے کا ریفرنس ہمارے ریکارڈ میں لکھوایا تھا۔" کلاس ٹیچر نے کہا۔

"میرا خیال ہے۔ ہمیں ڈرائیور کے گھر جانا چاہیے۔" عمیر نے اسکول سے نکلتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہم اس کے گھر کیسے جائیں گے؟" ساہر نے کہا۔

"کیا مطلب؟" عمیر نے گاڑی ریورس کرتے

ہوئے کہا۔ "تم نے اس کے گھر کا ایڈریس نہیں لیا تھا؟"

"نہیں عمیر! میں نے صرف اس کا سیل نمبر لیا تھا' ایڈریس لینے کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" ساہر روہانسی ہو گئی۔

عمیر کا پیر بے اختیار بریک پر جا پڑا۔

"اس کے آئی ڈی کارڈ کی فوٹو کاپی بھی لی تھی یا نہیں؟"

ساہر کا نفی میں ہلتا ہوا سر عمیر کے اعصاب پر کسی ہتھوڑے کی طرح لگا۔

"کس قدر احمق عورت ہو تم۔ حالات کتنے خراب ہیں۔ انسان سگے رشتوں پر بھروسا نہیں کر سکتا اور تم نے اٹھا کر ایک انجان بندے کو بیٹی کی ذمہ داری سونپ دی۔" وہ اتنی زور سے چلائے کہ ساہر کا دل کانپ گیا۔

"کیا کچھ نہیں کر سکتا' وہ اتنی چھوٹی سی بچی کے ساتھ۔"

"ایسے مت کہیں عمیر! پلیز مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" وہ رونے لگی تھی۔ عمیر کو اس پر ترس آیا لیکن وہ خود بہت پریشان تھے۔ اس پریشانی میں کیا کیا جا سکتا تھا۔

انہوں نے ساہر کو رونے دیا اور گاڑی پارکنگ سے نکال۔ مین روڈ پر آنے تک ان کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ ہدیہ کو تلاش کرنے کے لیے وہ جو کچھ کر سکتے تھے' انہوں نے ذہن میں ترتیب دینا شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

امی دیر تک تقی کے گلے لگ کر روتی رہیں۔ تقی سے ایک لفظ نہیں بولا گیا۔ انہیں ساتھ لگائے تھپکتا رہا بس۔

"آپ فکر مند نہ ہوں۔ ابا بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ میں ڈاکٹر سے بات کر کے آ رہا ہوں' وہ کہہ رہا ہے' جلد ہی ابا کو ہوش آ جائے گا۔" جب وہ رو رو کر تھک چکیں اور خود ہی اس کے کندھے سے سر اٹھا لیا تو اس نے نرمی سے کہا۔

تقی ایئرپورٹ سے سیدھا اسپتال گیا تھا پھر گھر آیا تھا۔

اس نے گھر آ کر کچھ نہیں کہا لیکن اتری ہوئی شکل سب بتا رہی تھی۔

"شفا!" امی نے چہرہ پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "بیٹا! تقی کے لیے کھانا گرم کرو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" تقی نے کہا۔

سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئے۔ بڑی سے بڑی بات بھی اس کی بھوک ختم نہیں کر پاتی تھی۔

"چائے۔" شفا نے کہنا چاہا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور جری کے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا۔

"میں اسپتال جا رہا ہوں۔"

"تھوڑا آرام کر لو تقی!" امی نے فکر مندی سے کہا

"ضرورت نہیں ہے۔ آج ابا کے پاس ہی رکوں گا۔" وہ اگلی کوئی بھی بات سنے بغیر گھر سے نکل گیا۔ امی گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔

ثمین کو بھی ڈاکٹر نے قریب کی تاریخ دے رکھی تھی۔ اسی رات اسے بھی اسپتال لے جانا پڑا تو تقی نے زبردستی رضی کو ثمین کے ساتھ بھجوا دیا۔ امی بھی اس کے ساتھ تھیں۔ اگلے روز جری اور شفا' تقی کے لیے کھانا لے کر اسپتال آئے۔ وہ آئی سی یو کے باہر ہی کھڑا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی اور مایوسی سے اٹی ہوئی صورت۔

شفا کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ تو ہمیشہ بڑا اپ ٹو ڈیٹ رہتا تھا۔ بڑا باغ و بہار لگتا اور اس وقت کتنا ویران لگ رہا تھا۔

"بھائی!" جری کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ان دونوں کو سامنے دیکھ کر جیسے گہری نیند سے جاگا۔

"ہم کھانا لائے ہیں آپ کے لیے۔" جری نے ہی کہا۔

"خوامخواہ زحمت کی یار! بھوک ہی نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

"کل سے تم نے کچھ نہیں کھایا۔ اب تو کھالو۔" یہ شفا تھی۔

"ڈاکٹر سے بات ہوئی آپ کی۔ کیا کہتے ہیں؟" جری بہت آس سے پوچھ رہا تھا۔ تقی نے اثبات میں سرہلایا لیکن اس کے انداز سے مایوسی ہی جھلکتی تھی۔

"اچھی امید ہے انہیں 'دعا کا کہہ رہے ہیں۔"

"یہی کہتے جارہے ہیں۔ دوائیاں کیوں نہیں بدلتے۔" جری روہانسا ہوگیا۔ "میں بات کرتا ہوں ڈاکٹر سے۔" وہ جذباتی پن سے دوسری طرف نکل گیا۔ تقی روکنے کا ارادہ کرتا ہی رہ گیا' پھر تھک کر کاریڈور میں نصب بینچ پر جا بیٹھا۔

شفا وہیں کھڑی اسے دیکھتی رہی 'پھر جا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"اتنی مایوسی اچھی بات نہیں ہے تقی! اللہ ہے ناں۔ وہ ابا کو ٹھیک کردے گا۔"

شفا نے نرمی سے کہا۔ تقی نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ اس نے تو ایک بار بھی نہیں کہا کہ وہ مایوس ہوگیا ہے لیکن شفا اس کے چہرے سے دل کا حال پہچان چکی تھی۔

"رونا چاہتے ہو تو رو لو۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔"

تقی کی آنکھوں میں نظر آتی سرخی دیکھ کر شفا نے آہستگی اور نرمی سے کہا۔

تقی کو اس کی اجازت کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایک جذباتی سہارا درکار ہوتا ہے ہر انسان کو۔ سو وہ چند لمحے ہی خود پر ضبط کرسکا پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

شفا خاموشی سے بینچ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ تقی روتا ہوا ذرا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیسی باغ و بہار شخصیت تھی اس کی۔ روتے ہوئے افسردہ بندے کو ہنساد یتا اور اب خود رو رہا تھا تو کیسا اجڑا ہوا ویران سا لگ رہا تھا۔

جب وہ جی بھر کر رو چکا تو اٹھ کر شیشے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ اندر ابا بالکل چپ چاپ ریسپیریٹر سے سانس لیتے دکھائی دے رہے تھے۔

"ابا ایک دفعہ آنکھیں کھول دیں تو میں انہیں بتاؤں گا وہ اس طرح خاموش بے بس لیٹے کتنے برے لگتے ہیں۔ میں انہیں بتاؤں گا 'وہ غصہ کرتے' زور زور سے بولتے' مجھے ڈانٹتے ہی اچھے لگتے ہیں۔ میں انہیں بتاؤں گا۔ وہ مجھ سے بات نہیں کرتے تھے تو مجھے کتنا برا لگتا تھا وہ اب بھی مجھے ڈانٹ لیں۔ جتنا دل چاہے مارلیں میں نہیں روکوں گا۔ میں میڈیا چھوڑ دوں گا۔ میں اسٹور چلا جایا کروں گا۔ میں۔۔۔ میں انہیں ضرور بتاؤں گا شفا! میں ان سے کتنی محبت کرتا ہوں۔"

وہ آئی سی یو کے شیشے سے پیشانی لگا کر بری طرح رو رہا تھا۔ شفا اسے دلاسا دینا چاہتی تھی لیکن۔

جب وہ دیر تک رو چکا تو واپس جا کر بینچ پر بیٹھ گیا۔ اپنا چہرہ صاف کر کے بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔

پھر شفا نے ہی اس خاموشی کو توڑا۔

"چلو کینٹین یا باہر لان میں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کھانا کھالو۔ مجھے اللہ کی رحمت پر پورا بھروسا ہے۔ ابا ٹھیک ہوجائیں گے۔ بس تم اپنی بات سے نہ مکرنا۔ یہ بتانا ضرور کہ تمہیں ان سے کتنی محبت ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے شفا!" تقی نے بوجھل آواز میں کہا۔

"بھوکے رہنے سے پریشانیاں ٹلتی ہیں نہ کم ہوتی ہیں۔ آزمائی ہوئی بات ہے۔ ایسا ہوتا ناتو ہمارے نکاح کے اگلے ہی دن ساہر بھابھی کی حقیقت عمیر بھائی کے سامنے آگئی ہوتی۔ چلو اٹھو اب۔"

اس نے ہاتھ پکڑ کر زبردستی تقی کو اٹھایا۔ تقی ساتھ کھنچتا چلا گیا۔

"میں تمہیں بتانا بھول گیا۔ روحیل مل گیا ہے۔"

شفا کو چلتے چلتے ٹھوکر لگی۔ "وہ۔۔۔ وہ کہاں مل گیا تمہیں؟"

"اس روز یہی بتانے کے لیے تو فون کیا تھا۔" پھر وہ اسے تفصیلات بتاتا چلا گیا۔

"لیکن وہ وہاں کیا کررہا تھا؟"

"ضمیر کا بوجھ کم کرنے گیا تھا۔ وہاں میں نے کہا فضول آدمی! اتنا ہی شفا کی زندگی خراب کرنے پر ضمیر تنگ کررہا تھا تو پاکستان آکر عمیر بھائی کو سب بتادیتے' یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔" تقی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "لیکن اب وہ پاکستان آنے کے لیے تیار ہے۔ تم بے فکر ہو جاؤ میں سب سنبھال لوں گا۔"

شفا نے فقط سر ہلا دیا۔ کہا کچھ نہیں۔ موقع بھی نہیں ملا۔ سامنے سے مہک آرہی تھی تک سک سے تیار۔ اونچی ہیل' ایک ہاتھ میں پھول۔

ان دونوں کو ساتھ دیکھ کر دور سے ہی اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے۔

"تمہارے لیے اتنی امپورٹنٹ میٹنگ چھوڑ کر آئی ہوں۔" کہا تقی سے تھا' گھورا شفا کو تھا۔

"شکریہ۔"

"اوہ کم آن۔" اس نے مسکرا کر کہا۔ "اب تمہارے فادر کی طبیعت کیسی ہے؟"

"آئی سی یو میں ہیں۔ ابھی تک ہوش نہیں آیا۔" تقی نے مایوسی سے بتایا۔

"تم فکر مت کرو تقی! وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔ پاپا کہہ رہے تھے' ضرورت ہو تو بتانا۔ وہ پاکستان کے بہترین ڈاکٹرز سے تمہارے فادر کا کیس ڈسکس کریں گے۔"

تقی نے آہستگی سے سر ہلا دیا۔

"یہ میں تمہارے فادر کے لیے لائی تھی۔" اس نے پھول تقی کو پکڑا دیے۔ "مجھے ذرا جلدی ہے تقی! میٹنگ کی ٹائمنگ میری وجہ سے بڑھائی گئی ہیں۔ کم سے کم اب تو وقت پر پہنچ جاؤں۔ تم مجھے باہر تک چھوڑنے نہیں آؤ گے؟" وہ جتنی عجلت میں آئی تھی' اتنی ہی عجلت میں واپس بھی جارہی تھی۔

تقی ایک لمحہ رکا' پھر پھول شفا کو پکڑا کر مہک کے ساتھ چل پڑا۔

مہک نے جاتے جاتے ایک عجیب سی نظر شفا پر ڈالی تھی۔

"اچھی بھلی شکل ہے اس کی۔ اگر چڑیلوں کی طرح دیکھنا چھوڑ دے تو اور خوبصورت لگے۔"

شفا نے اس کے جاتے ہی ایک گہری سانس بھر کر کہا اور پھولوں کی خوشبو سونگھتی واپس آئی سی یو کی طرف چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

کھانا ان تینوں نے کینٹین میں بیٹھ کر کھایا تھا۔ اگرچہ دل کسی کا بھی نہیں چاہ رہا تھا مگر کھالیا۔

"مجھے یاد آیا۔ آج تو تمہارا بھی کسی پرائیویٹ آرگنائزیشن میں انٹرویو تھا نا؟" چائے پیتے ہوئے تقی کو اچانک یاد آیا تھا۔

"ہاں تھا۔ لیکن میں نہیں گئی۔ ابا سے زیادہ کچھ امپورٹنٹ نہیں ہے۔ میرا کیریر بھی نہیں۔"

وہ سرسری انداز میں کہہ کر جری سے بات کرنے لگی لیکن تقی چائے پینا بھول گیا۔

شفا جانتی تھی' اسے کبھی نہ کبھی تقی کی زندگی سے الگ ہونا ہے اور مہک جانتی تھی' وہ عنقریب تقی کی زندگی میں شامل ہونے والی ہے۔

باتیں معمولی تھیں لیکن دونوں نے ہی اپنی ترجیحات واضح کردی تھیں۔

پہلی بار تقی کے ذہن میں مخمصے نے سر اٹھایا تھا۔

اسی شام انہیں دو خوش خبریاں ملیں۔ ابا کو ہوش آگیا اور رضی بیٹے کا باپ بن گیا۔

رضی ڈھیر ساری مٹھائی لے آیا۔ تقی اور جری نے اسپتال میں کوئی بندہ نہیں چھوڑا' جسے مٹھائی نہ کھلائی ہو۔

ابا کو آئی سی یو سے کمرے میں شفٹ کردیا لیکن ابھی زیادہ بات چیت کی اجازت نہیں تھی۔ شام تک ڈاکٹر نے بتایا کہ طبیعت اب بہتر ہے۔ دو دن تک ڈسچارج کردیں گے۔

☼ ☼ ☼

لودھی صاحب کی حالت بہت بہتر تھی لیکن ہوش میں آتے ہی انہیں پہلا خیال اپنے نالائق' نابکار بیٹے

کاہی آیا تھا۔
کیا سمجھتے رہے وہ اسے اور وہ کیا نکلا۔
شفا نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔ جب ساہر نے انہیں تقی کے بارے میں اطلاع دی تو انہیں وہ پہلا شخص ہونا چاہیے تھا' جو اس کا دفاع کرتا لیکن دل ہی دل میں وہ تسلیم کر چکے تھے کہ تقی ہمیشہ غلط کام ہی کرے گا۔
تب ہی انہیں ساہر کی بات کا فوراً" یقین آگیا تھا حالانکہ یہ وہی ساہر تھی' جو اپنی پسند سے شادی کرنے کی خاطر ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو گئی تھی۔ تقی ان کا خون تھا۔ انہوں نے کیسے سوچ لیا' ان کا خون ایسا برا کام بھی کر سکتا ہے۔
وہ ہمیشہ اس سے خفا رہتے۔ ہمیشہ نالاں رہتے۔ صرف اس لیے کیونکہ وہ ان کی سنتا نہیں تھا۔ ان کی بات ماننے سے پہلے منطق مانگتا تھا۔
صرف اتنی سی بات پر انہوں نے اس سے بیر باندھ لیا۔
لیکن یہ بھی سچ تھا کہ انہیں اس سے محبت تھی۔ بیٹا تھا ان کا۔ اپنے دل سے محبت کو کیسے نکال سکتے تھے۔
کاش انہوں نے اب تک جتنا ناروا سلوک اس سے روا رکھا۔ اس کی تلافی کر سکیں۔ اسے بتا سکیں کہ وہ بھی انہیں رضی اور جری کی طرح عزیز ہے لیکن۔۔۔
انہوں نے کمرے میں نظر ڈالی۔ سب ہی موجود تھے۔ ایک وہی نہیں تھا۔
دل چاہا پوچھ لیں لیکن۔۔۔
شفا نے ان کی تلاش کو بھانپ لیا اور چپکے سے باہر نکل آئی۔ تقی کاریڈور کی سیڑھیوں میں چائے کا ڈسپوزیبل کپ پکڑے بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور شرٹ کی آستینیں اس نے کہنیوں تک فولڈ کر رکھی تھیں۔ شفا ہنسی۔
خود کو ہیرو سمجھتا تھا اور اس وقت بھی ہیرو ہی بنا بیٹھا تھا۔
وہ آکر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ تقی ابا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پاس بیٹھتے دیکھ کر چند لمحے بے دھیانی میں اسے ہی دیکھتا رہا۔ پھر جیسے چونکا۔
"چائے پیو گی؟"
"ضرور۔" شفا نے کپ پکڑ لیا۔ وہ مستقل مسکرا رہی تھی۔
"سب لوگ اندر ابا کے پاس ہیں۔ تم کیوں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا کر یہاں بیٹھے ہو؟"
"ایسے ہی۔ کچھ سوچ رہا تھا۔" اس نے سرسری انداز میں کہا۔
"کیا سوچ رہے تھے؟"
تقی نے گردن موڑ کر پھر شفا کو دیکھا اب اسے کیا بتاتا۔ کیا سوچ رہا تھا' سو نفی میں سر ہلا دیا۔
"اچھا۔ چلو اندر چلو۔ جا کر ابا کو بتاؤ' تمہیں ان سے کتنی محبت ہے۔"
تقی جھینپ کر ہنسا اور سر جھٹک دیا۔
"جذباتی ہو کر ایک بات کہہ دی تھی۔ اب تو اسے بھول جاؤ۔ تم نے تو سیریس ہی لے لیا۔"
"تم بھی سیریس ہو جاؤ تقی! ابا کو جب تم یہ بتاؤ گے تو سوچو! انہیں خوشی ہو گی۔" شفا نے زور دے کر کہا۔
"یار! بتا تو دوں لیکن۔۔۔" وہ کشمکش کا شکار تھا۔ سر کھجانے لگا۔ "ابا مذاق اڑائیں گے۔" اس نے خدشہ اگل دیا۔
"مذاق کیوں اڑائیں گے؟" وہ حیران ہوئی۔
"انہیں جو مجھ سے محبت نہیں ہے۔"
"پاگل تو نہیں ہو تم۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کوئی باپ اپنے بیٹے سے محبت نہ کرے۔"
"انہوں نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔" اس نے بسور کر کہا۔
"اور پھر خود ہی واپس بھی لے آئے تھے۔" شفا نے ترنت کہا۔
"وہ میری وجہ سے واپس نہیں لائے تھے۔ تمہاری وجہ سے لائے تھے۔" تقی نے تلخی سے کہا۔
"بنے عقل مند ہو لیکن ہو نہیں۔" شفا چڑ کر بولی۔
"یہ بات تو کوئی بے وقوف بھی سمجھ سکتا ہے کہ ابا مجھے ڈھال بنا کر تمہیں ہی گھر لائے تھے۔ تمہیں گھر سے نکالتے ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو گا لیکن

واپس آنے کے لیے کیسے کہتے۔ یہ تو ان کی فطری ضد اور انا کے خلاف بات تھی' سو جب میں درمیان میں آئی تو وہ بھاگے چلے آئے۔ وہ چاہتے تھے کہ تم واپس آؤ' ورنہ مجھ سے ان کا رشتہ ہی کیا تھا۔ پھر جب تم نے گھر سے جانے کی بات کی تو انہوں نے اپنا گھر بھی ہمیں دے دیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے کوئی ٹھکانا میسر آئے اس لیے کہ تمہیں دردر بھٹکنا نہ پڑے۔ کوئی باپ اپنی محبت اور کیسے ظاہر کرے تقی!"
تقی اسے دیکھتا رہ گیا۔ بات تو ٹھیک تھی۔
"اچھا اب اٹھ بھی چکو۔ ایک تو تم دیر بہت لگاتے ہو۔"
شفا کے مسلسل اصرار پر وہ جھجکتے ہوئے اٹھ ہی گیا۔

☆ ☆ ☆

تقی اندر داخل ہوا۔ ابا بات کرنا بھول کر اسے دیکھنے لگے۔ بلکہ وہ کیا سب ہی اسے دیکھنے لگے۔
"اب۔۔۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" تقی نے ان کے پاؤں کی جانب کھڑے ہو کر جھجکتے ہوئے پوچھا۔
ابا اسے دیکھتے رہے پھر اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ قریب گیا تو اس کی طرف جھک کر رازداری سے بولے۔
"تمہاری ماں کو ابھی پتا نہیں ہے کہ تمہیں عنقریب بہترین اداکار کا ایوارڈ ملنے والا ہے۔ اسے بتانا بھی نہیں کیونکہ پھر وہ ضد کرے گی کہ تم اسے ساتھ لے کر جاؤ لیکن میں تمہیں صاف بتا رہا ہوں۔ تمہارے ساتھ میں ہی جاؤں گا باپ کا حق زیادہ ہوتا ہے۔"
تقی نے تعجب سے انہیں دیکھا۔ ہمیشہ کرخت دکھائی دینے والے چہرے پر شرارت اور محبت تھی۔ ان کا مافی الضمیر سمجھتے ہی تقی پر سرخوشی سی پھیل گئی تھی۔
"ابا!" وہ ننھے بچے کی طرح ان سے لپٹ گیا۔
اور بس اتنی سی بات تھی۔ کئی سالوں کے فاصلے خود بخود سمٹتے چلے گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

ساہر کا رو رو کر برا حال تھا۔ پورا دن گزر گیا۔ رات سرہانے کھڑی تھی اور ہدیہ کی کوئی خبر نہیں مل سکی تھی۔
"میری بچی نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ آپ کچھ کرتے کیوں نہیں ہیں عمیر!"
"اللہ سے دعا کرو ساہر! ہدیہ جہاں بھی ہو گی خیریت سے ہو گی۔" اس کی امی نے کہا تھا۔ وہ دوپہر سے خبر ملتے ہی اس کے پاس آگئی تھیں۔
عمیر کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا لیکن چونکہ مرد تھے' سو خود پر قابو رکھنا ان کی ذمہ داری ٹھہرا۔
"ہر طرف سے سارا شہر چھان مارا۔ اسپتال میں بھی دیکھ لیا۔ میں اب کہاں جاؤں اسے تلاش کرنے؟"
"نہیں۔ میں تھانے جا رہا ہوں۔ ہم سے غلطی ہوئی ہے ساہر! ہمیں پہلے ہی پولیس کی مدد لے لینا چاہیے تھی۔"
"لیکن پولیس کو بھی تو ہدیہ کو تلاش کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی سرا' کوئی سراغ چاہیے ہو گا۔ ہم وہ کہاں سے دیں گے۔ ہمیں تو اس وین والے کے نام کے سوا کچھ بھی نہیں معلوم۔" وہ اور شدومد سے رونے لگی۔
"تم گیٹ بند کرو۔ میں جا رہا ہوں۔" عمیر موبائل اور والٹ اٹھاتے عجلت میں باہر نکلے۔
"میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" ساہر نے عمیر سے کہا۔
"نہیں۔ پولیس اسٹیشن جانا مناسب نہیں۔ میں وحید کو ساتھ لے جاؤں گا۔"
عمیر نے اپنے دوست کا نام لے کر کہا اور زن سے گاڑی نکال لے گئے۔ ساہر نے بوجھل ہاتھوں سے گیٹ بند کر دیا۔
کیسی ویرانی سی پھیل گئی تھی ہر طرف۔ لان میں

ہدیہ کا جھولا اداس سا دکھائی دیتا تھا۔ جھولے کے پاس اس کے کھلونے بکھرے پڑے تھے۔ پتا نہیں کس حال میں ہوگی۔ کھانا کھایا ہوگا یا نہیں۔ پلے گروپ میں تو تھی۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے ساہر پر انحصار کرتی تھی۔ "یا اللہ! میری بچی کو اپنے حفظ و امان میں رکھنا۔"

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔

اندر آکر اس نے سوتے ہوئے عادل کو گود میں لے لیا۔ گود کو بیٹی میسر نہیں تھی۔ ایک انجان سا خدشہ ستا رہا تھا کہ کہیں عادل بھی نہ چھن جائے۔

جاء نماز پر بیٹھ کر دعا کرنے لگی۔ عادل گود میں پرسکون نہیں تھا تو اس کی کاٹ میں لٹا دیا اور کاٹ کو جائے نماز کے قریب گھسیٹ لیا۔

دونوں زانو کے گرد بازو باندھ کر گھٹنوں پر پیشانی ٹکا دی۔

دعا مانگتے ہوئے اچانک خیال آیا۔ ایک بار کسی کو کہتے سنا تھا۔ زندگی میں جب بھی کوئی پریشانی آتی ہے تو وہ یا تو اللہ کی طرف سے بندے کی آزمائش ہوتی ہے یا کسی غلطی کی سزا۔ وہ سوچنے لگی کیا یہ آزمائش ہے؟

"یا اللہ! اگر آزمائش ہے تو ٹال دے۔ ہم تیرے حقیر بندے ــــ اتنی سکت کہاں ہم میں کہ تیری آزمائشوں پر پورا اتر سکیں۔ رحم کردے۔ اور اگر سزا ہے تو معاف کردے.... میں نالائق' نادان کہیں انجانے میں کوئی بھول ہو گئی تو اسے میری بیٹی کے سامنے مت لانا۔"

یکایک ذہن میں ایک خیال آ گرا۔ پٹ سے آنکھیں کھل گئیں۔

نہیں ــــ انجانے میں نہیں.... اس نے جو بھی کیا تھا جان بوجھ کر کیا تھا۔ پاک باز عورت پر تہمت لگائی تھی۔ اسے بھائی کی نظروں میں ہی نہیں دنیا کی نظروں میں بھی گرا دیا تھا۔

شفا نے ایک بار نہیں کئی بار معافی مانگی تھی۔ وہ تھوڑی سی اعلا ظرف بن جاتی۔ تھوڑا سا دل بڑا کر لیتی۔ پچھلی باتیں بھول جاتی۔ گزرتا وقت ہر چیز پر گرد جما دیتا ہے لیکن وہ جان بوجھ کر ان یادوں کو جھاڑ پونچھ کر رکھتی رہی۔

اس نے دل میں ایک الاؤ روشن رکھا جس پر انتقام کا جذبہ ہولے ہولے سلگتا رہا۔ اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی تو عمیر کی محبت میں ہی بھول جاتی۔ کتنے لوگ تھے اسے سمجھانے والے۔ امی' تقی' ذوشمہ تک نے ڈھکے چھپے لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ جو تم کر رہی ہو' ٹھیک نہیں ہے اور اس نے کیا کیا؟ سب کے مخلصانہ مشوروں کو لات مار دی اور تو اور شفا کا ساتھ دینے کی پاداش میں تقی کو بھی نہیں بخشا۔

سو جب تم نے کسی کی پروا نہیں کی تو اب اللہ بھی تمہیں تمہارے کیے کا پھل دے رہا ہے۔ اللہ نے تو روحیل کی اصلیت دکھا کر بھی اشارہ دے دیا تھا۔ تم نے ہی عبرت نہ پکڑی۔ اب بھگتو۔ جب کسی کی بیٹی کو برباد کرتے دل نہ کانپا تو اب اپنی بیٹی کو برباد ہوتے بھی دیکھو!

وہ سجدے میں گر گئی۔ گڑگڑا کر دعا کرنے لگی۔ معافی مانگنے لگی۔ لیکن اللہ کا بھی اصول ہے۔ اس کے معاملات اس کے ساتھ' بندوں کے معاملات بندوں کے ساتھ۔

جب تک بندہ معاف نہ کرے اللہ بھی معاف نہیں کرتا ــــ وہ اللہ سے معافی مانگ سکتی ہے بندوں سے کیسے مانگے؟

شفا کے سامنے کیسے ہاتھ جوڑے؟

نہیں.... یہ تو ناممکن ہے۔

لیکن شفا معاف نہیں کرے گی تو اللہ بھی نہیں کرے گا پھر اس کی ہدیہ بھی نہیں ملے گی۔

وہ گھبرا گئی۔ مخمصے میں پڑ گئی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔

وہ صحیح معنوں میں بری پھنسی تھی۔

☼ ☼ ☼

لودھی صاحب کی بیماری نے تقی اور ان کے مابین حائل برف کو ہی نہیں پگھلایا تھا بلکہ چھوٹے بھائی اور ان کے درمیان ساہر کی پسند کی شادی کی وجہ سے آئی دراڑ کو بھی بھر دیا تھا۔ ہر رشتہ اپنی صحیح جگہ پر آ گیا تھا سوائے ساہر کے۔ اس بات کا دکھ اس کی امی کو تو بہت تھا۔ بیٹی سے مل کر آ رہی تھیں۔ اس کی بکھری ہوئی حالت دیکھی تو افسردہ بھی بہت تھیں۔

یہی سوچ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا بات ہے چچی! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" رضی نے انہیں آنسو پونچھتے دیکھ لیا تھا۔

"بیٹے! میں ساہر کے لیے بہت پریشان ہوں۔ ابھی اسی کے گھر سے آ رہی ہوں۔ اس کی بیٹی ہدیہ صبح اسکول گئی تھی لیکن واپس نہیں آئی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں چچی ــــ اتنی بڑی بات اور آپ اب بتا رہی ہیں؟" سب ہکا بکا رہ گئے تھے۔

"بیٹے! میں کیا بتاتی۔ تم سب بھائی صاحب اور بہن کی فکر میں تھے۔ میں ہدیہ کا بتا کر ایک نیا دفتر کھول دیتی' وہ بھی اس صورت میں جب کہ ساہر نے تم لوگوں سے خود بھی قطع تعلق اختیار کر رکھی ہے۔" وہ شرمندہ سی بول رہی تھیں۔

"اتنی پرانی بات کا حوالہ نہ دیں چچی! ابا اور ساہر کی بے جا ضد تھی ورنہ ہمیں تو کبھی بھی ساہر سے ملنے پر اعتراض نہیں ہوا ــــ" رضی نے کہا تھا۔

"رضی بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میرا خیال تھا۔ میرے غصے اور خفگی کی پروا کر کے وہ خود راضی ہو جائے گی اور نہیں تو شادی کے بعد ہی چھوٹی بن کر آ جاتی ــــ میں کتنا عرصہ ناراض رہ سکتا تھا لیکن وہ تو ضد میں مجھ سے بھی دو قدم آگے نکلی ــــ" ابا نے منہ بنا کر کہا تھا پھر تھوڑی دیر بعد دوبارہ بولے۔

"تم لوگوں کو بہن کے گھر جانا چاہیے۔ اسے مشکل وقت میں اکیلا مت چھوڑو.... بلکہ میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلتا ہوں۔" وہ پورے جسم کا زور لگا کر اٹھنا چاہتے تھے لیکن تقی نے زبردستی انہیں دوبارہ لٹا دیا۔

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے ابا! میں اور رضی جاتے ہیں.... جری تم یہیں رکو ــــ اور میں شفا کو بتاتا ہوں' وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گی۔"

وہ خود ہی فیصلہ کرتا کمرے سے نکل گیا۔ رضی جلدی جلدی کسی کو فون ملانے لگا۔

☼ ☼ ☼

ڈور بیل بجی تو اس نے بھاگ کر دروازہ کھول دیا۔

عمیر کا سر اور کندھے جھکے ہوئے تھے۔ ساہر نے ان کے عقب میں متلاشی نظریں دوڑائیں اور مایوسی سے پلٹ آئیں۔

"ہدیہ؟" اس نے آس سے پوچھا۔ عمیر نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

ساہر کو سامنے سے ہٹا کر وہ تھکے ہارے قدموں سے اندر آ گئے لیکن چند قدم چل کر ہی جیسے ان کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ گرنے کے انداز میں گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیے۔

"پہلے شفا چلی گئی اور اب ہدیہ.... اللہ مجھے کس بات کی سزا دے رہا ہے ساہر!" عمیر نے روتے ہوئے کہا۔ ساہر کے دل پر بھاری ضرب لگی۔

"یہ آپ کی نہیں میری سزا ہے عمیر میری غلطی کی پکڑ میری بیٹی سے ہو رہی ہے۔" وہ بھی ان کے ساتھ رونے لگی تھی۔ وہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ اس نے طے نہیں کیا تھا کہ حقیقت بتائے گی یا نہیں لیکن عمیر کو روتے دیکھ کر خود بخود زبان سے لفظ نکلتے چلے گئے۔

عمیر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

ساہر کی عجیب حالت ہو گئی۔ اس نے ایک پاگل پن کی سی کیفیت میں عمیر کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"مجھے پتا ہے عمیر! مجھ سے بہت بہت بڑی غلطیاں ہوئی ہیں لیکن ــــ لیکن وہ واقعی ایک پاگل پن تھا۔"

عمیر کے سر پر جیسے کوئی پہاڑ آن گرا تھا۔ ان کی چھٹی حس بتا رہی تھی۔ بات کوئی معمولی نہیں۔ انہوں نے ساہر کے بندھے ہوئے ہاتھ کھول دیے۔

"پہیلیاں مت بجھاؤ ساہر! مجھے بتاؤ کیا بات ہے۔"

اور وہ ــــ ناعاقبت اندیش لڑکی ــــ انہیں سب کچھ بتاتی چلی گئی۔ اپنی ہر غلطی کا اعتراف ان کے سامنے رکھتی چلی گئی۔

"شفا کی کوئی غلطی نہیں تھی۔ میں ہی ہمیشہ اس کے بارے میں آپ سے غلط بیانی کرتی تھی لیکن یہ ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا عمیر! یہ تب سے شروع ہوا' جب آپ نے شفا کے جھوٹ پر یقین کرکے مجھ پر ہاتھ اٹھایا تھا۔۔۔ آپ کو پتا ہے' آپ کے ان دو تھپڑوں نے مجھ سے میری فطرت کی اچھائی چھین لی۔ مجھے میری نیک نیتی سے خالی کر دیا۔ آپ نے مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ اپنی بہن کے لیے آپ نے میری محبت کی بھی پروا نہیں کی تب میں نے تہیہ کیا کہ اب میں شفا کو آپ کی نظروں میں گرادوں گی۔ اسے اتنا خوار کروں گی کہ وہ نظریں ہی نہ اٹھا سکے۔۔۔ میں اسی لیے آپ سے جھوٹ بول دیتی تھی۔ شفا کو بار بار میں آپ کے خلاف جانے پر اکساتی پھر آپ کے کان بھرتی۔ آپ کو یاد ہے شفا آپ کی اجازت کے بغیر مری چلی گئی تھی؟ اس لیے کیونکہ میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ آپ نے اسے جانے کی اجازت دے دی ہے۔

شفا مجھ سے کبھی بدتمیزی نہیں کرتی تھی عمیر! میں آپ سے جھوٹ بولتی تھی تاکہ وہ آپ کی نظروں میں گر جائے۔

اس نے کبھی روحیل میں دلچسپی نہیں لی۔ وہ سب بھی میرا بنایا ہوا کھیل تھا۔ میں نے روحیل کو اکسایا کہ وہ شفا کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ روحیل نے آپ کو جو تصویریں بھجوائی تھیں۔ وہ میں نے ہی اسے دی تھیں اور۔۔۔ اور چھت پر بھی شفا کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔۔۔ تایا جی کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ روحیل کے ساتھ۔۔۔ میں تھی۔ پھر میں ثمر کے گھر کی چھت پر کود گئی اور روحیل بھاگ گیا۔۔۔ میں جانتی تھی۔ شفا بے قصور ہے لیکن جب سب لوگ اسے قصوروار ٹھہرا رہے تھے تو میں جان بوجھ کر خاموش رہی۔۔۔ میں چاہتی تھی۔ وہ آپ کی زندگی سے نکل جائے۔ اس گھر سے چلی جائے۔ میری زندگی اس کے بغیر زیادہ پرسکون ہو جائے گی مگر۔ مگر پھر بیچ میں تقی آ گیا۔ وہ بھی ساری حقیقت جان چکا تھا۔ وہ مجھے سمجھاتا رہا۔ منع کرتا رہا کہ ایسا کام نہ کروں اس نے مجھے دھمکی دی کہ وہ آپ کو ساری حقیقت بتا دے گا تو میں نے روحیل کو بلوا لیا۔ لیکن تقی پھر بیچ میں آ گیا۔ اور وہ اس ساری کہانی کا حصہ بن گیا۔ میں نے غصے میں مہک کو بھی فون کرکے بتا دیا۔ آپ حیران تھے نا کہ تقی اور شفا کے نکاح کی خبر تایا جان تک کیسے پہنچ گئی۔۔۔ انہیں بھی میں نے بتایا تھا عمیر! میں نے ان سے کہا تقی نے شفا کے ساتھ۔۔۔ دست درازی۔۔۔ کی کوشش کی۔"

وہ بول رہی تھی اور بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"میں شفا سے انتقام میں اتنی اندھی ہو گئی تھی عمیر! کہ میں نے کسی کو بھی نہیں چھوڑا۔ میں نے سب کو برباد کر دیا۔"

وہ ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر رو رہی تھی۔

عمیر گم صم' ہکا بکا بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے۔۔۔ بولنا ہی بھول گئے تھے۔۔۔ رونا بھول گئے تھے۔

پھر وہ آہستہ سے اٹھے اور اندر کی طرف چلے گئے۔ ساہر کا خیال تھا۔ وہ اسے لعنت ملامت کریں گے۔ ماریں گے لیکن وہ تو بالکل خاموش ہو گئے تھے۔

وہ تیزی سے اٹھ کر ان کے پیچھے دوڑی۔

"مجھے معاف کر دیں عمیر! مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے لیکن اپنی بہن کی خاطر مجھے معاف کر دیں۔"

"شفا مجھے بتاتی تھی کہ تم جھوٹ بولتی ہو لیکن۔۔۔ میں نے کبھی اس کی بات نہیں مانی۔" عمیر نے کہا۔

"عمیر!" اس نے عمیر کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

عمیر نے اس کا ہاتھ ہٹا دیا۔

"میں تمہاری خاطر اسے ڈانٹتا تھا۔ میں نے کبھی اس سے اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ میں اس پر چلانے لگا۔ میں نے اس کا اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے سوچا۔۔۔ ساہر ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ میری ساہر اتنی بری کیسے ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ میں نے اسے گھر سے نکال کر ثابت کر دیا کہ وہی غلط ہے۔ وہی گنہگار ہے۔ کبھی مڑ کر اس کی خبر بھی نہیں لی۔ زندہ ہے کہ مر گئی۔ خوش بھی ہے یا نہیں۔۔۔ یہ تم نے کیا کیا۔ ساہر! شفا کو میری نظروں سے گراتے گراتے تم نے تو مجھے خود سے نظریں ملانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ میں نے کیوں کی تم سے محبت۔۔۔ تم سے محبت۔ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔"

انہوں نے اسے بازو سے پکڑ کر سامنے سے ہٹایا اور کمرے میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔ ساہر کو چند منٹ بعد جیسے ہوش آیا تھا اور ہوش آتے ہی وہ تیزی سے بند دروازہ کھولنے لگی لیکن دروازہ اندر سے لاک کیا جا چکا تھا۔ ساہر نے ہراساں ہو کر ناب کو بار بار گھمایا اور مزید خوف زدہ ہو کر دروازہ دھڑ دھڑانے لگی۔

"عمیر۔۔۔ عمیر۔۔۔ عمیر۔۔۔ پلیز دروازہ کھولیں۔"

وہ رو رہی تھی اور زور زور سے دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اس کے شور سے ڈر کر عادل جاگ گیا تھا اور رونے لگا تھا۔ ساہر نے بھاگ کر اسے گود میں اٹھا لیا۔

وہ مزید کچھ دیر دروازہ بجاتی رہی اور آوازیں دے کر عمیر کی منتیں کرتی رہی کہ دروازہ کھول دیں لیکن دروازہ کھولنا تو دور کی بات' عمیر کی اندر سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔

خدشات ساہر کے سر پر کسی آسیب کی طرح منڈلانے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

دروازہ ساہر نے ہی کھولا تھا۔ شفا سارے گلے شکوے ایک طرف رکھ کر اس سے لپٹ گئی۔

"آپ پریشان نہ ہوں بھابھی! اللہ نے چاہا تو ہدیہ یقیناً "خیریت سے ہوگی۔"

"میرا وعدہ ہے تمہارا بھائی ہدیہ کو کہیں سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔" تقی چھوٹا تھا لیکن بڑھ کر بڑے بھائیوں سے انداز میں شفقت سے اس کا سر تھپتھپایا۔

ساہر آنسو بھری آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھ کر رہ گئی۔

کس دنیا کے باسی تھے یہ دونوں۔ وہ اس کا دکھ بانٹنے بھاگے چلے آئے تھے۔ یہ بھول گئے تھے کہ ساہر نے ان دونوں کے ساتھ کیا کیا تھا۔ یاد رکھا تو بس یہ کہ ساہر کو غم لاحق ہے۔

اس کا پچھتاوا اور بڑھ گیا۔ شرمساری سے گردن جھک گئی۔ لیکن اس کے زار و قطار بہتے آنسوؤں نے ان سب کو وسوسوں کا شکار کر دیا تھا۔

"ساہر! تم اتنا کیوں رو رہی ہو۔ ہدیہ کی کوئی خبر۔" اس کی امی نے کانپتی آواز میں بڑھ کر پوچھا تھا۔

"میں نے عمیر کو سب کچھ بتا دیا ہے امی! سب کچھ۔ یہ کہ شفا کا کوئی قصور نہیں تھا۔ روحیل کے ساتھ چھت پر میں تھی۔ اور یہ کہ میں ان سے جھوٹ بولتی رہی۔ شفا کے بارے میں انہیں گمراہ کرتی۔ امی! عمیر نے خود کو کمرے میں بند کر لیا ہے۔ وہ دروازہ نہیں کھول رہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے کوئی جواب بھی نہیں دے رہے۔ تم دروازہ کھٹکھٹاؤ شفا! تمہاری آواز سن کر وہ ضرور دروازہ کھول دیں گے۔"

اس نے روتے ہوئے التجا آمیز لہجے میں کہا تھا۔

وہ سب تیزی سے اندر کی جانب لپکے۔ تقی نے فوراً" دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔

"عمیر بھائی! پلیز دروازہ کھولیں۔" شفا بھی اسے آوازیں دے رہی تھی لیکن جب کئی بار کی کوشش سے بھی دروازہ نہیں کھلا تو رضی نے پریشان ہو کر دروازہ توڑنے کا مشورہ دیا۔

ابھی وہ دونوں اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ معاً" دروازہ کھٹاک سے کھل گیا۔

عمیر کو سلامت دیکھ کر سب نے ہی سکون کا سانس لیا تھا لیکن عمیر نے جیسے کسی کو بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف شفا کو دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے آگے بڑھ کر زور سے اسے بھینچ لیا تھا۔ یہ ایک مکمل منظر تھا جس کے کینوس کو ساہر نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے خراب کر دیا تھا۔ اب سب کچھ اپنی جگہ واپس آ چکا تھا۔

اس کا سر شرمساری سے کچھ اور جھک گیا۔ وہ بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

امتل عزیز شہزاد

بارش روٹھ بھی جائے

"صبح سے ہوتی کن من نے رات ہوتے ہی اچانک موسلا دھار بلکہ خوفناک صورت اختیار کرلی تھی۔ گہرے سیاہ بادل لگتا تھا سارے کے سارے آج ہی برس کرہی والیں ہوجائیں گے۔ برسات کی تیز چبھتی بوچھاڑنے پرندوں کو بلاوقت بیدار کررکھا تھا۔ بادلوں کے گرجنے اور بجلی کے کڑکنے کی آواز کے علاوہ فضا میں وقفے وقفے سے کسی نہ کسی پریشان حال پرندکی بے چاری سی آواز بھی سنائی پڑرہی تھی۔ چاروں جانب ہُو کا عالم تھا۔

ناولٹ
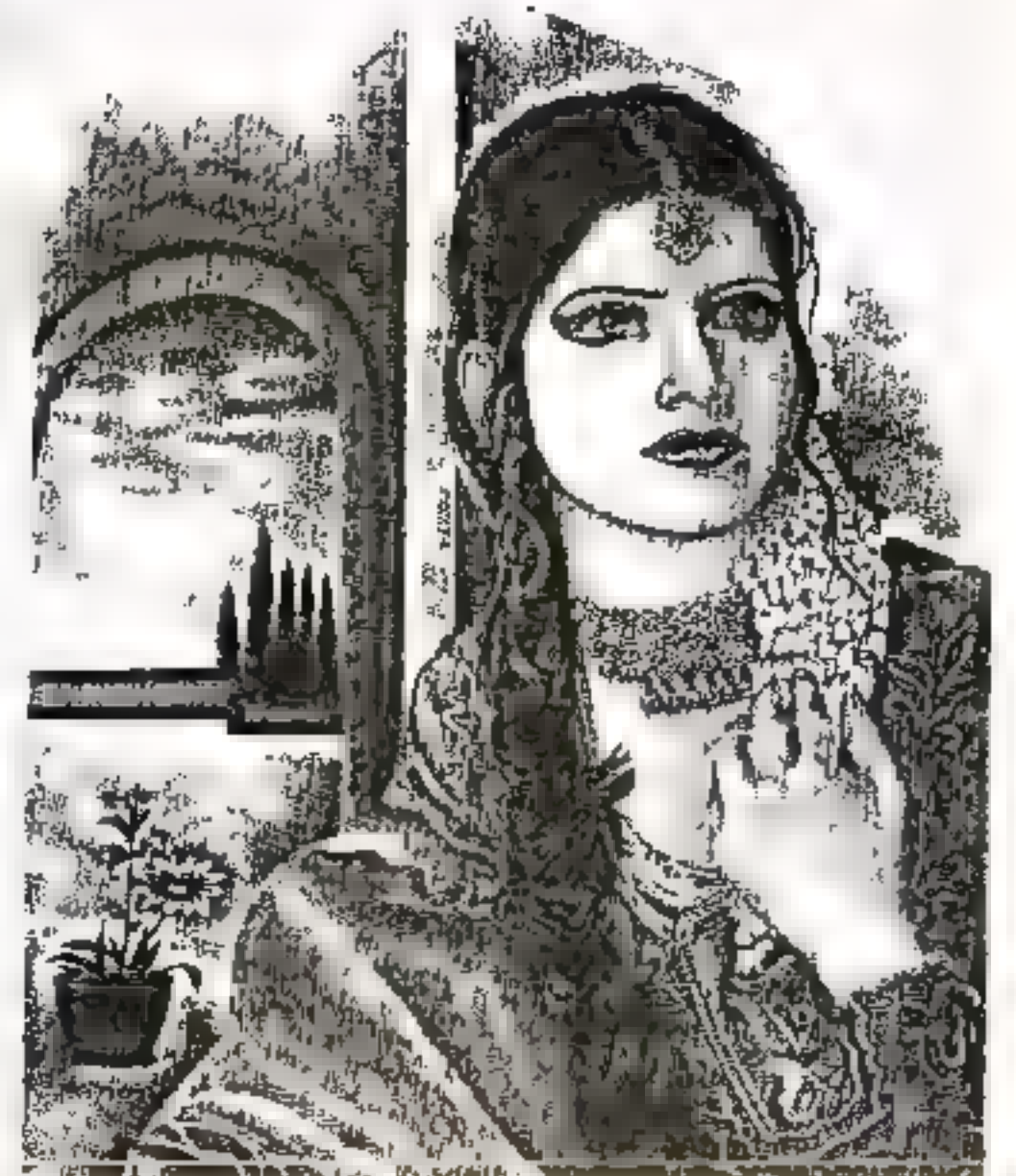
شہر کے متعدد علاقے اندھیرے میں ڈوب گئے" جگہ جگہ کئی فٹ پانی کھڑا ہوگیا۔ بجلی کے تار ٹوٹنے سے کہیں کرنٹ پھیل گیا' کسی غریب پر سال خوردہ درخت گرپڑا۔

کچی دیوار کچی چھت گرنے سے کئی جانیں لقمہ اجل بن گئیں۔"

نیوز کاسٹر طرح طرح کی اندوہناک خبریں فرفر سنا کر اب "ملتے ہیں کچھ دیر بعد تفصیلات کے ساتھ" کا مژدہ مسکراتے ہوئے سنا کر کمرشلز کی طرف بڑھ گئی۔

"لگتا ہے ہر نقصان غریب کے نام لکھ دیا گیا ہے۔" ماہ نور نے سر جھٹک کر تاسف سے سوچا اور ٹی وی کی آواز کم ـــــ کرکے ایک مرتبہ پھر اپنے شوہر شہباز خان زادہ جو کہ ایک کامیاب ترین بزنس مین تھے کے نمبر ڈائل کیے وہاں ہنوز پاور آف کا میسج تھا۔ ان کے پاس دو کانٹیکٹ نمبر تھے۔ ایک کاروباری دوسرا ذاتی گو کہ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنا کاروباری نمبر مخصوص اوقات میں استعمال کرنے کے بعد بند کردیتے تھے مگر اس نے پریشانی کے پیش نظر دونوں نمبر ہی ڈائل کرکے بار بار دیکھ لیے تھے مگر نتیجہ بے سود۔

وہ پچھلے دو گھنٹوں سے ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی اپنے شوہر کے انتظار میں محو تھی۔ گو کہ وہ ہائی کلاس سے متعلق تھی' مگر اپنے شوہر کی خواہش کے مطابق روزانہ نک سک سے تیار ہوکر وہ ڈنر پر اس کا یونہی انتظار کیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ کافی پنک اور میرون ڈیزائنر لان کا سوٹ جس پر سفید ریشم سے

ہلکی سی کڑھائی کی گئی تھی زیب تن کیے کانوں میں یاقوت اور ننھے ننھے سے ہیرے جڑے وہ ٹاپس پہنے جو اس کا شوہر اٹلی سے اس کے لیے لایا تھا' ہونٹوں کو نیچرل پنک سے رنگے کالے سیاہ سیدھے شانوں سے نیچے تک آتے بالوں کی ڈھیلی سی چٹیاں سائیڈ پر ڈالے ازحد پریشان سی بیٹھی تھی۔

وال کلاک نے ایک بجنے کا اعلان کیا۔ اس کی فکر حد سے سوا ہو گئی۔ وہ صوفے سے اٹھ کر لان کی طرف کھلنے والی شیشے کی سلائیڈز جو کہ ہوا کے جھکڑوں سے ہولے ہولے لرز رہی تھیں' کی جانب آئی اور متفکر سی اپنے خوب صورت لان جو کہ اب تالاب کا منظر پیش کر رہا تھا' دیکھنے لگی۔

"کہاں رہ گئے ہیں آپ شہباز! مجھے فکر ہو رہی ہے۔" اور یہ فکرمندی اس کے مضطرب وجود سے بھی جھلک رہی تھی۔

"بیگم صاحب! یہ دیکھیں یہ وہاں صوفے کے پاس گرا پڑا تھا۔" وہ اپنی کل وقتی مضبوط ہاتھ پیر والی ملازمہ خیری کی آواز پر چونک کر پلٹی۔

"کیا ہے؟" اس نے خیری کی کھردری ہتھیلی کو دیکھا۔

"آپ کا بندہ۔" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"اوہ!" اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے دائیں کان کی لو کی جانب بڑھا وہ خالی تھی۔

"تلاوہ... لگتا ہے اس کا لاک ڈھیلا ہو گیا۔" ماہ نور نے اس کے ہاتھ سے بندہ لیا اور ایک مرتبہ پھر پہن لیا۔

خیری اسے کہنا چاہتی تھی کہ وہ اسے اتار کر رکھ دے مبادا پھر گر کر کھو جائے اور کھوئی ہوئی چیزیں دوبارہ ملا نہیں کرتیں' مگر وہ نوکر تھی اور کسی بھی طرح کا مشورہ دینا اس کے فرائض منصبی سے خارج تھا یہ بات اسے پہلے دن ہی سمجھا دی گئی تھی۔

"بیگم صاحب۔" وہ کچھ جھجک کر بولی۔ "وہ میں کہہ رہی تھی کہ... وہ جی اب تو ایک بج گیا ہے۔"

"ہاں... ہاں تم سو جاؤ' میں کر لوں گی سب۔" ماہ نور نے اس کی ادھوری بات سے پورا مفہوم اخذ کرتے ہوئے اسے اجازت دی تو وہ مشکور نظروں سے اسے دیکھتی ہوئی "اللہ حافظ" کہہ کر کوٹھی کی پچھلی جانب بنے سرونٹ کوارٹرز میں چلی گئی۔

ڈائننگ ٹیبل پر برتن سمیت پورا کھانا چنا ہوا تھا۔ صرف اس ٹھنڈے بخ ہوتے کھانے کو اٹھا کر بس گرم کرنا تھا۔ اتنا تو وہ کر ہی سکتی تھی۔

اسے انتظار کرنا ہمیشہ ہی برا لگتا تھا مگر کیا کیا جائے کہ یہ لفظ اس کی پوری زندگی پر محیط ہو گیا تھا۔ اب سوا ایک بج رہا تھا اور اس کی ٹانگیں لاؤنج کے چکر کاٹ کاٹ کر اینٹھ گئی تھیں تب ہی مین گیٹ کھلا اور اس کے شوہر کی سفید مرسڈیز ڈرائیو وے سے اندر آتی دکھائی رہی۔

"تھینک گاڈ!" اس کے احمریں لبوں سے بے ساختہ کلمہ شکر نکلا۔ اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر گویا اتنی دیر جھیلی گئی ٹینشن زائل کرنے کی کوشش کی اور پانی کا گلاس لینے کے لیے کچن کی جانب گئی۔ منرل واٹر سے بلوریں گلاس بھر کر جس لمحے وہ لوٹی شہباز خان شیشے کا بھاری سفید دروازہ دھکیل کر اندر کی جانب بڑھ رہا تھا۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ ہی رہی تھی کہ اسے ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ وہ تنہا نہیں تھا۔

اس کے ساتھ جو کوئی بھی تھا ہرگز ایسا نہیں تھا کہ اسے نظر انداز کیا جا سکے۔

اونچا لمبا گورا چٹا بلیو پینٹ اور گرے شرٹ میں ملبوس' ہاتھوں میں بریف کیس اور کوٹ' گھنے سیاہ مخمل بھیگے ہوئے بال اور چہرے پر چھائی تھکاوٹ اور پریشانی کے باوجود بھی وہ جو کوئی بھی تھا بہت شان دار تھا۔ اس کے قدم بھی اندر آتے ہوئے ٹھہر سے گئے تھے۔ تب ہی مڑ کر شہباز نے اس سے کہا۔

"ارے اندر آیئے حمدان صدیقی صاحب! رک کیوں گئے؟" پھر وہ حیران پریشان کھڑی ماہ نور کی جانب متوجہ ہوا۔

"کیا ہوا ماہ!" وہ ہمیشہ اسے ماہ پکارتا تھا محبت سے۔

"آیئے ہمارے مہمان سے ملیے بلکہ ایسا کیجیے تعارف کی رسم کچھ دیر بعد کے لیے اٹھا رکھتے ہیں فی الفور انہیں فریش ہو کر خشک کپڑے پہننے کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ گیسٹ روم کھلوایئے اور خیری سے کہیں کہ میرا کوئی آرام دہ شلوار سوٹ انہیں لا دے یہ بے چارے کافی دیر سے بے آرام ہیں۔"

خیری تو سونے جا چکی تھی۔ یہ سب کام اسے ہی کرنے پڑے۔

جب تک اس نے کھانا گرم کیا۔ شہباز اور وہ اپنے بیڈ روم سے فریش ہو کر آرام دہ ٹراؤزر اور ہلکی ٹی شرٹ میں ملبوس ڈائننگ روم میں چلے آئے۔

"ہو گیا کھانا گرم۔ ارے آپ کیوں کر رہی ہیں۔ یہ خیری کہاں ہے؟" شہباز نے اچانک ہی دھیان آنے پر پوچھا۔

"خیری یہاں نوکرانی ہے اس کے بھی کچھ ڈیوٹی آورز ہیں' آپ کی بیوی نہیں ہے کہ چوبیس گھنٹے خدمت پر مامور رہے۔" وہ کوفتوں کا ڈونگا میز پر رکھتے ہوئے کٹیلے لہجے میں بولی۔ وہ جو سلاد کی پلیٹ میں سے کھیرا اٹھا رہا تھا یک دم کھل کر ہنس پڑا۔

"لگتا ہے کام کر کر کے تھک گئی آج میری جان۔" وہ میٹھی نظروں سے اسے دیکھتا ہوا اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کس نے کہا تھا خیری کو جانے دو۔ جگائے رکھتیں اسے۔" اب وہ جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیل رہا تھا۔

"وہ بھی انسان ہے مشین نہیں اور اسے چھوڑیں یہ بتائیں یہ آپ کسے لیے آ گئے ہیں اپنے ساتھ۔" وہ تشویش زدہ لہجے میں بولتی ہوئی اس کی نزدیکی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"بتاتا ہوں یار پہلے کھانا تو کھانے دو۔" اس نے ٹوکا۔ "کب سے بڑی زوردار قسم کی بھوک لگ رہی تھی' مگر بھلا ہو کراچی کی سڑکیں بنانے والوں کا پون گھنٹے کا راستہ بارش کی وجہ سے دو گھنٹوں پر محیط ہو گیا۔"

"نہیں تو کبھی بزنس ڈنر پہ گئے ہیں۔ ڈنر کر ہی لیا ہو گا۔" اس نے کٹلری اسٹینڈ قریب رکھتے ہوئے کہا۔ انداز نروٹھا سا تھا۔

"ایسا کیوں سمجھ لیا میری بیگم نے۔" وہ اس کی ناراضی بھانپ گیا تھا۔ ماہ نور کو انتظار کرنے سے نفرت تھی اور یقیناً "آج نا چاہتے ہوئے بھی شہباز نے اسے خوب انتظار کروایا تھا۔

"آپ تو جانتی ہیں بندہ بے چارہ آپ کے ہاتھ کا ذائقہ چکھنے کے بعد کہیں کا نہ رہا۔ کہیں بھی جائے یہ ہرجائی لوٹ کر آپ کے ہاتھ کا کھانا ہی کھاتا ہے' سچ سچ بتاؤ کیا ڈالتی ہو کھانوں میں کہ جی چاہتا ہے تمہارے یہ گورے گورے ہاتھ چوم لوں۔" اس نے ماہ نور کا سیدھا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

وہ ہنستے ہوئے ارے ارے کرتی رہ گئی۔ یہ سچ تھا اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ تھا۔ یہ بھی سچ تھا شادی سے قبل اسے حقیقتاً "انڈا تک فرائی کرنا نہیں آتا تھا۔ میکے میں نوکروں کی فوج تھی۔ فوج تو یہاں پر بھی تھی مگر شہباز کی دادی کے زمانے سے یہ اصول چلا آرہا تھا کہ رات کی ہانڈی گھر کی مالکن ہی بناتی تھی ملازمہ کے ساتھ مل کر۔ اس کے سسرال والے امیر کبیر مگر روایت پسند لوگ تھے۔ اسے بھی اس روایت کی پاسداری کرنی پڑی۔

تب ہی ڈائننگ روم کے داخلی دروازے سے کھنکھارنے کی آواز آئی۔ شہباز نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے بھی مسکراتے چہرے پر سنجیدگی کا غلاف چڑھا لیا۔

"آجائیں جناب۔" شہباز نے خوش دلی سے ہانک لگائی۔ حمدان صدیقی' شہباز کے ہلکے بادامی شلوار سوٹ میں نکھرا ستھرا سامنے کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کی ساحر آنکھیں اور ناک بے تحاشہ سرخ ہو رہی تھی۔

"چلیے شروع ہو جایئے ہم آپ کے ہی منتظر تھے۔" شہباز نے اس کے آگے مختلف ڈونگے رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ کوفتے لیجیے۔ ماہ بڑے مزے کے بناتی ہیں۔"

شہباز نے اپنی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں شکریہ مجھے کوفتے پسند نہیں"۔ اس نے نرمی سے انکار کرکے فرائیڈ رائس کی ڈش اپنے آگے کھسکائی۔

"پسند تو ہماری بیگم کو بھی نہیں ہیں مگر ہمارے لئے بنادیتی ہیں مجھے بہت پسند ہیں"۔ وہ رغبت سے کھا رہا تھا۔

حمدان نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھا کر ماہ نور کی جانب دیکھا۔ وہ تھوڑے سے چاول پلیٹ میں نکالے گویا چاولوں سے کھیل رہی تھی۔ حمدان نے تھوڑے چاول اپنے پلیٹ میں نکالے اور بے دلی سے کھانے لگا۔ تبھی ماہ نور نے اچٹتی سی نگاہ اس اجنبی پر ڈالی اسے اس کی ناک بے تحاشہ سرخ محسوس ہوئی۔

"ارے" یکدم شہباز نے چونک کر اس کی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ "یہ آپ کھا رہے ہیں یا مذاق کررہے ہیں؟ اپنا گھر سمجھیے صاحب! بے تکلفی سے کھائیے۔"

"میرے خیال سے ان کی طبیعت ناساز ہے۔ بارش میں بھیگے ہوئے بھی تو تھے۔ ایسا کیجئے آپ چاول بے شک مت کھائیے یہ کباب اور چپاتی لے لیجئے"۔ ماہ نور نے کباب اس کی طرف بڑھائے۔

"جی ایسی کوئی بات نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں۔" بات کے اختتام پر اسے زوردار قسم کی چھینک آئی جسے اس نے جیب سے رومال نکال کر روکنا چاہا۔

"دیکھا ہماری بیگم کی زیرک نگاہی فوراً" بھانپ گئیں کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے اب ایسا کیجئے واقعی چاول رہنے دیں کباب ہی کھائیے کہیں خدانخواستہ طبیعت مزید بگڑ نہ جائے" شہباز نے اپنی پلیٹ میں فرائیڈ رائس ڈالتے ہوئے کہا۔ اس نے چپ چاپ تعمیل کی مگر چند ہی لقمے لینے کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔

"ارے کیا ہوا جناب ڈنر پسند نہیں آیا۔" شہباز اب نیپکن سے ہاتھ صاف کررہا تھا۔ ماہ نور بچا کھانا فریج میں رکھنے لگی۔ "ایسی بات نہیں بس سارا بدن ٹوٹتا محسوس ہورہا ہے سب بے آرامی سی محسوس کررہا ہوں

میں۔" اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے کہا۔

"ارے خیریت تو ہے جناب! اگر اس شلوار سوٹ میں آرام نہیں مل رہا تو دوسری منگوادوں ویسے بخدا لگتا ہے کہ جیسے آپ کا اپنا ہی سوٹ ہو۔" شہباز واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ان دونوں کا قد بُت ڈیل ڈول ایک سا ہی تھا تقریباً"۔

"کچھ چیزیں واقعی اپنی لگتی ہیں مگر ہوتی نہیں۔" وہ گہرے لہجے میں بولا۔ شہباز نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"آیئے لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں' ماہ! اچھی سی کافی اور حمدان صاحب کے لئے فلو کی ٹیبلٹ لیتی آؤ۔"

جس وقت وہ تین کپ کافی لے کر لاؤنج میں آئی دیوار گیر گھڑی رات کے سوا دو بجا رہی تھی۔

"وہ تو شکر کیجئے جناب کہ کل سنڈے ہے اگر ورکنگ ڈے ہوتا تو ہماری بیگم ابھی تک نہ صرف اپنی آدھی نیند لے چکی ہوتیں بلکہ ہم ان کی ہاتھ کی بنی ذائقے دار کافی سے بھی محروم ہوجاتے" شہباز نے ہنستے ہوئے اپنا کپ اٹھایا۔

وہ بھی جواباً" مسکراتی ہوئی اپنا کپ لے کر شہباز کے برابر میں ٹک کر بولی۔

"فلو اور بخار کی ٹیبلٹ اور پانی" اس نے حمدان کے سامنے رکھی چھوٹی سی ٹرے کی جانب اشارہ کیا۔ "پہلے آپ دوائی لے لیں۔ تھوڑی دیر میں طبیعت سنبھل جائے گی۔"

پتا نہیں کیوں اس کے جبڑے یکدم بھنچ سے گئے۔

"آپ شاید جانتی نہیں ہیں۔ کچھ لوگوں کو فلو کی ٹیبلٹ سے الرجی ہوا کرتی ہے۔ مجھے بھی ہے۔ میں فلو ہوجانے پر جوشاندہ استعمال کرتا ہوں"۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"اوہ" وہ پشیمان دکھائی دینے لگی۔ "تب پھر آپ یہ بخار کی ٹیبلٹ لے لیں' میں فلو کے لئے جوشاندہ بنا لاتی ہوں" وہ اٹھنے لگی۔

"ارے نہیں۔ آپ زحمت مت کیجئے۔ آرام سے کافی پیئیں" اس نے ٹوکا۔

"زحمت کیسی حمدان! آپ ہمیں شرمندہ کررہے ہیں آپ ہمارے مہمان ہیں سب سے بڑھ کر اس شہر میں اجنبی ہیں آپ کو بروقت ٹریٹمنٹ نہ دی گئی تو خدانخواستہ آپ کی طبیعت بگڑ بھی سکتی ہے"۔ اب کی بار شہباز متانت سے گویا ہوا۔

"آپ چاہیں تو لینڈ لائن سے اپنی خیریت کی اطلاع اپنی فیملی کو دے سکتے ہیں ویسے بھی اسٹیٹس میں تو ابھی دن ہی نکلا ہوا ہوگا"۔ شہباز نے مزید کہا۔

"یہ اسٹیٹس میں رہتے ہیں؟" ماہ نور نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"ہاں بھئی' ہاشمی گروپ آف کمپنیز کے بڑے لائق فائق ایم ڈی اور غوث علی ہاشمی کے اکلوتے داماد بھی ہیں' موصوف کئی سال قبل اسٹیٹس گئے تھے کراچی یونیورسٹی سے بزنس میں ڈگری لے کر۔ اس وقت ان کے پاس صرف شاندار تعلیمی ریکارڈ تھا' جذبہ تھا خود پر اعتماد تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ مگر آج دیکھو..... حالانکہ میں آج ہی بزنس ڈنر میں ان سے ملا ہوں مگر ان کی صلاحیتوں نے جیسے مجھے اپنا گرویدہ ہی بنالیا۔ ایک کامیاب ترین بزنس مین کے علاوہ یہ ایک بہترین انسان بھی ہیں۔ میں تو یوں بھی ان کو اپنے گھر انوائٹ کرنے والا تھا مگر قدرت نے ازخود مجھے یہ موقع فراہم کردیا۔ سڑک پر جگہ جگہ کھڑے پانی کے باعث ان کی گاڑی بند ہوگئی تھی۔ ڈرائیور مکینک کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ مکینک تو اس طوفانی رات میں کہیں نہ ملا۔ الٹا ڈرائیور کراچی کے دوسرے کونے پر جاکر پھنس گیا۔ اب یہ بے چارے طوفانی رات میں اکیلے کھڑے ڈرائیور کو فون پر فون کررہے ہیں۔ نیٹ ورک پرابلم الگ۔ اسی لئے تو میرا فون بھی کام نہیں کررہا تھا ورنہ تمہیں ضرور اطلاع دے دیتا۔ اتفاقاً" میرا گزر وہیں سے ہوا جہاں یہ بے چارے بے یارومددگار کھڑے تھے۔ بس پھر کیا تھا اصرار کرکے انہیں لیتا آیا یہاں"۔ شہباز نے تعارف کی رسم اور اس کے یہاں تک پہنچنے کی روداد اب جاکر سنائی تھی۔

"میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں شہباز اس کالی بھیانک رات میں آپ مجھے رحمت کا فرشتہ ہی معلوم ہوئے تھے۔"

"شکریہ کی ضرورت نہیں مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنا ہی انسانیت ہے۔" اس نے واقعی خلوص سے کہا۔ ماہ نور بالکل خاموش بیٹھی تھی۔

"یہ آپ کا بڑا پن ہے صاحب ورنہ آج کے دور میں خالی انسان قیمتی نہیں۔ اس کے ساتھ لگے دولت کے انبار اسے انسان کہلوانے کا حق دلواتے ہیں ورنہ عام آدمی کو تو انسان کا درجہ بھی حاصل نہیں"۔ اس کا لہجہ سلگ رہا تھا۔

"آپ کے انداز گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے میں غالباً" آپ انقلابی رہے ہوں گے"۔ شہباز نے اسے لطافت سے چھیڑا۔

"جی ہاں کالج کے زمانے میں' میں غریب تھا اسی لئے انقلابی بھی تھا۔ انقلاب کے نعرے بڑے دل فریب لگتے تھے اور پھر یوں ہوا کہ واقعی انقلاب آگیا"۔ وہ جیسے ماضی میں کھو گیا تھا۔

"اچھا وہ کیسے؟" شہباز دلچسپی سے پوچھنے لگا۔ اسے واقعتاً" یہ شخص بہت منفرد اور دلچسپ لگا تھا۔

"میں اپنی زندگی کے نور کے لئے زندگی بنانے امریکہ چلا آیا۔ شبانہ روز محنت کی۔ تین سال تک پلٹ کر پاکستان کی طرف نہیں دیکھا۔ اپنی بوڑھی ماں کو جو مجھے دیکھ دیکھ کر جیتی تھی' بہن جس کے لئے میں ہی چھت تھا صرف اپنی آواز سناتا رہا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میں بہت کچھ نہ سہی کچھ نہ کچھ جوڑ کر جب پاکستان لوٹا تو یہاں سوائے پچھتاووں کے کچھ نہ بچا۔ نہ نور زندگی رہی نہ ماں کی پہلے سی ٹھنڈی میٹھی محبت' بہن اور وہ رشتے کی خالہ کے گھر ان کے ظلم و ستم سہہ رہی تھیں۔

میں عزت دار معاشرے کے سوکالڈ ٹھیکے داروں کے پاس گیا۔ انہیں بتایا کہ میں بھی اب امیر ہوں مگر تب بھی میں ان کے نزدیک کچھ نہ تھا۔

میرا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اس روز واقعی انقلاب آگیا۔ اسی روز میں نے بالآخر یہ حقیقت تسلیم کی کہ پیسہ رتبہ نام' زندگی کی سب سے بڑی حقیقتیں ہیں"۔ وہ بولتے بولتے ہانپ گیا تو سر صوفے کی پشت سے ٹکا دیا۔ شہباز متاثر مگر متاسف سی نگاہوں سے اسے تکے گیا۔ وہ خود جدی پشتی رئیس تھا۔ اسی لیے یہ لگن' یہ ترقی کا جنون اس میں مفقود تھا مگر وہ اس کی جدوجہد سے بہت متاثر ہوتا تھا۔ اسی سے وہ حمدان سے متاثر ہو رہا تھا۔

ماہ نور ٹھنڈی کافی کا کپ ہاتھ میں لیے خلاؤں میں نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔

"کبھی محبت بھی کی؟" اب کے شہباز کا لہجہ کچھ شوخ ہوا۔

"محبت کی بات کرتے ہیں۔ ہم نے تو عشق کیا تھا" وہ گمبھیر لہجے میں نیم وا نگاہوں سے چھت کو تکتے ہوئے بولا۔

"اچھا!" وہ محظوظ سے انداز میں ہنسا "وہ خوش نصیب آپ کی بیوی بنی؟" وہ اب آرام دہ انداز میں صوفے پر ترچھا دھنسا ہوا تھا۔

"جو میری بیوی بنی وہ خوش نصیب ہے"۔ اس نے شہباز کے جملے کی تصحیح کچھ اس انداز سے کی کہ وہ دل کھول کر ہنسا۔

"ماشاء اللہ کتنے بچے ہیں؟" وہ پتا نہیں کیوں اس کے انٹرویو پر تلا ہوا تھا۔ ماہ نور نے یکلخت پہلو بدلا۔

"دو۔ ایک بیٹا' ایک بیٹی' میرا نظریہ ہے کہ لڑکیوں کو پھولوں کی طرح نازک مگر باطنی اعتبار سے خوبصورت ہونا چاہیے۔ اور لڑکوں کو اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنے والا اور اپنے ارادوں میں فولاد کی طرح مضبوط ہونا چاہیے لہٰذا اسی لئے میں نے اپنی بیٹی کا نام کومل اور بیٹے کا نام تیمور رکھا ہے اور وہ دونوں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں"۔ اب کی بار اس کے سلگتے لہجے میں محبت کی پھوار تھی۔

"حیرت انگیز" شہباز بولا "میرے بھی دو ہی بچے ہیں اور ان کے نام بھی تیمور اور کومل ہی ہیں" وہ واقعی خوشگوار سی حیرت میں گھر گیا تھا۔ حمدان کے گداز لبوں پر بے جان مگر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے کیسے اتفاقات کو ہو جاتے ہیں" وہ دانستہ بے پروا سے لہجے میں بولی۔

"آپ کی بیگم ٹھیک کہہ رہی ہیں' اتفاقات تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اب اسے بھی خوشگوار اتفاق ہی کہیں گے کہ آپ کی بیگم اور میں یونیورسٹی میں کلاس فیلو رہ چکے ہیں"۔ وہ اس بار بڑے جاندار طریقے سے مسکرایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے ماہ نور کو لگا اسے چکر سا آگیا ہے۔

"رئیلی۔ یہ تو واقعی بڑے مزے دار قسم کا اتفاق ہے" شہباز اپنی پوری آنکھیں کھول کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اچھا۔ مجھے تو یاد نہیں پڑ رہا"۔ وہ ٹھنڈی ہوئی کافی کا کپ رکھ کر ایک لحظ کو سوچ میں ڈوبی تھی۔

"ہاں۔ آپ کا حافظہ تو ماشاء اللہ کافی تیز ہے۔ آپ کو کیوں یاد نہیں آرہا؟" شہباز یونہی بولا۔

"اب نہیں آرہا تو کیا کروں" وہ چڑ گئی "آپ کے ساتھ ہزاروں لوگ پڑھتے ہیں۔ آپ کیا سب کو یاد رکھ سکتے ہیں"۔

"مگر ہزاروں لوگوں میں حمدان نے تو آپ کو پہچان لیا نا؟"

شہباز کا لہجہ سادہ تھا مگر ماہ نور کو سانپ سونگھ گیا۔

"ارے جانے دیجئے شہباز خان زادہ صاحب۔ محترمہ ماہ نور مکرم شاہ مجھے ہی نہیں اپنے چار چار ہیبت ناک گارڈز کی وجہ سے غالباً" پوری یونیورسٹی کو یاد ہوں گی۔ ان کے بابا شاہ صاحب ان دنوں قومی اسمبلی کا الیکشن لڑنے والے تھے' سو یہ کوئی معمولی شخصیت نہیں تھیں اور میں۔" وہ استہزائیہ ہنسا "میں اور مجھ جیسے کئی کم نام اور عام سے بیک گراؤنڈ والے اسٹوڈنٹس سے یونیورسٹی بھری پڑی تھی۔ عام لوگوں کو کون یاد رکھتا ہے بھلا"۔

ماہ نور کے نقوش تنے ہوئے تھے۔ اعصاب پر گویا تھامنوں بوجھ پڑ گیا ہو۔ تب ہی وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"مجھے سخت نیند آرہی ہے کل اتوار ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ پوری رات جاگ کر ہی برباد کی جائے۔ رات کے تین بجنے والے ہیں بہتر ہے آپ دونوں بھی اب سو جائیں" وہ کہہ کر رکی نہیں' سیڑھیاں چڑھ کر اوپر اپنے روم میں چلی گئی۔

"کوئی بات نہیں۔ ویسے وہ کہہ تو ٹھیک ہی رہی تھیں۔ چلیں اب ہم بھی آرام کر لیتے ہیں کچھ دیر"۔ حمدان نے شہباز کے چہرے پر پھیلتے خجالت کے رنگ دیکھ کر کہا۔ اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلیں پھر صبح ملاقات ہوتی ہے" شہباز نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

"اوکے۔ گڈ نائٹ" وہ ہلکا سا مسکرایا۔

"اوہ۔ آپ کا جوشاندہ تو رہ ہی گیا"۔ دفعتاً" شہباز چونکا۔

"اوکم آن خان زادہ۔ بے شک آپ بہت مہمان نواز ہیں مگر اب اتنا شرمندہ بھی نہ کریں۔ آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جاؤں گا یوں بھی فیور کی ٹیبلٹ تو میں نے لے ہی لی ہے"۔ وہ تسلی آمیز لہجے میں بولا۔

"چلیں پھر گڈ نائٹ"۔ شہباز بھی مطمئن سے لہجے میں کہہ کر اپنے روم کی جانب بڑھ گیا۔

حمدان کے مسکراتے لب یکدم بھینچے تھے۔

وہ جانتا تھا نیند تو اسے نہیں آئے گی۔ نیند اسے آہی نہیں سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

حمدان صدیقی۔

ایک بے حد ڈیشنگ مگر اکھڑ پرسنالٹی۔ شاندار تعلیمی ریکارڈ۔ بہترین مقرر۔ کرکٹ کا بہت اچھا کھلاڑی۔ ذہین طالب علم۔ پروفیسرز کا چہیتا۔ صنف نازک کا موضوع گفتگو۔ مگر وہ بذات خود ان سے بے پروا۔ اور یہ بے پروائی آتش شوق مزید دہکاتی اور حمدان صدیقی جو صنف نازک کی دانست میں ناقابل تسخیر تھا۔ تسخیر ہوا بھی تو کس کے ہاتھوں۔

ماہ نور مکرم شاہ۔

چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں' گھٹاؤں جیسے بال' آبشاروں جیسی ہنسی' گلابوں کی ڈال سا سراپا' حاضر جواب' بذلہ سنج' ہمدرد اوسط درجے کی طالبہ تھی۔ اپنی خواہش پر بزنس پڑھ رہی تھی۔ اپنی مرضی سے کپڑے' جوتے' تعلیمی ادارہ' مضمون پسند کرنے والی نے سوچا جب زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اپنی رائے اور مرضی کو دخل ہے تو جیون ساتھی کے معاملے میں کیوں نہیں۔

اسے کچھ نوٹس درکار تھے۔ اس نے حمدان سے طلب کیے جو اس نے دے بھی دیئے۔ یہ پہلا واقعہ تھا کہ حمدان صدیقی جو اپنے نوٹس کے معاملے میں ازحد حساس تھا اس نے کسی کے حوالے اپنے بنائے گئے نوٹس کیے تھے۔ ڈیپارٹمنٹ میں خوب چرچا ہوا۔ اور یہ کتنا بے جانہ ہو گا کہ یہ ہوا ہی ان دونوں کو قریب لے آئی۔

"دیکھئے ایک بے ضرر سی بات کو یہ لوگ کتنا افسانہ بنا رہے ہیں" ماہ نور سخت ناراض تھی "آپ ان کو روکتے کیوں نہیں" تیا مطالبہ۔

"زبان خلق خدا کو کون روک سکا ہے' پروا نہ کیجئے" اس نے گویا مکھی اڑائی۔

"مگر یہ لوگ جو کہہ رہے ہیں یہ سچ نہیں ہے" وہ روہانسی ہو گئی۔ تب حمدان نے غور سے دو ستاروں میں ابھرتی نمی کو دیکھا اور۔ ڈوب گیا۔

"ان کے کہنے کو سچ کیوں نہ بنا دیں۔ سب چپ کر جائیں گے" اس نے حل پیش کیا۔ اس کے تجویز کردہ "حل" پر وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

آنکھوں میں نمی۔ احمریں لبوں پر مسکراہٹ کیا کوئی نظارہ اس سے بھی دلفریب ہو سکتا ہے؟

کئی دنوں تک وہ سوچے گیا۔

اور پھر یوں ہوا کہ وہ دونوں کچھ اتنے نزدیک آگئے کہ وہی خلق خدا جو انہیں نزدیک لانے کا باعث بنی تھی انہیں جدا کرنے کی تدابیر کرنے لگی۔

وہ ایک دوسرے کے مزاج' پسند ناپسند حتیٰ کہ سانسوں کے غیر متوازن ہونے تک کی خبر رکھتے تھے۔ نہیں رکھ سکے تو بس اسی چیز کی خبر نہیں رکھ سکے کہ حمدان سیکنڈ چند دن تو نا غیر یونیورسٹی آتا ہے جبکہ ماہ نور

چار گارڈز کے ساتھ اپنی امپورٹڈ لینڈ کروزر میں۔ حمدان کو آج بھی وہ سیاہ دن اپنی جزئیات کے ساتھ یاد تھا جو ان کی جدائی کا پروانہ اپنے ساتھ لئے طلوع ہوا تھا۔

☆ ☆ ☆

"حمدان۔۔ اگر تمہاری اتنی طبیعت خراب تھی تو تمہیں یونیورسٹی آنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ سخت طیش کے عالم میں بولی۔

حمدان کا بخار سے سرخ پڑتا چہرہ اور فلو کے باعث آنکھوں سے بہتا پانی اسے بہت اذیت دے رہا تھا۔

"نور زندگی۔۔ یہ تم مجھے حمدان کیوں کہتی ہو۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔ دیکھو' میں نے کس قدر محبت سے تمہارا نک نیم رکھا ہوا ہے اور تم ہو کہ آج تک میرا نام ہی نہ رکھ سکیں" ۔ وہ شکوہ کناں تھا۔

"حمدان! میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں تمہارا نام ہی اتنا پیارا ہے مجھے کہ میں اور کیا نام رکھوں تمہارا۔۔ اور بات کو گھماؤ مت۔ گھر میں رہ کر آرام کرنا چاہئے تھا تمہیں" ۔ اب کی بار وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

وہ دونوں اس وقت کینٹین میں اپنی مخصوص ٹیبل پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چونکہ یہ بریک ٹائم نہیں تھا اس لئے کینٹین میں رش خاصا کم تھا۔

"تم سب کچھ جانتی ہو پھر بھی یہ بات کہہ رہی ہو" ۔ اس نے ناراضی سے ماہ نور کو دیکھا۔ "وہ اسی گز کا ہر طرح کی سہولیات سے عاری گھر جہاں میری بوڑھی ماں آج بھی لوگوں کے کپڑے سی رہی ہے' اس امید پر کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرکے اس کے ارمان اس کے خوابوں کو پورا کرنے کا وسیلہ بنوں گا۔ بہن ہے تو چھوٹی مگر فکریں جھیل جھیل کر اپنی عمر سے دگنی لگنے لگی ہے۔ نور۔۔ میرا گھر وہ جگہ نہیں ہے جہاں مری روح کو آرام مل سکے۔۔ میری روح کو آرام صرف تمہیں دیکھ کر ملتا ہے۔ جانتی ہو نور۔۔ سب تمہیں ماہ کہتے ہیں مگر میں تمہیں نور کیوں کہتا ہوں؟"

اس نے اپنی ساحر آنکھیں جو نجانے کس جذبے سے سرخ پڑ گئی تھیں بڑے دھیان سے اس کی بات سنتی ماہ نور پر گاڑ کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کیونکہ ماہ بذات خود نور نہیں۔۔ نور بذات خود روشنی ہے ٹھنڈک ہے' سکون ہے اور تم اس زندگی کی تاریک راہوں میں میرے لئے روشنی ہو۔ مسائل کی دھوپ میں ٹھنڈک ہو بے چینیوں میں سکون ہو نور۔" اس نے شدت جذبات سے ٹیبل پر رکھا اس کا ہاتھ تھام کر کہا "تم مجھے کبھی اکیلا مت چھوڑ دینا' میرا جسم سانس لینا چھوڑ دے گا" ماہ نور جو اس کے جذبات کے زیر اثر دم بخود بیٹھی تھی یکلخت ہوش میں آئی۔

"حمدان۔۔ یہ تم کیا کیا سوچتے رہتے ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گی" ۔ وہ یقین دلانے والے انداز میں مسکرائی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو نا" پتا نہیں اسے یقین کیوں نہ آتا تھا۔

"ہاں بھئی" ۔ اس نے کہا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ اس کے جذبوں کی گہرائی سے خائف ہو گئی تھی۔ اس نے دولت کے انبار میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ جہاں رہتی تھی وہاں انسان نہیں اس کا "اسٹیٹس" ہی سب کچھ ہوا کرتا ہے اور یہ دیوانہ۔۔ یہ شخص اسے کن جہانوں کی باتیں سناتا ہے؟

اس شخص کا بے ریا اور بے نیازانہ انداز ہی تو تھا کہ وہ اس پر مرمٹی تھی۔ وہ وارفتہ نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔۔ کیا بہت ہینڈسم لگ رہا ہوں؟" وہ شرارت پر آمادہ ہوا۔

"میں تمہیں فلو کی ٹیبلٹ دے دیتی ہوں۔ تم کھا لو پلیز" ۔ وہ اس کے انداز پر گڑبڑا کر ملتجی لہجے میں بولی۔

"محترمہ۔۔ مجھے فلو کی ٹیبلٹ سے الرجی ہو جاتی ہے۔ پورا چہرہ اور ہاتھ پاؤں میں سوزش ہونے لگتی ہے۔ تم پریشان نہ ہو میں گھر جا کر جوشاندہ پی لوں گا" ۔ اب کی بار وہ اسے دلاسا دے کر بولا۔ اس نے مطمئن سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا پھر بالوں میں جکڑا اسٹیل اور سلور کیچر نکال کر ان میں انگلیاں چلانے لگی۔

حمدان نے جھٹ وہ کیچر اٹھا کر اپنے قبضے میں لے لیا۔

"ارے یہ کیا کر رہے ہو؟" وہ بوکھلائی "میں اپنے بال کیسے مینیج کروں گی؟"

"چھوٹی بات نہیں یہ تو ہماری عادت ہے نا نور' ہر ملاقات کے اختتام پر ہم ایک دوسرے کی کوئی چیز یادگار کے طور پر رکھ لیتے ہیں ایسا کرو تم میرا یہ نیلا رومال لے لو اسے ربن کی طرح باندھ لو اپنے بالوں میں" ۔ اس نے جیب سے نکال کر اپنا رومال آگے بڑھایا۔ جسے اس نے بنا پس و پیش تھام کر کسی نہ کسی طرح اس سے اپنے بال جکڑ ہی لئے۔

تب ہی کوئی تھا جو چلتا ہوا ان کے نزدیک آیا۔

"محترمہ مکرم شاہ صاحب اور جناب حمدان صدیقی صاحب۔۔ آپ دونوں کو شاہ سائیں نے یاد فرمایا ہے ابھی اور اسی وقت چلنا ہو گا" ۔ وہ مکرم شاہ کا معتمد خاص اللہ وسایا تھا۔

ماہ نور کو لگا کسی نے اس کے جسم کا سارا خون نچوڑ لیا ہو۔

☆ ☆ ☆

یونیورسٹی سے اس شاندار سفید محل تک کا راستہ بے حد خاموشی سے طے ہوا۔ ماہ نور کا ذہن شدید پریشانی کے زیر اثر ہر طرح کے محسوسات سے عاری ہو چکا تھا۔

حمدان کے دل میں گویا طوفان بپا تھا۔ وہ بے حیثیت شخص ہے یہ وہ اچھی طرح جانتا تھا مگر وہ اس قدر بے حیثیت ہے اس بات کا ادراک سامنے بڑی شان و شوکت سے ایستادہ سفید عمارت کو دیکھ کر ہوا تھا اور اب کہیں جا کر یہ فکر دامن گیر ہوئی تھی کہ کہیں یہ زور آور اس جیسے ناتواں سے اس کی طاقت یعنی ماہ نور چھین نہ لیں۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ضرور ہی انہیں جدا کریں گے تو پھر اس کا ردعمل کیا ہو گا یا کیا ہونا چاہئے؟

وہ گم صم سا بیٹھا ان سوالوں میں الجھا ہوا تھا تب ہی گاڑی وسیع و عریض لان پیچھے چھوڑتی ہوئی گھر کے داخلی لکڑی کے براؤن منقش گیٹ کے سامنے رکی اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھے چاروں اسلحہ بردار محافظ مستعدی سے باہر نکلے۔۔ آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا اللہ وسایا نیچے اترا اور ماہ نور کی طرف کا دروازہ بڑے ادب سے کھولا۔ تب وہ چونک کر ہوش میں آئی۔ اور چار و ناچار نیچے اتری۔

"آپ بھی آئیے" ۔ اللہ وسایا نے حمدان کو مخاطب کیا۔

وہ بھی خاموشی سے اتر آیا۔ اس نے دیکھا اس کا نیلا رومال ماہ نور کے بالوں کو جکڑے ہوا سے پھڑپھڑا رہا تھا۔

اللہ وسایا انہیں اپنی معیت میں لئے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہ محل حمدان کے لئے حیرت کدہ ثابت ہو رہا تھا قدم قدم پر اس کی نگاہیں خیرہ ہو رہی تھیں۔

"میرے اللہ۔۔ یہ مجھ سے کیا ہو گیا" ۔ اس نے جیسے تھک کر سوچا اسے اب صحیح معنوں میں اپنے اور ماہ نور کے درمیان موجود خلیج کا اندازہ ہو رہا تھا۔ مگر یہ ہی تو محبت کرنے والوں کا المیہ ہے۔ وہ فقط محبوب کو دیکھتے ہیں اس کے ارد گرد نگاہ جاتے جاتے ہمیشہ ہی دیر ہو جاتی ہے۔

"شاہ سائیں۔۔ حکم" ۔ اللہ وسایا نے ڈرائنگ روم کے دروازے میں رک کر شاید اجازت طلب کی تھی۔

"چلیے۔۔" اب وہ دروازے سے ایک طرف ہو کر کھڑا تھا۔ اس نے پہلے ماہ نور اور اس کے بعد حمدان کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اور آخر میں خود بھی اندر آ کر دروازہ بند کر دیا۔

سامنے ہی ٹانگ پر ٹانگ رکھے سفید براق شلوار قمیص اور کندھوں پر اجرک ڈالے سنجیدہ تاثرات اور گہری کالی سیاہ مونچھوں سمیت جو شخصیت گولڈن براؤن صوفے میں دھنسی ہوئی تھی ماہ نور ان سے اچھی طرح واقف تھی۔

وہ مکرم شاہ تھے۔ اس کے بابا سائیں۔

اور ناواقف تو حمدان بھی نہیں تھا' وہ انہیں اکثر ملک کے نامور سیاستدانوں کے جھرمٹ میں دیکھ چکا تھا۔ وہ اسے بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ نگاہیں تو اس کی بھی گہری ہی تھیں اور وہ بھی انہیں ہی دیکھ رہا تھا۔

"سائیں۔" چند ثانیے بعد ان کی بھاری رعب دار آواز گونجی "بیٹھو بابا۔ ادھر سامنے بیٹھو"۔ انہوں نے حمدان سے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ بیٹھ گیا۔

"تم بھی بیٹھو"۔ اب مخاطب ماہ نور تھی۔ وہ جو گردن۔ جھکائے کھڑی تھی سرعت سے سیدھے ہاتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اللہ وسایا ہاتھ باندھے سر جھکائے مکرم شاہ کے دائیں ہاتھ پر کونے کی طرف کھڑا تھا۔

"آج کل وقت کے تقاضے کچھ اور ہوگئے ہیں"۔ یک لحظہ توقف کے بعد وہ بولے تھے "پچھلے زمانے میں ہمارے خاندان برادری کی عورتیں گھر پر ہی تعلیم حاصل کرلیتی تھیں مگر نئے زمانے کے نئے تقاضے ان کا ساتھ بھی دینا پڑتا ہے۔ اب ہمارے خاندان کی بیٹیاں، بہوئیں بھی باہر سے اعلا تعلیم کی ڈگریاں حاصل کررہی ہیں۔ کاروبار میں ہاتھ بٹاتی ہیں' زمینوں کے معاملات دیکھتی ہیں۔ اپنی نسل سنوار رہی ہیں۔ اچھی تعلیم تو یہی کچھ سکھاتی ہے" وہ غالباً "تمہید باندھ رہے تھے۔ وہ نا سمجھی کے انداز سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ماہ نور کا سر ہنوز جھکا ہوا تھا۔

"ہم نے بھی ماہ نور کو اسی لیے اس کا جو جی چاہا جہاں جی چاہا پڑھنے کے لئے بھیجا۔ اس یقین کے ساتھ کہ یہ اپنے باپ دادا کے شملے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی روایت کی پاس داری کرے گی۔ مگر مقام افسوس تو یہ ہے کہ اس نے ہمارا یقین ملیا میٹ کردیا"۔ وہ بڑی ہی سے بولے۔ ان کے گہرے سانولے مگر پرکشش چہرے پر تناؤ تھا۔ ماہ نور بے آواز رونے لگی' جبکہ حمدان تڑپ کر سیدھا ہوا۔

"آپ غلط کہہ رہے ہیں سر! ماہ نور نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے آپ کی عزت و وقار پر حرف آ ہو"۔ وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔

"خوب" وہ طنزیہ گویا ہوئے' "کسی انجان لڑکے کے ساتھ یونیورسٹی۔ میں دن بھر گھومنا پھرنا' کھانا پینا تمہارے نزدیک عزت دار کام ہیں؟ تمہارے گھر کی بہن بیٹی اگر یہی سب کررہی ہوتی تو کیا تم انہیں شاباشی دیتے؟ جواب دو"۔ ان کا انداز نشست لب تبدیل ہوچکا تھا۔ دونوں ٹانگیں زمین پر گاڑے دونوں ہاتھ صوفے پر پھیلائے وہ نہایت ہی طیش کے عالم میں بیٹھے تھے۔ بات ایسی تھی کہ وہ تلملا گیا۔

"سر پلیز! آپ کو میرے گھر والوں کو گفتگو کے بیچ گھسیٹنے کا کوئی حق نہیں"۔

"یہی تو ہم کہہ رہے ہیں' تم صرف اپنے گھر کی عورتوں کا نام سن کر تلملا گئے اور ہماری عزت کو پوری یونیورسٹی میں ساتھ لیے پھرتے ہو"۔ وہ اسی لہجے میں بولے۔

"میں بھی نور کو اپنی عزت ہی سمجھتا ہوں۔ آپ غلط گمان مت کریں۔" بات ان کی معقول تھی تب ہی وہ باوجود غصے کے ضبط سے بولا۔

"دنیا صرف رشتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھتی ہے' تمہارا کیا رشتہ ہے ماہ نور سے؟" وہ اپنے سوال کی تلوار سے اسے زخمی کرگئے۔

"جو موجوں کا ساحل سے ہے
اور بارش کا بادل سے
پھولوں کا خوشبو سے ہے
اور دھڑکن کا دل سے۔"

وہ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہیں سکتا تھا کہ دنیا والا عمل سے قائل ہوتی ہے لفظوں سے نہیں۔

"رشتہ ہی تو بنانا ہے سر! تب ہی تو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں"۔ وہ نپے تلے لہجے میں اعتماد سے کہہ گیا۔ ایک لحظہ تو مکرم شاہ اپنے تمام تر طمطراق کے باوجود اس کا اعتماد دیکھ کر دنگ سے رہ گئے۔ اللہ وسایا نے ہڑبڑا کر سر اٹھایا۔ ماہ نور کا دل سکڑ کر پھیلا تھا۔ وہ

بے چینی سی محسوس کرنے لگی۔

"مکرم سائیں کی بیٹی سے رشتہ جوڑنا اتنا ہی آسان سمجھتے ہو!" کچھ دیر اپنے آپ کو کمپوز کرکے وہ بولے' ان کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"نہیں سر! جانتا ہوں یہ بہت مشکل ہے مگر یہ بھی جانتا ہوں اگر انسان سچے دل سے کوئی ارادہ کرلے تو کچھ بھی مشکل نہیں۔"

وہ پرعزم لہجے میں بولا۔ اس کے لفظوں کی سچائی اس کی روشن آنکھوں سے جھلکتی تھی۔ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔ دایاں ہاتھ گھٹنے پہ رکھے بائیں ہاتھ کی ایک انگلی مسلسل پیشانی پر ضربیں لگا رہی تھی۔ ماہ نور اتنا تو جانتی تھی کہ بابا سائیں جب کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوتے تب ہی یہ انداز اختیار کرتے تھے۔ انہوں نے اب تک اسے بالکل بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ ایسے میں وہ لب کشائی کرتی بھی تو کیسے۔ حمدان بھی اب گہری چپ کے زیر اثر تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ اسے لگا اگر وہ اب نہ بولی تو کبھی نہ بول پائے گی۔

"بابا سائیں!" اس نے تمام تر ہمت مجتمع کرکے کہا۔ "حمدان بہت اچھا لڑکا ہے۔ اسے میری دولت سے کوئی لینا دینا نہیں' آپ اسے ایک بار آزمائیں تو سہی۔ میں جانتی ہوں' یہ ہر آزمائش پر پورا اترے گا"۔

اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں ورنہ دیکھتی محبوب کی آنکھوں میں اس کی بات سے کیسے دیے سے جگمگانے لگے تھے۔ اور اچھا ہوا اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اگر باپ کی آنکھوں میں در آئی تحریر پڑھ لیتی تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔

"تو پھر ٹھیک ہے۔" کچھ دیر کی وحشت ناک خاموشی کے بعد مکرم شاہ کی گمبھیر آواز گونجی "محبت طبقاتی فرق کو نہیں مانتی۔ مگر معاشرہ ایسی باتوں کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ ماہ نور کروڑوں کی مالک ہے اور تمہارے پاس سوائے جذبوں کے زندگی گزارنے کا کوئی اور سامان نہیں"۔ مگر پھر بھی وہ یک لحظہ ٹھہرے' وہ دونوں دم بخود ان کا فیصلہ سن رہے تھے۔

"پھر بھی ہم تمہارے جذبوں کی قدر کرتے ہوئے تمہیں ایک موقع ضرور دیں گے۔ آج سے ماہ نور یونیورسٹی نہیں جائے گی اور نہ ہی تم اس سے کوئی رابطہ رکھنے کی کوشش کروگے۔ تین سال۔" وہ زور دے کر بولے۔ "تین سال ہیں تمہارے پاس' اپنی زندگی بناؤ اپنے پیروں پر اچھی طرح جم کر کھڑے ہوجاؤ۔ اگر ایسا کرسکے تو میں مکرم شاہ زبان دیتا ہوں۔" انہوں نے سینے پر سیدھا ہاتھ رکھا۔ "ماہ نور سے خود میں تمہاری شادی کرواؤں گا' کہو! منظور ہے؟"

وہ جیسے حکم سنا کر اب اس سے رائے چاہ رہے تھے۔ ماہ نور پر تو گویا حیرت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ تو اس کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ اتنی آسانی سے اس کے بابا سائیں راضی ہوجائیں گے۔ اور حمدان وہ کچھ تذبذب کا شکار تھا۔ گو کہ اسے اپنی تعلیم اور اپنے جذبوں پر پورا بھروسا تھا مگر قسمت۔۔۔ کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ وہ تو اپنی جانب سے پوری کوشش کرے گا اخلاص نیت کے ساتھ مگر۔

"کیا ہوا برخوردار! بس یہیں تک تھی تمہاری خود اعتمادی" وہ اسے گو مگو دیکھ کر طنزیہ بولے۔ خفا نظروں سے تو ماہ نور بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

"اتنا آسان سا تو مطالبہ کیا ہے بابا سائیں نے اور یہ سوچنے میں اتنی دیر لگا رہا ہے۔ جہاں تک رابطہ نہ رکھنے کی بات ہے تو فون پر نہ سہی انسان انٹرنیٹ پر تو رابطے میں رہ ہی سکتا ہے۔ یہ بھی نا بہت بے وقوف ہے"۔ وہ گویا اس کی پریشانی کی "وجہ" بھانپ کر اب محبت پاش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی لبوں پر دھیمی دھیمی مسکان۔

تب ہی حمدان نے اس کی جانب دیکھا اس نے سیدھے سے سر اثبات میں ہلا کر گویا اس کی مشکل آسان کردی۔

"ٹھیک ہے سر! آپ مجھے اس امتحان میں سرخرو پائیں گے"۔ کچھ دیر پہلے کے اس کے خدشات ماہ نور کا چہرہ دیکھ کر بھک سے اڑ گئے تھے۔ اور اس کا ازلی اعتماد

عود آیا تھا۔ بھلا جس کے ساتھ اس کا اتنا حسین محبوب ہو اس کی قسمت کیونکر خراب ہو سکتی ہے؟

"مجھے تم سے یہ ہی امید تھی برخوردار تو پھر ٹھیک تین سال بعد تم سے ملاقات ہوگی یہیں پہ۔ جاؤ وسایا انہیں گھر چھوڑ آؤ۔"

وہ اس سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ ان کے عقب میں ماہ نور کھڑی تھی۔ اس نے بغور اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ لاکھ مضبوط دل سہی مگر اس جدائی کے لمحے میں اس کا بھی دل ڈول گیا تھا۔ تین سال وہ اس چہرے کو دیکھے بنا کیسے گزارے گا۔ یہ خیال ہی سوہان روح تھا۔ مگر کہتے ہیں نا کہ کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے سو وہ اپنا دل مضبوط کر کے پلٹ آیا....

☆ ☆ ☆

تین سال۔۔۔

اور پھر تین سال کس طرح بیت گئے وہ سمجھ ہی نہیں سکا۔ ایم بی اے کا فائنل ایگزام دیتے ہی اپنے ایک دوست کے توسط سے اس نے اسٹیٹس جانے کی ٹھانی۔ اپنا اسی گز کا مکان بیچ کر کچھ رقم دوستوں سے ادھار لی۔ بوڑھی ماں اور بہن کو رشتے کی خالہ کے ہاں چھوڑا بہت سی دعائیں اور خوش کن سپنے لے کر وہ شہر بے اماں سدھارا۔ وہاں وہی روایتی سی اس کی جدوجہد رہی پہلے پہل چھوٹی موٹی جابز کیں۔ جونہی رزلٹ آیا مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس نے وہاں کی یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا اور اس کی قسمت کہ ایک فرم میں اسے کافی معقول جاب بھی مل گئی۔ وہ اپنے کام کے معاملے میں جنونی تھا۔ اس کی لگن اس کی استقامت اس کمپنی کے چیئرمین غوث علی ہاشمی کو اس کی جانب متوجہ اور اس کے بعد مائل کر گئی۔ اور یوں وہ تین سال میں اتنی ترقی کر گیا جو لوگ کئی سالوں میں کر پاتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

تین سال بعد جب وہ لکھ پتی بن کر لوٹا تب تک مکرم شاہ سائیں کھربوں پتی بن چکے تھے۔ آخر کو ایم این اے تھے اگر اپنے لئے اتنا بھی نہ کرے انسان تو کیا فائدہ اس کے حکومت میں ہونے کا۔

وہ اپنے پیروں پر جم کر کھڑا ہو گیا۔

اس لیے انہیں ان کا وعدہ یاد دلانے جا پہنچا۔

بڑی دقتوں سے ان تک رسائی ملی۔ وہ بھی یوں کہ اس نے اللہ وسایا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ ملا۔ اس کی بات سن کر اس کے کرخت چہرے پر تفکر پھیل گیا۔ وہ اندر گیا۔ کچھ دیر بعد باہر آیا بولا۔

"سائیں ابھی پارٹی کے بندوں کے ساتھ مصروف ہیں کچھ روز بعد آنا۔" وہ صاف ٹال رہا تھا۔ مگر وہ کوئی بچہ نہیں تھا جو اس کا انداز نہ پہچان پاتا اس کا ماتھا بری طرح ٹھنکا۔

"مجھے تو ان سے ابھی ملنا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔" وہ دبے دبے غصے سے بولا۔ اسے ٹلتے نہ دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر اندر گیا۔ اور اس بار جب باہر آیا تو سخت برہم تھا۔

"چلو" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ وہ عجیب طرح کے احساسات میں گھرا اندر تک آیا۔ اسے تین سال پہلے کی سہ پہر یاد آرہی تھی۔ محل کی شان و شوکت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی سیٹنگ اور انٹیریر بھی بدلا ہوا تھا۔ وہ اندر داخل ہوتے ہی بے ساختہ وہ جگہ دیکھنے لگا جہاں آج سے تین سال قبل بوقت جدائی نور زندگی ایستادہ تھی۔

"بابا کون ہو کیا چاہیے؟" بادامی کھڑکھڑاتے شلوار سوٹ کندھوں پر اجرک سر پر سندھی ٹوپی۔ سب کچھ وہی تھا ہاں البتہ ان کے عقب میں الرٹ کھڑے دو عدد گن مین نئے تھے۔ اور ان کے کرخت اور بیزار کن تاثرات بھی۔۔۔

"میں کون ہوں؟ کیا مجھے یاد دلانے کی ضرورت ہے؟" وہ کھڑا رہا بیٹھا نہیں۔

"ہم تنے لوگ دن رات ملتے ہیں اب ہر کسی کو تو ہم یاد رکھ نہیں سکتے۔" شان بے نیازی سے فرمایا گیا۔

"میں یاد نہیں تو مجھ سے کیا گیا وعدہ کہاں یاد ہوگا؟" وہ طنزیہ لہجے میں برہمی سے بولا۔

"بابا بیٹھ کر آرام سے بات کرو۔" وہ اس کے عکس بالکل مطمئن تھے۔ اس نے کچھ سوچ کر اپنے آپ کو کمپوز کیا پھر بیٹھ بھی گیا اور آہستہ آہستہ انہیں یاد دلانے لگا کہ "وہ کون" ہے؟

اور مکرم شاہ بھولے تو نہیں تھے اسے البتہ اس کی استقامت پر حیران ضرور تھے۔

"بات یہ ہے سائیں!" وہ اب کی بار مکمل سنجیدگی سے گویا ہوئے۔

"آج کے دور میں لکھ پتی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ ماہ نور میں نے بتایا تھا نا کروڑوں کی مالک۔ ناز و نعم میں پلی بڑھی تین زور آور بھائیوں کی اکلوتی چھوٹی بہن۔ سائیں! تم خود انصاف کرو تمہارا اس کے ساتھ کیا جوڑ؟ سمجھ دار بچی تھی خود ہی کچھ دن میں یہ بات سمجھ گئی۔ اور اب تو اس کی شادی کو دو سال ہونے کو ہیں اب بتاؤ تمہاری گنجائش کہاں نکلتی ہے اس کی زندگی میں؟" وہ لبوں پر دھیمی مسکان لیے اسے دیکھ رہے تھے۔

اور حمدان کو لگا جیسے کائنات کی گردش ختم گئی ہو۔ دریاؤں کا بہاؤ ٹھہر گیا ہو وقت کا پہیہ رک گیا ہو۔

"کدھر کھو گئے بابا؟ لو یہ ٹھنڈا میٹھا سنگتروں کا رس پیو"

ان کی بے رحم آواز اسے حواسوں میں لائی۔ اس نے ان تین سالوں میں دن رات اسے سوچا تھا چاہا تھا سراہا تھا اسے حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کی تھی اور اس ایک پل نے سب کچھ ختم کر دیا تھا۔ اب کیا ہوا اور کیوں ہوا جیسے سوالات بے معنی تھے۔ نقصان ہونا تھا ہو گیا تھا قسمت کا داؤ چل چکا تھا۔ وہ ان کا گریبان پکڑ سکتا تھا۔ ان سے لڑ سکتا تھا مگر وہ طاقت ور تھے بے پناہ اختیارات کے مالک تھے۔ ایک لمحے میں اسے جسم کی قید سے رہائی دلا دیتے۔ ایسے میں ان دو نفوس کا کیا ہوتا جو پچھلے تین سال سے اس کے لیے "اس کی کامیابیوں کے لئے مسلسل دعا گو تھے" اسے ان کا قرض چکانا تھا سو بغیر کچھ کہے سنے خاموشی سے پلٹ آیا۔ اور ان دونوں کو لے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس سرزمین کو چھوڑ آیا جہاں اس کے ارمانوں کا مدفن تھا۔

☆ ☆ ☆

کچھ جانی پہچانی سی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔ اسے لگا آنکھیں نہ ہوں جیسے منوں وزنی پتھر رکھے ہوں۔ اس کی نگاہیں چھت پر بے آواز گھومتے پنکھے پر گئیں۔ ذہن سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا کہ کہاں ہے۔ پھر دوبارہ اس کے فون کی آواز نے اسے مکمل بیدار کر دیا۔ اس نے بیزاری سے کال ریسیو کی۔ اس کا ڈرائیور تھا۔ بتانے لگا کہ گاڑی ابھی ابھی مکینک کے حوالے کی ہے دو تین گھنٹے لگ سکتے ہیں اگر آپ کو جلدی ہے تو کسی دوسرے ڈرائیور کا انتظام کروا دے گا وہ۔ مگر اسے کوئی جلدی نہیں تھی سو وہ اسے سہولت سے منع کر کے شاور لینے کی غرض سے واش روم میں گھس گیا آدھے گھنٹے تک نیم گرم پانی سے شاور لیتا رہا تب جا کر کہیں حواس مکمل بیدار ہوئے اور ایک مرتبہ پھر رات کے واقعات تیزی سے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

وہ شاور لے کر باہر نکلا ڈریسنگ کے سامنے اپنا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر اتنی تھکن رقم تھی گویا وہ صدیوں سے پاپیادہ سفر کر رہا ہو۔ اور ہاں۔۔۔ سفر تو وہ واقعی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی تقدیر بھی انسان کے ساتھ کیسا مذاق کر جاتی ہے انجانے راستوں پر دوڑاتے دوڑاتے اچانک جانی پہچانی سی منزل کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ منزل سامنے ہو مگر دسترس سے کوسوں دور کیا ستم ظریفی ہے۔

اسے ایک کپ گرما گرم کافی کے مگ کی شدید طلب صبح کے ساڑھے نو بجے ناچار باہر کھینچ لائی۔ اس کا رخ کچن سے ملحقہ ڈائننگ کی طرف تھا۔

"آپ بھی بہت عجیب آدمی ہیں اب کیا یہ ضروری ہے کہ میں ہر وقت آپ کے ساتھ چپکی رہوں۔ سو کام ہوتے ہیں انسان کو۔" ماہ نور کی جھنجھلاہٹ پر

شہباز کھل کر ہنس رہا۔ وہ اس وقت ایپرن پہنے بالوں کا جوڑا بنائے بیاد وپٹے کھڑی بیسن پر مٹی میں لتھڑے ہاتھ دھو رہی تھی۔

"تو جان من! یہ سو کام آپ نوکروں سے کیوں نہیں کرواتیں۔" وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا اخبار کی سرخیوں پر نگاہ دوڑا رہا تھا۔

"گارڈننگ میرا شوق ہے روز ہی صبح کچھ دیر کچھ نہ کچھ کرتی ہوں میں گارڈن میں ابھی بھی بشیر بابا (مالی) سے اپنی نگرانی میں گوڈی کروائی ہے۔ وہاں کچھ نئے بیج بونے تھے کہ آپ نے بلا لیا"۔ وہ اب اس کے پاس والی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ تب ہی اس نے غور سے اپنی محبوب بیوی کی جانب دیکھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟ کافی تھکی تھکی سی لگ رہی ہو" وہ اس کا ماتھا چھو کر بے ساختہ بولا۔

"طبیعت کو کیا ہوتا ہے" وہ بیزاری سے بولی' رات بھی آپ کے چکر میں سوتے سوتے تین بج گئے تھے۔ آپ نے خوامخواہ ہی مجھے اپنے ساتھ بٹھائے رکھا۔ پھر صبح سویرے ہی بچوں کی وجہ سے جاگنا پڑا۔ معظم بھائی بچوں کو اپنے ہالی ڈے والے فارم پر لے جا رہے تھے وہاں انہوں نے حال ہی میں اپنے پسندیدہ جانوروں پر مشتمل زو بنوایا ہے۔ کومل اور تیمور بھی جانے کے لئے مچل گئے۔ کل سے پلان تھا ان کا۔ مارتھا (گورنس) چھٹی پر ہے کئی روز سے۔ اس لئے بچوں کے ساتھ بھی لگنا پڑتا ہے۔ ایسے میں تھکن نہیں ہو تو کیا ہو"۔ اس نے سر جھٹکا۔

"رات میں آپ کو کھانا وغیرہ دینے کے سلسلے میں زحمت ہوئی۔ میں نے خوامخواہ نہیں بٹھا رکھا تھا آپ کو۔ مہمان داری کا خیال تھا"۔ اس نے شاید صفائی دی۔ تب ہی خیری ناشتہ ٹیبل پر لگانے لگی۔ حمدان ڈائننگ روم کے باہر کھڑا تھا زور سے کھنکھارا۔ تو وہ دونوں چونک سے گئے۔

"آجائیں حمدان صاحب!" شہباز تو بولا۔ وہ اندر چلا آیا۔

"معذرت چاہتا ہوں مگر کافی کی شدید طلب یہاں کھینچ لائی" وہ دزدیدہ نگاہوں سے اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کر بولا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"ضرور ضرور... کیا لیتے ہیں آپ ناشتے میں؟" وہ پوچھنے لگا۔

"ہاف فرائی انڈا اور کافی"۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔ نامحسوس انداز میں ماہ نور اپنا مگ اٹھا کر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

"کہیے طبیعت کیسی ہے اب؟ رات نیند ٹھیک سے آئی؟"

وہ دونوں باتیں کرنے لگے۔ تب ہی حمدان کا موبائل بجا۔

اس نے دیکھا اس کی بیوی تابندہ ہاشمی اسے کال کر رہی تھی۔ وہ معذرت کرتا ہوا اٹھا اور اپنا کافی کا مگ لے کر لان کی طرف نکل آیا۔

"وہاں اس وقت رات ہو رہی ہوگی پتا نہیں کیوں فون کر رہی ہے" وہ سوچ رہا تھا۔

"ہیلو" اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو حمدان کیسے ہو" اس کی بیوی بولی۔

"ٹھیک تم اور بچے کیسے ہیں؟"

"ہم سب ٹھیک ہیں ڈیر۔ تمہارا بزنس ٹور ٹھیک رہا صبح کی فلائٹ سے آ رہے ہو نا؟" وہ جیسے تصدیق کرنے کو بولی۔

"ہوں..."

"پلیز ڈارلنگ مجھے وہاں سے کچھ ڈیزائنرز کے آؤٹ فٹس لا دو کل ہی نیٹ پر دیکھے ہیں" وہ اٹھلا کر بولی۔

"لا دیتا ہوں اور حکم؟" وہ مسکرا کر بولا۔ وہاں سے وہ کچھ بولی تھی۔ جس پر وہ بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"سویٹ ہارٹ... آئی مس یو تو بچوں کو پیار دینا اور ہاں 'بابا' سن لیا لا دیتا ہوں... اور آپ کا یہ حکم تو وہیں آکر پورا کیا جا سکتا ہے۔ اوہ تو تم شرما رہی ہو آئی کانٹ بلیو اٹ بائے ڈیر اوکے او کے سمجھ گیا بابا 'بائے ٹیک کیئر'۔"

اس نے مسکراتے ہوئے موبائل بند کیا۔ ایک گہری سانس اندر کھینچی اور واپس پلٹ گیا۔ اور بائیں ہاتھ پر گھر کے پچھلے حصے کی جانب جاتی راہداری میں گملوں کی ترتیب درست کراتی ماہ نور کو لگا جیسے وہ کسی خواب سے جاگی ہو۔ ایک ایسا خواب جس کے سہارے وہ آج تک جیتی آئی تھی مگر وہ خواب آج ٹوٹ گیا تھا۔ خواب تو ٹوٹ ہی جاتے ہیں انہیں ٹوٹنا ہی ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا۔ اکثر لڑکیاں اس کی وجاہت کے گن گاتی تھیں تو کچھ اس کے بے نیازانہ رویہ کی دلدادہ تھیں۔ اساتذہ کے نزدیک اس کی ذہانت قابل ستائش تھی۔ وہ بہت خوب بولتا تھا اس نے اکثر مباحثوں میں انعامات جیت رکھے تھے وہ کرکٹ بہت اچھی کھیلتا تھا۔ اس سب کے باوجود وہ ماہ نور کے نزدیک صرف ایک کلاس فیلو تھا اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ مگر ہوتے ہیں نا کچھ لمحے جو اپنا اسیر بنا لیتے ہیں وہ بھی کسی ایسے ہی لمحے کا شکار ہوئی تھی۔ پھر وہ تھی اس کا محبوب اور ان کی محبت۔

اسے زندگی میں ہر سکون میسر تھا سوائے محبت کے' کہ اس کی ماں اس کی پیدائش کے چند گھنٹوں بعد خالق حقیقی سے جا ملی تھیں۔ اس کی ذات میں بہت سے خلا تھے جو صرف محبت پر کر سکتی تھی —— — اور پھر وہ محبت کے اس مقام پر پہنچی جہاں محبوب کی موجودگی ہی محب کے وجود کی علامت بن جاتی ہے۔ کیسے کیسے سپنے سجائے تھے ان دونوں بے خبروں نے ایک خوشبوؤں میں بسا محبتوں سے لبریز گھر ان کے دو بچے۔ ان کے نام۔ ان کی پرورش کے انداز۔ زندگی محض خوشیوں کا نام ہوتی تو کتنا اچھا تھا مگر اس کا دوسرا رخ بھی شاید اتنا ہی ضروری ہے کیونکہ دنیا میں کسی چیز کو بھی ثبات نہیں۔

جس دن بابا سائیں نے انہیں طلب کیا اسے لگا جیسے کسی نے اس کے سپنوں کی دنیا کو بھڑکتی آگ میں دھکیل دیا ہو۔ وہ ڈر رہی تھی بے حد و بے حساب۔ مگر اس دن اس پر یہ انکشاف ہوا کہ جسے اس نے چاہا ہے وہ کوئی عام آدمی نہیں وہ بہت خاص ہے۔ وہ اس کے بابا سائیں یا اس کے مال و دولت سے ذرا بھی مرعوب ہوئے بنا اس کے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے نگر بڑے ہی باتمیز لہجے میں محو گفتگو تھا۔ اسے بڑا فخر محسوس ہوا تھا۔ اور پھر بابا سائیں کی وہ شرط۔

اس نے تو سوچا تھا کہ کئی صحرا عبور کرنے ہوں گے کہ جانتی تھی اس کا باپ اور بھائی کیا "شے" ہیں۔ ان کا نیم رضامند ہو جانا ہی اس کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ مگر وہ بھول گئی تھی کہ آج کی دنیا میں معجزے نہیں ہوتے۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا محبوب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہے شاید وہ آزمائش سے گھبرا رہا ہے مگر اسے اس پر پورا یقین تھا تب ہی اس نے پورے اعتماد سے مسکرا کر اسے آزمائش کی بھٹی میں جھونکنے کا عندیہ دیا تھا اور اس کی یہ مسکراہٹ حمدان کا متزلزل ایمان پھر سے پختہ کر گئی۔ وہ لوٹ گیا تب اسے لگا اس کا دل ایک دم خالی ہو گیا ہو۔ وہ تین سال اس سے بات کیے بنا اسے دیکھے بنا کیسے رہ پائے گی؟

اس خیال سے اس کے اشک رواں ہو گئے۔ مکرم شاہ اس پر ایک سرد اور کاٹ دار نگاہ ڈال کر باہر چل دیے تھے سب سے پہلے اس سے اس کا سیل فون لیا گیا پھر اس کے کمرے سے کمپیوٹر اٹھوا لیا گیا اس کے ساتھ سائے کی طرح اس کی ہم عمر رکھی رہنے لگی' وہ کہیں آنے جانے کے لیے پابند کر دی گئی اتنے کڑے پہرے میں رہتے ہوئے اس نے سوچا شاید کہیں کچھ غلط ہو گیا ہے اور ٹھیک پانچ ماہ بعد جب مکرم شاہ الیکشن جیتے وہ بازی ہار گئی۔ جشن منانے کے بعد دوسرے دن انہوں نے اسے کمرے میں بلایا اور اطلاع دی کہ اس کی شادی طے کی جا رہی ہے۔

اسے لگا اسے سننے میں دھوکا ہوا ہے وہ ششدر سی ان کی صورت تکنے گئی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

"نوجوانی کی محبت بڑا زور آور جذبہ ہو جاتی ہے۔ جس روز مجھے تمہاری اس حماقت کا پتا چلا' چاہتا تو اسی روز میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کروا دیتا مگر الیکشن ہونے

والے تھے میں کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اتنی رازداری برتنے کی دوسری وجہ تمہارے ابا تھے۔ انہیں بھنک بھی پڑجاتی تو معاملہ بگڑ جاتا اور ان دنوں مخالفین بھی جیسے میری ناک ہی میں تھے کہ ذرا سی لغزش ہو اور وہ ہاہاکار مچادیں۔ بی بی۔ میں نے بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں سیاست کے میدان کا تمیں سالہ تجربہ ہے۔ خوامخواہ خون خرابے سے کیا حاصل ہوتا' سیاست سے بڑے سے بڑا مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔ کتنے آرام سے اسے تمہاری زندگی سے دور کردیا۔ اچھا ہی ہوا نا خوامخواہ بے چارہ جوانی میں مارا جاتا۔ اب تو امریکا میں بیٹھا عیش کررہا ہے۔"

انہوں نے بات کے اختتام پر اپنی کالی سیاہ مونچھوں کو تاؤ دیا۔ اس نے بے یقینی سے ان کا زمانہ ساز چہرہ دیکھا۔ کیا کیا تھا انہوں نے اس کے ساتھ۔ ایک شخص جو زندگی سے بھی پیارا تھا' اسے اس کی زندگی ہی سے نکال دیا تھا۔ ان دونوں نے تو ان کی زبان پر بھروسا کیا تھا مگر بھول گئے کہ وہ موجودہ دور کے سیاست دان تھے جس کے لیے وعدہ کرنا بچوں کا کھیل ہے وعدے کی اہمیت تو اس کے نزدیک ہوتی ہے جو اسے ایفا کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

الیکشن ہونے والے تھے' الیکشن سے قبل انہوں نے وعدہ کرلیا۔ الیکشن ہوگئے۔ وعدہ مٹی دھول ہوا۔ کہانی ختم' مگر وہ اپنے دل کا کیا کرے۔ اسے پتا بھی نہیں چلا اس کی ہذیانی چیخوں نے درودیوار ہلا دیے۔ اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا۔ کئی دن لگے اسے سنبھلنے میں۔ سنبھل کر بھی اس کی یہی رٹ تھی۔

"میں حمدان کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی۔" رکھی عاجز آجاتی۔

ایسے میں ماہ نور کو بے تحاشہ اپنی ماں کی کمی محسوس ہوتی۔ وہ ہوتی تو شاید آج صورت مختلف ہوتی' مگر یہ اس کی خام خیالی ہی تھی۔ روایتوں کی زنجیروں میں جکڑی بے تحاشا طاقت ور مرد کی بے تحاشا کمزور عورت کے سوا وہ کچھ نہ ہوتیں۔ اس کے سسرال والوں کا اصرار بڑھتا گیا۔ اس کے سسر اور بابا سائیں نے یہ رشتہ طے کیا تھا۔ وہ تب بھی نہ مانی تو آخری حربے کے طور پر حمدان کی والدہ اور بہن کا مکمل پتا اس کے سامنے رکھتے ہوئے مکرم شاہ نے کہا۔

"یہ اس کم ذات کی ماں اور بہن کا پتا ہے اور وہ خود بھی میری دسترس سے باہر نہیں۔ کہو تو کل ہی ان تینوں کی لاشیں تمہارے سامنے لے آؤں یا پھر تم میری بات مان جاؤ اور ان کی جان کی امان پاؤ۔"

اور اس رات وہ اتنا روئی تھی کہ سمندر بھی ہوتے تو خالی ہوجاتے۔ وہ جانتی تھی جو وہ کہہ رہے ہیں وہ کر گزریں گے۔

دوسری صبح اس نے شہباز خان زادہ کے لیے ہاں کردی تھی اور یوں وہ خالی دل خالی دامن لیے شہباز کی زندگی میں شامل ہوگئی۔ جو بہت اچھا شوہر ثابت ہوا ہر لحاظ سے۔ گزرتا وقت اس کی جھولی میں دو پھول ڈال گیا۔ دونوں کے نام اس نے اپنی مرضی سے رکھے شہباز کو کوئی اعتراض نہ ہوا بلکہ وہ کسی بات پر کم ہی معترض ہوتا تھا۔ اس کی زندگی مکمل تھی مگر دل ادھورا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ مکرم شاہ ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہوگئے۔ ان کی گدی اس کے بڑے ادا منعم شاہ نے سنبھال لی۔ انسان چلا جاتا ہے' مگر اس کے فیصلے باقی رہ جاتے ہیں۔ وقت کا کام ہے گزرنا سو گزرتا رہا۔ مگر اس کے دل میں اس پیارے سے شخص کی یاد کنڈلی مارے بیٹھی رہی جو ہمہ وقت اسے ڈستی رہتی۔ ان کی موت پر جب وہ اپنے گھر گئی تھی تب اس نے برسوں سے کسی مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا سوال وسایا سے کیا تھا۔

"کیا وہ آیا تھا؟" اور اس نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اس کی دنیا تہہ و بالا کردی تھی۔

"ہائے کتنا پیارا شخص تھا وہ جس کی جدائی مقدر ٹھہری۔" وہ کئی دن تک روتی رہی۔ شہباز اس کے آنسوؤں کو باپ کی جدائی پر محمول کرتا۔ اسے تسلی دیتا۔ دلجوئی کرتا۔ اسے بہلانے کی خاطر یورپ گھمانے لے گیا۔ اس شخص کے خلوص نے اسے زیربار کرلیا تھا اور پھر گم گشتہ محبت کا ماتم کرنے کا اب فائدہ بھی کیا تھا جو قسمت میں لکھا تھا ہوچکا تھا۔ اس کی یاد دل کے نہاں خانوں میں مقدس راز کی طرح دفن کرلی۔ وہ اب نور زندگی نہیں "ماہ بیگم" تھی۔

ایک مکمل خوش حال ترین زندگی جیتے ہوئے بھی کبھی کبھی کسی کمی کا احساس شدید تر ہوجاتا ایسے میں وہ تھکنے لگتی تب ہی نامعلوم اداسی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس کی محبت راستہ دکھلاتی تارا بن جاتی۔

راستے کے اختتام پر اسے حمدان منتظر ملتا ہمیشہ کی طرح۔ وہ جانتی تھی وہ شخص بے وفا نہیں ہے وہ کبھی اس سے بے وفائی نہیں کرسکتا۔ وہ کہیں بھی ہے' آج بھی اس کا ہے یہ خیال ہی بڑا خوش کن تھا' مگر زندگی کو آپ کی خوشیاں چھین کر نجانے کیا ملتا ہے اور کیا یہ ضروری تھا کہ گزشتہ رات کو وہ اجنبی مہمان وہی ہوتا' کبھی کبھی ماننا پڑتا ہے کہ دنیا گول ہے۔

کل رات اپنے شوہر کے ساتھ اسے دیکھ کر اسے لگا تھا کہ جیسے اس کی کائنات گردش میں آگئی ہو۔ یہ شخص اگر کسی پرانے حوالے سے اس کی زندگی میں آیا ہے تو بہت غلط کیا ہے اس نے۔ آج بھی اسے دینے کے لیے ماہ نور کے پاس سوائے دکھ اور زخم کے کچھ نہ تھا۔ الٹا جو کچھ اس نے زندگی میں حاصل کیا ہے اس حوالے کے بعد تو شاید اس سے بھی کچھ چھن جاتا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ الجھی ہوئی تھی۔ تب ہی اس کے شوہر نے اس کی الجھن رفع کی اور اس نے بے ساختہ اک پرسکون سانس لبوں سے خارج کی' مگر کچھ دیر بعد اس کے کچھ جتانے کے انداز پر ایک مرتبہ پھر وہ عجیب سے احساسات کا شکار ہوگئی تھی۔

وہ سونے چلی آئی' مگر سوئی نہیں رات اس پر بھی بڑی بھاری گزری تھی' مگر ایک گونہ سکون سا تھا جو اس کی رگ وپے میں سرایت کرگیا تھا۔ وہ اس سے بے اعتنائی برت رہی تھی اس کے نتیجے میں وہ بری طرح چڑ گیا تھا۔ کمرے میں آکر کتنی دیر تک اس کی سانسیں ناہموار رہیں۔

"وہ آج بھی مجھے چاہتا ہے۔ اس کے دل میں میری محبت آج بھی زندہ ہے وہ بے وفا نہیں۔ وہ میرے شوہر کے ذریعے مجھ تک ہرگز نہیں پہنچنا چاہتا۔ اسے تو زندگی محض اتفاقیہ طور پر یہاں کھینچ لائی ہے اور کیا تھا اگر یہ رات میری زندگی میں نہ آتی۔" وہ پوری رات ایسی ہی لایعنی سی سوچوں میں گھری رہی اور اب وہ کھڑکی سوچ رہی تھی۔

"اور کیا یہ ضروری تھا کہ میری خوش فہمی جو مجھے اس کی وفا پر تھی اس کا اختتام اس طرح ہوتا۔ میں یہ کیسے بھول گئی کہ مرد کی زندگی میں محبوبہ اور وہ بھی گم گشتہ ماضی کی' سے زیادہ مسلم حقیقت اس کی بیوی ہوا کرتی ہے۔ وہ اسے چاہتا ہے سراہتا ہے اس کی وفاؤں پر اس کی بیوی کا حق ہے اور مجھ جیسی بے وقوف یہ سوچے بیٹھی تھی کہ وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتا ہوگا۔ مرد کی محبت کیا چیز ہے؟

غبار خاک۔ چڑھا ہوا دریا یا پھر کالی گمبھیر رات کا طلسم.....
جو تمام ہو جاتا ہے۔

"بیگم صاحب۔ بیگم صاحب اسے کہاں رکھوں؟" بشیر مالی اسے کب سے آوازیں لگا رہا تھا مگر وہ کہیں اور تھی۔ اب ہی ہوش میں آئی تھی۔

"ہاں رکھ دو یہیں کہیں۔" اس نے کھرپی وہیں پھینک کر اپنے گرد آلود ہاتھ جھاڑے اور کوفت و بے زاری سے کہہ کر گھر کے اندرونی حصے کی جانب بڑھ گئی۔ مالی جو اس کی ہدایات سے سخت تنگ آیا ہوا تھا اس نے اطمینان سے سر ہلا دیا۔ وہ اندر آئی۔ وہ باہر جانے کے لیے رات والے لباس میں جو خیری نے صبح ہی دھو کر سکھا کر پریس کر کے رکھ دیا تھا ہاتھ میں اپنا کالا سیاہ لیدر کا بریف کیس تھامے کھڑا تھا۔

"ماہ بیگم!" اس کے ساتھ کھڑے شہباز نے گویا اسے متوجہ کیا۔ "مہمان تشریف لے جا رہے ہیں انہیں الوداع کیجیے میں تو کہتا ہوں لنچ کر کے جاتے آپ۔ بخدا برسوں بعد کوئی ایسا شخص ملا ہے۔ جس کی کمپنی میں 'میں لمحہ بھر بھی بور نہیں ہوا۔'" وہ بہت خوش دلی سے کہہ رہا تھا۔

"آپ کی میزبانی اور خاطر تواضع نے تو مجھے اچھا خاصا زیر بار کر دیا ہے خانزادہ صاحب۔ کبھی اسٹیٹس آئیں تو ہمیں بھی شرف میزبانی بخشیے گا۔" وہ بھی اخلاقاً بولا۔ ایک بات طے تھی یہ شخص اسے واقعی اچھا لگا تھا۔

"ضرور۔ ضرور کیوں نہیں آپ بھی فیملی کے ساتھ آئیں کبھی۔"

"ان شاء اللہ زندگی رہی تو" اچھا اب اجازت۔ گاڑی آگئی ہے ادھر سے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے اس میں بھی خاصا وقت صرف ہو گا پھر فلائٹ لینی ہے۔ اچھا اللہ حافظ آپ کی مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔" اس نے آخری جملے بالکل خاموش کھڑی ماہ کو نظر میں رکھ کر ادا کیے۔

"خدا حافظ!" اس نے ہولے سے کہا تو تھا مگر وہ سن نہیں سکا اور باہر نکلتا چلا گیا۔

"کچھ لوگوں سے مل کر زندگی کتنی اچھی لگنے لگتی ہے۔ حمدان صدیقی صاحب کمال کے آدمی تھے' کہنے کو ہم کل ہی ملے ہیں' مگر لگتا ہے گویا برسوں کی شناسائی ہو۔ کبھی اسٹیٹس گئے تو چلیں گے ان کی طرف۔ ماہ بیگم آپ کیوں یہیں کھڑی ہیں۔ خیری کو ذرا لنچ میں سندھی بریانی کا تو کہہ دیں بلکہ ایسا کریں آپ ہی بنالیں۔ کافی دن سے آپ کے ہاتھ کی کھائی نہیں پھر آپ کی طرف کی ڈش ہے آپ سے اچھی بھلا خیری بنا سکتی ہے؟"

وہ اسے کندھوں سے تھام کر کہتا ہوا چھوٹی ٹی وی لاؤنج کی جانب چل دیا۔

پتا نہیں کیوں ماہ کو لگا جیسے پورا گھر خالی ہو گیا ہو۔

☆ ☆ ☆

"اور وقت رخصت بھی میں تمہارے چہرے پر وفا تو کیا شناسائی کی رمق ڈھونڈنے میں بھی ناکام ہی رہا۔" اس نے گاڑی کی بیک سے سر ٹکا کر سوچا۔ باہر بڑی تیزی سے منظر پیچھے بھاگے جا رہے تھے۔ اس کے تھکے تھکے ذہن کی طرح۔

"میں نے ہمیشہ تمہارے سکھ اور خوشیوں کے لیے دعا مانگی تھی۔ کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم سے زندگی میں پھر یوں ملاقات ہوگی۔ تم سکھی بھی ہو اور بہت خوش بھی' میرے دل کو تو قرار آجانا چاہیے مگر آیا نہیں۔

گو کہ میں جانتا ہوں کہ تم روایات میں جکڑی عورت ہو مگر کیا میری محبت اور وفائیں اس بات کی متقاضی نہیں تھیں کہ تم ایک لمحے کے لیے ہی سہی میرا حال ہی دریافت کر لیتیں۔ مجھ سے یوں رکھائی اور بے اعتنائی نہ برتیں۔ اس درجہ اجنبیت تھی تمہارے انداز میں کہ میں یہ سوچتا ہی رہ گیا کیا یہ تم ہی ہو جسے میں نے ان گزرتے ماہ و سال میں بے طرح چاہا ہے؟ لوگ سچ ہی کہتے ہیں دنیا میں عورت کی محبت سے زیادہ ناپائیدار کوئی شے نہیں۔ تو اس سے وفا کی امید لگانا بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے صحرا میں پانی کو تلاش کرنا۔ میں جانتا ہوں مگر م شاہ نے ہم سے چال چلی تھی اور ہم دونوں مات کھا گئے۔ تم قصوروار نہیں تھیں یقیناً "مجبور کر دی گئی ہو گی میری دعائیں بھی اسی لیے ہمہ وقت تمہارے لیے تھیں اور میں آج مطمئن ہوں کہ میری دعائیں مستجب ہوئی ہیں۔ میں بھی اپنی زندگی میں مطمئن ہوں مگر خوش نہیں۔ ہر چند کہ میری بیوی بہت اچھی ہے' مگر میں نے محبت تو تم سے کی تھی نا۔ اور محبت تو تم نے بھی کی تھی مگر خیر۔

تمہیں تو اب یاد بھی نہیں ہو گا کہ ہم ہر بار ملاقات کے اختتام پر ایک دوسرے کی کوئی چیز عادتاً "رکھ لیا کرتے تھے' مجھے معاف کرنا۔ میں اس بار بھی تمہاری اک چیز اپنے ساتھ لے آیا ہوں۔" اس نے گاڑی کی سیٹ بیک سے اپنا گھنے بالوں والا سر اٹھایا اور شرٹ کی پاکٹ سے کچھ نکالا پھر اس نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس کے اک خفیہ خانے میں بڑی احتیاط سے ماہ نور کے کان سے گرا یاقوت اور ہیرے جڑا وہ ستارہ رکھ دیا جس کا لک ڈھیلا تھا اور جو اس نے کچن کی زمین سے اٹھایا تھا۔

گاڑی شاپنگ سینٹر کے پارکنگ میں داخل ہو رہی تھی اسے تابندہ کے لیے ڈیز انر ڈریسز خریدنے تھے۔ اس نے گہری سانس لے کر بریف کیس دوبارہ بند کیا۔ یقیناً "یہ بندہ اس نے اپنے اسی پرسنل لاکر میں رکھنا تھا جہاں ماہ نور سے منسوب دیگر اشیا اپنی قدر و قیمت پر نازاں بڑے آرام سے محفوظ تھیں۔

حمدان کے دل میں اس کی محبت کی طرح۔

☆ ☆ ☆

"تو تم چلے گئے۔" ماہ نور پچھلے کئی گھنٹوں سے اپنے کمرے سے ملحقہ ٹیرس پر کھڑی تھی۔ شام کا ملگجا سا اندھیرا ہر شے پر حاوی تھا۔ شہباز آؤٹنگ کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ وہ تو اسے بھی گھسیٹ رہا تھا مگر اس نے خرابی طبیعت کا بہانہ بنا کر اسے ٹال دیا۔

"تمہیں تو جانا ہی تھا تو پھر میں اتنی مضطرب کیوں ہوں؟" اس نے دھندلی آنکھوں سے گارڈن پر پھیلتے اندھیرے کو دیکھا۔

"شاید اس لیے کہ یہ پاگل دل جان گیا ہے کہ برسوں سے جو خوش فہمی اس نے پال رکھی تھی آج وہ تمام ہوگی۔ کیا تھا اگر یہ بھرم آج بھی قائم رہتا میری آئندہ شامیں اتنی تنہا اور اداس تو نہ ہوتیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ اب یہ ہی اس زندگی کی حقیقت ہے۔ میرا منصب مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اپنے شوہر کے ہوتے ہوئے کسی اور کے بارے میں سوچوں مگر اس دل کا کیا کروں۔ جس نے آج بھی ہماری محبت کی اس روایت کو دہرایا ہے جو شاید تمہیں یاد بھی نہ ہو۔"

اس نے گالوں پر بہتے آنسو ہاتھوں کی پشت سے پونچھے اور آہستگی سے پلٹ کر کمرے تک آئی۔ ڈریسنگ روم میں بنے دیوار گیر وارڈروب کے سب سے نچلے خانے کی چابی گھمائی۔ پھر اٹھی اور اپنے تکیے کے نیچے سے کچھ نکالا۔

یہ گرے اور نیلا رومال حمدان کی جیب سے گرا تھا اور اس نے نظر بچا کر کسی متاع کی طرح اٹھا لیا تھا۔

اس نے یک لخت اسے مٹھی میں بھینچا اور بڑی احتیاط سے وارڈروب میں ٹھیک وہیں رکھ دیا جہاں کچھ بے ضرر سی یادیں بکھری پڑی تھیں۔ وارڈروب کا پٹ بند کر کے وہ جو نہی پلٹی لان سے کچھ مانوس سے شور کی آوازیں ابھریں۔

اس کے بچے پکنک سے لوٹ آئے تھے۔ اک دھیمی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کیا۔ اس نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے گال رگڑے۔ بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ کپڑوں کی شکنیں ہاتھ ہی سے درست کیں۔ اور اپنے بچوں کے استقبال کے لیے کمرے سے باہر قدم رکھ دیے۔

قانتہ رابعہ

"اوئے بگلے! ادھر آؤ۔" عافیہ نے منعم عرف نومی کو کھینچ کے اپنے قریب کیا اور گرم بلکہ گرما گرم جیکٹ پہنانے لگیں۔ گرما گرم اس معنی میں کہ جیکٹ کو ہیٹر کے قریب لٹکا کے گرم کیا گیا تھا۔ جیکٹ دیکھتے ہی نومی چیخنے چلانے لگا۔

"نہیں۔ پلیز نہیں عافیہ مامی! میں جیکٹ نہیں پہنوں گا۔" اس نے احتجاج کرتے ہوئے اپنی جرسی اوپر کی۔

"یہ دیکھیں! سب سے نیچے بنیان پھر ہائی نیک پھر سویٹر پھر شرٹ اس کے اوپر جرسی اور اب جیکٹ۔" وہ صحیح معنوں میں احتجاج کر رہا تھا۔

"عافیہ مامی! میرا دم گھٹ جائے گا۔۔۔ پلیز!"

اس کے چیخنے چلانے کے دوران کنٹوپ بھی پہنا دیا گیا۔ اس کے کان گردن اور سر کو ڈھانپنے والا ٹوپ۔۔۔ کنٹوپ پہنتے ہی اسے چپ لگ گئی۔ وہ قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔۔۔ بہت دیر تک وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہا۔ پھر آہستہ سے بڑبڑایا۔

"یہ میں ہوں۔۔۔ جیسے برفانی ریچھ یا بھالو۔"

عافیہ مامی ہنس پڑیں۔ نومی نے بالکل صحیح تجزیہ کیا تھا۔ اس کے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جسے دو دو مرتبہ ڈھانپ نہ دیا ہو' چند لمحوں کے بعد پھر وہ اپنی پرانی ٹون میں واپس آگیا۔

"عافیہ مامی ٹرین میں بیٹھ کر پتا ہے کیا ہو گا؟"

"کیا ہو گا؟" عافیہ مامی نے پوچھا۔

"وہ جہلم سے نکلتے ہی میں یہ جیکٹ اتار دوں گا' گجرانوالہ پہنچ کر کنٹوپ اتاروں گا۔ اس کے بعد خانیوال پہنچ کر جرسی' پھر صادق آباد پہنچ کر سویٹر بھی اتاروں گا۔ جب حیدر آباد آئے گا تو ٹائٹس' موزے سب اترے ہوئے ہوں گے۔ میں خالی شلوار قمیص میں کسی شریف انسان کی اولاد نظر آ رہا ہوں گا اور میرا اترا ہوا پہناوا ٹرین کے فرش پر لنڈا کے ڈھیر کی شکل اختیار کر چکا ہو گا ہاہاہا"

وہ خود ہی اپنی بات کا مزہ لے رہا تھا۔

"خبردار جو ایسے کیا۔" عافیہ مامی نے آنکھیں دکھائیں۔ "ہر سال وہاں سے وہ کپڑے پہن کر چلے آتے ہو اور ہر سال ہمیں تمہارے لیے گرم کپڑے خریدنا پڑتے ہیں۔ اب آرام سے اتار کر تہہ لگا لگا کر رکھتے جانا اور کراچی پہنچ کر بیگ میں رکھ دینا۔ اگلی دفعہ جب دسمبر کی چھٹیوں میں آؤ گے تو یہ بیگ ساتھ لے آنا۔۔۔ یہ گلوز امریکہ سے گلو بھائی نے بھجوائے ہیں تمہیں کیا پتا ان کی قیمت پاکستانی کرنسی میں کتنی بنتی ہے۔ آرام سے اتار کر بیگ میں ڈال دینا ورنہ گم ہو جائیں گے۔"

عافیہ مامی نے تنقیدی نظروں سے نومی کا جائزہ لیا۔ ہر لحاظ سے وہ سردی پروف ہو چکا تھا۔ عافیہ مامی کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی۔

ان کی اکلوتی نند ماریہ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں اسلام آباد میکے آتی تھی اور سب کی دوڑیں لگ جاتی تھیں۔ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن سال میں ایک دفعہ ہی تو آسکتی تھی۔ خوب خاطر مدارات ہوتیں بالعموم مری سوات تک کا چکر بھی لگ جاتا۔ پنڈی باڑے سے خوب خریداری ہوتی واپس جاتی تو ہر وہ معنوں میں لدی پھندی ہوتی۔

اب کے امی کی بیماری کی وجہ سے آنا پڑا جو اتنا طویل قیام ہو گیا کہ کراچی واپس جاتے جاتے دسمبر کیا جنوری بھی آدھا گزر گیا تھا۔ اب واپس جانے کا پروگرام بنا تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔ کوئی سردی سی سردی پڑی اسلام آباد میں اس مرتبہ؟

اسلام آباد میں پیدا ہونے پلنے بڑھنے جوان ہونے والی ماریہ جو دس سالہ کراچی میں قیام کے دوران اسلام آباد میں بہت سردی ہے کا ہر سال سنا کرتی تھی چشم دید گواہ بن گئی۔ ماں کی وفات کے بعد واپسی پہ دل ویسے ہی پگھلا جا رہا تھا۔۔۔ بار بار آنسو پونچھتی اور بے دم ہو کر گر جاتی۔

"بھئی تم نے تو ماں کی خدمت کر کے بڑا اجر کمایا ہے۔" جیسے فقرے بھی اس کا غم غلط نہ کر سکے۔ ماں سے جدائی کے دکھ نے اسے اس قدر نڈھال کر رکھا تھا کہ وہ سفر کی تیاری کے لیے اٹھتی اور پھر مٹی کے ڈھیر کی طرح ڈھے جاتی۔

عافیہ کی ذمہ داری نومی کو ٹرین میں ہونے والی متوقع ٹھنڈ سے محفوظ رکھنے کے لیے کپڑے پہنانے کی تھی جبکہ انیلا' ماریہ کی چھوٹی بھابھی کی ذمہ داری راستے کے لیے طرح طرح کے پکوان تیار کرنے کی تھی' سب سے پہلے اس نے چپس تلے' پھر سینڈوچز' برگر' اس

کے بعد سونف اور ثابت دھنیے کی یخنی والے پلاؤ کے ساتھ چپٹ پٹے کباب۔۔۔ میکرونیز۔۔۔ صبح سے باورچی خانے سے اشتہا انگیز خوشبوئیں آرہی تھیں۔
نومی خوشی خوشی ہر چیز کو چکھ کر نعرے لگارہا تھا۔
"واہ بھئی واہ ممانی ہوں تو ایسی لگتا ہے سارے سال کی حسرتیں اس سفر میں پوری ہوجائیں گی۔"

گا ہے بگا ہے گھر کے سارے افراد ماریہ کو دیکھ رہے تھے۔ پہلی دفعہ ماں کے بعد وہ اپنے گھر جارہی تھی اور رونا نہیں تھم رہا تھا۔
ماریہ کی بڑی بھابھی ثمن نے نومی کا اور ماریہ کا تمام سامان پیک کرنے کی ذمہ داری لی تھی اور بحسن خوبی یہ ذمہ داری بھی ادا کرچکی تھیں۔ گھر کے کونے کھدروں میں چار ماہ سے بکھرا سامان اکٹھا کرکے پیک کرچکی تھیں۔ بالآخر رخصت کا وقت آگیا۔ سب نے گلی کے نکڑ تک ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہا۔ اسٹیشن پر ٹرین موجود تھی۔
بھائی نے سارا سامان سیٹ کیا از سر نو ہدایات دہرائیں۔
"اپنا دھیان رکھنا۔ الا بلا نہ کھانے دینا اسے یہ دیکھو نظروں سے نہ او جھل ہو جائے۔" انہوں نے نومی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
ٹرین آنے اور روانہ ہونے میں پندرہ منٹ لگے۔
"پہنچ کر اطلاع ضرور دے دینا۔" بھیا نے رسمی سا فقرہ کہا اور ماریہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر پلیٹ فارم سے باہر چلے گئے۔
ماریہ کے بہت دیر سے رکے آنسو تمام سرحدیں پار کرکے بہہ نکلے۔
ماں موئی تے مک گئے میکے کیہہ کڑیاں دا جینا ۔۔۔۔"

برسوں پہلے پڑھا شعر یاد آگیا تمام راستے وہ روتی ہی رہی۔ پل بھر کے لیے ماں کا چہرہ نظروں سے اوجھل نہ ہوا۔ اس نے حیرت سے سوچا آج تک اس نے کسی سفر میں امی کو اتنا یاد نہیں کیا تھا جتنا آج۔۔۔ شاید دنیا

ٹھیک کہتی ہے۔ مائیں زندہ ہوتی ہیں تو آس پاس ہوتی ہیں مرنے کے بعد دلوں کے اندر آبستی ہیں۔
جہلم پہنچنے سے پہلے فون آنا شروع ہوگئے۔ اسلام آباد والے پوچھتے۔ "کتنا سفر ہوگیا۔"
کراچی والے پوچھ رہے تھے "کتنا سفر باقی ہے۔"
اونگھتے ہوئے سفر تمام ہو ہی گیا۔ اس نے سامان کی سمیٹا سمیٹی کی ٹرین رکنے سے پہلے ہی نومی نے بابا کو دیکھ کر چھلانگ ماردی۔ سامان گاڑی میں رکھ کر ابھی ریلوے کراسنگ تک بھی نہیں پہنچے تھے کہ گاڑی پر زور سے کوئی چیز لگی۔ شیشہ کرچی کرچی ہوگیا۔ گاڑی روکنے کا اشارہ پاکر ماریہ کے میاں انیس نے گاڑی روکی۔ اللہ جانے وہ تھے یا چار' پنجابی تھے یا پٹھان بس لوٹنے والوں نے جی بھر کے لوٹا۔۔۔ موبائل' پرس' بانڈ میں موجود چوڑیاں تک اتروا کر جانے کی اجازت ملی۔
نومی' ماریہ دم سادھے بیٹھے رہے۔ نومی کا بیکار سا موبائل کہیں سیٹ کے نیچے گرا ملا۔ بیل ہوئی۔۔۔ ماریہ نے لرزتے ہاتھوں سے آن کیا۔
"ماریہ! تمہارا اور انیس کا نمبر بزی جارہا ہے خیریت ہے' دونوں ہی بات کررہے ہو کہیں؟" عافیہ نے پوچھا۔
ماریہ پھوٹ پھوٹ کر رودی۔۔۔ کیا کہتی۔
"آپ نے سردی سے بچنے کے لیے بندوبست بہت اچھا کیا کھانے پینے کی راستے میں کوئی تنگی نہیں ہوئی۔۔۔ بستر بڑا آرام دہ بنا کردیا تھا کہ سفر میں نیند آرام و سکون کی ہو۔ تکیے تک ہمراہ کردیے۔ بس جان و مال کی حفاظت و سلامتی کی دعائیں دینا بھول گئے۔ اس لیے بھول گئے کہ ممتا کے علاوہ یہ کام کوئی کرہی نہیں سکتا۔" ماریہ ہچکیوں کے ساتھ رو پڑی۔
ماں تھی تو سفر پر روانہ کرتے ہی صدقہ دے دیتی تھی۔ حفاظت کے لیے دعاؤں کا حصار باندھ دیتی تھی۔ باقی لوگ بھی یہی کام بغیر یاد دلائے کرنے لگ جائیں تو ماں کو کون روئے اور یاد کرے۔۔۔؟؟

☆

سحر ساجد

مکمل ناول
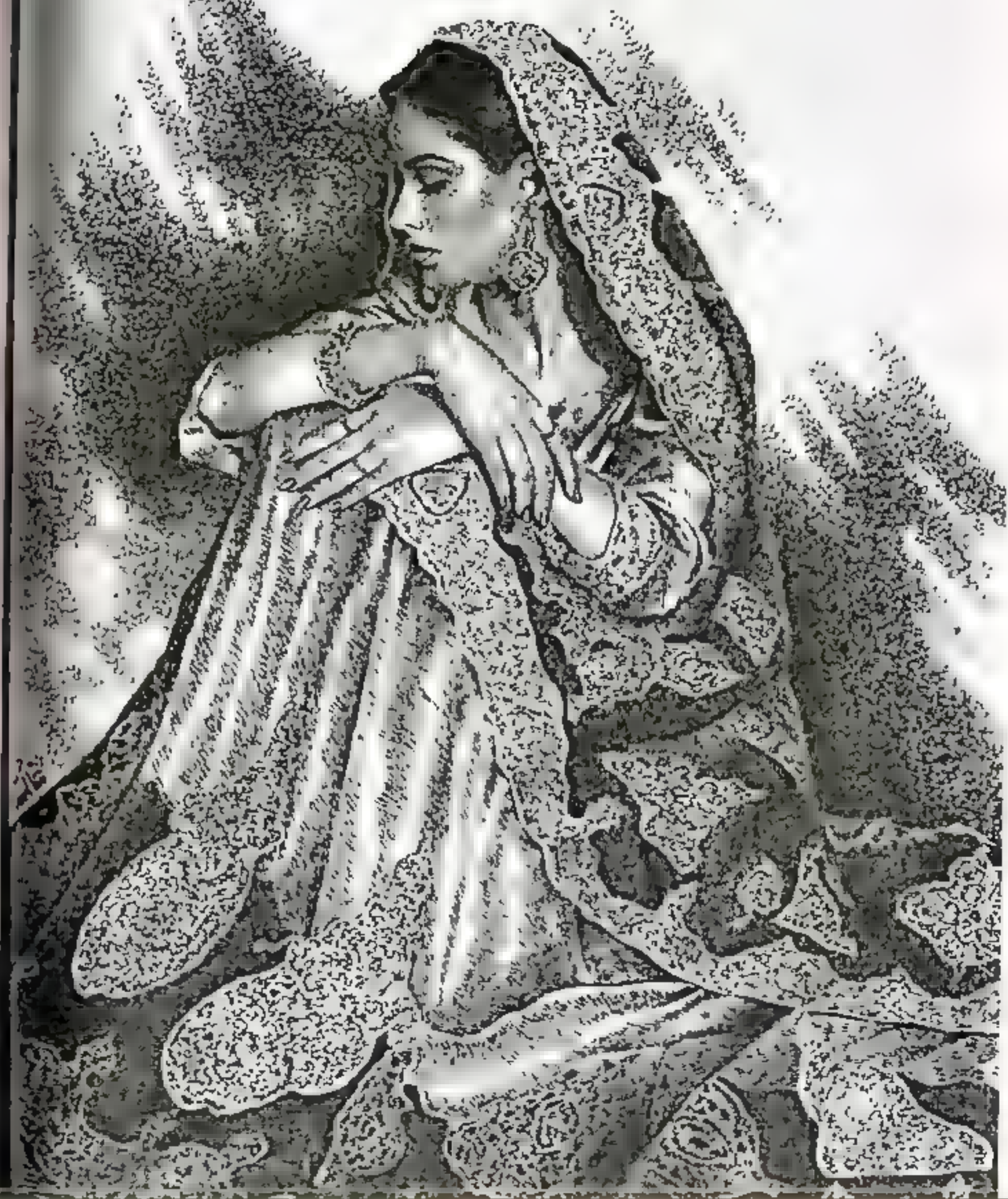
وہ اسے بلیو جائے اس کی گہرے نیلے رنگ کے کور والی ڈائری اٹھا لایا تھا۔ یعنی کہ وہ چوری کر کے آرہا تھا۔ حرکت تھی تو بہت غیر اخلاقی اور نامناسب مگر۔

انسان کی زندگی میں کچھ "مگر" یوں تیزی کے ساتھ داخل ہوتے ہیں کہ اس کے بعد اس کے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں یکدم غائب ہو جاتی ہیں اور وہ اس "مگر" کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔

وہ بھی مجبور ہوا تھا اور پھر... وہ ڈائری اٹھا لایا تھا۔

ابھی ابھی وہ دائیں طرف کا ٹیرس پھلانگ کر اپنے والے ٹیرس پر آیا تھا کیونکہ اس کے ہاتھوں میں چوری شدہ "مال" تھا۔

وہ چند لمحے اس ڈائری کو دیکھتا رہا یوں جیسے وہ خود کو اس احساس جرم سے باہر نکالنا چاہتا ہو یوں کسی کی پرسنل ڈائری کو پڑھنا۔ بے اختیار اس نے اپنا ماتھا مسلا تھا۔

تجسس انسان سے بڑے بڑے کام کروا لیتا ہے۔

"مگر یہ کیا...؟" اس نے جلدی جلدی اگلے دو تین صفحے پلٹے۔

پہلا... دوسرا... تیسرا صفحہ۔

سب خالی تھے وہاں پہ کسی کا نام کوئی انتساب کچھ بھی تو نہیں تھا اور اس سے اگلے چند صفحے۔

وہاں چند آڑی ترچھی ٹیڑھی میڑھی لکیریں کھینچی گئی تھیں اور بعض لکیریں تو اتنی شدت سے کھینچی گئی تھیں کہ صفحہ وہاں سے ادھڑ سا گیا تھا۔

اس نے چند اگلے صفحے پلٹے۔

ان کی حالت بھی باقی صفحوں کی طرح ہی تھی۔

وہ بری طرح جھنجھلایا اور ڈائری اپنے پیچھے بیڈ پر پھینکی اور وہ خود سن ہو کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ڈائری وہاں سے اٹھا کر لا رہا تھا اس کے ذہن میں صرف اس کو پڑھنے کا تجسس تھا اور اب جبکہ وہ خالی نکلی تو اس کے ذہن میں دوسرا خیال وہ ہی آیا تھا جو کہ کسی بھی باشعور ذہن میں آنا چاہیے۔

"مجھے یہ ڈائری اسی طرح واپس رکھ دینی چاہیے جس طرح سے میں یہ اٹھا کر لایا تھا۔" اور اسی خیال

کے تحت اس نے مڑ کر ڈائری کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر ڈائری کو ہاتھ لگانے سے بھی پہلے اسے کرنٹ لگا تھا۔

اس نے ڈائری اپنے کندھے سے اوپر مڑے بغیر پڑے پھینکی تھی اور یوں پھینکنے سے ڈائری کے درمیانی صفحات کھل گئے تھے۔

ایک بار پھر اس نے ان ہی جذبات کا شکار ہو کر ڈائری اٹھائی تھی۔ "وہ گہرے نیلے رنگ کے کور والی ڈائری "اس" تک پہنچ چکی تھی۔"

✡ ✡ ✡

عنایا سکندر۔۔۔

یہ کسی لڑکی کا نام نہیں تھا' یہ ایک "پریشانی" کا نام تھا اور ایسی پریشانی جو آپ کو ایک کے بعد دوسرا سانس نہ لینے دے۔

پیدائش سے لے کر عمر کے ایک لمبے عرصے تک۔۔ وہ ایک مسلسل سردرد کی طرح تھی۔

اس کی پیدائش قبل از وقت ہوئی تھی' جس کے بعد وہ تین ماہ تک انکیوبیٹر میں رہی تھی۔

تین ماہ کے بعد وہ بچ تو گئی تھی مگر مسلسل کسی نہ کسی موسمی بیماری کا شکار رہتی تھی اور یہ اوپر تلے بچپن کی صورت میں آنے والی بیماری کی وجہ بھی اس کی قبل از وقت پیدائش تھی۔

پھر بھی خزینہ سکندر اور سکندر علوی کے لیے وہ کسی قیمتی خزانے کی طرح تھی۔ وہ انہیں اپنے دونوں بڑے بیٹوں سے بڑھ کر عزیز تھی۔ یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کی ضد پوری نہ کی جائے' اس کے ناز نہ اٹھائے جائیں۔ اوپر سے سکندر اور ان کے بھائی ایک گھر میں ہی رہائش پذیر تھے سو یہ بات صرف خزینہ اور سکندر کے گھر تک محدود نہیں تھی بلکہ وہ پوری علوی فیملی کے لیے اسپیشل چائلڈ تھی۔ اس کو اسپیشل بنانے میں بڑا ہاتھ اگر اس کی کمزور صحت کا تھا تو دوسری بڑی وجہ اس کا۔ علوی فیملی میں بچوں میں سب سے چھوٹا ہونا بھی تھا۔

عدیل اور کامران تو اس کے بھائی تھے' سو انہوں نے تو اس کے ناز نخرے اٹھانے ہی تھے' مگر داؤد' اسما' نعمان جو کہ اس کے تایا' مرتضیٰ علوی کے بچے تھے' وہ بھی اسی طرح اس سے لاڈ کیا کرتے تھے۔ اسے علوی فیملی میں کسی شہزادی کا سا رتبہ حاصل تھا۔ ایسی شہزادی جس کے لیے دادا سے لے کر تایا تک گھوڑا بن کر تینوں پورشنز کی سیر کروا سکتے تھے تو دادی سے لے کر داؤد تک اس کی چاکلیٹ' آئس کریم' کینڈیز وغیرہ کی فرمائشیں پوری کر سکتے تھے۔

وہ ایک کمزور بازوؤں اور پتلی پتلی سی ٹانگوں والی کمزور سی بچی تھی' جس کے چہرے کی رنگت اتنی زرد تھی کہ اس پہ موجود نیلی اور ہری رگیں صاف طور پر دیکھی جا سکتی تھیں۔ یہی حال کچھ اس کے ہاتھوں کا تھا جو تھے تو لمبے اور مخروطی انگلیوں والے مگر اتنے کمزور تھے کہ کسی ڈھانچے کے ہاتھ لگتے تھے' نہ صرف ہاتھ بلکہ اس کی جسامت بھی ایسی تھی کہ اسے جتنے تنگ کپڑے پہنا لو' وہ اس پر کھلے ہی دکھتے تھے۔ وہ اتنی کمزور تھی کہ سب اسے پہلی نظر میں "بیمار" قرار دے دیتے تھے۔

البتہ داؤد مرتضیٰ کے ساتھ تعلق ذرا مختلف تھا۔ اس کا شمار "دوستوں" میں ہوتا تھا اور اس کی بنیادی وجہ عمروں کا وہ فرق تھا جو عنایا کا باقی کزنز کے مقابلے میں داؤد کے ساتھ کم ترین سطح پہ تھا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اکثر جوائنٹ فیملی سسٹم میں ہم عمر بچے یوں ہی ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔ سو وہ دونوں بھی تھے۔

عنایا سکندر اس ایک کنال کے گھر کے تین پورشنز کی غیر مشروط طور پہ شہزادی تھی اور اس کا یہ مقام اس سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

لیکن کبھی نہ کبھی۔۔۔ کہیں نہ کہیں یہ مقام بدل بھی جاتا ہے یا بدلا نہ جائے تو اسے تقسیم کرنا پڑ جاتا ہے' سوچا ہے بدلاؤ ہو یا شراکت داری۔۔۔ دونوں تکلیف دہ ہوتے ہیں اس کے لیے بلا شرکت غیرے اس مقام پر فائز ہوتا ہے۔

عنایا سکندر کو غیر متوازن پیار اور توجہ ملی تھی اور یہ چیز بچے کی زندگی میں بہت سی دوسری چیزوں کو متوازن نہیں رہنے دیتی۔ اس کا ذہن اس بات کو قبول کر لیتا ہے کہ ہر وہ چیز اس کی ہے جس کی وہ خواہش کرے۔ اور یہ چیز بچوں کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔

✡ ✡ ✡

اس نے مریم شہباز کو یونیورسٹی کے یوتھ کارنیول میں دیکھا تھا۔ وہ سہ روزہ فیسٹیول تھا' جس میں ملک گیر یونیورسٹیز سے بہت سے اسٹوڈنٹس آئے تھے۔ خود وہ کراچی سے آیا تھا۔ مریم شہباز کوئی مقابلہ جیتنے کی وجہ سے اس کے نوٹس میں نہیں آئی تھی بلکہ وہ اپنی خوب صورتی کی وجہ سے اس کی توجہ کا مرکز بنی تھی۔

وہ یو ای ٹی لاہور سے آئی تھی اور اپنے گروپ کی واحد لڑکی تھی جو سر پہ دوپٹا لیتی تھی جو اس کے پورے جسم کو ڈھانپتا تھا۔

اس کے چہرے کی رنگت پٹھانوں کی طرح کی تھی اور اس چہرے پہ دو چیزیں کسی نیون سائن کی طرح جگمگاتی تھیں۔ اس کی آنکھیں اور چیری جیسے سرخ ہونٹ

اور سجاد ابراہیم۔۔۔ ہر خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اسے لگتا تھا کہ وہ واقعی اس کی محبت میں مبتلا ہو چکا ہے۔ لڑکی جتنی خوب صورت ہوتی اس کی محبت کی "شدت" کا گراف بھی اتنا ہی بلند ہوتا تھا۔ مگر اس بار جوبات سجاد ابراہیم کے لیے پریشان کن تھی وہ یہ تھی کہ محض تین دنوں میں وہ مریم سے کیسے رابطہ کرے اور پھر مریم کو متاثر کر کے اس سے محبت کی پینگیں بڑھا سکے۔ ظاہر ہے یہ اتنا آسان نہیں تھا' وہ ناکام ہوا۔ تین دنوں میں وہ یہ تک نہیں جان سکا تھا کہ مریم کا تعلق کہاں سے ہے۔

اسے کراچی واپس آنا پڑا' مگر لگتا تھا کہ اب کی بار اسے صحیح والی "محبت" ہو گئی تھی کیونکہ دو سال گزرنے کے باوجود اسے مریم شہباز نہیں بھول سکی تھی۔

دو سال بعد وہ پی او ایل میں انٹرن شپ کرنے کے لیے اسلام آباد آیا تھا۔

اسلام آباد جیسے ٹھنڈے شہر میں انٹرن شپ کا دورانیہ پورا کرنا مشکل کام تھا مگر یہ مشکل مشکل نہیں رہی تھی۔

پورے دو سال بعد وہ اسے وہاں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

پھر وہ ذرا سا سنبھلا۔ گہری سانس لی۔۔ لاشعوری طور پر اپنی ٹائی ٹھیک کی اور کوٹ صحیح کیا۔ اس وقت اسے شدت سے اس چیز کا بھی احساس ہوا تھا کہ لڑکیاں کیوں اپنے پرس میں ہر وقت آئینہ رکھتی ہیں۔ بہرحال اچھے خاصے جمے جمائے بال' ہاتھ پھیر کر اس نے انہیں ٹھیک کیا کرنا تھا۔ البتہ خراب ضرور کر لیا تھا۔

آج سجاد ابراہیم کا جوائننگ ڈے تھا اور مریم شہباز کا بھی' بغیر پوچھے وہ جان گیا تھا کہ وہ بھی اس کی طرح انٹرنی تھی۔

وہ وزیٹر روم میں بیٹھی جوائننگ کے لیے اپنی درخواست لکھ رہی تھی اور اس نے سجاد کے آنے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔

"ہیلو۔!" اس نے مریم کے قریب جا کر مسکرا کر کہا۔

مریم چونکی' سر اٹھا کر اسے دیکھا اور پھر سر جھکا کر بڑے عام سے انداز میں جواب دیا۔ "ہیلو!"

وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔

"کیسی ہیں آپ؟" اس سوال پہ یقیناً" مریم کا چلتا قلم رکنا چاہیے تھا' سو رک گیا۔

اب کی بار اس نے حیران نظروں سے سجاد کو دیکھا۔

"سوری!"

"پہلے سے زیادہ خوب صورت ہو گئی ہیں آپ!"

"ایکسکیوز می!"

"میں بتا نہیں سکتا آپ کو یہاں دیکھ کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔"

اب کی بار مریم نے قلم چھوڑ کر تیز نظروں سے سجاد کی گہری ہوتی مسکراہٹ کو دیکھا تھا۔

"یہ پول والوں نے الو کے پٹھوں کو کب سے کال لیٹر بھیجنے شروع کردیے؟" اسے دیکھتے ہوئے وہ خاصے تیکھے لہجے میں بولی تھی۔

"جب سے انھوں نے آپ جیسوں کو لیٹر بھیجنا شروع کیے ہیں، جن کے سامنے ہم اچھے خاصے بندے واقعی الو نظر آتے ہیں۔" جواب ترنت اور بُرا مانے بغیر آیا تھا۔

مریم کو تلملانا چاہیے تھا' وہ تلملائی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا اور اس نے سرخ چہرے کے ساتھ اپنی چیزیں سمیٹنی شروع کردیں۔

"جارہی ہیں... کچھ کہیں گی نہیں؟" ہونٹ دبائے وہ جیسے اپنے قہقہے کو روکنے کی کوشش میں تھا اور مریم اس شخص کی ڈھٹائی پہ عش عش کر اٹھی تھی وہ چیزیں سمیٹ کر وہاں سے تو اٹھ گئی مگر وہ اپنا سامان سمیٹ کر اسلام آباد سے جاسکتی تھی نہ اس آفس سے....

سجاد ابراہیم اور وہ ایک ہی ڈپارٹمنٹ میں تھے اور مصیبت یہ تھی کہ وہ دونوں پیٹرولیم انجینئرز تھے۔ وہ چاہ کر بھی اس بلا سے چھٹکارا نہیں پاسکتی تھی۔

اور سجاد... اس نے کبھی بھی کسی لڑکی کے سامنے اس طرح اپنا امیج خراب نہیں کیا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی چیز تھی جس نے سجاد کو ایسا کرنے دیا تھا۔ شاید وہ مریم کا سرخ ہوتا چہرہ تھا یا پھر اس کا تلملانا....

اور اسے اپنا امیج خراب ہونے کی بھی فکر نہیں تھی کیونکہ وہ بہت اچھی طرح سے جانتا تھا کہ کیسے اس امیج کو ٹھیک کرنا ہے۔

یہ اس جیسے بندے کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا جو لڑکیوں کو کسی سائیکالوجسٹ کی طرح ڈیل کرتا ہو اور اس کا تجربہ اس کام میں کئی سال ہو۔

✡ ✡ ✡

علوی فیملی کے سارے کے سارے بچے امریکن گرامر اسکول میں پڑھے تھے۔

ان کے سارے بچے چاہے وہ پچھلی نسل کے ہوں یا اب کی... بہت لائق فائق ذہین اور غیر معمولی ذہانت کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ "ذہانت" جیسے علوی فیملی کی میراث تھی۔

وہ سارے کزنز پڑھائی کے علاوہ دیگر ایکٹیویٹیز میں بھی نمایاں نام رکھتے تھے۔

اور یہ عزت و فخر کا احساس صرف نئی نسل کو ہی نہیں تھا۔ ان بچوں کے باپ دادا بھی کسی سے کم نہیں تھے۔

عنایا کے والد نے اپنے وقت میں پنجاب یونیورسٹی سے کامرس کی فیلڈ میں گولڈ میڈل لیا تھا اور آج وہ ایک نجی بینک میں بطور پریذیڈنٹ کام کررہے تھے۔ اس کی پھپھو بھی کافی پڑھی لکھی تھیں۔ عنایا کے دادا بھی منسٹری آف فنانس میں رہ چکے تھے اور جہاں تک بات تھی مرتضیٰ علوی کی تو وہ چیف اکاؤنٹنٹ کے عہدے پر فائز تھے۔

وہ لاہور کے پڑھے لکھے خاندانوں میں سے ایک خاندان تھا۔ جن کے بچے اگر آؤٹ اسٹینڈنگ تھے تو یہ حیرت والی بات نہیں تھی۔ حیرت والی بات تو تب ہوتی جب کوئی ایسا نہ ہوتا۔

داؤد مرتضیٰ' علوی فیملی کی نئی نسل کا سب سے روشن ستارہ تھا اور یہ بات آگے چل کر تب ثابت ہوئی' جب اس نے انٹرنیشنل ورلڈ ایجوکیشنل گیمز کے مقابلے میں پوزیشن حاصل کی تھی۔ عنایا کی اسکولنگ جیسے گھر والوں کے لیے ٹینشن کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

وہ باقی بچوں کی طرح ذہین تھی نہ آؤٹ اسٹینڈنگ... وہ اوسط درجے کی لائن سے بھی نیچے تھی اور یہ جیسے گھر والوں کے ایک الیکٹرک شاک تھا۔

اس بات کا احساس خزینہ کو اس وقت ہوا جب انھوں نے مونٹیسوری سے بھی پہلے عنایا کو گھر میں ہی لائنز کھینچنے اور رنگ بھرنے سکھانے شروع کیے تھے تو اس نے عام بچوں سے زیادہ وقت لیا تھا۔ وہ خاندان کے باقی بچوں کی طرح چیزوں کو "فوراً" سمجھ نہیں پاتی تھی' لیکن ایک بات عنایا سکندر میں تھی کہ دیر سے ہی سہی مگر وہ سیکھ ضرور جاتی تھی اور اس کی یہ بات اس کے گھر والوں کو نظر نہیں آرہی تھی۔ ان کے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا کہ ان کی نسل میں ایک کند ذہن بچہ موجود ہے لیکن اس کے باوجود انھوں نے عنایا کو مطعون نہیں کیا۔ بلکہ دادا سے لے کر داؤد تک اپنی پوری کوشش کرتے تھے کہ عنایا کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوسکے۔

عنایا کی اس صورت حال نے اس کے لیے خاندان بھر کی ہمدردیوں میں اور اضافہ کیا تھا۔ اس کے لیے توجہ و پیار بڑھ گیا تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی اس کے ناز نخرے بھی بڑھ گئے تھے۔

✡ ✡ ✡

اس نے مریم کو سیٹ چھوڑ کر اپنی طرف آتا دیکھ لیا تھا اور اب وہ بظاہر بڑے انہماک سے کمپیوٹر پہ کام کررہا تھا' مگر اس کے ہونٹوں پہ وہ ہی چھیڑنے والی مسکراہٹ تھی۔ جسے مریم نے بھی دور سے دیکھ لیا تھا۔ سو وہ بھی بظاہر فائل میں لگے پیپرز کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی' مگر حقیقت میں وہ مسکراہٹ اسے دانت پیسنے پہ مجبور کررہی تھی۔

یہ اس دن کے بعد ان دونوں کا دوسرا ٹاکرا تھا اور سجاد کا "شریف" بننے کا پورا پورا ارادہ تھا' مگر وہ چہرہ... اسے دیکھتے ہی دل کے ساتھ ساتھ اس کی حرکتیں بھی بے قابو ہوجایا کرتی تھیں۔ مریم اس کی ٹیبل کے پاس آکر رکی اور بنا کسی تمہید کے بولنا شروع ہوگئی۔

اور سجاد کمپیوٹر چھوڑ کر اب پوری توجہ سے پلک جھپکے بنا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے کسی پراجیکٹ کی فیزیبلٹی رپورٹ تیار کرنے کے بارے میں بتارہی تھی' جس کے لیے ان دونوں کو فیلڈ میں جانا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ اسے اس پراجیکٹ کے چند مندرجات بھی بتا رہی تھی۔ وہ اسے دیکھے بنا فائل میں لگے پیپرز کو دیکھ کر بات کررہی تھی' مریم کو سو فیصد یقین تھا کہ وہ اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ وہ صرف اپنی خبیث حرکتوں میں مصروف تھا۔

تب ہی اچانک... اس نے بولنا چھوڑ کر سیدھا سجاد کی آنکھوں میں دیکھا سجاد کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی تھی۔

"آپ کو پتا ہے۔ میں نے ابھی ابھی آپ سے کیا کہا ہے؟" اس نے ٹھنڈے لہجے میں پوچھا۔ سجاد کو اسی سوال کی توقع تھی۔

جواب میں اس نے مریم کی باتوں کو اسی کے انداز میں دہرانا شروع کردیا تھا۔

مریم کا منہ کھلنا چاہیے تھا۔ مگر اس کے سامنے وہ ایسا نہیں کرسکتی تھی' لیکن اسے سجاد کی ذہانت کا اندازہ ہوگیا تھا' یعنی کہ وہ بیک وقت دو کام کررہا تھا۔

"میں نے کچھ مس تو نہیں کیا؟" اب وہ چھیڑنے کے سے انداز میں مریم سے پوچھ رہا تھا۔

مریم نے تیز نظروں سے اسے دیکھا اور وہ زور سے ہنس پڑا تھا۔

"اوکے... اوکے بی سیریس..." اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا "پلیز...!" اور پھر سامنے پڑی کرسی کی طرف اشارہ کیا مریم کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

پھر واقعی وہ بہت سنجیدہ اور مہذب انداز میں اس سے اس رپورٹ کے بارے میں بات کرتا رہا اور جب مریم سب کچھ طے کرکے وہاں سے اٹھنے لگی تو سجاد کی آخری بات نے پھر اسے تیز نظروں سے گھورنے پہ مجبور کردیا۔

"یو مین کہ میں فیلڈ میں نہ جاؤں؟" وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولی۔

"یس... میں کرلوں گا سب کچھ اور اگر آپ یہ سوچ رہی ہیں کہ بعد میں سارا کریڈٹ میں خود لے جاؤں گا تو بائے گاڈ! ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ رپورٹ میں ہم دونوں کا نام ہوگا۔"

"اور ایسا آپ کیوں کریں گے؟" تیز لہجے میں پوچھے جانے والے اس کے سوال پہ سجاد یک دم خاموش ہوا تھا۔

"میں آپ کو فیلڈ کی ذلالت سے بچانا چاہتا ہوں۔"

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد جواب آیا تھا۔

"وہ بھی کیوں؟" اس سوال پہ وہ صرف ایک گہرا سانس لے سکا تھا۔

مریم چند لمحے کینہ توز نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے مگر کیوں کہہ رہا تھا۔ یہ بھی وہ جان گئی تھی۔

"مجھے نول والوں نے یہاں کام کرنے کے لیے بلایا ہے اور میں کام کروں گی۔ چاہے مجھے اس کے لیے کتنا ہی ذلیل ہونا پڑے۔ آپ نے میرا خیال کیا مہربانی ہے آپ کی۔ آپ فیصل کا کیوں نہیں خیال کرتے جو بے چارا سارا دن ہی آپ کو بھی مجھے۔ کبھی باس کو چائے سرو کرتا رہتا ہے۔ اس کے ہاتھ سے ٹرے لے کر آپ اسے کیوں نہیں ذلالت سے بچاتے۔"

زندگی میں پہلی بار سجاد ابراہیم کا منہ سرخ ہوا تھا۔ وہ بھی ایک لڑکی کے ہاتھوں۔

"میں ایسی عنایات کی عادی نہیں۔" اس کا تیز لہجہ اب کی بار سرد تھا۔

اگر تھوڑی دیر پہلے وہ سجاد کی ذہانت سے متاثر ہوئی تھی تو اب یہی کیفیت سجاد کی تھی۔ جس طرح اس نے مریم کے ذہن کو جانا تھا' اسی طرح مریم نے بھی اس کا ذہن جانچ لیا تھا۔ یہ سجاد کی غلطی تھی کہ اس نے مریم کو عام لڑکیوں کی طرح سمجھا تھا۔

مگر وہ مریم تھی' مریم شہباز۔

اور پھر وہ اسے اپنے ساتھ فیلڈ میں "ذلیل" ہوتے دیکھتا رہا۔ تب ہی سجاد کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ واقعی وہاں کام کرنے آئی تھی اور کام کرنا کسی کے لیے بھی ذلالت کا باعث نہیں ہوتا۔ وہ لڑکی ہو کر انجینئرنگ پڑھ سکتی تھی تو وہ کام بھی کر سکتی تھی۔ فیلڈ میں خوار بھی ہو سکتی تھی۔

زندگی میں پہلی دفعہ سجاد نے کسی عورت کو گرل فرینڈ کی لسٹ سے باہر نکالا تھا۔

متاثر تو وہ اسی دن اس سے ہو گیا تھا جب اس نے مریم شہباز کو پہلی دفعہ دیکھا تھا' مگر وہ اس کی خوب صورتی تھی۔ اب اس کا کردار تھا جس نے سجاد ابراہیم کو عجیب سے انداز میں متاثر کیا تھا۔

وہ مقناطیس کی طرح مریم کی طرف کھنچا تھا۔ مریم نے اسے عجیب سے حصار میں باندھ لیا تھا کہ وہ چاہ کر بھی اس سحر سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ خوب صورتی وہ پہلی چیز تھی' جس نے سجاد ابراہیم کو متاثر کیا تھا اور اس کا کردار وہ آخری چیز تھی' جس نے سجاد کو ڈھیر کر دیا تھا۔

وہ پہلی لڑکی تھی جسے اس نے بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہا تھا اور وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسے ہوگا۔

اس دن کے بعد سجاد کا رویہ واضح طور پر مریم کے ساتھ بدلا تھا۔ فیلڈ میں گزارے گئے پندرہ دن جیسے ایک کے بعد ایک مریم کی پرتیں اس پہ کھولتے گئے تھے۔

اگر وہ لڑکیوں کو کسی سائیکاٹرسٹ کی طرح ڈیل کرتا تھا تو یہ کوالٹی مریم شہباز میں بھی تھی۔

وہ ان کی فیلڈ کا پندرھواں دن تھا۔ وہ اور مریم سڑک کے کنارے کھڑے تھے' روڈ پار کرنے کے لیے وہ دونوں ٹریفک سگنل بند ہونے کا انتظار کر رہے تھے تاکہ وہ آرام سے دوسری طرف جا سکیں۔ سجاد اس سے ذرا فاصلے پہ دو قدم پیچھے کھڑا تھا۔

"مریم! میپ رکھ لیا تھا گاڑی میں؟" اس نے اچانک خیال آنے پہ مریم سے پوچھا۔ مریم نے اس کی بات کا جواب دینے کے لیے اس کی طرف مڑ کر دیکھا تھا۔

اور بس۔

سڑک پر آنے والی تیز رفتار گاڑی کو اگر وہ پہلے دیکھ لیتی تو یقیناً" دو قدم پیچھے ہٹ جاتی۔ سجاد سے بات کرتے کرتے گاڑی کے تیز ہارن پہ اس نے چونک کر دیکھا۔ تب تک گاڑی اس کے قریب آچکی تھی۔ اور وہ گاڑی اسے پیچھے ہٹنے کا موقع دیے بغیر اس کے بہت قریب سے یوں گزری تھی کہ یک دم مریم لڑکھڑائی تھی۔ اس طرح لڑکھڑانے سے اس کا پاؤں بری طرح مڑا اور بے اختیار اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی اور وہ کھڑی نہیں رہ سکی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟" اسے گرتے دیکھ کر سجاد یک دم گھبرا کر اس کے پاس آیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے مڑ کر دور جاتی گاڑی کو انتہائی غصے سے دیکھتے ہوئے زیر لب گالی دی تھی۔

وہ سڑک کے کنارے پاؤں پکڑے بیٹھی تھی اور تکلیف کی شدت کا اندازہ اس کے چہرے سے لگایا جا سکتا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" اس نے پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"ہنس رہی ہوں۔ نظر نہیں آرہا کیا؟" جل کر کیے جانے والے تبصرے نے سجاد کو سٹپٹانے پر مجبور کیا۔

"آؤ' تمہیں گاڑی تک لے چلوں؟" اس نے کھسیا کر ہاتھ بڑھایا۔

مریم نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور پھر سجاد کو۔

"وہ یوٹرن نظر آرہا ہے نا۔ اُدھر سے گاڑی موڑ کر اس روڈ پہ لے آؤ۔"

وہ بھول گیا تھا کہ اس کے ساتھ مریم شہباز تھی۔

جس روڈ پر گاڑی کھڑی تھی' انہیں اسی روڈ سے سیدھا جانا تھا اور اب مریم کی وجہ سے اسے گاڑی اس روڈ پر لانی تھی۔ ایک خاصا لمبا چکر کاٹ کے۔ صرف اس لڑکی کے ہاتھ نہ پکڑنے کی وجہ سے۔

مگر وہ جھنجلایا نہیں۔ اسے غصہ نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے دل میں مریم کے لیے موجود جذبات میں کچھ اور شدت محسوس کی۔

گاڑی اس کے قریب لا کر روکتے ہوئے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا پھر اس نے مریم کو گاڑی کا سہارا لے کر اٹھتے ہوئے اور گاڑی میں بیٹھتے دیکھا تھا۔

وہ مریم کو ہسپتال لے گیا۔ واپسی میں وہ ایک نرس کے سہارے پٹیوں میں جکڑا پاؤں لے کر گاڑی میں بیٹھی تھی۔

"کتنا بل بنا؟" اپنا پرس چیک کرتے ہوئے جب مریم نے سجاد سے پوچھا تھا تو کوئی جواب نہ پا کر اس نے سر اٹھا کر سجاد کو دیکھا۔ وہ اسے اتنی خفگی اور شرمندہ کر دینے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ مریم واقعی شرمندہ ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے دوبارہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

مریم کو دو دن کا بیڈ ریسٹ بتایا گیا تھا۔ اس دن تکلیف کی وجہ سے وہ سجاد کو درخواست کا کہنا بھول گئی تھی' مگر اگلے دن جب اس نے آفس کال کر کے اپنی غیر حاضری کا بتانا چاہا تو اسے معلوم ہوا تھا کہ وہ دو دن کی میڈیکل لیو پہ تھی۔ پوچھے بنا وہ جانتی تھی کہ یہ کس کا کارنامہ تھا۔

"پتا نہیں اس شخص کو میرا گاڈ فادر بننے کا کیا شوق ہے؟" ایک گہرا سانس بھر کر فون رکھتے ہوئے اس نے سوچا۔

اسی دن اس کے کچھ قریبی کولیگز اس سے ملنے آئے مگر سجاد ان کے ساتھ نہیں تھا مگر اگلے دن اسے کوریئر سے ایک بکے اور ایک پارسل ملا۔ کچھ حیران اور پریشان ہوتے ہوئے اس نے وہ چیزیں وصول کی تھیں مگر جب اس نے بکے پہ لگا کارڈ کھولا تو اس کی حیرانی و پریشانی یک دم دور ہو گئی۔

چند لمحے وہ خفگی سے ان چیزوں کو گھورتی رہی جیسے وہاں چیزیں نہیں۔ سجاد تھا۔ پھر سر جھٹک کر اس نے گہرا سانس لیا۔ اس بندے کے بدلنے کا امکان کم از کم اس زندگی میں نہیں تھا۔ وہ جان گئی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے پھولوں کی تازگی اور مہک کو جیسے اپنے اندر اتارا تھا۔

ایک دم اسے اس پارسل میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ آخر اس میں کیا تھا اور کھولنے پہ اندر چاکلیٹس' جوس اور دوسری چیزیں تھیں۔

پتا نہیں کیوں مگر وہ ان چیزوں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اسے یہ بھی احساس ہوا تھا کہ سجاد نے اس کے یہاں اسلام آباد میں اکیلے ہونے کو محسوس کر لیا تھا۔ جیسے وہ جان گیا تھا کہ اس کا خیال رکھنے والا کوئی اپنا نہیں ہے۔

مریم نے پہلی دفعہ اس شخص کے لیے اپنے دل میں کسی مثبت احساس کو ابھرتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ حالانکہ وہ ایسا محسوس نہیں کرنا چاہتی تھی مگر چاہتے نہ

چاہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔
زندگی میں بہت کچھ ایسا ہوتا ہے۔ جس کا ہونا نہیں چاہیے۔
اور جو چاہتے ہیں۔
وہ ہوتا نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

"تم داؤد مرتضیٰ کی کزن ہو؟" اس کے نام کے ساتھ جڑا "علوی" دیکھ کر ٹیچر نے چونک کر عنایا سے پوچھا۔
"نہیں۔!" اس نے گردن اکڑا کر جواب دیا۔
ٹیچر نے حیرانی سے اسے دیکھا' پھر اس کی ہوم ورک کاپی کو۔
"ناقابل یقین۔" ٹیچر منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی اور اس کی ہوم ورک کی کاپی کچھ بے زاری کے انداز میں چیک کرنے لگی۔
وہ اتنی خراب لکھائی والا ہوم ورک تھا کہ کوئی بھی ٹیچر یوں ہی بے زار ہو سکتا تھا۔
یہ سوال عنایا سے اکثر کیا جاتا تھا جس کا جواب وہ گردن اکڑا کر تب تک دیتی رہی' جب تک وہ اس سوال میں چھپی حیرت کے مفہوم سے آگاہ نہیں ہوئی تھی۔
اور جب آگاہ ہوئی تو۔۔۔
عنایا سکندر اس وقت مونٹیسوری پاس کر چکی تھی۔ ٹیچرز' پیرنٹس میٹنگ میں خزینہ کو بہت شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔ وہ عنایا کے حوالے سے پہلی ایسی میٹنگ تھی اور پہلی ہی دفعہ انہیں۔۔۔ گو کہ وہ عنایا سے توقع نہیں کر رہی تھیں کہ وہ کوئی غیر معمولی رزلٹ دے گی' مگر ایسے رزلٹ کی بھی توقع نہیں تھی انہیں۔
وہ مشکل سے سارے مضامین میں پاس ہوئی تھی۔ کوئی خفت سی خفت تھی۔ وہ غائب دماغی سے ٹیچر کے مشورے سن رہی تھیں۔ عنایا کی تعلیمی حالت کو بہتر کرنے کے۔۔۔
اس کے بعد بھی وہ ایسی کئی میٹنگز میں ایسی ہی خفت کا سامنا کرتی رہیں۔

داؤد اس وقت گریڈ ون میں تھا۔ اس کا رزلٹ ویسا ہی تھا جیسا علوی فیملی کے کسی بھی بچے کا ہونا چاہیے تھا۔
شاندار۔۔۔ بہترین۔۔۔ غیر معمولی۔۔۔
ایک ہی گھر میں۔۔۔ ایک ہی گاڑی میں بیٹھ کر جانے والی دو مائیں۔۔۔ دو مختلف جذبات والے چہرے لے کر علوی ہاؤس میں داخل ہوئی تھیں۔ ایک کا تمتماتا' پُرجوش ہنستا چہرہ۔۔۔ اور دوسری کا چہرہ کیسا تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔
خزینہ اس کے بعد بھی کئی دن تک اپ سیٹ رہی تھیں' وہ مایوسی' پریشانی اور بے چینی کا شکار ہو کر عنایا کے چہرے کو دیکھتیں۔ جہاں اسکول جانے کے بعد آنکھوں کے نیچے پڑنے والے حلقے مستقل ہونے لگے تھے۔ وہ کیا کر سکتی تھیں' وہ اس کی صحت کو دیکھتیں یا تعلیم۔
"عنایا!" انہوں نے بلڈنگ بلاکس کے ساتھ کھیلتی عنایا کو بلایا۔
عنایا کبھی بھی بلڈنگ بلاکس کو صحیح طرح سے جوڑ نہیں پائی تھی' مگر ابھی ان کی توجہ ان بلاکس پہ نہیں تھی۔ عنایا کے چہرے کو دیکھتے ہوئے انہیں یاد آیا تھا کہ آج انہوں نے اسے دودھ کا گلاس نہیں دیا تھا۔
"عنایا!" دوسری آواز پہ اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔
"کم ہیر بیٹا!" انہوں نے بازو پھیلا کر اسے بلایا۔
عنایا ان بلاکس کو ادھورا چھوڑ کر ان کی طرف بھاگ کر آئی تھی۔
"آپ نے دودھ نہیں پیا!" اسے بازوؤں میں لے کر اس کے سر کو سہلاتے ہوئے خزینہ نے بڑے پیار سے پوچھا۔
"ممی! مجھے نہیں پینا۔" حسب عادت اس نے منہ بنایا۔
وہ جتنے نخروں سے دودھ پیتی تھی' یہ خزینہ ہی کی ہمت تھی۔ عنایا کو دیکھتے خزینہ نے ان بلاکس کو نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ انہیں دیکھ لیتیں تو جان لیتیں گو کہ

انہیں ادھورا چھوڑ دیا تھا' مگر اب وہ انہیں صحیح طریقے سے جوڑ رہی تھی۔۔۔ دیر سے ہی سہی' مگر عنایا نے انہیں جوڑنا سیکھ لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دو دن کے بعد اگرچہ پاؤں صحیح طریقے سے ٹھیک نہیں ہوا تھا' مگر وہ لنگڑا کر چل سکتی تھی۔ سو آفس آ گئی۔
سب ہی آفس کولیگز باری باری آکر اس سے اس کے پاؤں کا حال پوچھ چکے تھے نہیں آیا تھا تو سجاد ابراہیم۔ اسے حیرانی ہوئی تھی۔
"مجھے کیا آئے نہ آئے۔۔۔" سر جھٹک کر وہ کمپیوٹر پہ کام کرنے لگی تھی۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا لیکن اندر کہیں چبھن کا احساس بھی تھا۔
لنچ بریک میں اس نے فیصل سے کہہ کر چائے اور سینڈوچ منگوا لیے تھے' وہ لنگڑا کر کیفے ٹیریا نہیں جا سکتی تھی' مگر اس وقت وہ ہکا بکا رہ گئی جب اس نے فیصل کے بجائے سجاد کو یہ چیزیں لاتے دیکھا تھا۔
وہ اب سارے کام چھوڑ کر اپنے مخصوص کھا جانے والے انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔
"میرا خیال ہے۔ کھانے کے لیے یہ چیزیں ہیں میں یقیناً "نہیں۔۔۔" اس نے ذرا دور رہتے ہوئے ٹرے مریم کے آگے کھسکائی۔
"حالانکہ دل تو بڑا ہو گا تمہیں کچا چبا جانے کو۔" اور پھر کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر سر کو کھجاتے ہوئے بولا۔
"تم!" وہ زچ ہوئی۔
"پاؤں کیسا ہے؟"
"خیال آ گیا؟"
"تو کیا نہیں آنا چاہیے تھا؟"
"صبح تک تو نہیں آیا تھا۔"
"مجھے دوسروں کی طرح فارمیلٹی نہیں نبھانی۔"
"تو پھر کیا نبھانی ہے؟" اس سوال پہ سجاد نے مریم کا چہرہ دیکھا' مسکرایا اور پھر سر جھٹک دیا۔
"جواب دو۔۔۔"

مریم نے چائے کے ساتھ سینڈوچ کھانا شروع کر دیے۔
"نہیں دے سکتا۔" اس نے لاچاری ظاہر کی۔
"اوہ کم آن۔۔۔!" مریم نے ہاتھ جھٹک کر جیسے اس کی لاچاری کو چٹکی میں اڑایا تھا۔
"کوئی دوسرا بھی بھوکا ہو سکتا ہے۔" وہ مریم کے سامنے رکھی پلیٹ میں سے سینڈوچ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "یقیناً" اس نے بات بدلی تھی۔
"تمہیں میرا گاڈ فادر بننے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"
"کیا مطلب؟" وہ حیرانی سے بولا۔
"اتنی چیزیں کیوں بھجوائی تھیں؟"
"یا اللہ۔۔۔!" سجاد کو صحیح معنوں میں کرنٹ لگا۔ بجائے شکریہ ادا کرنے کے' وہ اس سے اس طرح پیش آ رہی تھی۔ بے اختیار اس نے چائے کا کپ دوبارہ ٹرے میں رکھا تھا۔
"مریم! تھوڑی سی۔۔۔ تھوڑی سی شرم۔۔۔ جو تمہیں کسی کا شکریہ ادا کرنے پہ مجبور کر دے۔" مارے صدمے کے اسے تاؤ آ گیا تھا۔
"کیوں۔ میں کیوں کروں شکریہ ادا۔۔۔ تم نے اپنی خوشی سے بھیجی تھیں۔" وہ بڑے مطمئن انداز میں کرسی سے ٹیک لگا کر چائے پیتے ہوئے مزا لینے والے انداز میں بولی۔
سجاد نے کچھ کہنے کے لیے بے اختیار منہ کھولا' دونوں ہاتھ اٹھائے اور پھر کچھ کہے بنا کرسی کو زور سے پیچھے دھکیلتے ہوئے اٹھ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔
"تم بھوکے تھے؟" ہاتھ میں سینڈوچ اٹھا کر اس نے پیچھے سے آواز دی۔
اور پھر سجاد نے اپنے پیچھے مترنم سی ہنسی سنی تھی۔ دھیمے لہجے میں۔۔۔ مگر بھرپور ہنسی۔۔۔ اس کے قدم رکے تھے' بے اختیار اس نے مڑ کر دیکھا۔
وہ سر جھٹک کر ہنستے ہوئے کمپیوٹر پہ پھر سے کام کرنے میں مشغول ہو گئی تھی۔
اور سجاد ابراہیم۔۔۔ اس کی ہنسی کسی زنجیر کی طرح اس کے پیروں میں بندھ گئی تھی۔

اور زنجیروں کو توڑنا کب آسان ہوتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ ویک اینڈ تھا جب تقریباً" آٹھ بجے ڈور بیل کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی۔

اتنی صبح صبح۔۔۔ وہ بھی ویک اینڈ پر کسی نے اس کی نیند خراب کرنے کی کوشش کی تھی' مگر وہ بھی اپنے نام کا ایک تھا۔

کروٹ بدلتے ہوئے تکیے کو دونوں کانوں پہ لپیٹ کر وہ پھر سے سونے لگا تھا۔ مگر باہر کھڑا شخص اس سے بڑا ڈھیٹ ثابت ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے تک اس کے باہر نہ آنے کے باوجود وہ اسی طرح ڈور بیل بجا رہا تھا۔

وہ پوری نیت سے۔۔۔ قتل کے ارادے سے اٹھا۔ بغیر چپل پہنے۔۔۔ اک طیش کے عالم میں وہ دروازے تک آیا اور اک جھٹکے سے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

"سر! یہ آپ کے لیے۔" کوریئر والے نے اسے بولنے کا موقع دیے بغیر کہا۔

صبح صبح پھولوں کے بکے کے ساتھ موجود کارڈ کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ سائن کر کے قلم واپس کوریئر سروس والے کو پکڑاتے ہوئے وہ بھول چکا تھا کہ ابھی اسے ایک عدد قتل کرنا تھا۔ بکے کو بائیں ہاتھ میں پکڑ کر اس نے دائیں ہاتھ سے کارڈ کھولا تھا۔ وہ ایک تھینک یو کا کارڈ تھا۔

کارڈ کھلنے پہ اس کی حیرت اور بڑھ گئی تھی۔

"میرے اللہ! یہ لڑکی ذرا جو حساب باقی رہنے دے۔" وہ بڑبڑایا۔

جس طرح وہ اس کا حال پوچھنے نہیں گیا تھا اور چیزیں بھجوا دی تھیں' بالکل اسی طرح اس نے بھی کیا تھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا۔

"کیا چیز ہے یہ۔۔۔؟" کتنی ہی دیر وہ اس کارڈ اور بکے کو دیکھتا رہا۔ نیند تو اڑ چکی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسی حلیے میں مریم کے پاس جائے اور اس حرکت کی وجہ پوچھے' مگر یہ ممکن نہیں تھا' فریش ہونے کے بعد اس نے کافی بنائی تھی۔ پھر کھڑکی میں کھڑے ہو کر سوئے ہوئے اسلام آباد کو دیکھتے ہوئے ایک ہاتھ پاکٹ میں ڈالے وہ گھونٹ گھونٹ کافی پی رہا تھا' مگر سوچ مریم کو رہا تھا۔

"پول والو نے الو کے پٹھوں کو لیٹر کب سے بھیجے شروع کر دیے؟" وہ سر جھٹک کر بے اختیار مسکرایا۔

"وہ یوٹرن دیکھ رہے ہو نا! وہاں سے گاڑی موڑ کر لے آؤ۔" مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

"کیوں میں کیوں شکریہ ادا کروں۔۔۔ تم نے اپنی خوشی سے بھیجی تھیں۔" پھیلی مسکراہٹ کو روکنا مشکل ہو رہا تھا اور پھر پاکٹ والا ہاتھ باہر آیا تو اس میں سیل فون تھا۔ کسی معمول کی طرح اس نے مریم کا نمبر ملایا۔ دوسری ہی بیل پہ فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" اس نے مریم کی ہشاش بشاش آواز پہ بے ساختہ گھڑی دیکھی۔ ساڑھے نو بجے تھے۔

"اٹھ چکی ہو؟" وہ اس سے کسی معمول کی طرح مخاطب ہوا تھا۔

"نہیں! سوتے ہوئے تم سے بات کر رہی ہوں۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔ اس لڑکی سے سیدھی بات کی توقع مشکل تھی۔

"اتنی صبح مجھے تمہاری ہنسی سن کر اپنا دن خراب کرنے کا شوق نہیں ہے۔۔۔ فون کیوں کیا؟" سجاد کو لگا' وہ کسی کام میں مصروف تھی۔

"تمہارے تھینک یو کا تھینک یو ادا کرنے کے لیے۔" وہ کافی کا گھونٹ بھر کر بولا۔

مریم کان اور کندھے کے درمیان سیل فون دبائے اپنے کمرے سے چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ اس بات پہ چونک کر سیدھی ہوئی تھی۔

"اچھا! تو تمہیں مل گیا۔" اسے لگا کہ مریم کا لہجہ متبسم ہوا تھا۔

"سوچا جس طرح تمہاری وجہ سے میری نیند خراب ہوئی تھی میں بھی تمہاری نیند خراب کروں۔ مگر تمہارا کچھ بگڑتا نہیں اور میرا کچھ بنتا نہیں۔" دھیمے لہجے میں کی گئی ذو معنی بات۔

مریم نے سنا۔۔۔ سمجھا۔۔۔ اور پھر نظر انداز کر دیا۔

"او کے! تمہارا تھینک یو ایکسیپٹ ہوا۔۔۔ اور کوئی بات؟" وہی بندے کو آسمان پہ پہنچا کر نیچے سے سیڑھی کھینچ لینے والا اس کا مخصوص انداز۔۔۔ کافی یک دم پھیکی اور کڑوی ہوئی تھی۔

"کچھ نہیں!" خاصے بگڑے موڈ کے ساتھ جواب دیا گیا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ اللہ حافظ!" اس نے مریم کو کہتے سنا اور خود اس نے جواباً" کوئی ایک رسمی جملہ بھی نہیں کہا تھا۔ اس کا موڈ سخت خراب ہو چکا تھا۔

چند لمحے وہ اپنی حالت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا' پھر اس نے غصے سے کافی کا آدھا بھرا مگ کھڑکی سے نیچے الٹ دیا۔

مریم شہباز نے اس کا سنڈے برباد کر دیا تھا۔ اور سنڈے خراب ہونے کی کتنی تکلیف ہوتی ہے یہ تمام کام کرنے والے خواتین و حضرات اچھی طرح سے سمجھ سکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

اور عنایا سکندر جب ٹیچرز کے لہجوں میں چھپی حیرت کے مفہوم سے آگاہ ہوئی تو وہ۔۔۔ زندگی کے بالکل نئے ذائقے سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس کی زندگی کا سب سے پہلا تلخ ذائقہ۔ اس کے اندر ایک نئی چیز پیدا ہوئی تھی۔

احساس کمتری۔

اتنی محبت' پیار' توجہ' ناز نخروں کے ساتھ عنایا کو ایک خود اعتماد بچی ہونا چاہیے تھا۔ مگر نہیں بن سکی تھی۔

ایک ایسی فیملی جس کی کسی بھی سوشل یا معمول کی تقریبات میں باتیں بچوں کی پڑھائی سے شروع ہو کر ان کے کیریئر پہ ختم ہوں۔

ایسی کسی فیملی میں عنایا سکندر اگر احساس کمتری محسوس کرتی تو یہ حیرت کی بات نہیں تھی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے بہت کم عمری میں اس چیز کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ اس وقت گریڈ ون میں تھی اور لاشعوری طور پر اس نے اپنا موازنہ داؤد کے ساتھ کیا تھا۔ باقی کزنز اور اس کے بھائی اس سے بہت آگے تھے' ایک داؤد ہی تھا' جس سے وہ موازنہ کر سکتی تھی۔

"ممی! کیا میں ٹرافی ون نہیں کر سکتی؟" خزینہ کو اس کے سوال نے نہیں' اس کے لہجے نے ساکت کیا تھا۔

اس کا لہجہ معصوم نہیں تھا۔ کمتری کا احساس لیے ہوا تھا۔ خزینہ نے مڑ کر اسے دیکھا تھا وہ کچن میں کام کر رہی تھیں اور عنایا کو انہوں نے تھوڑی دیر پہلے نوڈلز کھانے کو دیے تھے جو ویسے کے ویسے ہی رکھے تھے۔

"کون سی ٹرافی بیٹا؟" وہ کام چھوڑ کر اس کے پاس دوسری کرسی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

"فرسٹ پوزیشن کی؟" اس نے اداسی سے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹا! تم فرسٹ پوزیشن حاصل کر سکتی ہو۔"

انہوں نے وہی کہا تھا۔ جو ایک ماں کو کہنا چاہیے تھا۔ وہ اب اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔

"نہیں ممی! میں حاصل نہیں کر سکتی۔" ناخن سے میز کی سطح کھرچتے ہوئے' سر جھکا کر اس نے جیسے جرم قبول کیا تھا۔ خزینہ کے دل پر گھونسا پڑا۔

"کیوں تم کیوں نہیں لے سکتیں ٹرافی؟"

"میں داؤد کی طرح انٹیلی جینٹ نہیں ہوں۔"

خزینہ اسے حیرت سے دیکھنے لگیں' بچے ایک دوسرے سے موازنہ کرتے ہیں' مقابلہ بھی کرتے ہیں مگر وہ یہ نتیجہ نہیں نکال پاتے کہ وہ کسی دوسرے کی طرح ذہین نہیں ہیں۔

"تم سے کس نے کہا کہ تم داؤد کی طرح ذہین نہیں ہو۔ تم بھی اس کی طرح ذہین ہو۔" اب کی بار انہوں نے اسے گود میں اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر میں ٹرافی کیوں نہیں جیتتی؟"

خزینہ لاجواب ہوئی تھیں۔

"تم یہ نوڈلز کیوں نہیں کھا رہیں۔ اتنے مزے کے بنے ہیں۔"

انہوں نے چمچہ بھر کر اس کے منہ کے آگے کیا۔

"مجھے نہیں کھانے!" اس نے بے زاری سے چمچہ ہٹایا تھا۔

"اوکے! عنایا نے نہیں کھانے تو ممی کھالیتی ہیں۔" خزینہ نے چمچہ اپنے منہ میں ڈالا تھا۔

"ہم ---- م ---- یمی!" ان کے چہرے پہ اس وقت ایسے تاثرات تھے جیسے کہ ان نوڈلز جیسی مزے دار چیز دنیا میں اور کوئی نہیں تھی۔ ایک اور چمچہ بھر کر انہوں نے اپنے منہ میں ڈالا۔

اور تیسرا چمچہ بھرنے تک عنایا انہیں للچائی نظروں سے دیکھنا شروع ہو چکی تھی۔

"کھاؤ گی؟" اپنے منہ میں ڈالنے سے پہلے انہوں نے عنایا سے پوچھا تھا۔ ان کا انداز ترغیب لیے ہوئے تھا۔

"یس!" اس نے جلدی سے کہا اور انہوں نے وہ چمچہ اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔

عنایا ان کی گود سے اتر کر اپنی کرسی پہ بیٹھی اور نوڈلز کھانا شروع کر دیے۔

وہ بہل گئی تھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ وہ کب تک بہلائی جاسکتی تھی۔ ذہنی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کے اندر یہ بات بھی پختہ ہوتی چلی جاتی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی کسی بھی قسم کے کمپلیکسز کا شکار ہو۔ وہ پہلے ہی صحت اور تعلیم کے حوالے سے پرابلمز کا شکار تھی وہ جذباتی حوالے سے بھی کسی قسم کے مسائل کا شکار ہوتی۔ یہ یقیناً" انہیں گوارا نہیں تھا۔

اس کی وجہ سے اک نیا مسئلہ تب پیدا ہوا جب ان کی اور سکندر کی اتنے سالوں میں پہلی دفعہ اختلافی بحث ہوئی تھی۔ انہوں نے عنایا کا مسئلہ سکندر کو بتایا تھا۔

"تم اس کا اسکول بدل دو خزینہ!" ان کی بات سننے سمجھنے اور چند لمحے سوچنے کے بعد سکندر نے کہا تھا۔

"واٹ!" خزینہ کو کرنٹ لگا تھا۔

"آپ چاہتے ہیں ہمیں اس کا اسکول بدل دوں تاکہ وہ مزید کمپلیکسز کا شکار ہو جائے۔" تیز لہجے میں کی گئی اس بات پہ سکندر نے چشمہ اتار کر انہیں دیکھا۔

"اسکول بدلنے سے وہ کس قسم کے کمپلیکسز کا شکار ہوگی؟"

"ہماری فیملی کے سارے بچے گرامر اسکول میں پڑھے ہیں سکندر! عنایا یہ نہیں سوچے گی کہ وہ کیوں نہیں؟ اس کے بھائی' کزنز سب ایک اعلا درجے کے اسکول سے پڑھتے ہیں اور وہ نہیں۔ کیونکہ وہ ان جیسی ذہین اور لائق فائق نہیں ہے۔"

"تمہیں کس نے کہا کہ میں اسے کسی عام سے اسکول میں داخل کرواؤں گا۔ میں بس اسے اس ماحول سے نکالنا چاہتا ہوں' جہاں وہ خود کو inferior (کم تر) محسوس کر رہی ہے۔"

"تو کیا کسی دوسرے اچھے اسکول میں وہ خود کو inferior محسوس نہیں کرے گی۔ وہاں کیا لائق بچوں کی کمی ہوگی؟" ماتھے پہ بل لیے خزینہ بے زاری سے بولی تھیں۔

"تم سمجھ نہیں رہیں خزینہ۔ وہ اگر خود کو کسی ذہین بچے سے کمپیئر کرتی تو یہ صحت مند علامت ہے۔ مگر وہ کمپیئر نہیں کر رہی' وہ خود کو inferior محسوس کر رہی ہے۔ اسکول بدلنے سے ....."

"آپ جو بھی کہیں سکندر! بٹ ایم سوری' میں اسے اس اسکول سے نہیں اٹھاؤں گی۔ وہ وہیں رہ کر پڑھے گی' چاہے ایک گریڈ میں دو سال لگا دے۔" خزینہ نے ان کی بات کاٹی۔

"اور اس کے اس نئے پیدا ہونے والے پرابلم کا کیا کرو گی؟ تم کیوں اسے پرسنالٹی ڈس آرڈر کا شکار بنانا چاہتی ہو؟"

انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے دونوں آنکھوں کو مسلتے ہوئے وہ بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہے تھے۔

"کچھ نہیں ہوتا سکندر! میں سنبھال لوں گی اسے۔"

"شیور!" اور خزینہ نے بس مسکرا کر سکندر کو دیکھا تھا۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس میں سو فیصد یقین تھا۔

عورت کب کسی مرد سے متاثر ہوتی ہے؟

اس سوال کا جواب انفرادی سطح پر مختلف ہو سکتا ہے' لیکن پھر بھی۔

عورت کسی مرد سے تب متاثر ہوتی ہے جب کوئی آپ کی اپنی بنائی گئی حدوں کی دیواروں کے پار رہتے ہوئے آپ سے تعلقات کی بنیاد رکھے۔ آپ سے دوستی' فون نمبر یا پھر اس قسم کا کوئی بے ہودہ مطالبہ نہ کرے۔

عورت کی عزت کرنی چاہیے۔ وہ یہ سمجھتا ہو۔ مریم بھی متاثر ہونے لگی تھی۔

وہ سجاد کو جس قسم کا انسان سمجھتی تھی' وہ اس سے مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ فیلڈ میں' آفس میں' بس میں آتے جاتے' وہ بہت نامحسوس طریقے سے اس کا خیال رکھا کرتا تھا۔

مریم کو پیش آنے والے مسئلوں سے وہ اس کے بتائے بنا آگاہ ہوتا تھا۔ حالانکہ بظاہر اس کا رویہ ویسا ہی ہوتا جیسا کہ آفس کے کسی دوسرے فرد کا۔ سجاد نے اس حد کو پھلانگنے کی کوشش نہیں کی تھی' جس پہ مریم نے اسے رکھا ہوا تھا۔

مریم کو کبھی اس بات کا ادراک نہ ہوتا کہ اس کے مسئلے کیسے خود بخود حل ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر اس دن ....

وہ اپنے بھائیوں سے چھوٹی تھی اور اس کے دوسرے نمبر والے بھائی کی شادی تھی۔ ایک انٹرنی ہونے کی وجہ سے اسے چھٹیاں لینے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ ایک ہفتے کی چھٹی لینا چاہتی تھی' مگر اسے ایک ہفتے کی چھٹی مل نہیں رہی تھی۔

اس دن وہ آفس آئی تو اسے یہ خبر ملی کہ اسے پانچ دن کی چھٹی مل گئی تھی۔

وہ اپنا ٹائم ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ آج ہی لاہور جانا چاہتی تھی مگر مصیبت یہ تھی کہ اسے لاہور جانے والی فلائٹس میں سیٹ نہیں مل رہی تھی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مدیحہ سے اپنی پریشانی ڈسکس کر کے آ رہی تھی۔ مدیحہ نے اسے ٹرین یا ڈائیوو سے جانے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس کے لیے پھر اسے کل صبح کا انتظار کرنا پڑتا۔ ظاہر ہے وہ آفس ٹائم کے بعد ٹرین یا پھر ڈائیوو بس سے نہیں جاسکتی تھی۔

وہ کچھ پریشان سی ہو کر اپنی سیٹ پر واپس آئی تھی۔ ایک ڈرافٹ بناتے ہوئے اس نے پریشانی سے پیشانی کو مسلتے ہوئے سر اٹھایا۔

اس نے سجاد کو مدیحہ کے کیبن کی طرف جاتے دیکھا ۔ اس کے ہاتھ میں کوئی فائل تھی۔

وہ اک عام سی لاشعوری سی نظر تھی۔ وہ پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے مدیحہ کو اپنے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے دیکھا۔

"ہوا کچھ؟" اس نے بیٹھتے ہوئے پوچھا ۔ اور مریم نے مایوسی سے سر ہلایا تھا۔

"ٹھہرو! میں کچھ کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے سیل فون سے کوئی نمبر ملایا۔ چند لمحے بات کرنے کے بعد اس نے سیل فون مریم کی طرف بڑھایا۔

اس آدمی نے مریم کو تھوڑی دیر بعد کال کرنے کو کہا۔

اور تھوڑی دیر بعد مریم کی حیرت اور خوشی کی انتہا نہیں رہی تھی' جب اس نے اپنی سیٹ کنفرم ہونے کی خبر سنی وہ خوش ہوتے ہوئے مدیحہ کے پاس آئی تھی۔

"دیٹس گریٹ!" مدیحہ نے خبر سنتے ہی کہا "مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ یہ آدمی تمہارا مسئلہ حل کروا دے گا۔" مدیحہ نے روانی سے کہا۔

"تمہارا کوئی جاننے والا ہے؟"

"ہم ....." مبہم سا جواب۔

"میں پہلے بھی تو تمہارے پاس آئی تھی یہ پرابلم لے کر تب تم نے کیوں نہیں مجھے بتایا۔"

"میرے ذہن میں نہیں تھا اس وقت بعد میں مجھے خیال آیا۔" مدیحہ مسکرائی۔ مریم الجھی اور پھر اچانک مریم کے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا۔ وہ چند لمحے خاموشی سے مدیحہ کو دیکھتی رہی۔

"مدیحہ! تمہیں یہ نمبر سجاد نے دیا ہے؟"

"او کم آن مریم اسجاد کا۔"

"مدیحہ! تمہیں یہ نمبر سجاد نے دیا ہے؟" وہ مدیحہ کی بات کاٹ کر پہلے سے بھی زیادہ سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔ مدیحہ بے ساختہ چپ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں۔" پھر اس نے اعتراف کر لیا تھا۔

مریم نے ہونٹ بھینچ کر رخ بدلا۔

"پلیز مریم! وہ صرف تمہاری ہیلپ کرنا چاہ رہا تھا۔"

"وہ خود بھی تو آسکتا تھا میرے پاس۔" اس کے تیز لہجے پر مدیحہ نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا' وہ اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

"خیر اگر وہ میرے پاس آتا تو میں اسے کچا تھوڑا ہی جاتی۔" اب کے اس کا لہجہ متبسم تھا۔

"مگر اسے یہ یقین ہوتا تو ضرور آتا۔" مدیحہ سر جھٹک کر ہلکا سا مسکرائی۔

"اینی وے تھینک یو۔" وہ سیٹ سے اٹھتے ہوئے بولی۔

اور جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی تو اس نے سجاد کو اپنی سیٹ پہ نہیں دیکھا تھا۔

اس نے ایک حرکت کی تھی اور اپنی اس حرکت پہ محظوظ ہوتے ہوئے وہ اپنی میز تک آئی۔ اسے ابھی آج کے دن کے لیے آدھے دن کی رخصت کے لیے بھی باس سے مغز ماری کرنی تھی۔ مگر سیٹ مل جانے کی خوشی اتنی تھی کہ یہ کوفت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔

باس کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے اس نے ایک دفعہ پھر سجاد کی سیٹ کی طرف دیکھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر بڑی بے ساختہ سی مسکراہٹ آئی تھی۔

اور سجاد جب اپنی سیٹ پہ واپس آیا اپنی بنائی گئی رپورٹ کا یہ حال دیکھ کر غصے کی ایک شدید لہر اٹھی تھی۔

کسی نے اس رپورٹ کے اوپر بڑا بڑا تھینک یو لکھ دیا تھا۔

"یہ کس کی حرکت ہے؟" وہ اونچی آواز سے یہ بات کہنا چاہتا تھا' مگر یک دم رک گیا۔ اس نے بے یقینی سے ان الفاظ کو دیکھا۔

وہ مریم کی ہینڈ رائٹنگ تھی۔ مریم نے اس کی اتنی محنت سے بنائی گئی رپورٹ کا ستیاناس کر دیا تھا اور وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر متبسم آنکھوں اور ہونٹوں کے ساتھ ان لکھے گئے الفاظ کو دیکھتا رہا تھا۔

بعض نقصانات کی انسان کو پروا نہیں ہوتی۔ جیسے اس وقت سجاد ابراہیم کو نہیں تھی۔

اس کا ہونے والا نقصان اس فائدے کے مقابلے میں بہت کم تھا' جو کہ اس وقت اسے اس صفحے پہ "تھینک یو" کی صورت لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"داؤد! تم فرسٹ پوزیشن کیسے لیتے ہو؟" عنایا کے اس سوال پہ داؤد نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

وہ دونوں اس وقت اسکول میں ہونے والی لنچ بریک کے دوران اکٹھے ہوئے تھے اور داؤد اسے چاکلیٹ کا ریپر کھول کر دے رہا تھا۔

"پڑھ کر لیتا ہوں اور کیسے؟" اس نے وہی جواب دیا تھا جو ایک ففتھ گریڈ کا بچہ دے سکتا تھا۔

"پڑھتی تو میں بھی ہوں۔" وہ گریڈ ٹو کی بچی الجھن کا شکار ہوئی۔

"میں تم سے زیادہ اسٹڈی کرتا ہوں۔" داؤد نے اپنا لنچ باکس کھولتے ہوئے کہا۔

"تم کتنی اسٹڈی کرتے ہو؟" عنایا نے چاکلیٹ کھاتے ہوئے پوچھا۔

"میں ریگولرلی ہوم ورک کرتا ہوں۔" داؤد نے کچھ فخر سے عنایا کو بتایا۔

"وہ تو میں بھی کرتی ہوں۔" جواب بہت تیزی سے آیا تھا۔

"میں اپنا سبق بہت اچھی طرح یاد کرتا ہوں۔" داؤد نے برتری کا ایک اور نکتہ ڈھونڈ نکالا۔

"وہ تو میں بھی کرتی ہوں۔"

"میں اپنے سبق کو بھولتا نہیں ہوں۔" اب کے عنایا کو چپ لگی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ وہ بہت اچھی طرح سبق یاد کرتی تھی مگر ٹیچر کو ٹیسٹ دیتے وقت بھول جایا کرتی تھی۔

اس نے مایوسی سے سر جھکا کر چاکلیٹ کو دیکھا۔ داؤد کی برتری قائم ہو چکی تھی۔ سو اب وہ مزے سے چکن سینڈوچ کھا رہا تھا۔

"تم سبق بھولتے کیوں نہیں ہو؟" تھوڑی دیر بعد سوال آیا۔

"میں اسے یاد کر کے لکھتا ہوں۔" اب کے داؤد نے کچھ لاپروائی سے جواب دیا تھا۔

اسے اب اس فرق کو مٹانا تھا۔ اگر مٹا نہ بھی سکتی تو کم از کم اسے داؤد کے برابر ضرور آنا تھا۔

اس دن کے بعد عنایا نے ہر سبق کو یاد کر کے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ پہلے سے زیادہ محنت سے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ خزینہ کے لیے یہ کسی نیک شگون کی طرح تھا' انہیں اپنے فیصلے کی درستی کا اندازہ ہوا۔

جس دن سے انہوں نے عنایا میں احساس کمتری کے جراثیم محسوس کیے تھے۔ اس دن سے ان کی راتوں کی نیندیں برباد ہو چکی تھیں مگر اب وہ مطمئن تھیں۔

عنایا نے گریڈ ٹو میں بہت محنت کی۔

اب بھی اگرچہ وہ فرسٹ پوزیشن نہیں لے سکی تھی مگر اس کا رزلٹ پہلے سے بہت اچھا تھا۔

خزینہ کے لیے یہ بھی بہت تھا۔

مگر عنایا نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ اسے داؤد کی طرح ٹرافی چاہیے تھی۔ اتنی محنت کرنے کے باوجود وہ اپنا رزلٹ صرف بہتر کر سکی تھی۔ وہ روتی نہ تو اور کیا کرتی۔

خزینہ' سکندر' مرتضیٰ' اسما' نعمان' عدیل' کامران' دلاور' ڈاڈی حتیٰ کہ داؤد بھی۔ سب اسے سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ مگر اس کا رونا ختم نہیں ہوا تھا۔ تنگ آکر داؤد اپنی ٹرافی اٹھا لایا۔ عنایا کو دینے کے لیے۔

عنایا نے اس ٹرافی کو دیکھا اور پھر داؤد کو۔ اور پھر اس نے وہ ٹرافی لینے سے انکار کر دیا تھا۔

وہ محض سات سال کی تھی مگر جانتی تھی کہ یہ ٹرافی اس نے جیتی نہیں تھی۔

اس رات سوتے ہوئے عنایا نے جیسے خود کو باور کرایا تھا کہ وہ کبھی بھی داؤد کی طرح فرسٹ پوزیشن نہیں حاصل کر سکتی تھی۔

وہ اس سے کم تر تھی۔ چاہے کتنی ہی محنت کیوں نہ کر لے۔

☼ ☼ ☼

اس واقعے کے بعد مریم نے سجاد کی توجہ اور خیال کو واضح طور پر محسوس کرنا شروع کیا تھا اور جیسے جیسے وہ اس چیز کو محسوس کر رہی تھی' اس کے اور سجاد کے درمیان موجود برف پگھلنے لگی تھی۔

دونوں کا رویہ دوستانہ ہونے لگا تھا۔

مریم کی رائے سجاد کے بارے میں بدلنے لگی تھی۔

ان ہی دنوں پاکستان آئل فیلڈز لمیٹڈ (POL) میں انٹرن شپ کرنے والا ایک نیا بیچ آیا تھا۔ اسی بیچ میں سعد اسحاق بھی تھا۔

وہ ایک فلرٹی بندہ تھا۔ لیکن اس میں ایک بات تھی۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو تنگ کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا' جس میں کوئی اور دلچسپی لیتا ہو۔ اس معاملے میں وہ کافی خردماغ واقع ہوا تھا۔ مریم کی بدقسمتی کہ وہ ان دونوں گروپس کی سب سے خوب صورت لڑکی تھی۔

سعد اسحاق کو اس کی اور سجاد کی دوستی جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگی تھی۔

"آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟" وہ اپنے کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ جب اچانک سعد اسحاق اس کے سامنے آیا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے؟" مریم فائل کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔

"لگتا تو نہیں آپ دوستی کریں گی۔"

"پھر آپ جیسے ذہین آدمی کو یہ سوال بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔" مریم کے چہرے پہ نرمی' مگر نظروں میں سختی تھی۔ وہ مریم کی اس بات پہ ہلکا سا ہنسا تھا۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔ مگر یہ میری ذہانت ہی تھی جس نے مجھے یہ سوچنے پہ مجبور کیا کہ مریم شہباز' سجاد ابراہیم سے دوستی کر سکتی ہے تو پھر سعد اسحاق سے کیوں نہیں؟"

اس نے سرخ چہرے کے ساتھ سعد کو دیکھا۔ "ہر شخص سجاد ابراہیم نہیں ہو سکتا۔"

"ہر شخص سعد اسحاق بھی نہیں ہو سکتا۔" ترنت جواب آیا۔

"ہاں! ہر شخص سعد اسحاق نہیں ہو سکتا مگر سعد اسحاق وہ بھی نہیں ہو سکتا جس سے مریم شہباز دوستی کرے۔" مریم کے چہرے اور آنکھوں سے ہر وہ تاثر غائب ہو چکا تھا جسے نرم کہا جا سکتا تھا۔ اب کی بار سعد کو غصہ آیا تھا۔

"آپ کو مجھ سے دوستی کرنا پڑے گی مس مریم!" سنجیدہ انداز میں کہتے ہوئے وہ دو قدم آگے آیا تھا۔

"دیکھتے ہیں۔" ایک چیلنجنگ مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے مریم نے کہا۔ اور سعد اسحاق غصے سے تنا ہوا چہرہ لے کر اسے جاتے دیکھتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عنایا!" ٹیچر کی اس سخت پکار پہ عنایا کا دل سہما اور وہ باوجود کوشش کے کھڑی نہیں ہو سکی۔

"اپنی ڈائری لے کر میرے پاس آئیں۔" وہ خاموشی سے ڈائری نکالنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ ٹیچر اب اس ڈائری کے ساتھ کیا کرنے والی تھی۔ آج میتھ کا ٹیسٹ تھا۔

ٹیچر نے ایک سخت نظر اس پہ ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ سے ڈائری پکڑی۔ عنایا کا میتھس کا ٹیسٹ ڈائری میں فولڈ کرتے ہوئے پن اپ کیا۔ اور سرخ پین سے ایک لمبا سا نوٹ تحریر کرنے لگی۔

عنایا کی نظریں اپنے جوتوں سے اوپر نہیں اٹھ رہی تھیں اور سر اتنا جھکا تھا کہ ٹھوڑی سینے کو چھو رہی تھی۔ اس کی ڈائری کے پچھلے صفحات ایسے ہی نوٹس سے بھری ہوئی تھی۔

وہ گردن جھکائے ممی کا ردعمل بھی سوچ چکی تھی اور اب اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو بھرنا شروع ہو چکے تھے۔ ڈر ٹیچر کا تھا' نہ ممی کا۔ بس تکلیف تھی۔

اتنی محنت کرنے کے بعد بھی وہ ٹیسٹ میں اچھے نمبرز حاصل نہیں کر پائی تھی۔ ٹیچر نے ایک اکتائی ہوئی نظر عنایا کے چہرے پہ ڈالی۔

"یقین نہیں آتا آپ عواد کی کزن ہیں۔" عنایا نے بے عزتی کے احساس کو کچھ اور بڑھتے ہوئے محسوس کیا۔

"کل اس نوٹ پہ آپ کی مما کے سگنیچر ہوں۔" ڈائری پکڑاتے ہوئے ٹیچر نے تاکید کی اور اس نے سر ہلا دیا۔

دل گرفتگی سے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اس نے ڈائری واپس رکھی تھی۔

گھر آ کر جب وہ پڑھنے بیٹھی تھی تو اس نے بڑی خاموشی سے ڈائری ممی کی طرف بڑھائی تھی۔

خزینہ نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اپنے تاثرات چھپا سکیں' مگر وہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔ ڈائری کو ایک سائیڈ پہ رکھتے ہوئے انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ وہ اب تھک چکی تھیں۔

"آئی ایم سوری ممی!" وہ آنسو جو کلاس روم میں آنکھوں سے باہر نہیں آئے تھے۔ اب بہنا شروع ہو چکے تھے۔

یک دم سکندر کمرے سے باہر نکلے تھے۔ انہوں نے حیرت سے خزینہ کو دیکھا اور......

"عنایا! جانی کیا ہوا؟" پنجوں کے بل بیٹھتے ہوئے اسے بازوؤں میں لے کر وہ بہت پیار سے بولے۔

عنایا نے ان کے سینے میں منہ چھپائے زور' زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔ "پاپا! میرا ٹیسٹ بہت خراب ہوا ہے۔"

سکندر نے ملامتی نظروں سے خزینہ کو دیکھا مگر وہ پیشانی کو مسلتے ہوئے بڑے ہی بے زار انداز میں بیٹھی تھیں۔

اس وقت تو وہ عنایا کو بہلا پھسلا کر وہاں سے لے کر

چلے گئے تھے۔ مگر رات کو خزینہ سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔

"خزینہ! آپ کو عنایا کے ساتھ یوں بی ہیو نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"سکندر! میں تھک چکی ہوں۔ اتنی کوشش' محنت کے باوجود اس لڑکی کی پوزیشن میں ذرا فرق نہیں پڑا۔ وہ ویسی کی ویسی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کل کو وہ اولیولز کیسے کرے گی۔ کسی اچھی یونیورسٹی' کالج میں ایڈمیشن کون دے گا اسے۔" خزینہ سخت پریشان تھیں۔

سکندر نے بے ساختہ ایک گہرا سانس بھرا۔

"خزینہ! آپ مان کیوں نہیں لیتیں کہ عنایا ویسی ذہین نہیں ہو سکتی جیسے کہ خاندان کے دوسرے بچے۔"

خزینہ نے ایک بے بس سی نگاہ ان پہ ڈالی۔

"آپ کا رویہ اسے مضبوط نہیں کمزور بنا رہا ہے۔ آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسے کانفیڈنس دیتیں۔ اسے یہ بات سکھاتیں کہ وہ جو ہے' جیسی ہے' اچھی ہے' کسی سے کم تر نہیں' آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کے اس رویے کی وجہ سے عنایا کتنے دباؤ میں ہے۔"

سکندر اب بھی خزینہ کا ہی قصور نکال رہے تھے۔ وہ محنت انہیں کہیں نظر نہیں آ رہی تھی جو خزینہ نے اب تک اس پر کی تھی۔ خزینہ کو ظاہر ہے غصہ ہی آنا تھا۔

"آپ ایک نائن ٹو فائیو جاب کرنے والے باپ ہیں سکندر۔ آپ یہاں بیٹھ کر مجھے مشورے ہی دے سکتے تھے سو آپ وہی کر رہے ہیں۔"

تلخ لہجے میں کہتے ہوئے وہ وہاں سے اٹھ گئیں۔ سکندر نے پھر تاسف سے سر ہلایا۔ وہ عنایا کے معاملے میں ان کی کوئی بات ماننے یا سمجھنے والی نہیں تھیں۔ وہ جان چکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ایڈیٹ!" فائل کو زور سے میز پہ پٹختے ہوئے مریم غصے سے بولی۔

سجاد اور مدیحہ دونوں نے "کیا ہوا" والے تاثرات کے ساتھ اسے دیکھا۔

"جو نیئر ہو کر اتنی بدتمیزی۔" مریم تلملا رہی تھی۔

"تم کس کی بات کر رہی ہو مریم؟" مدیحہ نے پوچھا۔

"سعد اسحاق کی۔" جواب سجاد کی طرف سے آیا تھا۔

مدیحہ نے حیران ہو کر سجاد کو دیکھا۔ جبکہ وہ مریم کے سرخ چہرے کی طرف متوجہ تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ مریم سے اس نے بدتمیزی کی ہے۔" مریم کے پانی پینے کے دوران مدیحہ نے سجاد سے پوچھا۔

"یہاں سب سے زیادہ ایڈیٹ اور کون ہو سکتا ہے۔" سجاد نے کندھے اچکا کر کہا۔

"اس نے اتنا مس بی ہیو کیا ہے میرے ساتھ' میں شکایت کروں گی اس کی۔"

"فار گاڈ سیک مریم! اس شخص سے الجھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ سائیکو کیس ہے۔"

"ایسا کیا کہہ دیا اس نے؟" یہ سوال اب کے مدیحہ کی طرف سے تھا۔

"فرینڈشپ کی آفر کر رہا تھا۔"

"تو! پھر تم نے کیا کہا؟" اس احمقانہ سوال پر۔ مریم نے بے اختیار مدیحہ کو گھورا تھا۔

"میں نے کہا میرے بوائے فرینڈز کی ایک لمبی لسٹ ہے اس میں تمہاری گنجائش نہیں نکلتی سو انتظار کرو' ہو سکتا ہے کہ کسی سے بریک اپ کے بعد تمہارے لیے جگہ پیدا ہو جائے۔"

اس جملے پہ سجاد کو محظوظ ہونا چاہیے تھا مگر وہ نہیں ہو سکا۔

"مریم! تم نے سعد کو کیا جواب دیا؟" اچانک وہ بہت سنجیدہ ہوا۔

"مجھے کیا جواب دینا چاہیے تھا سجاد!" مریم نچ ہوئی۔

"تم مجھے بتاؤ! تم نے اس سے کیا کہا؟" مریم کو اس

کے اصرار پہ حیرت ہوئی۔

"تم جانتے ہو کہ میں اسے کیا جواب دے سکتی تھی۔"

"پھر بھی میں جاننا چاہوں گا کہ تم نے اسے کیا جواب دیا؟"

"میں اسے چیلنج کر کے آئی ہوں۔ وہ ایڈیٹ مجھ سے کہہ رہا تھا جب آپ سجاد ابراہیم سے دوستی کر سکتی ہیں تو سعد سے کیوں نہیں' اور میں نے کہا کہ ہر شخص سجاد ابراہیم نہیں ہو سکتا۔"

روانی سے بولتے ہوئے وہ یہ بات بھی کہہ گئی تھی جو کہ عام حالات میں کبھی نہ کہتی۔ پھر یک دم چپ ہو کر اس نے سجاد کو دیکھا۔

اور سجاد۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ضرور اس جملے کا لطف لیتا۔ مگر وہ اس کی چیلنج والی بات پہ اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر چکر لگاتے ہوئے اپنی پیشانی کو مسلنے لگا۔

"تم کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟" مدیحہ نے اسے یوں چکر لگاتے دیکھ کر پوچھا۔

"تم تصور بھی نہیں کر سکتیں' وہ کیا کر سکتا ہے۔" وہ قدرے خفگی سے بولا۔

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"مریم! ہر مسئلے کا حل منہ توڑ جواب دے کر نہیں نکالا جاتا۔ تم خاموشی سے وہاں سے نہیں آسکتی تھیں کیا؟" مریم کو سجاد کے غصے پہ غصہ آیا تھا۔

"اور وہ میری خاموشی کو پوزیٹو رسپانس سمجھتا تو؟"

"اور اب جو کچھ تم اسے سمجھا کر آرہی ہو' اس کا رسپانس بھی دیکھ لینا۔"

"مثلاً" کیا کرے گا وہ؟ مجھے کڈنیپ کرے گا یا ہراساں کرے گا۔" تیز لہجے میں بولتی ہوئی وہ یک دم کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

سجاد کو مریم کے ہٹ دھرم انداز پہ آج سے پہلے کبھی اتنا غصہ نہیں آیا تھا۔

"نہ وہ تمہیں اغوا کرے گا' نہ ہراساں' جس سجاد کے بارے میں تم اسے بریف کر کے آرہی ہو' وہ تمہیں اسی سجاد کے ساتھ اتنا بدنام کر دے گا کہ سوائے اس کی بات ماننے کے تمہارے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ ہوگا۔"

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سجاد نے سخت غصے سے الفاظ کو چبا چبا کر کہا۔ وہ اسے کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ سجاد کا لہجہ' اس کا انداز اور اس کا غصہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ غلط کر کے آئی تھی۔

اور پھر اس نے سجاد کو بہت غصے سے وہاں سے جاتے دیکھا تھا۔

اس نے مڑ کر تصدیق کرتی نظروں سے مدیحہ کو دیکھا اور مدیحہ کا ہر انداز سجاد کی بات کی تصدیق کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں اور داؤد کسی لکیر کے دو سروں کی طرح تھے ایک سے شروع ہو کر دوسرے پہ ختم۔ وہ کسی تیسرے پوائنٹ کی طرح ہم دونوں کے درمیان آگئی تھی۔ اس کے بعد ایک پوائنٹ سے دوسرے پوائنٹ تک کا سفر جیسے اختتام پذیر ہو گیا تھا۔

اور ہمارا تعلق لائن سے نکل کر مثلث میں جا رہا تھا۔ جس کا ہر کونا مکمل اور توازن کے ساتھ قائم تھا اور اس توازن کو قائم رکھنے کے لیے جتنی محنت میں نے کی ہے شاید کہ کوئی جان سکتا۔

جب بھی تین دوستوں میں سے ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تو کہیں نہ کہیں۔ کبھی نہ کبھی ٹرائی اینگل کی شکل خراب ہو ہی جاتی ہے۔

مگر آج میرا خود کو داد دینے کو چاہ رہا ہے۔ کیونکہ یہ میں ہی تھی جس سے میرا اس کا اور داؤد کا تعلق ایک متوازن شکل میں قائم تھا۔

اور کمال یہ تھا کہ کسی کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس توازن کا مرکز کس کے ہاتھ میں ہے۔

داؤد ہم دونوں کا مرکز تھا۔ وہ اس طوطے کی طرح تھا جس میں ہم دونوں کی ہی جان تھی۔ داؤد نے ہمیشہ بچپن سے لے کر آج تک اس کو مجھ سے بڑھ کر توجہ دی تھی۔ فوقیت دی تھی۔ مگر خدا گواہ ہے۔ میں نے کبھی اس چیز کا برا نہیں مانا۔

کیونکہ وہ واقعی ڈیزرو کرتی تھی۔ پورے خاندان کے بچوں میں وہ سب سے زیادہ محرومی کا شکار تھی۔

میں نے کبھی اس سے حسد یا رشک محسوس نہیں کیا۔ میں نے ہمیشہ اسے داؤد کی نظروں ہی سے دیکھا تھا۔ ایک کیئرنگ دوست کی طرح۔

مگر اس کے پرابلمز اتنے زیادہ' اتنے شدید تھے کہ وہ نفسیاتی مسائل کا شکار ہوتی چلی گئی اور اس کی ممی۔ وہ جیسے کچھ سمجھنے پہ تیار ہی نہیں تھیں۔

انہیں کبھی وہ سب کچھ نظر نہیں آیا تھا جو اس کے اندر پل رہا تھا اور انہیں نظر آتا بھی تو کیسے۔

اپنے اندر کو دوسروں سے کیسے چھپانا ہے۔ اسے اس بات میں کمال حاصل تھا۔ کوئی اسے دیکھ کر کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ یقین ہی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کلیپٹو مینک تھی۔ ہاں! اسے کلیپٹو مینیا (عادتاً "چوری کرنا) تھا۔

اور داؤد کو یہ سطور پڑھتے پڑھتے ایک شدید جھٹکا لگا تھا۔ اسے بھی اعتبار کرنے میں مشکل پیش آئی تھی۔

کتنی ہی دیر وہ کلیپٹو مینیا کے لفظ پر نظریں جمائے بیٹھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"مریم! تم مجھے پریشان لگ رہی ہو۔"

"نہیں بابا! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے بے ساختہ وضاحت دی تھی۔

"مریم! تم جانتی ہو کہ تمہارے بارے میں میرے اندازے غلط نہیں ہوتے۔" اس نے اپنے باپ کی خفگی بھری آواز پر بے ساختہ گہرا سانس بھرا تھا۔

"بابا! آفس میں چھوٹے موٹے مسائل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔"

"تو ان چھوٹے موٹے مسائل کی وجہ سے پریشان ہونا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"بابا پلیز۔" وہ بے زار ہوئی۔

"گھر کب آرہی ہو۔"

"اس ویک اینڈ پہ تو نہیں۔ نیکسٹ ویک اینڈ پہ کوشش کروں گی۔"

"سیٹ کنفرم کروا دوں۔"

"کروا لوں گی بابا!" اب کے وہ مسکراتے ہوئے بولی تھی۔

اپنے باپ کا پیار اسے یوں ہی خوش کر دیا کرتا تھا۔

"اپنی امی سے بات کر لو۔"

اور اب فون پہ اس کی ماں تھیں۔ وہ جتنی دیر گھر بات کرتی رہی تھی۔ پریشانی جیسے اس کے ذہن سے بھاگ گئی تھی مگر جیسے ہی اس نے فون بند کیا تھا۔ اس کے اندر کا خوف اسے پھر سے ڈرانے لگا تھا۔

وہ کبھی اتنی پریشان نہ ہوتی' اگر سجاد اس دن اتنا غصہ نہ کرتا۔ اس کا غصہ کرنا مریم کو بہت کچھ سمجھا گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے اس کی سجاد سے پھر بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ صحیح کہتا تھا۔ ہر کسی کو' ہر بات پہ یوں منہ توڑ جواب نہیں دیا جا سکتا۔

سجاد کی ناراضی اور سعد کی خاموشی دونوں اسے ڈرائے جا رہی تھیں۔ وہ جہاں دو آدمیوں کو کھڑا باتیں کرتا دیکھ لیتی تھی۔ یک دم پریشانی کا شکار ہو جاتی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ اسی کے بارے میں بات کر رہے ہوں گے۔ عزت اور کردار ہر اچھی عورت کے لیے بہت اہم ہوتے ہیں۔ سو وہ مریم کے لیے بھی اہم تھے۔

وہ لنچ ٹائم میں مدیحہ سے بات کرنے کے ارادے سے اس کے کمرے تک آئی۔ مگر اندر سے آتی آوازوں نے اسے کمرے میں داخل ہونے سے روک دیا۔ اندر سے کاشف' سجاد اور مدیحہ کی باتوں کی آواز آرہی تھی۔

کاشف بھی ان کا بیچ فیلو تھا اور وہ چاروں باقی بیچ فیلوز کی نسبت زیادہ ایک دوسرے کے قریب تھے۔ سجاد' کاشف اور مدیحہ اکثر اکٹھے ہوتے تھے۔ البتہ مریم کبھی کبھار ان تینوں کو جوائن کیا کرتی تھی۔

"تم جانتے ہو سعد کو' وہ جب کسی لڑکی کے پیچھے پڑ جائے تو کیا ہوتا ہے۔" یہ کاشف کی آواز تھی۔

بنا بتائے مریم جان چکی تھی کہ وہ ہاٹ ٹاپک بن چکی

تھی۔ بے اختیار اسے دکھ ہوا۔ اسے کم از کم سجاد سے ایسی توقع نہیں تھی۔

"تم نے سعد سے بات کی سجاد؟" اس نے مدیحہ کی پریشان آواز سنی تھی۔

"ہاں۔!" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد سجاد کا جواب آیا۔

"واٹ۔؟" کاشف چیخا۔

"سجاد! تمہارا سعد سے بات کرنا مریم کے لیے مزید مشکلات پیدا کرے گا۔ مجھے کم از کم تم سے ایسی بے وقوفی کی توقع نہیں تھی۔" کاشف خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں مریم کے لیے مسائل پیدا کروں گا۔ بلکہ میں تو اس مسئلے کو ہمیشہ سے ختم کر کے آرہا ہوں۔" مریم کے دل کو بے اختیار ٹھنڈ پہنچی تھی۔ وہ جانتی تھی اندر بیٹھا شخص ہمیشہ سے اس کے مسائل کو حل کرتا آیا تھا۔ اس نے اب بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔

"تم نے کیا کہا سعد سے؟"

"میں کو اس سے کیا کہ میں یہ مسئلہ کیسے ختم کر کے آیا ہوں۔ بس ہو گیا ختم۔"

"پھر بھی ایسا کیا کہہ کر آئے ہو تم اس سے کہ وہ مریم کو اب تنگ نہیں کرے گا۔" یہ مدیحہ تھی۔

"مدیحہ پلیز۔!"

"اس میں حرج ہی کیا ہے سجاد! ہم فرینڈز ہی تو ہیں، کوئی دوسرا تو یہاں موجود نہیں ہے نا۔" مدیحہ کی اس بات پہ سجاد نے کچھ بے چارگی سے کاشف کو دیکھا۔

باہر کھڑی مریم کو بھی دلچسپی ہوئی کہ آخر وہ سعد سے کیا کہہ کر آرہا تھا۔

"مدیحہ! میں تمہیں بتاتا ہوں اس نے سعد سے کیا کہا ہوگا۔" کاشف بول اٹھا۔

"کاشف پلیز۔ تم کوئی فضول بات نہیں کرو گے۔" سجاد اچانک مضطرب ہوا۔

"مدیحہ! اس نے سعد سے کہا ہوگا۔ آئی ایم کرش آن مریم۔"

ایک لمحے کے لیے کمرے میں گہری خاموشی چھا گئی تھی۔

اور مریم۔! اس کے عین سر کے اوپر بم بھی پھٹتا تو اس کی یہ حالت نہ ہوتی۔

مریم کو اب اندر سے ہنسی اور باتوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ دونوں سجاد کا مذاق اڑا رہے تھے۔ مریم کو مشتعل ہونا چاہیے تھا۔ مگر اسے طیش نہیں آیا تھا۔ ایک گہرے سناٹے کے ساتھ اس نے کسی اور چیز کو بھی اپنے اندر پھیلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ شاید دکھ۔

وہ خود کو سنبھال کر کمرے میں داخل ہوئی۔ اندر بیٹھے نفوس پہ سکتہ چھایا تھا۔ کاشف نے اسے دیکھ کر کرسی چھوڑی تھی۔ وہ وہی کرسی گھسیٹ کر سجاد کے سامنے بیٹھ گئی۔

"مریم نے کچھ سنا یا نہیں۔" وہ اندازہ کرنے میں ناکام ہوئے تھے۔

"پھر اس کے بعد کیا ہوا سجاد؟"

اس کی آنکھوں میں سیدھا دیکھتے ہوئے مریم نے اس بچے کی سی دلچسپی سے کہا تھا جسے آگے کہانی سننے کا اشتیاق ہو۔

"مریم پلیز۔ میں۔"

"میں جاننا چاہتی ہوں سجاد ابراہیم۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں سجاد کی بات کاٹی۔

"تو پھر سعد نے کہا ہوگا کہ وہ مریم کو چار دنوں میں پٹا کر دکھا سکتا ہے اور تم نے کہا ہوگا کہ یہ کیا کمال ہے۔ میں تو یہ کام دو دنوں میں کر سکتا ہوں۔ ہے نا؟" اس نے ذرا سا آگے جھک کر اسے دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی تھی۔ سجاد کا منہ مارے ضبط کے سرخ ہونے لگا تھا۔ کاشف اور مدیحہ سانس روکے اسے دیکھ رہے تھے۔

"پھر تم دونوں کی بحث ہوئی ہوگی اور بحث اس شرط پر ختم ہوئی ہوگی کہ تم واقعی ہی مریم کو دو دنوں میں ٹریٹ کر کے دکھاؤ گے۔ لیکن افسوس! مریم نے بہت غلط جگہ انٹری دے دی۔"

وہ افسوس سے سر کو نفی میں ہلا رہی تھی۔

جبکہ سجاد سیدھا سرخ کیے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسائے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے کی سرخی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا۔

"لیکن سجاد جانتا ہے نہ سعد۔ مریم تو حقیقت میں پٹ چکی۔" اس نے مریم کی نم آواز سنی۔ چونک کر اس نے مریم کو دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ابھرتی نمی۔ سجاد ابراہیم کو ایک گہرے سناٹے میں چھوڑ دینے کے لیے کافی تھی۔

وہ ایک جھٹکے سے کرسی چھوڑ کر اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

کاشف چند لمحے اس کا سرخ چہرہ جھکا سر دیکھتا رہا تھا۔

"تم نے مریم جیسی لڑکی کو چیٹ کرنے کی کوشش کی؟ شیم آن یو۔" وہ یکدم پھٹ پڑا۔ "تم جیسے فیوڈل پس منظر کے لوگ اور کیا کر سکتے ہیں۔ سوائے عورتوں سے دل بھرنے کے۔"

غصے سے ہاتھ کو فضا میں لہراتے ہوئے کاشف نے کہا تھا۔ سجاد نے یکدم اپنی جگہ چھوڑی تھی اور پھر کرسی کو ایک بھرپور ٹھوکر لگاتے ہوئے وہ بھی وہاں سے چلا گیا تھا۔

"ایڈیٹ!" کاشف نے اپنی آواز نیچی کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"کاشف!" مدیحہ نے اسے پکارا۔

"تم نے دیکھا اس بلڈی کو۔ کیا کیا اس نے۔" کاشف نے جیسے مدیحہ کی بات سنی ہی نہیں۔

"کاشف!"

"شرم نہیں آتی ان جیسے مردوں کو۔"

"کاشف!" اب مدیحہ کو چیخنا پڑا تھا۔ وہ یکدم خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"سجاد، مریم کے ساتھ سیریس ہے کاشف!" چند لمحوں بعد مدیحہ نے بے حد تھکی ہوئی آواز میں کہا۔

کاشف بھونچکا رہ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ داؤد اور ان دونوں کے دادا اس وقت لوڈو کھیل رہے تھے۔ حسب معمول داؤد گیم جیت چکا تھا۔ جبکہ اب عنایا اور گرینڈپا کے درمیان مقابلہ جاری تھا۔ عنایا کے لیے یہ کھیل کوئی نیا نہیں تھا، مگر پھر بھی وہ اتنی مہارت سے اس گیم کو کھیل نہیں پاتی تھی جتنی مہارت سے اس کی عمر کے دوسرے بچے کھیلتے تھے۔

اب بھی وہ گرینڈپا سے ہار رہی تھی۔

داؤد مسلسل اسے مشورے دے رہا تھا۔ مگر وہ اس کے مشوروں کو سنے بغیر اپنی مرضی اور اپنی سمجھ کے مطابق کھیل رہی تھی۔

اس کی عقل کبھی بھی اس کے لیے جیت نہیں لائی تھی۔ آج بھی رزلٹ وہ ہی تھا۔

مگر پھر اچانک۔

وہ ہارتے ہارتے جیتنے لگی تھی۔

بے تحاشا ایکسائٹمنٹ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ ایک کے بعد ایک گرینڈپا کی گوٹ مارتی جا رہی تھی۔

"یا ہو!" اور گیم جیتنے کے بعد بے ساختہ اچھل کر اس نے نعرہ لگایا تھا۔ "میری چاکلیٹس!" اس نے داؤد کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کہا تھا۔

گویا۔ عنایا کی زندگی میں جیت کی خوشی کبھی نہیں آئی تھی۔ مگر وہ ہارنے پر بھی داؤد سے چاکلیٹ ضرور کھاتی تھی اور داؤد نے اس سے کہہ رکھا تھا جس دن وہ جیتے گی وہ اسے دو چاکلیٹ لے کر دے گا۔ اور آج تو عنایا کی جیت کا دن تھا۔

مگر پھر پتا نہیں کیا ہوا تھا اس کند ذہن۔ نالائق سی بچی نے ایک عجیب بات محسوس کی تھی۔

"گرینڈپا! آپ مجھ سے جان بوجھ کر ہارے ہیں نا؟" اس نے چند لمحے لیے تھے سمجھنے میں اور پھر بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

اور پھر اس نے ایک چاکلیٹ داؤد کو واپس کر دی تھی۔ داؤد نے کچھ حیران ہو کر عنایا کو دیکھا۔

حیران تو دادا بھی تھے۔ مگر ان دونوں کی حیرانگی اس وقت سکتے میں بدلی تھی جب انہوں نے عنایا کے منہ سے نکلنے والی اگلی بات کو سنا۔

"کہتے ہیں انسان جیتے تو وہ جیت اس کی اپنی ہونی چاہیے ورنہ اس سے بہتر ہے کہ وہ ہار جائے۔!!"
نہایت حقانیت سے جواب دیا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم کی جب سے مدیحہ سے دوستی ہوئی تھی اس نے ہاسٹل چھوڑ کر اس کے ساتھ فلیٹ میں رہنا شروع کر دیا تھا۔

اور آج اپنی چابی سے لاک کھولتے ہوئے اس نے خواہش کی تھی کہ کاش اس نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ مریم نے دروازہ کھول کر اندر پاؤں رکھا تھا۔ فلیٹ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

مریم نے پاؤں زمین پہ ہی رکھا تھا مگر اسے ایسا محسوس ہوا تھا کہ اندھیرے کی وجہ سے وہ دیکھ نہیں پائی کہ آگے زمین نہیں تھی۔ کھائی تھی۔ جس میں وہ لاعلمی سے گرتی جا رہی تھی۔

سارا دن آفس میں جس ایک بات کو جھٹلانے کے لیے اس نے پوری توانائی صرف کر ڈالی تھی وہ سرا پاؤں رکھتے ہی اس نے ہار مان لی تھی۔

اس نے دروازے کے بائیں طرف لگے سوئچ بورڈ پہ ہاتھ مارا اور وہاں روشنی پھیلتی چلی گئی۔

"چلو کچھ تو روشن ہوا۔" ایک گہرا سانس بھر کر اس نے سوچا۔

اس نے خود کو عجیب بے چارگی کے عالم میں پایا تھا۔ وہ آہستہ سے چلتے ہوئے لاؤنج میں رکھے صوفے تک آئی۔

اب مریم ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس نے کوشش کی تھی۔ ایک بھرپور کوشش اپنی ہچکیوں، سسکیوں پہ قابو پانے کی۔ نہ رونے کی مگر اندر جیسے گرم پانی کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ اور وہ روئے جا رہی تھی۔

تو مریم شہباز بھی عام سی عورت نکلی۔ اس نے بھی وہی کیا جو اس کی جگہ پہ موجود کوئی بھی دوسری عورت کرتی۔

اسے سجاد ابراہیم سے محبت ہو چکی تھی۔ اور محبت نے ہمیشہ ایک ہی کام کیا تھا۔ "رلانا"۔

سو وہ مریم کو بھی رلائے جا رہی تھی۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد اس نے کال بیل کی آواز سنی تھی۔ وہ جانتی تھی دروازے پر کون تھا۔

اپنے آنسوؤں کو صاف کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دیکھے بنا دروازہ کھول کر وہ واپس مڑ گئی تھی۔

اسے اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھتے دیکھ کر مدیحہ تیزی سے آگے بڑھی۔

"مریم! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے لپک کر مریم کا بازو پکڑا۔

"مدیحہ! مجھے تنگ نہیں کرو۔" اس کے لہجے میں وہ سختی غائب تھی جو مریم شہباز کی پہچان تھی۔

"مریم! زندگی میں کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں رک کر سمجھنا اور سننا پڑتا ہے اور اگر ایسا نہ کرو تو سوائے "کاش" کے پھر کچھ نہیں بچتا۔"

اس نے مریم کا رخ اپنی طرف موڑتے ہوئے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر نرم لہجے میں کہا تھا۔ اس نے ایک نظر مدیحہ کو دیکھا اور خود پہ قابو پانے کی کوشش کی تھی مگر دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔ مدیحہ نے اسے رونے دیا تھا۔

کافی دیر بعد بھی وہ چپ نہ ہوئی تو مدیحہ نے اسے صوفے پہ بٹھا کر پانی پلایا تھا۔

اچانک مدیحہ کا موبائل بجا۔ جسے اس نے دیکھنے کے بعد کاٹ دیا تھا۔

"تم ہمیشہ خود سے باتیں سپوز (فرض) کرتی ہو اور پھر یہ بھی مان لیتی ہو کہ وہ صحیح ہیں۔"

"تو تمہیں لگتا ہے کہ اب کی بار بھی میں غلط ہوں۔"

"دنیا میں ہر مرد چیٹر نہیں ہوتا مریم!"

"ہاں ہوتے ہوں گے ایمان دار مرد بھی۔ اور ان ایمان داروں میں آج ایک اور نام کا اضافہ ہو گیا ہے۔"

اس کے لہجے کی شکستگی میں طنز کی آمیزش ہوئی۔

"سجاد تمہیں پرپوز کرنا چاہتا تھا مگر وہ اپنے کچھ فیملی

میٹرز کی وجہ سے مجبور ہے اور دوسری وجہ تمہاری سو کالڈ ایگو تھی۔ جس بات سے ڈر کر اس نے تمہیں کچھ بتایا نہیں۔ آج وہی بات ہو گئی۔ وہ ہمیشہ اسی بات سے ڈرتا رہا کہ کہیں تم اسے غلط نہ سمجھ بیٹھو۔ ہمیشہ اس نے پیچھے رہ کر تمہیں ہیلپ کیا ان ڈائریکٹ پروٹیکٹ کیا۔ کیوں مریم۔ تب سجاد برا نہیں تھا کیا؟"

مریم یکدم ٹھنڈی پڑی۔

"مگر جب میں اس سے بات کر رہی تھی تو اس نے مجھے کلیئر کیوں نہیں کیا۔ وہ خاموش کیوں رہا؟" سر جھکائے مدہم لہجے میں اس نے پوچھا۔

"اپنا لہجہ دیکھا تھا تم نے۔ اور تب جیسے تم اس کی بات سن لیتیں!" مدیحہ نے طنز کیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

"اور جہاں تک بات سعد کی ہے تو جو شخص کسی کے جھوٹے برتن میں پانی تک نہ پیتا ہو' وہ اس لڑکی سے فلرٹ کیسے کر سکتا ہے جسے اس سے پہلے کسی اور نے پسند کیا ہو۔ بس یہ ہی بات سجاد نے سعد سے کہی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ سعد سائیکک ہے۔"

مریم نے زندگی میں اتنی شرمندگی کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ مدیحہ نے چند لمحے اس کے گیلے گال' متورم آنکھوں اور شرمندہ سے تاثرات والے چہرے کو دیکھا۔

"تم سجاد کے لیے سیریس ہو؟"

اس نے سر اٹھا کر مدیحہ کو دیکھا۔ اس سے اسی بے تکی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔

"کوئی خوامخواہ کسی کے لیے نہیں روتا مدیحہ!"

بہرحال اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ مدیحہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

"تھوڑی دیر پہلے ایک شخص کی کال آئی تھی۔ وہ بے چارہ باہر ٹھنڈ میں اکڑ رہا ہے۔ تم یہیں ٹھہرو۔ میں اس بے چارے کو یہ بات بتا کر آتی ہوں کہ "کوئی خوامخواہ کسی کے لیے نہیں روتا۔"

مریم نے ہکا بکا ہو کر اسے دیکھا اور پھر مدیحہ کے جاتے ہی وہ سرعت سے اٹھ کر کھڑکی تک آئی تھی۔ اس نے پارکنگ لاٹ میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑے اس بے چارے شخص کو دیکھا۔

"میرے اللہ!" بے ساختہ اس نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ ٹھنڈ کی شدت کا اندازہ وہ کمرے کے اندر بیٹھ کر لگا سکتی تھی تو باہر کیا عالم ہو گا۔

☼ ☼ ☼

داؤد نے دوبارہ نظریں اس لائن پر ڈالی تھیں۔

"اسے کلیپٹومینیا (بلا ضرورت چوری کرنے کی عادت) تھا۔"

"اس نے ان سب چیزوں کو انجوائے نہیں کیا تھا جنہیں علوی فیملی کے دوسرے بچے اپنے بچپن سے انجوائے کرتے آ رہے تھے۔

اس کی محرومیوں نے اسے چوری کرنا سکھا دیا تھا اور اس کے مرض کا سب سے زیادہ شکار بھی میں ہی رہی تھی اور تو کسی کو آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔

مجھے یاد ہے آج بھی وہ دن جب ہم دونوں ففتھ گریڈ میں تھے۔ وہ اور میں اکثر ہوم ورک بھی اکٹھے ہی کیا کرتے تھے۔

اس دن وہ بار بار میری میتھس کی کاپی کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں اس کا بار بار اپنی کاپی کو دیکھنا سمجھ میں نہیں آیا اور سمجھ تو تب آیا' جب اگلے دن کلاس روم میں ڈھونڈنے پر بھی مجھے میتھس کی کاپی بیگ میں سے نہیں ملی تھی۔

مجھے یاد تھا۔ بہت اچھی طرح سے یاد تھا کہ میں نے خود اپنی کاپی بیگ میں رکھی تھی مگر اب وہ بیگ سے غائب تھی۔

اس دن کلاس میں — ٹیچر کے ہاتھوں میری جتنی انسلٹ ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مجھے کبھی اس بات کا پتا نہ چلتا۔ اگر اس کی ممی مجھے میری کاپی واپس نہ کرتیں۔

"یہ تمہاری کاپی ہے' تم اپنی دوست کے روم میں چھوڑ آئی تھیں۔"

وہ نہیں جانتی تھیں مگر میں جانتی تھی کہ ہوم ورک ہم نے اس کے نہیں میرے روم میں بیٹھ کر کیا تھا اور

وہ کاپی کیسے اس کے روم تک پہنچی تھی۔

یہ بالکل سامنے کی بات تھی۔

میں نے اس کی ممی کو یہ بات نہیں بتائی تھی بلکہ یہ بات میں نے اپنی ماں کو بتائی تھی۔ مگر انہوں نے یقین نہیں کیا تھا۔ مجھے ہمیشہ سے اپنی بات دوسروں کو سمجھانا مشکل رہا تھا۔ سو میں خاموش ہو گئی تھی۔

اور پھر یوں یہ بات محض کاپی تک محدود نہیں رہی تھی۔ آئے روز میری چیزیں غائب ہونے لگی تھیں۔

اور پھر وہ وقت بھی آیا جب اس کی حرکتیں مجھے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے لگیں۔

میں چیخ کر' اس سے لڑ کر اس کو کالرز سے پکڑ کر گھسیٹنا چاہتی تھی میں کب تک برداشت کرتی ہوں یہ سب۔ آخر کب تک؟

اسکول میں انسلٹ' گھر میں ممی سے ڈانٹ۔ مگر ہمیشہ کی طرح سوائے برداشت کرنے کے میں اور کچھ نہیں کر سکی تھی۔ میں تو کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھی۔

"تب ہی میں نے اسلامیات کی کتاب میں پڑھا تھا کہ دوسروں کے عیبوں پر پردہ ڈالنے سے اللہ آپ کے عیبوں پر پردہ ڈالتا ہے۔"

ہر بات کی ایک روح ہوتی ہے۔ جس کی تہہ تک کوئی کوئی پہنچ پاتا ہے اور مجھے اس بات کی تہہ میں میرے باپ نے اتارا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

"بیٹا! ہیلپ کرنا یہ ہی نہیں ہوتا آپ کسی کو پیسے دے دیں' کسی کو گائیڈ کر دیں یا پھر کسی کا کوئی مسئلہ حل کرا دیں۔ کسی کی برائی کو چھپانا اور اس طرح سے چھپانا کہ اگر آپ دائیں ہاتھ سے چھپائیں تو بائیں کو خبر نہ ہو۔ اور یہ بھی ہیلپ ہی ہوتی ہے۔

اور یہ بات مجھ پہ اتنی حاوی ہو گئی تھی کہ میں کہیں اس کی تہہ میں ہی دب گئی تھی۔ سو میں نے اس کی ہیلپ کرنا شروع کر دی۔ وہ جان بوجھ کر' کسی کے نقصان کے لیے تو چوری نہیں کرتی تھی۔ وہ مجبور تھی۔ ایسے مریض مجبور ہی ہوتے ہیں۔

اور آج میرے ڈائمنڈز کے وہ ٹاپس گم ہوئے ہیں جو میری برتھ ڈے پہ میرے ڈیڈی نے مجھے گفٹ کیے تھے۔

آج ممی کے ساتھ ابو نے بھی مجھے ڈانٹا۔ مگر مجھے اچھائی کرنے کی' ہیلپ کرنے کی اتنی عادت سی ہو گئی ہے کہ میں باوجود کوشش کے اس کا نام نہیں لے سکی۔ بچپن سے میں انسلٹ کرواتی آئی ہوں۔ سو آج بھی کروالی۔

وہ چیزیں چراتی رہے گی۔ میری انسلٹ ہوتی رہے گی۔ اس کی تسکین ہوتی رہے گی۔ اور میری تحقیر "مگر اس کا کوئی فائدہ"

کیا کسی اچھائی کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا یا پھر اس اچھائی کا وہ فائدہ نہیں ہوتا جسے انسان تلاش کرتا ہے۔"

داؤد نے گہرا سانس بھر کر نظریں ڈائری سے اٹھائی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تم کیا سمجھتے ہو کہ جس فیملی سے تم تعلق رکھتے ہو' وہاں یہ بچپن کی منگیتر کو نظر انداز کرنا آسان کام ہے؟"

"نہیں! میں ایسا نہیں سمجھتا۔"

"اس کے باوجود تم نے کسی اور لڑکی سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا۔ میں اسے کیا سمجھوں؟"

"مجھے آپ کی سمجھ سے سروکار نہیں ہے چاچا! مگر اتنا ضرور سمجھ لیں کہ میں شادی اسی سے ہی کروں گا۔"

"اور تمہاری منگیتر کا کیا ہو گا؟"

"یہ فیصلہ کرنا میرا کام نہیں۔" اس کے ضدی انداز پہ اس کے چاچا نے گہری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ سات بہنوں کا اکلوتا بھائی۔ خاندان کا واحد وارث۔

اپنی اس پاور سے وہ اچھی طرح آگاہ تھا۔ سو گردن اکڑائے بیٹھا تھا۔

"تم کیوں بھول جاتے ہو کہ تمہارا تعلق ایک ایسے خاندان سے ہے جہاں لڑکیوں کو اے بی سی تک نہیں آتی اور تم چلے ہو ایک انجینئر لڑکی سے شادی کرنے

تمہارا کیا خیال ہے تمہارا بابا ایسا کرنے دے گا؟"

اس بات پہ سجاد نے سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

"جنید چاچا! اگر آپ مجھے یہاں یہ اماں یا بابا کے نام سے ڈرانے آئے ہیں تو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خاندان کے مردوں کے لیے دوسری شادی کبھی بھی مسئلہ نہیں رہی۔ آپ کے لیے یہ مسئلہ یوں بن رہی ہے کہ میری سو کالڈ منگیتر آپ کی بیوی کی بہن بھی ہے۔"

"وہ نہ صرف میری بیوی کی بہن ہے بلکہ تمہارے بہنوئی کی بہن بھی ہے۔" جنید چاچا نے تلملا کر کہا۔

وہ اسے وٹہ سٹہ کی نزاکت سمجھا رہے تھے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان نزاکتوں کو وہ ان سے زیادہ سمجھتا تھا۔ نہ صرف سمجھتا تھا بلکہ ان کو ہینڈل کرنا بھی بہت اچھی طرح سے جانتا تھا۔

"میں نے اس سے شادی سے انکار تو نہیں کیا جنید چاچا! صرف اتنا کہا ہے کہ سوہائی سے شادی سے پہلے میں مریم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور بس۔"

جنید چاچا چند لمحے اسے دیکھتے رہے۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارے بابا کو بتادوں گا۔"

"مہربانی ہوگی آپ کی!" اس نے بھی براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جس طرح شیر کا بچہ شیر ہی بنتا ہے' اسی طرح وڈیرے کا بچہ بھی وڈیرہ ہی ہوتا ہے۔

سجاد ابراہیم بھی ایک وڈیرہ تھا۔ کل کا سہی مگر تھا تو وہ وہی۔ ایک پس ماندہ گوٹھ کے وڈیرہ خاندان کا سپوت۔

وہ جانتا تھا کہ مریم سے شادی اس کے لیے مسئلہ ہوگی مگر اتنا بڑا مسئلہ نہیں کہ وہ حل نہ کرسکے۔

اور جانتی تو مریم نہیں تھی کہ سجاد سے شادی اس کے لیے اتنا بڑا مسئلہ ہوگی کہ وہ اسے حل کرنے میں مشکلات کا شکار رہے گی۔

وہ لاہور کے ایک پڑھے لکھے خاندان کی بیٹی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ گھر والوں کے سامنے سجاد کا پرپوزل رکھے گی اور گھر والے بڑے آرام سے یہ پرپوزل قبول کرلیں گے۔ اسے اپنے باپ سے اس سلسلے میں بات کرنے میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ وہ اپنے بابا سے بہت بے تکلف تھی۔

سجاد کا پرپوزل واقعی اس قابل تھا کہ بڑے آرام سے مان لیا جاتا مگر سجاد کے نام کے ساتھ جڑی فیوڈل فیملی جیسے مریم کی فیملی کے لیے گلے کی ہڈی ثابت ہورہی تھی۔

اسے شادی کرکے دوسرے صوبے میں بھیجنے کے لیے کوئی بھی رضامند نہ تھا۔

نہ بھائی' نہ ماں اور نہ باپ۔

"امی! میں نے تو سجاد میں فیوڈل لوگوں جیسی کوئی چیز محسوس نہیں کی۔ ایک سال ہونے والا ہے مجھے اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے۔" مریم حد درجہ جھنجلائی ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے غصے کو دباتے ہوئے اس کی شکل دیکھی۔

"مریم! اس طرح کے جاننے میں اور شادی کے بعد کے جاننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ابھی تم اگلے دس سال بھی اس سے ملتی رہو تو اسے جان نہیں پاؤ گی۔ کیونکہ دو لوگ جب اس طرح سے ملتے ہیں تو دونوں ہی اپنی اپنی ذات کے وہ سوئچ آف کردیتے ہیں جن سے ان کی خامیاں واضح ہوتی ہوں۔"

مریم نے بے ساختہ پیشانی کو مسلا۔

"امی! کون سی ایسی شادی ہے جس میں کمپرومائز نہیں ہوتے اور کون سا ایسا شخص ہے جس میں خامیاں نہیں ہوتیں۔"

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہیں۔

"بہتر ہے تم اپنے بابا سے بات کرلو۔" اور مریم نے ایک گہری۔ سکھ بھری سانس لی تھی۔ بابا سے بات کرنا ماں کی نسبت زیادہ آسان تھا لیکن یہ مریم کی خام خیالی ہی تھی۔ اس کی زندگی میں اب کوئی ایسی چیز نہیں بچی تھی جسے آسان کہا جاسکتا تھا۔

بابا سے بات کرنے کا یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ سجاد کے گھر والوں سے ملنے پر مان گئے تھے اور اس کے لیے وہ

خود اس کی امی کے ساتھ جامشورو جانا چاہتے تھے۔ وہ سجاد کا گھر ان کے طور طریقے دیکھنا چاہتے تھے۔

مریم کا خیال تھا کہ اس کے گھر والے وہاں کا سیٹ اپ دیکھ کر اس پرپوزل کے لیے ہاں کردیں گے۔ مگر اب ہر بات مریم کی توقعات کے برعکس ہورہی تھی۔

سجاد کے گھر اس کی امی' بابا کے علاوہ بڑے بھائی بھی گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پہ جیسے سب کو چپ سی لگ گئی تھی۔ مریم کے لیے گھر والوں کا یہ رویہ پریشان کن تھا۔ اس کی انٹرن شپ ختم ہونے میں تھوڑا ہی عرصہ باقی رہ گیا تھا اور ایسے میں یہ حالات۔

گھر والے خاموش تھے تو اس نے بھی بولنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔

اور پھر وہ اسلام آباد واپس آگئی تھی۔ مگر اب کے پہلے جیسا کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں۔

مریم کو ایک لیٹر دو دو بار پڑھنا پڑتا تھا مگر پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کی بنائی گئی رپورٹس پہ جگہ جگہ ابجیکشن لگنے لگے تھے۔ مریم مشکل میں نہیں۔ مصیبت میں تھی۔

سجاد دو دن سے اس کی پریشانی اور اس کی حالت کو دیکھ رہا تھا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔" اسے سجاد کا میسج ملا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ اتنی پریشان تھی کہ اس نے سوچے سمجھے بنا جواب دیا تھا۔

آفس میں کسی کو بھی یہ نہیں معلوم تھا کہ سجاد مریم کو پرپوز کرچکا ہے۔ حتیٰ کہ مدیحہ اور کاشف کو بھی نہیں۔ وہ دونوں کسی بھی قسم کا شور شرابا نہیں چاہتے تھے۔

"مدیحہ! میں ذرا باہر جارہی ہوں۔" اس دن آفس سے واپسی پہ اس نے مدیحہ سے کہا تھا۔

مدیحہ حیران ہوئی تھی۔ کیونکہ مریم کبھی بھی شام میں باہر نہیں نکلی تھی۔

"خیریت؟"

"سجاد سے ملنے جارہی ہوں۔" چند لمحے ہتھیلیوں کو آپس میں مسلنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ مدیحہ مسکرادی

وہ ایف نائن کا ایک مصروف سا پارک تھا۔ خاموشی سے وہ بنچ کے دوسرے سرے پہ جاکر بیٹھ گئی تھی۔

"گھر والے کوئی رسپانس نہیں دے رہے۔" کافی دیر بعد اس نے آہستگی سے کہا۔

"کیا کہتے ہیں؟"

"کہتے ہیں' سندھ بہت دور ہے۔ تمہارے اور میرے گھر کے سیٹ اپ کا فرق اس کے علاوہ ہے۔"

"مریم! گھوڑے گدھوں کا زمانہ تو ہے نہیں' جو تمہیں سندھ سے آتے جاتے دنوں لگ جائیں گے۔" وہ تلخ نہیں ہونا چاہتا تھا مگر ہوگیا تھا۔

مریم نے ایک نظر اسے دیکھا اور اس کی ساری تلخی بھاپ بن کر اڑی تھی۔

"مریم! میں تمہیں ہمیشہ تھوڑی وہاں رکھوں گا۔ میری بیوی میرے ساتھ رہے گی۔"

"کہا تھا بابا سے۔"

"پھر؟"

"انہوں نے کہا کہ تمہارے انکل کی بیوی ابھی تک تمہارے آبائی گھر میں ہے۔ حالانکہ وہ کراچی میں جاب کرتے ہیں۔"

وہ لاجواب ہوا تھا۔

"چاچا میں اور مجھ میں فرق ہے مریم!"

"مثلاً؟" مریم نے رخ موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ اکلوتے نہیں تھے۔ میں ہوں۔"

مریم خاموش ہوگئی۔

"یہاں بیٹھ کر ممکنات کو ڈسکس کرنے سے بہتر ہے سجاد! میں تمہیں ایک بات واضح کردوں۔" اسے محسوس ہوا جسے مریم کی آواز کانپی تھی۔

"میں بابا سے بات کروں گی لیکن اگر اس بار بھی وہ نہ مانے تو۔" مریم کے گلے میں کچھ اٹکا۔ سجاد پلکیں جھپکائے بنا اسے دیکھتا رہا۔

"تو تم مجھ سے کچھ زیادہ کی توقع نہ رکھنا۔"

اور وہ اسے دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکا تھا۔ کچھ کہہ تک نہیں سکا تھا۔ اس کا چہرہ کیسے تاریک ہوا تھا۔ کاش وہ دیکھ پاتی۔ مریم کا جھکا سر بتدریج سرخ ہوتا چہرہ جیسے کسی شکست کا اعلان تھا۔

اور پھر مریم چلی گئی۔ سجاد نے اسے روکا بھی نہیں۔ وہ روک کر کرتا بھی کیا؟

مگر اس لمبے سبزے سے ہرے بھرے اس پارک کی بینچ پہ بیٹھے شخص نے ایک منٹ میں اپنے دل کو خاک ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اور محبت دلوں کو خاک کرنے کے سوا کرتی بھی کیا ہے؟

سنا ہے اس جہاں میں
زندگی کی قحط سالی ہے
یہاں وہ چار دن جینے کا
اکثر ذکر ہوتا ہے
یہاں ہر چیز فانی ہے
یہاں اظہار کیا کرنا
یہاں پر پھر پیار کیا کرنا
مگر کچھ یوں بھی سنتا ہوں
کہ ایسا اک جہاں ہو گا
حیات جاوداں کے سب
وہاں اسباب رکھے ہیں
یہ میرا تم سے وعدہ ہے
اگر دونوں وہاں ملیں گے
وہاں اقرار کریں گے
وہاں اظہار کریں گے
وہاں پھر پیار کریں گے
وہاں پھر پیار کریں گے

☼ ☼ ☼

کمرے کا دروازہ اک ہلکی سی چرر کی آواز کے ساتھ کھلا تھا اور روشنی ایک پتلی سی لکیر کی صورت زمین پر پھیلتی گئی۔ اندر کمرے میں سکون آمیز اے سی کی ٹھنڈک کے ساتھ ملگجا سا اندھیرا تھا جس میں روشنی کی لکیر پڑی واضح نظر آرہی تھی۔

"گرینڈ پا! آئی کم ان؟" انہوں نے سرگوشی کی سی صورت وہ آواز سنی تھی۔

"یس! آئی کم ان؟" انہوں نے بھی مسکراتے ہوئے اسی سرگوشی میں کہا تھا۔

کیونکہ بیڈ کے دوسرے سرے پہ دادی سو رہی تھیں۔

وہ کوئی آواز پیدا کیے ان تک آئی اور اشارے سے کان کو قریب لا کے کہا۔

"مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔" ساتھ ہی اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئے۔

بات لمبی ہے اور انہیں باہر ہو جانا ہوگا۔ اور گرمیوں کی اس دوپہر میں اے سی کی ٹھنڈک چھوڑ کر وہ دونوں لان میں آگئے تھے۔ جہاں ایک گھنے سایہ دار درخت کے نیچے جھولا رکھا ہوا تھا۔

"گرینڈ پا! اللہ نے سب کو ایک جیسا پیدا کیا ہے نا؟" ان کے جھولے پر بیٹھتے ہی وہ بولی تھی۔

"بالکل! اللہ نے سب انسانوں کو ایک جیسا پیدا کیا ہے۔"

"تو پھر داؤد مجھ سے زیادہ لائق کیوں ہے؟"

وہ یکدم سکتے میں آگئے تھے۔

انہوں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں الجھن کے ساتھ ساتھ اضطراب بھی تھا۔

"عنایا! تمہیں پتا ہے نابلائنڈ (اندھے) لوگوں کی سینسز (حسیات) عام لوگوں سے زیادہ شارپ ہوتی ہیں۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"پتا ہے کیوں؟"

اب کے سر کو نفی میں ہلایا گیا۔

"سویٹ ہارٹ اللہ! جب کوئی ایک چیز انسان کو نہیں دیتا تو اس کے بدلے میں دوسری چیزیں عام انسانوں سے بڑھ کر دے دیتا ہے۔"

انہوں نے عنایا کے سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا تھا۔ وہ اگر محنت کرے تو وہ داؤد جیسی لائق ہو سکتی ہے وغیرہ وغیرہ انہوں نے وہ نہیں کیا تھا جو اس کی ماں اس کے ساتھ کرتی آرہی تھی۔

انہوں نے عنایا کو نیا سبق پڑھایا تھا۔ اپنی ذات میں جینے کا... خود اعتمادی کا۔

"بٹ گرینڈ پا! اسکول میں ٹیچرز کہتی ہیں کہ میں داؤد جیسی نہیں ہوں... گھر میں ممی... مجھ میں ایسی کوئی چیز نہیں جو داؤد سے اچھی ہو... میں تو گیمز میں بھی اس سے ہار جاتی ہوں۔"

اب کے گرینڈ پا نے عنایا کے چہرے پہ مایوسی دیکھی تھی۔

وہ ایک دن میں یہ احساس اس کے ذہن سے کھرچ نہیں سکتے تھے جو شعور سنبھالتے ہی اس کے دماغ میں ڈال دیا گیا تھا۔

"ہو سکتا ہے کوئی ایسی چیز ہو جس کا تمہیں ابھی پتا نہ ہو... جب تم بڑی ہو جاؤ تب تمہیں وہ بات معلوم ہو۔" انہوں نے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تھا۔

اس نے کچھ کہا نہیں تھا بس ہونٹ دبا کر نفی میں سر ہلایا تھا۔ اور یوں سر ہلانے سے اس کے پونی ٹیل میں بندھے لمبے بال لہرائے تھے۔ پچھلے چند سالوں میں اگر عنایا کی کسی چیز میں بہتری آئی تو وہ اس کے بال تھے۔

سیاہ ریشمی لمبے سیدھے بال...

سکندر کو اس کے بال اتنے پسند تھے کہ وہ انہیں کٹوانے ہی نہیں دیتے تھے۔ تب ہی اب اس کے بال اتنی سی عمر میں ہی کمر کے نیچے تک آتے تھے۔ دادا نے اس کے ہاتھ چھوڑ کر بالوں کو سہلایا تھا۔

"تم کسی سے کم نہیں ہو عنایا!"

"بٹ!"

"نو بٹ عنایا! یہ اللہ کی مرضی ہوتی ہے وہ جسے چاہے جو چاہے دے... اگر داؤد لائق ہے تو اس میں اس کا کوئی کمال نہیں... یہ اللہ کی طرف سے ہے اور اگر تم اس جیسی ذہین نہیں ہو تو اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں... یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور یاد رکھو اللہ کبھی بھی کسی کے ساتھ بھی ناانصافی نہیں کرتا۔ وہ بہت انصاف والا ہے۔"

انہوں نے اسے ساتھ لگاتے ہوئے پیار سے کہا تھا کیونکہ انہوں نے عنایا کی بڑی بڑی آنکھوں میں اتنے ہی بڑے بڑے آنسو دیکھ لیے تھے۔

اللہ انسان کو ایک چیز سے نہیں آزماتا... اللہ انسان کو بہت سی چیزوں سے آزماتا ہے۔

"اور ضرور ہم تمہیں آزمائیں گے... ڈر اور بھوک سے اور مالوں، جانوں اور پھلوں کے خسارے سے اور خوش خبری سناؤ... صبر کرنے والوں کو۔" (سورہ بقرہ ۱۵۵)

کبھی کسی نے سوچا ہے کہ "نعمت" بھی آزمائش ہو سکتی ہے اور رحمت سے بھی انسان کو آزمایا جا سکتا ہے۔

اللہ تو دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی...

اور داؤد سخت حیران ہوا تھا۔ بات اس کی ہو رہی تھی تو پھر اچانک ڈائری لکھنے والے کو "اللہ" کیسے یاد آگیا؟

تو کیا اسے بھی آزمایا گیا تھا...؟

☼ ☼ ☼

اور مریم جتنی بھی باپ سے بے تکلف سہی مگر اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اپنے باپ سے دوبارہ بات کر پاتی۔ حالانکہ وہ شخص اسی لیے اسلام آباد سے آئی تھی۔ یہ اس مہینے میں اس کا دوسرا چکر تھا۔

مریم پریشان تھی... اور اس کی پریشانی سب ہی جانتے تھے مگر کوئی بھی اس کی "بس" پریشانی کو دور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر اس دن مریم نے بہت انتظار کیا... صبح سے رات ہونے تک حالانکہ وہ تو روز ہوتی تھی مگر اس دن کرنا پڑا۔

پھر جب رات ہوئی تو وہ لان میں ٹہلتے ہوئے باپ کا انتظار کرنے لگی تھی۔ وہ کھانا کھا کر عشاء کی نماز پڑھنے جاتے تھے اور واپسی پر لان میں چہل قدمی ضرور کیا کرتے تھے۔

بیٹی اگر باپ کو جانتی تھی تو باپ سے یہ توقع کیسے کی

جاسکتی تھی کہ وہ بچی کو نہیں جانتے ہوں گے۔ وہ مریم کو وہاں دیکھتے ہی سمجھ گئے تھے کہ اس وقت وہ وہاں کیوں موجود تھی۔

مریم نے انہیں دیکھا اور رک گئی تھی۔ وہ اس کے قریب آئے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلایا۔

"آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ لان میں رکھے جھولے پر بیٹھ گئے۔

"میں جانتا ہوں کہ تم پریشان ہو مگر تمہاری پریشانی بھی مجھ سے تمہاری مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں کرواسکتی۔ میں تمہاری خواہش کا احترام کرنا چاہتا ہوں مگر مریم! سجاد ابراہیم ایک بہت ہی روایتی قسم کے فیوڈل خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ لوگ اتنے روایتی ہیں کہ ان کے خاندان کی ایک بچی بھی پڑھی لکھی نہیں اور ایسا پچھلی کئی نسلوں سے ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اس بات کا ذکر اتنے فخر سے کرتے ہیں جیسے۔۔۔"

انہوں نے خود بات شروع کرکے مریم کو بات شروع کرنے کی مشکل سے بچایا تھا مگر اب وہ یک دم خاموش ہوئے تھے۔ مریم خاموش تھی۔

"تم کیسے وہاں ایڈجسٹ کرپاؤ گی؟"

اس کی خاموشی پہ ان کو دوبارہ بولنا پڑا تھا۔

مریم اب بھی چپ تھی۔۔۔ آنسوؤں نے اس کا گلا بند کردیا تھا۔

"مریم!" انہوں نے گود میں رکھے اس کے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ رکھ کر بہت نرمی سے پکارا۔

اور بارش کا پہلا قطرہ ان کے ہاتھوں پہ گرا تھا۔ انہیں تکلیف ہوئی تھی۔

"پاپا! ماں باپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ پیدائش سے لے کر بڑے ہونے تک اولاد کے لیے وہ دن دیکھتے ہیں نہ رات۔۔۔ وہ اسے عقل و شعور دیتے ہیں۔۔۔ اور جب اولاد اس شعور کو۔۔۔ عقل کو اپنی مرضی سے استعمال کرنا چاہے تو وہ اس کے گلے پہ نہیں۔۔۔ ذہن پہ پاؤں رکھ دیتے ہیں کہ اس سے آگے نہیں سوچنا۔۔۔ کیوں پاپا؟ ایسا کیوں کرتے ہیں ماں باپ؟" اس نے نمکین پانیوں کے طوفان والی آنکھوں کو اٹھا کر باپ کو دیکھا تھا۔

چوبیس سالوں میں اس کے باپ نے اس کی ایک خواہش پوری نہیں کی تھی اور چوبیس سالوں میں مریم نے پہلی بار شکوہ کیا تھا۔ تکلیف تو ہونی تھی۔۔۔ فطری عمل جو ٹھہرا۔۔۔ انہیں مریم کی شکایت پہ کوئی شکوہ نہیں ہوا تھا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ بالکل صحیح کہہ رہی ہو۔ مگر بیٹا! ماں باپ بہت مجبور ہوتے ہیں۔ اللہ جب عورت اور مرد کو ماں اور باپ بناتا ہے نا تو وہ انہیں مائیکروسکوپک آنکھیں بھی دے دیتا ہے جس سے وہ۔۔۔ وہ چیزیں بھی دیکھ لیتے ہیں جو عام آنکھ سے نظر نہیں آتیں پھر ماں باپ کیا کریں۔ جب وہ آکر ڈراتی ہیں۔ سو مجبور تو ہو جاتے ہیں ناوہ۔" انہوں نے مریم کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ اٹھا لیا تھا۔

"مریم! تمہارا رونا مجھے تکلیف دے رہا ہے۔۔۔ دکھ پہنچا رہا ہے مگر میں ابھی اتنا بھی دکھی نہیں ہوا کہ سجاد کا پرپوزل ایکسیپٹ کرلوں۔ ایم سوری مریم!" وہ اب دونوں ہاتھ گود میں رکھے سامنے دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

اس نے بے یقینی سے اپنے باپ کو اپنے پاس سے اٹھ کر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ جھولا آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔۔۔ اور وہ بھی جھولے کے ساتھ ہل رہی تھی۔ آگے پیچھے۔۔۔ آگے پیچھے۔۔۔

مگر کمال یہ تھا کہ پھر بھی وہ ساکت تھی۔۔۔ ایک دم ساکت۔

☆ ☆ ☆

مریم کو کچھ بتانے کی اور سجاد کو کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس کا ستا ہوا چہرہ تمام سوالات کے جواب بخوبی دے رہا تھا۔

اور پھر وہ بھی دن آگیا جب مریم کی انٹرن شپ کا اختتام ہوتا تھا۔

ایک سال میں۔۔۔ زندگی یوں بھی بدلتی ہے؟ مریم کو پہلی بار تجربہ ہوا تھا۔ ابھی ابھی اسے اپنے باس کی

طرف سے بلائے جانے کا پیغام ملا تھا۔
دروازہ کھولتے ہی ایک لمحے کے لیے اس کے دماغ سمیت سارے جسم کی چولیں ہل گئی تھیں۔ سجاد بھی وہیں موجود تھا۔
وہ خاموشی سے آکر اس کے برابر والی کرسی کو ذرا فاصلے پہ کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ سجاد نے اس فاصلے کو بری طرح سے محسوس کیا تھا۔
"مس مریم!" باس نے اسے مخاطب کیا۔ اس نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے نظریں اٹھائیں اور سجاد کی نظروں نے اس کے ہاتھوں کا احاطہ کیا تھا۔ وہ لرز رہے تھے۔
"کاش! وہ اس کے ہاتھوں کی لرزش ختم کر سکتا" اس نے بڑی شدت سے خواہش کی تھی۔
باس اسے مستقل جاب کی پیش کش کر رہے تھے۔ مگر مریم نے صاف معذرت کر لی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔
باس نے اس سے کافی اصرار کیا۔ مگر وہ نہ مانی۔
سجاد جانتا تھا۔ اس کی ایسی کوئی مجبوری تھی اور نہ ہی ایسا کوئی مسئلہ اسے درپیش تھا۔ پھر بھی وہ انکار کر رہی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے اپنے کانٹریکٹ کے پیپرز باس سے پکڑے تھے۔
"تو مریم نے ساتھ چھوڑ دیا ہے۔" اس نے سوچا مگر پھر اسے یاد آیا کہ مریم نے ساتھ دینے کا وعدہ بھی کب کیا تھا؟
اس دن کے بعد اس نے مریم کو اس جگہ دوبارہ نہیں دیکھا تھا حالانکہ اس کے کچھ آفیشل معاملات باقی تھے مگر اس نے وہ مدیحہ کے حوالے کر دیے۔
وہ دوبارہ وہاں نہیں آئی تھی۔ سجاد پاگل ہو گیا تھا۔ وہ اپنے سیل فون پر مریم کا نمبر نکالتا اور اسے دیکھتا رہتا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے انگوٹھے کے ایک ہلکے سے دباؤ سے وہ۔۔۔ سیکنڈز میں مریم کی آواز سن سکتا تھا۔۔۔ اس سے بات کر سکتا تھا مگر اس ہلکے سے دباؤ کے لیے اس پر بہت دباؤ تھا۔
پھر مریم کی واپسی کا دن بھی آ گیا۔

"تم آخری دفعہ سجاد سے مل لیتیں۔" مدیحہ نے اس سے کہا۔
"اس سے کیا فرق پڑے گا مدیحہ!" مریم نے مدیحہ کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر پھر بھی وہ کچھ تو جان ہی گئی تھی۔
"مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے اور سجاد کے درمیان ایسا کیا ہوا ہے کہ تم یوں جا رہی ہو مگر پلیز مریم! ایک دفعہ اس سے مل لو۔"
"تم سے سجاد نے کہا ہے؟" اچانک مریم خوش فہم ہوئی تھی۔
"نہیں!"
خوش فہمی۔۔۔ مایوسی میں بدلی تھی۔
"مجھے چلنا چاہیے۔۔۔ کہیں فلائٹ نہ چھوٹ جائے" چند لمحوں بعد مریم نے اس سے ملتے ہوئے کہا تھا۔
ٹرالی گھسیٹتے ہوئے وہ بورڈنگ پاس لینے کے لیے اندر جا رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کی ٹرالی کے ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کر اسے روکا تھا۔ بے اختیار اس نے مڑ کر دیکھا۔
"مریم!" اس نے تھکے سے انداز میں زیر لب کہا تھا۔۔۔ وہ سجاد تھا۔
وہ یہاں سے ایسی کوئی بات اپنے ساتھ نہیں لے کر جانا چاہتی تھی جو ساری عمر اسے سوئی کی طرح چبھتی رہتی مگر یہ مدیحہ۔۔۔
"تم تو یوں چھوڑ کر جا رہی ہو مریم! جیسے میں کسی باب کا ناپسندیدہ ورق تھا جسے پھاڑ کر پھینک دیا جائے۔"
اس نے شکوہ کیا۔ اسے شکوہ کرنے کا حق تھا۔
"کاش کہ تم زندگی کے باب کا کوئی ورق ہوتے سجاد! اور کاش کہ میں تمہیں پھاڑ کر پھینک سکتی!" مریم نے پہلی بار اعتراف کیا تھا وہ بھی کب۔۔۔
سجاد اس کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ وہ اب سر جھکائے کھڑی تھی۔
وہ دونوں اتنے خالی ہاتھ۔۔۔ تہی داماں تھے کہ ایک دوسرے کو کہنے کے لیے ان کے پاس الوداعی کلمات بھی نہیں تھے۔ وہ دونوں ہی اپنے ذہن میں لفظوں کو

پکڑ پکڑ کر ترتیب دینے کی کوششوں میں تھے اور دونوں ہی ناکام ہو رہے تھے۔
"میں تمہارا انتظار کروں گا مریم!" بالآخر ایک جملہ بن ہی گیا تھا۔
"کوئی فائدہ نہیں!" سوال کا جواب دینا آسان تھا۔
"بے فائدہ ہی سہی پر میں کروں گا۔ ہو سکتا ہے کوئی راہ نکل آئے۔"
"راہ کیا نکلنی ہے اب۔۔۔ اب تو بس ایک ہی کام رہ گیا ہے میں یہاں سے بھاگ جاؤں اور تم سے کورٹ میرج کر لوں۔"
مریم نے اردگرد بکھرے ہجوم کو دیکھتے ہوئے تلخی سے کہا۔۔۔ حالانکہ وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتی تھی۔
"کیا تم ایسا کر سکتی ہو مریم؟" اس نے اچانک پوچھا۔
مریم نے صرف ایک نظر۔۔۔ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور سجاد خاموشی سے اس کی ٹرالی پکڑ کر اندر کی طرف چلنے لگا۔
"ایسا مت کرو۔" وہ اسے ٹرالی گھسیٹنے سے روکنا چاہتی تھی۔
مگر وہ سنی ان سنی کر کے ٹرالی گھسیٹتا رہا اور پھر "حد" ختم ہو گئی تھی۔
اس سے آگے وہ نہیں جا سکتا تھا۔۔۔ آگے مریم کو اکیلے جانا تھا۔۔۔ اکیلے۔۔۔
اس نے ٹرالی مریم کو پکڑائی۔۔۔ وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ مریم ضبط کرتی رہی۔۔۔ مگر آج ضبط کی ہی تو آزمائش تھی۔۔۔ اور پھر وہ رو پڑی۔ خود سے کیے گئے وعدے یوں ہی ٹوٹتے ہیں۔
سجاد کا شدت سے دل چاہا کہ وہ اس کے آنسو صاف کر دے۔۔۔ مگر صرف چاہنے سے کچھ ہوا ہے کبھی؟ اس نے ہاتھ کی مٹھی زور سے بند کر کے اسے مریم کے چہرے تک جانے سے روکا تھا۔
"مریم پلیز۔۔۔" وہ بے چارگی سے بولا۔
مریم رو رہی تھی۔۔۔ زار و قطار۔۔۔ اس کا ہر گرنے والا آنسو سجاد کو بتا رہا تھا کہ صرف اسی کی محبت میں شدت نہیں تھی۔
پھر وہ یک دم مڑی اور اپنی ٹرالی کو گھسیٹ کر اندر کی طرف چل پڑی۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔ وہ بس روتی جا رہی تھی اور چلتی جا رہی تھی۔
وہ وہیں کھڑے کھڑے مریم کو دیکھتا رہا۔
کاش اتنے ہجوم میں یک دم تنہا ہو جانے والے شخص کی بے بسی کو کوئی محسوس کر پاتا۔ اس کے پاس سے وہ روتی ہوئی گئی تھی۔۔۔ اور وہ اسے چپ تک نہیں کروا سکا تھا۔ کوئی حرف تسلی۔۔۔ کوئی حرف یقین۔
آہ! کہ وہ خاک ہوتا شخص۔۔۔ ٹوٹ کر سنگریزوں کی مانند بکھرتا وہ شخص۔۔۔

اگر دونوں وہاں ملیں گے
وہاں اقرار کر لیں گے
وہاں اظہار کر لیں گے
وہاں پھر پیار کر لیں گے

☼ ☼ ☼

اور اس دن کے بعد مریم ہنسنا بھول گئی تھی۔ اس کی آنکھوں نے ایک نئی بات جو سیکھ لی تھی۔
مریم نے اپنی بھرپور کوشش کی تھی ایک ایسی زندگی گزارنے کی جس میں وہ سجاد کے بغیر گزارہ کر لیتی مگر ناکام ہو گئی تھی۔
گھر والوں کے لیے مریم کا یہ انداز کافی ناقابل قبول تھا مگر وہ چپ تھے۔ وہ سب اسے ایک موقع دینا چاہتے تھے۔۔۔ سنبھلنے کا۔۔۔ اور سنبھلنا تو مریم بھی چاہتی تھی مگر۔۔۔ اور چاہتی تو وہ اور بھی بہت کچھ تھی۔۔۔ وہ اچھی بیٹی بننا چاہتی تھی۔ مگر۔۔۔
وہ ماں باپ کے فیصلے پہ خوشی سے آنکھیں بند کر کے اپنے آنے والے پروپوزل کے لیے "ہاں" نہیں کر پائی تھی۔ اور "ناں" کرنے کے لیے اس نے کوئی بہانہ نہیں کیا تھا۔ "ابھی نہیں کرنی شادی" جیسے الفاظ نہیں کہے تھے۔ مریم ذہین تھی نا۔۔۔ بہت ذہین اور ذہانت اس کی موروثی خصوصیت تھی۔
اب کی بار مریم نے اسی خصوصیت کا استعمال کیا

تھا۔

اس نے کوئی ہیر پھیر۔۔۔ کوئی گھماؤ پھراؤ والی بات نہیں کی تھی۔ اس نے سیدھے سیدھے دھماکا کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج اس کی مہندی تھی۔ زرد اور آتشی رنگ کے امتزاج کے گھیر والے فراک اور چوڑی دار پاجامے میں وہ اتنی ہی دلکش لگ رہی تھی جتنا مریم شہباز کو لگنا چاہیے تھا۔

ایک قیامت۔۔۔

اس کے پاس سے مہندی اور پھولوں کی ملی جلی دل فریب سی خوشبو آرہی تھی۔

مگر مریم کو کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ پتا نہیں کیوں اپنی مرضی کر لینے کے باوجود اسے دکھ تھا۔۔۔ کوئی چیز اس کے دل میں سوئی کی طرح کھب گئی تھی اور اب وہ ساری عمر تکلیف دینے والی تھی۔۔۔ ساری عمر۔۔۔

اس کا خیال تھا کہ گھر والوں کا ردِ عمل انتہائی شدید ہوگا مگر کسی نے اس سے پلٹ کر یہ تک نہ پوچھا تھا کہ کیوں کیا ایسا تم نے۔۔۔ وہ چاہتی تھی کہ کوئی تو اس سے ۔۔۔ اس کی حرکت کے بارے میں سوال کرتا۔۔۔ کوئی لعن طعن۔۔۔ کوئی ڈانٹ کوئی مار مگر وہاں تو کچھ نہیں تھا۔ اس کا باپ ایک نفیس طبیعت کا پڑھا لکھا انسان تھا۔ یہ سب کرنا یہ اس کے لیے ناممکن سی بات تھی۔

مگر مریم چاہتی تھی کہ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے بری طرح ماریں۔۔۔ اتنا ماریں کہ اس کے دل پہ چھایا غبار کم ہو جائے مگر۔۔۔

وہاں تو سب جیسے بولنا۔۔۔ کچھ کہنا ہی بھول گئے تھے۔

مریم بہت مضطرب تھی اور اسی اضطراری کیفیت میں اس نے سجاد کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

"کیا ہوا؟" سجاد کی گھبرائی ہوئی آواز۔ وہ خاموش رہی۔

"مریم!" وہ مزید گھبرایا۔

"میں بابا کو سب کچھ بتا رہی ہوں سجاد!" اس نے کہا

"واٹ؟" سجاد کو جھٹکا تھا۔ مریم پہلے پاگل تھی یا اب۔۔۔

سجاد اب اپنے غصے، بے چینی اور دماغ کو قابو رکھتے ہوئے اسے اس فیصلے کے مضمرات سمجھا رہا تھا۔ اور وہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔

"وہ کچھ نہیں کر سکتے سجاد! پورا لاہور شہر اکٹھا ہے یہاں۔۔۔ تم کیا سمجھتے ہو، وہ کوئی جواز پیش کر سکیں گے یک دم شادی روکنے کا یا پھر کسی اور سے یک دم شادی کر دینے کا۔۔۔"

"مریم! انسان غصے میں بہت کچھ کر لیتا ہے۔۔۔ وہ سب کچھ بھی جو عام حالات میں کبھی نہ کرے۔"

مریم ہلکا سا ہنسی۔۔۔ ایک طنزیہ ہنسی

"انہیں کچھ کرنا ہوتا نا سجاد! تو وہ بہت پہلے کرتے۔۔۔ اب نہیں جب کہ وہ اتنے اہتمام سے تم سے میری شادی کروا رہے ہیں۔"

"مجھے کیوں لگ رہا ہے کچھ غلط ہو جائے گا"

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔

"کچھ غلط نہیں ہوگا۔ بلیو می! اگر ہو بھی ہو جائے تو ۔۔۔" یک دم اس کا گلا رندھ گیا۔

ایک گہرا سانس بھرتے ہوئے سجاد نے فون بند کر دیا۔

اسی لمحے جب مریم اپنی پانی بھری آنکھوں سے سیل فون کو دیکھ رہی تھی کمرے کا دروازہ کھلا۔ اس نے آہستگی سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کی ماں تھیں۔

وہ سر اٹھائے انہیں دیکھتی رہی۔ ان کے چہرے پہ کوئی تاثر تھا جو مریم کو تکلیف دے رہا تھا۔ وہ آکر اس کے بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی تھیں۔

"کیا بات ہے امی؟" ایک طویل خاموشی کے بعد بالآخر مریم نے پوچھا۔

"تمہارے پاپا بہت پریشان ہیں۔ دنیا کو دکھانے کے لیے ہمیں سجاد سے تمہارا نکاح تو کرنا پڑے گا اور اب دنیا کو کیا پتا، شہباز صاحب کی بیٹی پہلے ہی یہ کارنامہ سرانجام دے چکی ہے۔"

مریم نے نہیں سوچا تھا کہ وہ یوں اپنے ماں باپ کے سامنے کبھی اس طرح سر جھکائے گی۔

"اب نکاح پہ نکاح۔۔۔ بے شک آدمی ایک ہی۔۔۔ معلوم نہیں جائز ہے بھی یا نہیں۔۔۔" وہ سخت پریشانی سے کہہ رہی تھیں اور مریم سر جھکائے ہاتھوں کو مسل رہی تھی "میں نے شہباز کو کبھی اتنا پریشان۔۔۔"

"امی! میں نے سجاد سے نکاح نہیں کیا تھا۔" اس نے ماں کی بات کاٹ کر بے حد دھیمے لہجے میں کہا تھا۔

"کیا۔۔۔! کیا بکواس کی تم نے۔۔۔!" وہ یکدم کھڑی ہوئی تھیں۔

"میں نے نکاح نہیں کیا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا تاکہ میں۔۔۔" مریم نے رک کر اپنے گالوں پہ بہنے والے آنسو صاف کیے۔

"میں نے سجاد کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرنا تھی امی! سو مجھے جھوٹ بولنا پڑا تاکہ پاپا مجبور ہو کر ۔۔۔ اسے رکنا پڑا۔"

اس کی ماں اتنی شاکڈ تھیں کہ وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکیں۔ وہ چند لمحے یوں ہی اسے دیکھتی رہیں۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتی کمرے سے چلی گئی تھیں۔

مریم نے سر اپنے گھٹنوں پہ گرا لیا تھا۔ اس کا دل بہت بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔

پتا نہیں اب کیا ہوگا؟؟؟۔۔۔

کیا پاپا سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس کی شادی سجاد سے کر دیں گے؟ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان کسی بھوت کی طرح اس کے ذہن سے چمٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عنایا! تمہاری ایک بہن آرہی ہے" عنایا کو بتایا گیا۔

"بہن؟" وہ سر اٹھا کر دادا کو دیکھنے لگی۔

"ثنا آپی کی طرح؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، وہ تم جتنی ہے۔۔۔ تمہارے ساتھ رہے گی۔ تم اسے اپنی دوست بنانا۔۔۔ بہت اچھی دوست"

" No Grand Pa! I Dont want any more friends Deoud is enough "

(نہیں گرینڈ پا! مجھے کوئی اور دوست نہیں چاہیے۔ میرے لیے داؤد کافی ہے) "پہلے ہی لمحے میں اس نے آنے والی بہن نما دوست کو مسترد کیا۔

"ہو سکتا ہے وہ تمہاری داؤد سے بڑھ کر اچھی فرینڈ ثابت ہو!"

"آئی ڈونٹ لائیک۔۔۔" وہ چڑ کر بولی۔

اس وقت عنایا گریڈ فائیو میں جا چکی تھی۔ عموماً "عمر کے اس حصے میں بچے کسی اچانک آنے والی تبدیلی کو یک دم قبول نہیں کر پاتے۔۔۔ اور جس طرح کا عنایا کا مزاج تھا۔۔۔ اس چیز کے لیے اسے پہلے سے تیار کیا جا رہا تھا۔

"اچھا! ایک بات بتائے گی عنایا گرینڈ پا کو۔" انہوں نے عنایا کو گود میں اٹھا لیا۔

"عنایا کو برا لگے گا جب گرینڈ پا آپ کی بہن کو بھی اسی طرح سے پیار کریں گے۔ جس طرح کہ آپ کو۔۔۔" اس سوال پر عنایا کچھ خوف زدہ ہوئی تھی۔

"آپ پھر مجھے پیار نہیں کریں گے۔ مجھے آئس کریم نہیں کھلائیں گے اور نہ ہی میرے ساتھ کھیلیں گے؟" اسی خوف کے سے تاثر کے ساتھ اس نے اچانک پوچھا۔

"ارے۔۔۔!" وہ یک دم ہنس پڑے۔ "آپ کو کس نے کہا کہ گرینڈ پا آپ کو پیار نہیں کریں گے۔ گرینڈ پا آپ کو آئس کریم بھی کھلائیں گے اور آپ کے ساتھ کھیلیں گے بھی، بٹ آپ کا ایک اور پارٹنر آرہا ہے نا سو گرینڈ پا اس کے ساتھ بھی اتنا ہی پیار کریں گے جتنا آپ کے ساتھ۔۔۔"

"آپ اس سے کہیں کہ وہ یہاں نہیں آئے۔ اپنے ممی پاپا کے ساتھ وہیں رہے۔"

بے ساختہ انہوں نے گہرا سانس بھرا تھا۔ یہ بات تو انہوں نے عنایا کو بتائی ہی نہیں تھی کہ وہ اب اپنے ممی پاپا کے ساتھ ہی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے وہاں آنا ہی تھا۔ سو وہ۔۔۔ وہاں۔۔۔ علوی ہاؤس میں آرہی تھی ہمیشہ

ہمیشہ کے لیے۔

ایک شہزادی ایک دوسری والی شہزادی کو ویلکم کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔

اور یہ اتنا آسان کام تھا بھی نہیں اس کے لیے جو بلا شرکت غیرے راج کر رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

شہباز صاحب کی زندگی میں کئی ایک مواقع ایسے آئے تھے جب مریم کی ذہانت کی بدولت ان کا سر فخر سے بلند ہوا تھا مگر یہ آج پہلی بار ہوا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی ذہانت سے خائف ہو گئے تھے۔ مریم نے اپنی ذہانت کی بدولت ماں باپ کی "عزت" کو تو بچا لیا تھا مگر اس کے بدلے اس نے بہت کچھ گنوا بھی دیا تھا۔

سجاد سے نکاح والی بات مریم کے منہ سے سن کر اس کے ماں' باپ' بھائی' بھابھیاں سب اتنے شاکڈ رہ گئے تھے کہ کوئی اس سے نکاح نامہ دکھانے کا سوال تک نہیں کر سکا تھا۔ مریم نے اتنی بڑی بات کہی تھی تو صحیح ہی کہی ہوگی۔

عزت دار ماں باپ نے خاموشی سے ایک دن سب خاندان والوں کو مریم کی بات طے ہونے کے "غم" (بظاہر خوشی) میں مٹھائی بھجوادی تھی۔

اور جس طرح آناً "فاناً" مریم منگنی شدہ ہوئی تھی اسی طرح اب شادی شدہ ہونے جا رہی تھی اور مریم پاگل نہیں تھی۔

اس نے سب کے ہاتھ کمر کے پیچھے کس کر باندھ دینے کے بعد عین ٹائم پہ اصل بات کا بھانڈا پھوڑا تھا۔

کم از کم اس نے باپ کے دل سے ایک بوجھ تو کم کیا تھا مگر اس ایک بوجھ کو کم کرنے سے کچھ اور وزن ان کے دل پہ آگرا تھا۔

شہباز صاحب چاہتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے اب بھی۔ مگر انہوں نے صرف ایک بات سوچی تھی۔ آج مریم نے اپنی مرضی کرنے کے لیے ایک چال چلی تھی۔ کل کو وہ اس طرح کی دس چالیں اور چل سکتی تھی۔

آج بدنامی نہیں ہوئی تھی۔ کل کو ہو سکتی تھی۔

عزت بڑی چیز ہوتی ہے سو اس کا دفاع کیا گیا تھا اور مریم کی شادی طے کردہ تاریخ پہ سجاد سے کردی گئی تھی۔

اور وہ مریم شہباز سے مریم سجاد ہو گئی تھی۔ انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ بھی رکھا تھا اور دعا بھی دی تھی مگر انہوں نے ایک اور بات بھی کہی تھی۔

"مریم! بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت دل دکھی ہوتا ہے' مگر میرا دل اتنا اور ایسا دکھی ہوگا' یہ میں نے بھی نہیں سوچا تھا۔"

اور مریم کو محسوس ہوا تھا کہ سر پہ باپ کا ہاتھ نہیں دھرا تھا' احد پہاڑ تھا جو سر پہ یکدم آن گرا تھا۔

"زندگی میں کبھی مشکل آئے تو یاد رکھنا تمہارا باپ ابھی زندہ ہے۔" ایک اور احد پہاڑ۔۔۔۔

ماں باپ کا دل کتنا بڑا ہوتا ہے نا۔۔۔۔ کسی گہرے' بڑے سمندر جیسا۔ ذرا غور کیجیے گا۔ سمندر جیسا۔ ایکدم گہرے سمندر جیسا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد ہر لڑکی خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا سب سے زیادہ خوش قسمت تصوّر کرتی ہے۔

مریم بھی ایک لڑکی ہی تھی۔ وہ بھی خود کو اُڑتے اور خوش قسمت تصوّر کرنے سے باز نہیں رکھ پائی تھی۔ اس کا وہ "دکھ" جو ماں باپ کے گھر سے وہ لے کر اور دے کر آئی تھی یکدم کہیں غائب سا ہو گیا تھا۔

سجاد نے اس سے کہا تھا کہ وہ "اکلوتا" ہے اور اب وہ اس کے اکلوتے ہونے کی پاور کو بخوبی سمجھ اور دیکھ سکتی تھی۔

وہ جانتی تھی کہ جس طرح اس کے ماں باپ کی مرضی اس شادی میں نہیں تھی' اسی طرح سجاد کے والدین بھی خوش نہیں تھے۔

اس گھر میں مریم اکلوتی بہو تھی مگر پھر بھی "اکلوتی بہو" جیسا پروٹوکول اسے نہیں دیا جا سکتا تھا مگر وہاں پروا کسے تھی؟

وہ جانتی تھی کہ وہاں اسے تھوڑے دن ہی رہنا تھا اور پھر وہ سجاد کے ساتھ اسلام آباد واپس آجائے گی۔ سجاد کے ماں باپ خوش نہیں تھے اور مریم کو انہیں خوش رکھنے میں اتنی دلچسپی بھی نہیں تھی' مگر وہ بے وقوف نہیں تھی۔ دکھانے کو سہی۔ دل سے نہ سہی وہ ان کی عزت کرتی تھی۔ ان کی ہر اچھی بُری بات کو سہہ لیتی تھی صرف اس لیے کہ وہ اس شخص کے ماں باپ تھے جس سے اسے محبت تھی۔

وہ دونوں جب ہنی مون سے واپس آئے تو گھر میں ایک نیا ہنگامہ ان کا منتظر تھا۔ سجاد کے بہنوئی نے اس کی بہن کو دو طلاقیں دے کر گھر بھجوادیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ اگر سجاد نے اس کی بہن سے شادی نہ کی تو وہ تیسری طلاق بھی بھجوا دے گا حالانکہ وہ پانچ بیٹوں کی ماں تھی۔

"میں کبھی بھی سوہائی سے شادی نہیں کروں گا۔" کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سجاد یوں انکار کر دے گا۔ اسے بہن کی ذرا بھی پروا نہیں تھی۔

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں اپنی مرضی کرنے دی جائے۔ اس کے بعد تم سوہائی سے بھی نکاح کرلو گے۔" یہ اس کے چاچا تھے۔

جواب میں سجاد نے ایک گہری طنزیہ مسکراہٹ اپنے چاچا کی طرف اچھالی تھی۔

سب کو جیسے سانپ سونگھا تھا۔

"تم مرد ہو کر زبان سے پھر رہے ہو۔ زبان سے پھرنا کسی مرد کے لیے موت کے برابر ہے سجاد!" باپ کی اموشنل بلیک میلنگ۔

"وہی روایتی حربے۔" سجاد بے زار ہوا۔

"جھولے میں لیٹا دس ماہ کا بچہ مرد نہیں ہوتا بابا! اور تب کیا آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اپنے سے پانچ سال بڑی لڑکی سے منگنی کرو گے؟ زبان آپ نے دی تھی میں نے نہیں۔ مجھے اپنی مردانگی پہ حرف آنے کا کوئی خطرہ نہیں۔"

وہ چند لمحے سکتے کی کیفیت میں سجاد کو دیکھتے رہے۔

"اور وہ تمہاری بہن۔۔۔ اس کا کیا ہوگا؟"

وہ چند لمحے چپ ہوا۔ "میں سمجھاؤں گا طارق کو۔۔۔"

سب جانتے تھے کہ یہ مسئلہ سمجھنے سمجھانے کا نہیں تھا۔ مسئلہ روایت واقتدار کا تھا جس کا حل صرف وہ ہی تھا جس نے اس نے انکار کیا تھا۔

یہ گفتگو تمام گھر والوں کے سامنے ہوئی تھی۔ مریم اور دوسری خواتین بھی سن رہی تھیں۔ جیسے ہی گھر کے مرد اٹھ کر گئے تھے' سجاد کی بہن تیزی سے مریم پہ جھپٹی۔

"یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔" اس نے مریم کے بال پکڑنا چاہے تھے۔ مریم نے زوردار چیخ ماری۔

"ردی!" اس چیخ سے بھی اونچی آواز میں چیختے ہوئے سجاد' بہن اور بیوی کے درمیان آیا تھا۔

"اس کو ہاتھ بھی لگایا تو۔۔۔" وہ کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گیا تھا۔

"جاؤ تم۔" اس نے مڑ کر مریم سے کہا تھا۔

مریم گھبرا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

جبکہ اس کی بہن۔۔۔ وہ سخت حیرانی۔ دکھ سے گنگ۔ سانس روکے اسے دیکھ رہی تھی۔

تو بھائی بھی بدل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم جب کمرے میں آئی تو اسے اپنے باپ کی بات یاد آئی تھی۔

"زندگی میں کبھی مشکل آئے تو۔۔۔"

"نہیں! یہ مشکل تو نہیں ہے۔" اس نے سختی سے خود کو باور کرایا۔

"اور اگر سجاد واقعی دوسری شادی پہ مجبور ہو گیا تو؟"

یقیناً" اس سے بڑی مشکل مریم کی زندگی میں کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔

اسے ماں کی بات بھی یاد آئی جب اس طرح سے دو لوگ ملتے ہیں تو وہ اپنی ذات کی خامیوں کا سوچ آف کر دیتے ہیں۔"

اور ابھی ابھی ایک سوچ آن ہوا تھا۔

سجاد بے حس تھا۔ اس چیز کے بارے میں جس میں

اس کی مرضی یا مطلب شامل نہ ہو۔

اس کی بہن کا معاملہ تھا کوئی دوسرا مرد یقیناً" مجبور ہو جاتا مگر وہ صرف اپنے مطلب سے غرض تھی۔ مریم کو یقین تھا کہ سجاد کا رد عمل یقیناً" کسی بڑے حادثے کا سبب ہی بننے لگ گیا کرتی۔ اس کی بہن کا گھر بچاتی یا اپنا گھر۔ اور ابھی بھی مریم کا خیال تھا کہ یہ مشکل نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"داؤد! مجھے بھی سائیکل چلانا سکھاؤ۔"

عنایا کافی عرصے سے داؤد اور ثمن کو لان میں سائیکل چلاتے دیکھ رہی تھی' اب کے بہت غصے سے بولی تھی۔

"عنایا! میں تمہیں کتنی دفعہ سکھا چکا ہوں۔ تمہیں نہیں آئے گی۔ دیکھو! ثمن نے کتنی جلدی پک کرلیا۔" داؤد نے سائیکل چلاتی ثمن کی طرف اشارہ کیا۔ عنایا کو شدید ہتک اور غصہ کا احساس ہوا۔

"میں چلا سکتی ہوں۔" وہ چلائی۔

"ٹھیک ہے پہلے ثمن۔" مگر داؤد کی بات پوری نہیں ہوئی۔ اس نے تیزی سے حرکت کی تھی اور پوری قوت سے ثمن کو دھکا دیا تھا۔

مگر اس وقت وہ شدید حیرانی کا شکار ہوئی تھی جب اس کے دھکا دینے پہ ثمن نے یکدم دونوں پاؤں زمین پر لگا کر اس کی حرکت کو ناکام بنایا تھا۔ اسے منہ کے بل زمین پہ گرنا چاہیے تھا مگر اس نے بروقت عنایا کے ارادے کو بھانپ لیا تھا۔

اور اب وہ بہت سرد سے تاثرات کے ساتھ عنایا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ عمر میں عنایا کے برابر ہی تھی مگر اپنی صحت کے اعتبار سے وہ عنایا سے بڑی لگتی تھی۔ وہ ایک سرخ و سفید رنگت اونچے قد والی اسمارٹ مگر مضبوط جسم کی بچی تھی۔ عنایا نے شدید غصے اور نفرت کے ساتھ ایک بار پھر اسے دھکا دینا چاہا تھا مگر۔

"دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا۔" داؤد نے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر بری طرح جھڑکا۔ عنایا کی آنکھوں میں یکدم موٹے موٹے آنسو آگئے۔

"تو اب رونا شروع کرد۔ روؤ اور روؤ۔ گرینڈ پا کو بتاؤں گا۔ تمہاری حرکت کے بارے میں۔ پھر جب ڈانٹ پڑے گی تا گرینڈ پا سے پھر کھل کر رونا۔" عنایا بے اختیار سسکی۔

"وہ بھی فرینڈ ہے ہماری جیسے کہ میں اور تم۔ کتنی بُری بات ہے نا فرینڈز کے ساتھ ایسا کرنا۔" داؤد کا لیکچر ہی ختم نہیں ہو رہا تھا۔

"سوری بولو ثمن سے۔"

عنایا نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔

"عنایا!" داؤد نے آنکھیں نکال کر تنبیہہ کرتے ہوئے لہجے میں کہا۔ اس نے ثمن کی طرف دیکھا۔

"سوری!" داؤد کے کہنی مارنے پر وہ بولی۔

اور ثمن نے ایک بھرپور خیرسگالی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالی تھی۔

"فرینڈز۔" اسی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

عنایا نے خاموشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مگر اس کے منہ سے جواباً" "فرینڈ" کے الفاظ نہیں نکل سکے تھے۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری چھٹیاں کب ختم ہو رہی ہیں؟" مریم کے اس سوال پہ سجاد نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

"کیوں؟ تم نے کیوں پوچھا؟"

"میں نکلنا چاہتی ہوں اس سخت ٹینشن والے ماحول سے۔ گھر والوں کی زبانیں ہی نہیں آنکھیں بھی طعنے دیتی ہیں۔ مجھے خوف ہے کہ میں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر پاؤں گی سجاد! اور جس دن میری زبان کھلی تب۔" وہ دونوں ہاتھوں کو رگڑتے ہوئے بہت پریشان نظر آرہی تھی۔

پریشان تو سجاد بھی ہو گیا تھا۔ وہ مریم کی بات کا مطلب سمجھ نہیں پایا تھا یا پھر سمجھ چکا تھا مگر ہضم نہیں کر پا رہا تھا۔

"میری چھٹیاں ختم ہونے سے تمہارے اس ماحول سے نکلنے کا کیا تعلق؟" اس نے رک کر بات مکمل کی۔

"ظاہر ہے تمہارے ساتھ چلی جاؤں گی اور کیا تعلق ہو سکتا ہے؟" مریم ذرا خفگی سے بولی تھی۔

"اوہ میرے خدا۔" سجاد چکرا گیا۔ تو وہ یہ سمجھے بیٹھی ہے۔

وہ خاموش ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑے سیل پہ مصروف ہو گیا تھا۔ مریم چند لمحے جواب کا انتظار کرتی رہی۔

"تم چپ کیوں ہو گئے ہو؟" اسے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا تھا۔ سجاد نے گہرا سانس بھرا۔

"مریم! میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے کر جا سکتا۔"

مریم اتنی شاکڈ ہوئی کہ جواب میں چلا کر "واٹ" تک نہیں کہہ سکی تھی۔ اس کی سانس رُکنے لگی تھی۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہو سجاد!" سانس ابھی تک بحال نہیں ہو سکی تھی۔

"مریم پلیز... چند دنوں کی بات ہے کچھ عرصہ کے لیے۔ دیکھو۔ ابھی اگر میں تمہیں ساتھ لے گیا تو بابا کا غصہ بہت بڑھ جائے گا اور وہ طیش میں آکر کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ جائیداد سے عاق تک کر سکتے ہیں۔ میں جتنا بھی کمالوں' کل کو اپنے بچوں کو وہ عیش نہیں دے سکتا' جو مجھے آج میسر ہے۔ اپنے ہونے والے بچوں کے لیے۔ ان کے ایک سیکور فیوچر کے لیے پلیز تھوڑا سا کمپرومائز کرلو۔"

اسے سامنے بیٹھی عورت کا تحفظ یاد نہیں تھا' وہ ان بچوں کے تحفظ کی بات کر رہا تھا جن کا ابھی نام و نشان تک نہیں تھا۔

اسے سجاد کو کسی وعدے یا دعوے کی یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یقیناً" وہ ان وعدوں کو دعووں سمیت بھلائے بیٹھا تھا۔ تب ہی تو ایسی بات کر رہا تھا۔

وہ شخص جسے مریم شہباز کے چھوٹے چھوٹے مسئلے نظر آجایا کرتے تھے۔ آج اتنا بڑا مسئلہ کیسے اس سے چھپ سکتا تھا؟ حیرانی کی بات تھی نا۔ سو مریم بھی حیران تھی۔

اور محبت یوں ہی حیران کیا کرتی ہے۔

☼ ☼ ☼

پھر سجاد چلا گیا تھا۔

مریم کو وہیں جامشورو کے ایک پسماندہ گوٹھ میں چھوڑ کر جہاں کے مستقبل کا وہ وڈیرہ تھا اور جہاں پر اس کی بیوی نے کسی خون بہا میں آئی عورت جیسی زندگی گزارنی تھی۔ یہ الگ بات کہ یہ کچھ عرصہ کبھی پورا نہیں ہو سکا تھا۔

بہو چاہے کتنے ہی اونچے گھر کی ہو۔ اگر وہ بیٹے کی مرضی سے آئی ہے تو اس کے ساتھ وہ ہی ہوتا ہے جو مریم شہباز کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ساری عمر اگر وہ ماتھے پہ لگے اس ٹیک کو کھرچ کھرچ کر بھی مٹانا چاہے تو نہیں مٹا سکتی۔

سجاد کے جانے کے بعد مریم پہلی دفعہ زندگی کے ترش اور تلخ ترین ذائقے سے متعارف ہوئی تھی۔ اس کی ہتک نہیں کی جاتی تھی اسے اتنا ذلیل کیا جاتا تھا کہ مہذب دنیا اسے "ظلم" میں شمار کرتی تھی اور یہ تب ہوا تھا جب سجاد کی بہن کو تیسری طلاق بھی ہو گئی تھی۔

زندگی میں بہت دفعہ ہر نیا سورج ابھرنے اور غروب ہونے پہ اسے اپنا باپ یاد آتا تھا۔

مشکلیں اتنی زیادہ ہو چکی تھیں مگر ہر نئی تذلیل پہ وہ خود کو باور کراتی کہ یہ مشکل نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو اتنی بڑی نہیں ہے کہ وہ اپنے باپ سے رابطہ کرے۔

مریم کا سیل فون چھین لیا گیا تھا۔ اسے اپنے میکے والوں سے ملنے' ان سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی اور یہ ہی پابندی اس کے میکے والوں کے لیے بھی تھی۔

سجاد سے بات کرنے کی ممانعت نہیں تھی۔

مگر جب سارے گھر والے مریم کی شکایتیں لگا چکے ہوتے تب اسے فون پکڑایا جاتا اور جب وہ فون پہ آتی تب۔ جو جو کچھ اس نے سوچ رکھا ہوتا تھا کہ وہ سجاد سے یہ کہے گی۔ وہ کہے گی۔ وہ سب حلق سے کہیں اڑ جاتا کیونکہ آگے سے اسے سجاد کی نم آواز سننے کو ملتی تھی۔

"آئیم سوری مریم!"

وہ بچہ نہیں تھا۔ وہ سب سمجھتا تھا' سب جانتا تھا' مگر پھر بھی اس نے مریم کو وہاں چھوڑ رکھا تھا اور مریم خاموشی سے فون رکھ دیا کرتی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کیا کرتی۔ وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ اس کا ایک "سوری" سارے دن کی مشقت کے بعد اس کے ٹوٹے بدن کا مرہم نہیں بن سکتا تھا۔

یہ نہیں تھا کہ گھر میں ملازم نہیں تھے۔ ملازموں کے نام پہ ایک فوج جمع تھی وہاں۔ مگر مریم کو تو ایسی زندگی گزارنی تھی جیسے کہ خون بہا میں آئی کوئی عورت گزارتی ہے۔ بدن تو ٹوٹنے کا ہی تھا... اس کی حیثیت گھر میں وہ بھی نہیں تھی جو کہ کسی پاکستانی کی امریکا میں ہوتی ہے۔

مریم پڑھی لکھی تھی... ایک کوالیفائیڈ انجینئر۔ شروع شروع میں اس نے معمول کے کام بنا کسی کے کہے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ادا کیے تھے' مگر جب وہ ہی کام کسی جن کی طرح اس پہ نازل ہونے لگے اور اس سے اتنا کام کرنے کو کہا جانے لگا جسے عرف عام میں بیگار کہا جاتا ہے تو مریم نے انکار کر دیا۔ صاف انکار... اپنی عادت کے مطابق اس نے کہا وہ "ملازم" نہیں ہے۔

مگر جب سجاد کی ماں' اس کی طلاق یافتہ بہن اور چاچی نے اسے پکڑ کر زمین پہ پٹخا تھا اور اس کے پیٹ میں ٹھڈے مارے تھے تو اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ "کیا" تھی۔ ساری پڑھائی ناک کے رستے نکل گئی تھی اس طرح مار کھا کر خود اپنی ہی نظروں میں گرنے سے بہتر تھا کہ انا کو بلند رکھتے ہوئے گدھے کی طرح کام ہی کرلیا جائے۔

کہاں وہ انجینئر لڑکی اور کہاں ایک پسماندہ گوٹھ میں مار کھاتی مریم شہباز... اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ اس کے نام کے ساتھ جڑے "شہباز" کا سابقہ کیا تھا۔

شہباز کے سابقے نے اسے اک محل میں کسی شہزادی کی طرح پالا تھا مگر اب کی بار ہے۔ کوئی جن شہزادی نہیں شہزادی جن پہ عاشق ہوئی تھی تو پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔ ایسا تو ہوتا ہی ہے جب بھی کوئی شہزادی کسی جن پہ عاشق ہو جائے۔

ایسا تو ہوتا ہی ہے۔

☼ ☼ ☼

عنایا اور ثمن اکٹھے بیٹھی ہوم ورک کر رہی تھیں' وہ دونوں ایک ہی کلاس میں تھیں لور ثمن علوی خاندان کے باقی بچوں کی طرح ہی ذہین تھی۔ اسی موروثی خصوصیت کی مالک جو کہ علوی خاندان کا خاصہ تھی۔ ایسے میں جبکہ دو بچے ایک ساتھ ایک ہی گریڈ میں ہوں اور ان کی ذہنی صلاحیت میں زمین آسمان جتنا فرق ہو تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ عنایا اس بات کو محسوس نہ کرتی۔ اس کا موڈ آف تھا۔

وہ بری طرح پھنسی تھی۔ ان حالات میں وہ ثمن کے لیے کوئی بھی نرم گوشہ اپنے دل میں پیدا کرنے کے لیے ناکام ہو رہی تھی حالانکہ اس دن ثمن کو غصے میں دھکا دینے کے بعد وہ بہت شرمندہ ہوئی تھی خاص طور پر تب جب دادا نے اسے سمجھایا تھا' مگر حالات عنایا سکندر کو مجبور کر دیا کرتے تھے۔

ثمن کسی کام سے کمرے سے باہر گئی تھی۔

اس نے ثمن کی کاپی سے سوالات نقل کرلیے مگر کاپی واپس رکھتے ہوئے اسے ایک عجیب خیال آیا۔

"کل جب ٹیچر ہوم ورک چیک کریں گی تو اگر ثمن کی کاپی اس کے بیگ میں نہیں ہوگی تو... یقیناً" عنایا تب ہی داؤد کی مستحق بن سکتی تھی۔" اس کے علاوہ اسے حساب بھی تو برابر کرنا تھا۔

سو اس نے ثمن کی کاپی اٹھالی تھی۔

ثمن اپنی عمر کی نسبت کافی تیز بچی تھی۔ داؤد سے بھی زیادہ ذہین...

اس نے ایک سال میں دو کلاسز پاس کی تھیں۔ اس کی اس تیز رفتاری کو دیکھتے ہوئے داؤد حقیقتاً "پریشان" تھا۔ عمر میں چھوٹی ہونے کے باوجود وہ کل کو اس کے برابر آسکتی تھی۔

مقابلے کی اسی کیفیت نے داؤد اور ثمن کو قریب کر دیا تھا۔ عنایا کہنے کو بچی تھی' مگر حساسیت کے معاملے میں وہ بچی نہیں تھی۔ اس نے بہت جلدی اور بہت بری طرح سے اس چیز کو محسوس کرنا شروع کیا تھا۔ داؤد اس کے لیے محض کسی کزن یا دوست کا نام نہیں تھا۔ وہ اس کے لیے کسی "سیکورٹی" کی طرح تھا۔

عنایا کو داؤد کے چھن جانے کا خوف نہیں تھا اسے اپنی شناخت کے گم ہو جانے کا خطرہ تھا۔

اک وہ ہی ایسا انسان تھا جو ہمیشہ اسے یہ احساس دیتا تھا کہ وہ "کم تر" نہیں ہے۔ یہ احساس اسے باپ اور دادا کے لیکچر بھی نہیں دے سکے تھے۔

داؤد... عنایا کو نارمل کر دینے والی اس دوا کا نام تھا جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

مریم کی ماں ہی تھیں جو کہ شادی کے بعد اس سے رابطہ رکھے ہوئے تھیں۔ بھائی اتنے دل برداشتہ تھے کہ وہ مریم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتے تھے' مگر یہ مریم کا باپ ہی تھا جس کے کہنے پہ مریم کی ماں اسے کال کرلیا کرتی تھیں۔

مگر پچھلے کچھ دنوں سے وہ مریم سے بات نہیں کر پا رہی تھیں۔ اس کا فون آف جا رہا تھا۔ یہ تب ہی کی بات تھی جب مریم سے سیل فون چھین لیا گیا تھا۔ مریم کی ماں نے یہ بات اس کے باپ کو بتائی تھی۔ اسی پریشانی کی وجہ سے انہیں سجاد سے رابطہ کرنا پڑا تھا۔

"مریم کا فون کیوں بند ہے سجاد؟"

سجاد خاموش نہیں رہنا چاہتا تھا وہ کوئی بہانہ' کوئی بات کرنا چاہتا تھا مگر وہ کچھ نہیں کہہ سکا تھا۔

"میرے پیرنٹس نے اسے آپ لوگوں سے بات کرنے سے منع کر رکھا ہے۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے اصل بات بتادی۔ وہ کب تک ان سے جھوٹ بول سکتا تھا۔

اور اب شہباز صاحب کی خاموشی سجاد کو شرمندہ کر رہی تھی۔

"میں اس کی بات کروا دیا کروں گا آپ سے۔ آپ پلیز پریشان نہ ہوں۔"

"ہوں..." شہباز صاحب نے مدھم سی آواز میں کہا اور فون کاٹ دیا۔

سجاد چند لمحے تذبذب کے عالم میں فون کو دیکھتا رہا کہ اسے دوبارہ انہیں کال کرنی چاہیے یا نہیں اور پھر اس نے ارادہ کیا کہ وہ ہر ماہ جب وہ کراچی جائے گا۔ مریم کی بات اس کے گھر والوں سے ضرور کروا دیا کرے گا۔ اور جب مریم کی بات اس کی ماں سے ہوئی تو... وہ چاہتی تھی کہ وہ اپنی ماں کو اپنے وہ زخم دکھائے۔

وہ ماں کے سامنے رونا چاہتی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ امی میرے ساتھ بہت برا ہوا مگر بتا نہیں "شادی" کس رسم کا نام تھا جس نے مریم کے جملوں کی ترتیب بدل دی تھی۔

باوجود ایک ذہین اور باشعور لڑکی ہونے کے وہ اپنی ماں کو "سب اچھا" کی گردان سناتی رہی' وہ انہیں یہ کہہ کہہ کر تسلی دیتی رہی کہ کون سی ایسی سسرال ہے جہاں مسائل نہیں ہوتے۔ مریم جانتی تھی کہ اس کا فیصلہ غلط تھا۔ مگر یہ فیصلہ کتنا غلط تھا' یہ بات وہ دوسروں کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔

یہ شادی کے چھ ماہ بعد کی بات تھی کہ جب مریم نے اپنے لیے "بانجھ" کے الفاظ سنے تھے۔ اسے ان لوگوں' ان کی زبانوں اور ان کے ذہنوں پہ حیرت ہوئی۔ حالانکہ اب تک مریم کو حیران ہونا چھوڑ دینا چاہیے تھا مگر پھر بھی وہ حیران ہوئی تھی۔ شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے... چھ سال نہیں' مگر وہ لوگ...

آٹھویں ماہ میں جاکر اسے خوش خبری ملی تھی اور پھر مریم نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا کمال دیکھا۔ اتنی مٹھاس شہد میں نہیں ہوگی جتنی کہ ان لوگوں کی زبانوں میں بھر گئی تھی۔ مریم کو اپنی حالت کی وجہ سے کم چکر آتے تھے۔ گھر والوں کے رویے کو دیکھ کر زیادہ آتے تھے۔ وہ یکدم کنیز سے ملکہ کا رتبہ پاگئی تھی۔

اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی زندگی کا دوسرا بڑا کمال دیکھا۔ ان سب نے "بیٹا... بیٹا" کی گردان شروع کردی تھی جیسے مریم نے اپنی مرضی سے اولاد چننی تھی۔ مگر کمال یہ نہیں تھا... اصل کمال تو تب ہوا

جب اس نے سجاد کے منہ سے بھی یہ ہی بات سنی۔
"مجھے بیٹا چاہیے مریم!" اور مریم کے لیے یہ زندگی کا بدترین دھچکا تھا۔

وہ بی لو آئل کا پیٹرولیم انجینئر۔ ایم یو ای ٹی کا انجینئرنگ گریجویٹ۔ ایسے شخص کے منہ سے ایسی بات سن کر حیران تو ہونا ہی تھا وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔

"یہ میرے اور تمہارے سروائیول کے لیے ضروری ہے۔"

مریم اس سے پوچھنا چاہتی تھی کون سا سروائیول کیسا سروائیول؟ زندگی ہو تو انسان بقا کے لیے ہاتھ مارتا ہے اور اس نے پچھلے آٹھ ماہ سے اسی زندگی نامی چیز کو اپنے اندر قطرہ قطرہ مرتے دیکھا تھا۔ اور جب وہ بات کرتا تھا سروائیول کی اور "ہم دونوں" کی تو مریم سخت حیران ہوتی تھی اور ٹکر ٹکر اس پڑھے لکھے شخص کی صورت دیکھتی تھی۔

اس کے گھر والے جب ایسی بات کرتے تھے تو سمجھ میں بھی آتی تھی اور عقل بھی مانتی تھی۔

مگر وہ جب یہ بات اس کو الیفائیڈ انجینئر کے منہ سے سنتی تھی تو۔۔۔؟

وہ ساکت ہو کر کسی مجسمے کو مات دیتی ہونٹ بند کیے اس شخص کا چہرہ دیکھتی تھی۔

مریم نے چاہا جس طرح سے اس کے ہونٹ بند تھے کاش کہ کان بھی بند ہو سکتے۔ وہ خوش ہونا چاہتی تھی۔ زندگی کے ایسے انمول تحفے۔۔۔ انوکھے تجربے کو محسوس کرنا چاہتی تھی، مگر سانحہ یہ تھا کہ وہ کچھ بھی محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔

نہ خوشی۔۔۔ نہ کچھ اور۔۔۔

اک بے حسی کی دھند سی تھی جو مریم کے وجود پہ کسی چادر کی طرح لپٹتی چلی جاتی تھی۔

ان لوگوں کے رویے دیکھ کر مریم کو خوف ہوا کہ اس کی بیٹی ہوئی تو وہ لوگ کہیں اسے زندہ دفن ہی نہ کر دیں۔ انہیں بیٹا چاہیے تھا۔ وارث چاہیے تھا اور مریم اس چیز پہ قادر نہیں تھی۔

وہ سردیوں کے دن تھے اور ان یخ بستہ راتوں میں مریم سردی سے نہیں اس خوف سے ٹھٹھرتی تھی کہ اگر اس کی بیٹی ہو گئی تو۔۔۔؟ اس سوالیہ نشان کا جواب بھی جلد ہی مریم کو مل گیا تھا۔

"اگر اس کی بیٹی ہوئی تو وہ لوگ سجاد کی دوسری شادی کر دیں گے کہ بہرحال انہیں بیٹا چاہیے تھا۔" باوجود اس کے کہ اس کی ساس کا رویہ اس کے ساتھ بدل چکا تھا پھر بھی انہوں نے ایک دن باتوں باتوں میں مریم کو یہ بات سنا دی تھی۔

جیسے جیسے دن گزر رہے تھے، مریم کے خوف میں اضافہ ہو رہا تھا اور اس خوف کی حالت نے اسے اللہ کے قریب کر دیا تھا۔ وہ دن میں پانچ نمازوں کے علاوہ اور پتا نہیں کتنی ہی نمازیں پڑھا کرتی تھی۔ دعائیں۔۔۔ نفل۔۔۔ منتیں کیا نہیں تھا جو مریم سجاد نے نہیں کیا تھا۔ مریم سجاد نے ہر وہ کام کیا تھا جو مریم شہباز کبھی کرنے کا سوچتی بھی نہیں۔۔۔

اور پھر ایک عجیب بات ہوئی۔۔۔ ایک عجیب تبدیلی مریم نے خود میں محسوس کی۔ وہ بھی یہ ہی خواہش کرنے لگی کہ اس کا بیٹا ہی ہو۔

وہ ان لوگوں جیسی نہیں تھی وہ سجاد جیسی نہیں تھی، مگر پھر بھی وہ۔۔۔ وہ ہی بن گئی۔

آف! کیا یہ المیہ نہیں تھا؟

کیا ماں کو اس بات کی تخصیص کرنی چاہیے کہ وہ بیٹے کی ماں ہے یا بیٹی کی۔

تب ہی اسے سجاد کی ذہنی کیفیت کا اندازہ ہوا۔ کیوں وہ کوالیفائیڈ انجینئر۔۔۔ ایک پڑھا لکھا شخص بیٹے کی خواہش کرتا تھا۔

اس لیے کہ محض "بیٹا" اس کو زندگی کی مصیبتوں سے نجات دلا کر اس کی عارضی ملکہ کی حیثیت کو مستقل کر سکتا تھا جبکہ بیٹی کی ماں بن کر وہ کسی کنیز سے بدتر زندگی گزارتی تو کیا غلط تھا کہ سجاد بھی ایسی خواہش کرتا تھا اور کیا برا تھا کہ مریم اس خواہش کے لیے نفلیں نمازیں دعائیں مانگتی تھی۔

برا تو وہ رویہ تھا جو لوگ بیٹی کی ماں کے ساتھ کرتے ہیں سو مریم بھی ڈرتی تھی اور سجاد بھی خوف زدہ تھا۔

اور پھر وہ دن بھی آگیا۔

تیسرے مہینے میں الٹرا ساؤنڈ کرواتے وقت اس کی ساس اس کے ساتھ موجود تھی۔ ڈاکٹر نے اسے خوش خبری سنائی تھی ـــــ اس کا بیٹا ہی تھا۔ ایک سکون کی سی لہر تھی، جو مریم نے خود میں کسی سمندر کی طرح پھیلتی ہوئی محسوس کی تھی۔

"تو وہ بیٹے کی ماں تھی۔۔۔" آنکھوں کے نم کناروں کو اس نے لبوں پہ اک عجیب سی مسکراہٹ لے کر صاف کیا تھا۔ باقی کا عرصہ مریم کے لیے کاٹنا کچھ مشکل نہ رہا تھا۔ وہ ملکۂ عالی مقام بن چکی تھی۔ سوائے کیا غم ہو سکتا تھا۔ مگر اس سب کے باوجود۔۔۔ اس سب کے باوجود۔۔۔ مریم کے ہونٹوں کی چپ نہیں ٹوٹی تھی۔ اس کے اندر کی اداسی نے ختم ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ کوئی چیز دن رات خوف کی شکل میں اسے کھاتی تھی۔ سارا دن اپنے تخت پر براجمان وہ پتا نہیں کون سے مسئلے سلجھاتی رہتی کہ اس کو اپنے اردگرد کا ہوش بھی نہیں رہتا تھا۔

شاید وہ اس تکلیف کو اب محسوس کر رہی تھی جو کہ وہ اپنے ماں باپ کو دے کر آئی تھی۔ اب ہی تو وہ اس قابل ہوئی تھی کہ جان سکتی سو مریم کی چپ نہیں ٹوٹتی تھی اور اس کے مسئلے نہیں سلجھتے تھے۔

"اس نے کیٹ کو بھی مار دیا۔ محض اس لیے کہ میں اس سے زیادہ توجہ کیٹ کو دینے لگی تھی۔ سو اس نے اسے مار دیا۔ بات صرف اس معصوم سی بلی کی نہیں تھی بات تو ہر اس چیز کی تھی جو میری زندگی میں اس سے زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ چاہے وہ کوئی ڈائمنڈ ٹاپس ہو یا میری مانو بلی۔ وہ ایسا ہی کرے گی۔ کیٹ کو وہ مجھ سے چھین نہیں سکتی تھی۔ اسے چوری نہیں کر سکتی تھی۔ سو اس نے میری کیٹ کو مار دیا۔

داؤد کے بعد میں جس سے سب سے زیادہ قریب تھی وہ کیٹ تھی۔ مگر۔۔۔"

اور داؤد جانتا تھا کہ وہ اس مگر کے بعد کتنا روئی ہو گی۔

ایک گہرا سانس بھر کر اس نے آگے پڑھنا شروع کیا تھا۔

"میری زندگی میں آگے مشکلات کم تھیں جو اس کی شکل میں ایک اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا مجھے۔ کیا یہ ضروری تھا کہ اسے، میری ہی زندگی میں شامل کیا جائے اور اگر شامل کیا جانا ہی تھا تو کیا وہ ایک نارمل انسان نہیں ہو سکتی تھی۔

آج میرا دل شدت سے چاہ رہا ہے کہ میں جا کر اسے بھی اسی طرح سے مار دوں۔ جس طرح اس نے میری سبز آنکھوں والی کیٹ کو مارا تھا۔"

داؤد جانتا تھا کہ یہ الفاظ لکھتے ہوئے اسے صبر نہیں آرہا ہو گا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے ہچکیوں سے روتے ہوئے یہ الفاظ لکھے ہوں گے۔

اس نے سر جھٹک کر الفاظ کے بوجھل پن کو دور کیا تھا۔ "میرا دل کر رہا ہے کہ میں کیٹ کے مرنے کا ماتم کروں۔ زندگی نے آج تک مجھے کوئی ایک اچھی چیز۔ کوئی خوشی نہیں دی۔

ہاں۔ ہاں۔ داؤد دیا زندگی نے مجھے۔ مگر میں داؤد سے اب محبت نہیں کرنا چاہتی۔ اس کی توجہ حاصل نہیں کرنا چاہتی۔ اسے سوچنا تک نہیں چاہتی۔ اس سے کسی تعلق، کسی جذبے کا اظہار تک نہیں کرنا چاہتی۔

میری اس سے لاتعلقی ہی اچھی ہے۔ اس کے لیے بھی۔ اور میرے لیے بھی۔ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میرے دل میں داؤد کے لیے کیا جذبات ہیں تو میرا بھی کیٹ جیسا ہی حال ہو گا اور میں مرنا نہیں چاہتی۔ کم از کم ابھی نہیں۔ ابھی تو بالکل بھی نہیں۔"

ابھی ابھی مریم کو اسپتال لے جایا گیا تھا۔ سجاد کو بھی اطلاع کر دی گئی اور وہ پہلی فلائیٹ سے آگیا تھا۔ اس کی ساس نے مریم کی طبیعت خراب ہوتے ہی مٹھائی کے ٹوکروں کا آرڈر کر دیا تھا۔

آخر کو پوتا آنے والا تھا۔ وارث تھا وہ۔ دس کوٹھوں میں بھی مٹھائی بانٹی جاتی تو کم تھا۔ لیبر روم کے باہر مریم کی ساس کی بے چینی دیکھنے سے ہی تعلق رکھتی

تھی۔ ان کا پوتا ساتھ خیریت سے دنیا میں آجائے۔ بس یہی دعا تھی ان کی۔

تکلیف کی ہر لہر کے ساتھ مریم کے جسم میں خوف کی ایک لہر بھی اٹھتی تھی۔ جو اس کی حالت مزید خراب کرنے کا باعث بنتی تھی۔

مریم کی اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ وہ کیا کرے۔ کہاں سے پناہ مانگے اور کس کا سہارا ڈھونڈے۔ حالانکہ اللہ موجود تھا۔ اور وہ تو ہر وقت موجود ہی ہوتا ہے۔

اور پھر بے اختیار اس کا سانس اکھڑا تھا۔

"ریلیکس مریم! ریلیکس۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ٹیک اٹ ایزی۔" ڈاکٹر نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ مریم کی ایسی حالت کیوں ہو رہی ہے۔

"ڈاکٹر پلیز! میں اپنی ماں سے بات کرنا چاہتی ہوں پلیز!" مریم رو رہی تھی۔

"مگر مریم!"

"پلیز ڈاکٹر!" اس نے ہاتھ جوڑے۔ اور اس نزع جیسے عالم میں اس نے ماں سے کیا کہنا تھا۔ وہ معافی مانگنے کے سوا اور کیا کہہ سکتی تھی۔

مگر پھر بھی اس نے معافی مانگنے کے علاوہ بھی کچھ کہا۔

اس نے کہا کہ اگر وہ زندہ نہیں رہتی تو وہ یہ لوگ اس کی اولاد کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ اس پل اس نے اپنی ماں سے وعدہ لیا کہ اس کے مرنے کی صورت میں وہ اس کی اولاد کو یہاں نہیں رہنے دیں گی۔ اسے یہاں سے لے جائیں گی۔

اور مریم کی ماں کیا کر سکتی تھی سوائے وعدہ کرنے کے۔

اور تب ہی اس کی حالت نے اسے بات جاری رکھنے نہیں دی تھی۔

اور پھر

اسی پل اس نے لمحہ موجود میں آکر اپنی پہلی سانس اس دنیا کو بخشی۔ ایک حیات سے اک دوسری حیات کا جنم ہوا تھا۔

وہ لمحہ خوشی کا لمحہ تھا کہ جب وہ وجود آنکھیں کھولے مریم کو دیکھتا تھا۔ مگر مریم۔ خوف سے اس کو لپیٹے بیٹھے میں جیسے ساکت تھی۔

"مبارک ہو" آپ کی پوتی ہوئی ہے۔"

وہاں اگر بم بلاسٹ بھی ہوتا تو اس عورت کی وہ حالت نہ ہوتی جواب ہوئی تھی۔

"پوتی؟؟؟"

وہ دل پہ ہاتھ رکھ کر زمین پہ بیٹھتی چلی گئی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں تو وارث آنے والا تھا تو پھر یہ کیا ہو گیا تھا؟

☼ ☼ ☼

اس نے تجسس سے آگے بڑھ کر دیکھا تھا۔ وہ ایک خوب صورت بلی کا بچہ تھا۔

دوسرے دن عنایا نے پھر اسے۔ اسی جگہ پہ دیکھا تھا۔ عنایا کو پتا نہیں کیا سوجھی۔ اس نے ایک برتن میں دودھ ڈال کر اس جگہ پر رکھ دیا جہاں پہ وہ بلی کا بچہ آتا تھا۔ وہ اسے پالنا چاہتی تھی۔

اور یوں وہ اسے روزانہ دودھ ڈالنے لگی تھی اور وہ بلی کا بچہ اس سے مانوس ہو تا گیا۔ خزینہ کو اعتراض ہوا تھا۔

"عنایا" یہ گندگی پھیلائے گا۔ تو کون صاف کرے گا۔"

"پلیز می! میں اسے ٹرینڈ کرلوں گی۔ پلیز۔"

خزینہ کو اس کی صورت پر رحم آگیا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی تھیں۔

اور پھر عنایا نے سارے گھر والوں کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ سب اس کی کم از کم اس صلاحیت کے معترف ہو گئے تھے اس نے واقعی میں اس بلی کو یوں ٹرینڈ کیا تھا کہ وہ کہیں پہ گندگی نہیں پھیلاتی تھی۔ کسی کو تنگ نہیں کرتی تھی۔

عنایا جب گھر پہ نہیں ہوتی تھی تو وہ بلی بھی کسی کو دکھائی نہیں دیتی تھی اور جیسے ہی عنایا گھر پہ آتی تھی

وہ پتا نہیں کہاں سے بھاگتے ہوئے آکر اس کے پیروں میں لوٹ پوٹ ہو جایا کرتی تھی۔ آج بھی یہی ہوا تھا۔

وہ جیسے ہی گاڑی سے اتری تھی۔ کیٹ کہیں سے بھاگتے ہوئے آئی اور اس کے پیروں کے گرد چکر کاٹنے لگی تھی۔

اس نے نرمی سے کیٹ کو اٹھایا تھا۔

"یہ کہاں سے لی تم نے؟" ثمن نے پوچھا۔

آج وہ بھی عنایا کے ساتھ ہی ان کے پورشن کی طرف آگئی تھی۔

"یہ!؟" عنایا کیٹ کو پیار سے دیکھتے ہوئے مسکرائی اور پھر وہ ثمن کو بتانے لگی کہ کس طرح سے اس نے کیٹ کو حاصل کیا تھا۔

وہ اور ثمن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت اچھی دوست بن چکی تھیں۔ اور ابھی تک اکٹھے ہی زیر تعلیم تھیں۔ مگر ثمن اولیولز کی اسٹوڈنٹ اور عنایا میٹرک کی۔ اس کی تعلیمی حالت کو دیکھتے ہوئے خزینہ نے اسے میٹرک کروانے کا سوچا تھا۔

ثمن اب پیار سے بلی کے جسم پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ ایک نہایت سلجھی ہوئی اور ذہانت میں داؤد کو بھی پیچھے چھوڑتی ہوئی لڑکی تھی۔ اس وقت سفید یونیفارم میں ملبوس سلیقے سے دوپٹے کو پٹی کی شکل میں ڈالے ہوئے تھی۔ اس کے شولڈر کٹ بال اس وقت پونی ٹیل میں بندھے ہوئے تھے اور سارا وقت اسکول میں گزارنے کے بعد بھی اس کے جو گرز پہ گرد کا نشان تک نہیں تھا۔

وہ علوی فیملی کی وراثت کی صحیح جانشین لگتی تھی۔

عنایا کو دیکھ کر صحیح طور پر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک پورا دن اسکول گزار کر آئی ہے جبکہ ثمن کو دیکھ کر لگتا تھا کہ جیسے وہ ابھی اسکول جانے کے لیے تیار ہوئی ہے۔ ان دونوں میں بہت فرق تھا۔ مگر پھر بھی وہ دوست تھیں۔

بہت اچھی دوست۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے والی۔ مگر عنایا کے لیے ایک پہلو تکلیف دہ تھا۔

ثمن کی برتری۔ ہر جگہ۔ ہر چیز میں۔

اسکول سے لے کر گھر اور گھر سے لے کر خاندان تک وہ جانی جاتی تھی۔ اس میں وہ طاقت تھی کہ جو کہ کسی مقناطیس میں ہوتی ہے۔ لوگوں کو اپنی طرف کھینچنے والی۔

کوئی ایسا نہیں تھا جس سے وہ کہہ سکتی کہ اسے بعض اوقات ثمن سے حسد محسوس ہوتا ہے سو اس کو کیٹ مل گئی۔ اور وہ اس کی اس کتوئیں جیسی دوست بن گئی تھی جس میں منہ دے کر سب کچھ سارا راز اگل دینے سے کسی کو بھی نہیں پتا چلتا تھا۔

ثمن کو بھی وہ سبز آنکھوں والی کیٹ بہت پسند آئی تھی۔ اور وہ بھی اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی۔ مگر کیٹ نے ثمن کو پسند نہیں کیا تھا۔ اور کیٹ کیا عنایا بھی اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی کہ ثمن اس سے دوستی کرے۔ وہ کم از کم کیٹ پر صرف اپنی حکومت چاہتی تھی۔

یہ ان ہی دنوں کی بات تھی جب عنایا نے سخت الفاظ میں ثمن کو کیٹ سے دور رہنے کا کہا تھا۔ ایک بلی کی ہی تو بات تھی۔ ثمن خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

اس بات کے ایک ہفتے کے بعد عنایا ٹائیفائیڈ کا شکار ہو گئی تھی۔ اور عنایا اپنے بستر سے اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اسے کیٹ کا خیال تک نہیں رہا تھا۔ اس کے لمبے اور خوبصورت بال اس بیماری کی وجہ سے گرنے لگے تھے۔ اسے اپنے بالوں سے بہت محبت تھی۔ وہ دن رات اپنے بالوں کو دیکھ کر روتی رہتی تھی۔

ایک بیماری اور دوسرے اس کے بال۔ ان دونوں چیزوں نے کیٹ کو بھی بھلا دیا تھا۔ وہ چڑچڑی اور بے زار رہنے لگی تھی۔

دس دنوں کے بعد جا کر اس کا بخار اترا تھا اور خزینہ نے اسے کمرے سے باہر نکالا تھا۔ جیسے ہی وہ لان میں آئی تھی۔ کیٹ دوڑ کر اس کے پیروں میں لوٹ پوٹ ہونے لگی تھی۔

وہ اسے ہاتھوں میں اٹھائے پیار کرتے ہوئے حیران

بھی ہو رہی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ اس کی بیماری کے دوران کوئی خاص طور پر کیٹ کا خیال رکھتا رہا تھا۔ مگر کون؟۔

"کیا داؤد؟" یک دم وہ خوش فہم اور مسرور ہوئی تھی۔

کھل کر گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے جیسے زندگی کو نئے سرے سے محسوس کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور بیٹی کی ماں ہونا مریم کے لیے کتنا سنگین ثابت ہوا تھا یہ بات وقت نے اسے بہت اچھی طرح سے سمجھادی تھی۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد پانچ سال کا عرصہ اس نے اپنی زندگی کا بدترین' سیاہ ترین دور گزارا تھا۔

وہاں اس لیبر روم کے اندر مریم سانس روکے اپنی بیٹی کے وجود کو سینے سے چمٹائے خوف سے کانپتی تھی۔ ہاں! اسی کمرے کے باہر اس کی ساس "غم" کے مارے بپھر رہی تھی۔

وہاں اس کی ساس کے علاوہ اور بھی لوگ تھے۔ اس کی نندیں' سسر اور وہ سارا کا سارا مجمع حسب توقع نتیجہ نہ آنے پر مشتعل تھا۔ اس کی ساس اور نندیں ڈاکٹر سے لڑ رہی تھیں۔ یہ وہی ڈاکٹر تھی کہ جس نے انہیں "پوتے" کی خوش خبری سنائی تھی اور ابھی اسی نے آکر ایک منحوس خبر سنائی تھی۔

"سائنس اللہ سے بڑی تو نہیں ہے نا! غلطی بھی بہرحال انسان سے ہی ہوتی ہے۔ اس وقت ایسا ہی محسوس ہوا تھا یہ صرف اور صرف اللہ کی رضا ہے اور کچھ بھی نہیں۔" ڈاکٹر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی تھی مگر وہ سمجھنے والے لوگ ہوتے تو بہت پہلے سمجھ چکے ہوتے۔

"آپ کی پوتی صحت مند ہے اور پوری طرح نارمل ہے اور کیا چاہیے آپ کو۔"

"جو چاہیے تھا وہ تو تم نے دیا نہیں۔" ڈاکٹر کی بات کے جواب میں مریم کی ساس نے کہا۔

کیا "دینا" اس کے بس میں تھا؟" ڈاکٹر اس عورت کی شکل دیکھ کر رہ گئی تھی۔ تب اسے مریم کا خوف لہو ہوتا اس کا کانپنا سمجھ میں آیا تھا۔

اور پھر "وہ غم زدہ" لوگ اسپتال سے چلے گئے مریم کو اس کی بیٹی سمیت وہیں چھوڑ کر۔ کسی نے اسے پوچھا تک نہیں۔ اور وہ جو کبھی مریم شہباز ہوا کرتی تھی۔ جو اپنے ماں باپ کے لیے کسی پھول کی مانند تھی۔ جسے وہ کسی کو بھی توچنے کیا بُری نظر سے دیکھنے کی بھی اجازت نہ دیتے۔

اور اب!!!

عزت نفس کو معلوم نہیں کس پاتال میں دفن کر کے وہ گھر خود ہی واپس آئی تھی۔ اور گھر واپس آتے ہی اس نے اس سے بھی بڑا اور برا دھچکا کھایا تھا۔ سجاد گھر آچکا تھا۔

وہ گود میں اٹھائی ہوئی بچی کا باپ تھا۔ باپ اور مرد اتنا بھی مرد نہیں تھا کہ اسپتال آتا۔ وہ سن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے اعصاب نے جواب دے دیا ہو۔

اس کا جسم اتنا ہلکا اور بے جان ہونے لگا تھا کہ بچی کے وجود پہ اس کی گرفت یک دم ڈھیلی پڑنے لگی تھی۔ وہ اس وقت۔ اس لمحے۔ سب کچھ بھول کر سب کچھ چھوڑ کر' آنکھیں بند کر کے کہیں کھو جانا چاہتی تھی مگر۔ دور سے آئی ایک معصوم سی آواز اور ایک ساعت کا وقفہ۔

وہ واپس اپنی حالت میں آگئی۔ اس نے دہل کر بچی پہ اپنی گرفت مضبوط کی اس نے ایک نگاہ غلط بھی اس شخص پہ نہیں ڈالی تھی اور وہاں سے چلی گئی تھی۔

رات کے کسی پہر۔ کسی نے اس کے پہلو میں لیٹے وجود کو بہت نرمی سے اٹھایا تھا۔ اتنی نرمی اور خاموشی سے کہ مریم کو محسوس تک نہ ہوا۔ اس نے ایک نظر مریم کے چہرے کو دیکھا اور خاموشی سے بچی کو اٹھا کر لے گیا تھا۔

چند لمحوں بعد مریم نے کروٹ بدلی۔ شدید نیند اور تھکن سے بری حالت میں بھی کہ

بہت ہی ناخوش گوار سا احساس ہوا تھا۔ کسی چبھن کی طرح ویسے ہی لیٹے لیٹے اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور سوچنے کی کوشش کی کہ وہ کیا تھا۔ اس نے دہل کر اپنے خالی پہلو کو دیکھا۔ اس کی بیٹی۔

☼ ☼ ☼

"زندگی میں جتنی چیزیں وہ مجھ سے چھین چکی تھی۔ انہیں شمار کرنا آسان نہیں تھا۔

"ہاں! ٹھیک ہے چیزوں کا جانا۔ ان کا کھونا تکلیف دیتا ہے مگر ایک حد تک۔ اس کے بعد وہ دکھ بھول جاتا ہے مگر۔ میں اسے یہ کیسے سمجھاؤں کہ داؤد کوئی چیز نہیں کسی ہینڈ بیگ کا نام یا کوئی ڈائمنڈ رنگ یا پس نہیں ہے جنہیں وہ چرانے کی کوشش کرے اور میں اسے ایسا کرنے دوں۔

وہ داؤد ہے داؤد۔ حیات کا دوسرا نام۔ زندگی جیسی قیمتی چیز کا سا احساس۔ میں کیسے یہ سب قبول کرلوں۔ وہ داؤد کو مجھ سے چھینے اور میں خاموش رہوں۔"

مجھ میں اتنا حوصلہ' اتنا ضبط یا اتنا ظرف نہیں۔ میں انسانی ہمدردی کے نام پہ مسکراہٹ کے سنہرے ریپر میں لپیٹ کر اسے داؤد نہیں دے سکتی۔

ہاں! مجھے اس پہ ترس آتا ہے۔ مگر پھر بھی۔ میں داؤد کو اسے نہیں دے سکتی۔ اتنی بڑی قربانی نہ مانگی جائے مجھ سے۔ کیا کوئی جان سکتا ہے؟۔ داؤد میرے لیے کیا ہے؟

بات اگر محبت' کی ہوتی تو شاید آسان ہوتی۔ مگر داؤد تو میرے سروائیول کا نام ہے۔ میرے ہونے کا جواز۔ تو پھر میں کیسے؟"

☼ ☼ ☼

"ہاؤ آر یو فیلنگ ناؤ؟"

سرخ گلابوں کا ایک چھوٹا سا بکے عنایا کو تھماتے ہوئے داؤد نے کہا تھا۔ اور عنایا نے یک دم ان گلابوں کے رنگ کو کچھ اور شوخ ہوتے محسوس کیا تھا۔ وہ اس وقت دادا کے پورشن کی طرف آئی تھی اور لان کے جھولے پر بیٹھی تھی۔ ہلکی سبز قمیص اور سفید چوڑی دار پاجامے میں وہ بہت فریش دکھائی دے رہی تھی۔ داؤد اسے دیکھتے ہوئے جھولے کے دوسرے سرے پر آکر بیٹھا تھا۔ اس نے پھول داؤد کے اور اپنے درمیان رکھے تھے۔

"تم نے کیٹ کا بہت خیال رکھا۔ تھینکس۔" پھولوں کے سروں پر انگلی پھیرتے ہوئے اس نے کہا۔

"میں نے تو نہیں البتہ ثمن نے بہت رکھا۔ یہ "تھینکس" اس کا بنتا ہے۔" پھولوں کے سروں پر حرکت کرتی انگلی یک دم ساکت ہوئی تھی۔ سیکنڈ میں اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا اور ہر تاثر برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

یہ بہت معمولی بات تھی مگر اس نے عنایا کو بہت تکلیف دی تھی' وہ کیٹ پر صرف اپنی حکمرانی اپنا تسلط چاہتی تھی۔ اس نے تحمل کا عظیم مظاہرہ کرتے ہوئے داؤد کی بات سنی تھی۔ پھر جیسے ہی وہ اٹھ کر گیا۔ وہ نہایت غصے سے ثمن کی طرف گئی تھی۔

"تم نے کیٹ کو ہاتھ بھی کیسے لگایا؟" اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"کیا ہوا ہے عنایا؟ کیا کیٹ کو کچھ ہوا؟" وہ یک دم پریشان ہوئی تھی۔

"جب میں نے منع کیا تھا تو پھر تم نے کیوں اسے ہاتھ لگایا۔" اس کا انداز بہت ہتک آمیز تھا۔ ثمن نے اسے حیران نظروں سے دیکھا' پھر وہ خاموشی سے اسے بلکہ جھلکا دیکھتی رہی تھی۔

"آئندہ اگر تم نے کیٹ کو ہاتھ بھی لگایا نا تو میں ہاتھ توڑ دوں گی تمہارا۔" وہ اسے متنبہ کرتے ہوئے چلی گئی۔

ثمن کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس سے پہلے کہ مریم گھبرا کر پاگلوں کی طرح باہر نکل کر اپنی بیٹی کو ڈھونڈتی دروازہ کھلا تھا اور سجاد اسے گود میں اٹھائے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ پریشانی ایک لمحہ میں غم و غصہ میں بدل گئی۔

"ناجائز اولاد نہیں ہے یہ تمہاری 'جو تم اسے یوں رات کے اندھیروں میں اٹھا کر رکھو۔"

سجاد نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اس نے اسی نرمی اور آہستگی کے ساتھ اسے مریم کے پہلو میں لٹا دیا۔

"ہونہہ۔ بزدل انسان" اک اور طنز کا تھپڑ۔

پھر وہ اسی خاموشی کے ساتھ مریم کے پیروں کی طرف بیڈ پہ بیٹھ گیا تھا۔ مریم نے اس کے بیٹھتے ہی پیر سمیٹے تھے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا یوں جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مریم نے اسے دیکھے بغیر منہ موڑ لیا۔

"یہ حادثہ بھی ہمارے ساتھ ہی ہونا تھا۔ الٹرا ساؤنڈ میں بیٹا اور اب۔" بے ساختہ مریم اس شخص کا چہرہ دیکھنے پہ مجبور ہوئی تھی۔ دل میں چھرا گھونپنے جیسی تکلیف کے احساس کے ساتھ۔

"یہ بیٹی ہی تھی سجاد ابراہیم! پہلے دن سے یہ بیٹی ہی تھی۔ وہ میں تھی' جس نے اس کی شناخت کو بدلا تھا۔ کیا یہ میرے لیے مشکل تھا سجاد!

چند آنسو' سسرال والوں کے ظلم کی داستان اور بیٹی معلوم ہونے پر اسے ختم کروا دینے کی دھمکی۔ اور بس۔"

اب کے تکلیف وہ صورت حال سجاد کے لیے تھی۔ وہ حق دق مریم کا منہ دیکھ رہا تھا۔

"تم۔ تم نے۔۔۔!" اس نے دونوں بازو فضا میں بلند کیے تھے۔

"تمہیں کم از کم مجھے بتانا چاہیے تھا مریم! میں باپ تھا اس کا۔"

"اور وہ باپ ہی ہوتے ہیں سجاد! جو بیٹیوں کو زندہ دفن کرتے رہے ہیں۔"

اور سجاد کا ذہن' ذہن اس وقت یک دم خالی ہو گیا تھا۔ بالکل خالی۔ وہ خاموشی سے مریم کا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ اور مریم ذرا سا رخ موڑے اپنے تاثرات کو بہم کرنے کی انتہائی کوشش میں تھی۔ سیکنڈ پلک جھپکتے گزر جاتا ہے مگر اس وقت وہ سیکنڈ بہت بھاری ہوا تھا۔

"تم دوسری شادی کر لو سجاد! واحد احسان ہو گا جو تم مجھ پر کرو گے۔" بچی کو گود میں اٹھاتے ہوئے مریم نے بہت عام سے انداز میں کہا تھا۔

وہ چند ثانیے اس عورت کا چہرہ دیکھتا رہا۔ یہ بات کہنے والا اس عورت کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً اس کا منہ توڑ دیتا۔

مگر وہ اس عورت کو کیا کہتا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے۔ وہ مسلسل اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"محبت کی ہے میں نے تم سے اور محبت مذاق نہیں ہوتی مریم!" پھر وہ چلا گیا تھا۔

"محبت۔۔۔؟ ان دونوں کے درمیان یہ آخر تھی کہاں؟؟"

مریم حیران ہو کر سوچتی رہ گئی تھی اور اس کا حیران ہونا بنتا بھی تھا۔

✡ ✡ ✡

اس نے دور سے کیٹ کو لان میں لیٹے دیکھا تھا مگر وہ اپنی جگہ منجمد کھڑی آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کپکپائے تھے۔ اس نے ہاتھوں کی مٹھیوں کو بھینچا اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کیٹ تک آئی تھی۔

کیٹ نے عنایا کو دیکھتے ہوئے اک ہلکی سی میاؤں کی تھی۔ عنایا کا دل دکھ سے بھرا تھا مگر وہ مجبور تھی بے بس ہو چکی تھی۔ بہتے آنسوؤں کے ساتھ اس نے کیٹ کے جسم پہ ہاتھ پھیرا۔ بھینچے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس کا ہاتھ کیٹ کی گردن پر آ کر رکا۔

اس نے کیٹ کی گردن پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا تھا۔ بند آنکھیں' کپکپاتے ہونٹ اس کے رونے میں شدت آئی تھی اور پھر یکدم اس نے دباؤ اتنا بڑھایا کہ کیٹ کا جسم تڑپنے لگا۔

عنایا ہچکیوں سے رو رہی تھی مگر اس نے ہاتھ نہیں اٹھایا۔

اور پھر۔ اک زوردار چیخ بلند ہوئی تھی۔ "عنایا!" ثمن بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس نے عنایا کو پوری قوت سے دھکا دے کر ہٹایا تھا۔

عنایا اوندھے منہ گھاس پر گری تھی اور گرتے ہی گھاس پہ ہاتھ مار مار کر رونے لگی تھی۔

اور ثمن۔ اس نے کیٹ کے جسم پر ہاتھ رکھ کر اس کی سانسوں کو محسوس کرنا چاہا تھا مگر تب تک اس کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

ثمن نے حیرت اور دکھ سے روتی ہوئی عنایا کو دیکھا تھا۔

وہ یقیناً "پاگل تھی۔ پاگل۔ سائیکک۔

✡ ✡ ✡

"سکندر! اگر آپ اسی طرح اسے اگنور کرتے رہے تو یقیناً "ایک دن' ہم اسے مینٹل ہاؤس بھجوانے پہ مجبور ہوں گے۔"

"تو کیا کروں۔ دو تھپڑ لگا کر اس کے منہ پر اس سے پوچھوں کہ کیوں اس نے اپنے پیٹ کو مارا۔" اگر خزینہ پریشانی سے بے قابو ہوئی تھیں تو سکندر بھی ہو چکے تھے۔ ان کو یوں طیش میں آتے دیکھ کر خزینہ ٹھنڈی پڑ گئیں۔ "سکندر! اسے کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھانا چاہیے۔"

"دکھا لو۔ سائیکاٹرسٹ کو بھی دکھا کر دیکھ لو۔ کوئی فرق نہیں آئے گا اس کی شخصیت میں۔ خزینہ! علاج کی اسے نہیں' تمہیں ضرورت ہے۔ جو آج تک یہ ہی ایکسیپٹ نہیں کر پائیں کہ تمہاری یہ اولاد باقی اولادوں جیسی نہیں ہے۔ تمہارے Do More والے رویے نے اسے اس حالت میں پہنچایا ہے۔ کبھی تم نے اس کو یہ کانفیڈنس دیا کہ وہ ایک انسان ہے جیسی بھی ہے۔ جتنی بھی خامیوں کے ساتھ ہے' وہ تمہاری پیاری بیٹی ہے؟"

شدید طیش میں مگر وہ نیچی آواز سے بول رہے تھے۔ اور خزینہ وہ سانس روکے کھڑی تھیں۔

"یہ کیا رویہ ہے خزینہ! کیسی ماں ہے؟ برتن کو اس کی گنجائش کے مطابق ہی بھرا جاتا ہے۔ پریشرائز کرنے کا نتیجہ تم نے دیکھ لیا۔ اب سائیکاٹرسٹ کیا تیر مار لے گا' ہاں! سلیپنگ پلز پہ لگا دے گا یا پھر سیشنز پرشہنز کر کے اپنی پاکٹ بھرے گا۔ رہنے دو خزینہ! جب وہ تم سے نہیں سنبھلی تو ایک غیر شخص اسے کیا سنبھالے گا۔"

"کھٹ۔ کھٹ۔ کھٹ۔ ایک کے بعد ایک کھڑکی کھلتی گئی تھی۔ سکندر پریشان ہونے کے ساتھ ساتھ بیزار بھی لگ رہے تھے۔

خزینہ نے صدمے کی سی حالت میں آہستہ آہستہ سکندر سے نظریں ہٹائی تھیں۔

"یہ کیا کر دیا تھا انہوں نے۔"

✡ ✡ ✡

پیدائش سے لے کر عمر کے پانچویں سال تک مریم کی بیٹی اس کے لیے اتنی بڑی آزمائش ثابت ہوئی تھی کہ مریم پچھلی ساری آزمائشوں' امتحانوں کو بھول گئی تھی۔

وہی سسرال والوں کے روایتی حربے' بہو کو تنگ کرنے کے مگر وہ لوگ اتنے اچھے ضرور تھے کہ ان کے کچن میں چولہا نہیں پھٹتا تھا۔ سو مریم بھی زندہ تھی اور اس کی بیٹی بھی۔

اس کی نندوں کے بچے اسے بے دھڑک مارتے تھے اور مریم کے لیے مسئلہ یہ نہیں تھا۔ سجاد اس سے پیار نہیں کرتا تھا۔ مریم کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ سجاد اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ مگر وہ اب بھی مریم کو ساتھ نہیں رکھ سکتا تھا اور وجہ وہی پرانی اور دقیانوسی سی جائیداد۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اور بیوی صبر کریں۔ یقیناً" صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے مگر مسئلہ یہ تھا کہ یہ پھل تب ملتا ہے جب منہ کا ذائقہ اتنا کڑوا ہو چکا ہوتا ہے کہ مٹھاس بھول جاتا ہے۔

بہرحال ان گزرے تین سالوں میں مریم نے بہت کٹھن زندگی گزاری تھی۔ اپنی اور اپنی بیٹی کی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے۔ مگر ان دونوں کی چوٹوں میں فرق تھا۔ مریم کو زخم نہیں لگتے تھے مگر پھر بھی چوٹیں زخم زدہ تکلیف جیسی تھیں۔ اس کی بیٹی کو زخم آتے تھے۔ کبھی کسی کے دھکا دینے پہ۔ کسی کے تھپڑ مار دینے پہ مگر پھر بھی وہ زخم اس کے لیے تکلیف دہ نہیں تھے۔

مگر یہ تو طے تھا مریم اس "محبت" سے عاجز آچکی تھی۔ کتنی ہی دفعہ وہ سجاد کو دوسری شادی کا مشورہ دے چکی تھی۔ اس سے کم از کم اس کی جان تو چھوٹتی نا اس بار ظلم سسرال والے نہیں سجاد خود کر رہا تھا۔

وہ ہر دفعہ دوسری شادی کے مشورے پہ مریم کا منہ دیکھ کر رہ جاتا۔

ان تین سالوں میں اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ مثلاً" خشک روٹی کو سالن کے بنا پانی کے ساتھ کیسے کھایا جاتا ہے۔ سارے دن کی بیگار کے بعد بھی اگر کھانا نہ ملے تو صبر کیسے کیا جاتا ہے۔

تیس بتیس لوگوں کا روزانہ کھانا بنانے کے بعد بھی اپنے خالی پیٹ کو کیسے برداشت کیا جاتا ہے اور یہ کہ اس خالی پیٹ کے ساتھ اپنی بچی کا پیٹ کیسے بھرا جاتا ہے۔

مریم کو بہت سی چیزوں کا ذائقہ بھولنے لگا تھا۔ وہ چیری جیسے سرخ ہونٹ، شفاف اور دلکش چہرہ نا معلوم کس مریم کا تھا۔

یہ تو کوئی پھیکے ہونٹوں والی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے لیے کوئی اور ہی عورت تھی۔ اسے ماں باپ سے ملے ہوئے، انہیں دیکھے ہوئے چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا اس کی اولاد ایسی محروم زندگی گزارے گی۔ حالانکہ اس کا باپ کروڑوں نہ سہی لاکھوں تو ضرور کماتا تھا مگر کیا تھا کہ وہ ایک "بیٹی" تھی۔ باپ کے لائے ہوئے کھلونوں کے ساتھ سوائے اس کی بیٹی کے باقی ہر کوئی کھیلتا تھا سیریلیک کے ڈبے، میڈیکیٹڈ ملک اور دوسری اس طرح کی چیزوں کو اس کی بیٹی کے علاوہ ہر کوئی استعمال کرتا تھا اور یہ تکلیف دہ تکلیف تھی جو نا زخم کے درد دیتی تھی۔

تب ہی مریم نے ایک نئی چیز سیکھی۔ اس نے سجاد کی لائی ہوئی چیزوں کو چھپانا شروع کر دیا تھا۔ ان پر اس کی بیٹی کا پہلا حق تھا سو وہ کچھ چیزیں چھپا لیا کرتی تھی اور رات کے وقت کمرہ بند کر کے بیٹی کو کھلایا کرتی تھی اور ساتھ میں اسے یہ بھی سکھلایا کرتی تھی کسی کو بتانا نہیں ہے۔ بتانے پہ کیا ہو سکتا ہے، وہ اسے یہ بھی سمجھایا کرتی تھی اس کی بیٹی تین سال کی ہو چکی تھی اور وہ نہایت ذہین اور تیز تھی۔

اور یہ اس کی تیزی ہی تھی کہ محض تین سال کی عمر میں ایک دن اس نے

☼ ☼ ☼

کیٹ کے مرنے کے بعد جو چیز سب کے لیے حیران کن تھی۔ وہ عنایا کا رویہ تھا۔ وہ یوں نارمل تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا جبکہ گھر بھر کے لیے یہ ایک سنگین صورت حال تھی اور ثمن۔۔۔

"گرینڈپا! کیوں مارا اس نے کیٹ کو صرف اس لیے کہ میں نے اسے ہاتھ لگایا۔ اسے پیار کیا۔ اس کا خیال رکھا تھا۔ وہ اتنی معصوم سی تھی گرینڈپا!"

دادا کے سینے سے لگی وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ کیٹ کے مرنے پر وہ ثمن ہی تھی جس نے چیخ چیخ کر سب کو اکٹھا کیا تھا۔ وہ اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ اپنی چیخوں پر قابو ہی نہیں رکھ سکی تھی۔

اور گرینڈپا اسے چپ کروانے کی پوری کوشش میں تھے مگر وہ چپ ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ عنایا کی بیماری کے دنوں میں وہ کیٹ سے بہت زیادہ مانوس ہو گئی تھی وقت کے ساتھ سب اس حادثے کو بھولنے لگے مگر خزینہ نہیں بھول سکی تھیں۔ انہوں نے عنایا کو کچھ وقت دیا اور پھر وہ اسے سائیکاٹرسٹ کے پاس لے کر گئی تھیں۔ وہ سائیکاٹرسٹ سے کچھ نہیں چاہتی تھیں ماسوائے اس کے وہ عنایا سے یہ پوچھے کہ اس نے کیوں اپنی بلی کو مارا، جس سے وہ اتنا پیار کرتی تھی۔ مگر خزینہ کی حیرت کی انتہا نہیں رہی تھی جب ابتدائی ملاقات میں ہی عنایا نے ڈاکٹر سے کہا۔

"آپ نے جو بات مجھ سے پانچ چھ دن کے بعد پوچھنی ہے، وہ میں آپ کو ابھی بتا دیتی ہوں۔ میں نے اپنے پیٹ کو نہیں مارا۔ اور جب میں نے اسے مارا ہی نہیں تو پھر کیوں مارنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔"

خزینہ ڈاکٹر کی زبانی یہ بات سن کر ششدر رہ گئی تھیں۔ وہ کیسے انکار کر سکتی تھیں۔ یہ بالکل سامنے کی بات تھی۔

ڈاکٹر ان سے کہہ رہا تھا کہ ان کی بیٹی شدید نفسیاتی بیماری نہیں۔ بیماریوں کا شکار تھی۔ اور اس کا یہ رویہ کل کو اسے مجرم بھی بنا سکتا ہے۔ وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا جسے سن کر خزینہ بے ہوش ہونے لگی تھیں۔

آتے ہی انہوں نے سکندر کو بتایا۔

"تم آئندہ عنایا کو وہاں لے کر نہیں جاؤ گی۔" سب کچھ سننے کے بعد سکندر نے کہا۔ اس کے جواب نے خزینہ کو کچھ اور پریشان کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان کے کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ مدھم سی۔

"آجاؤ!" گود میں رکھے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو فولڈ کرتے ہوئے سکندر نے کہا۔

"آر یو بزی" (آپ مصروف ہیں) اس نے سر اندر کر کے پوچھا تھا۔ وہ مسکرائے تھے اور بے ساختہ انہیں اس کا بچپن یاد آیا تھا۔ "تمہارے لیے نہیں ہنی!"

اس کو اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"کام؟" اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس کے کنفیوز انداز سے سکندر کو اندازہ ہو چکا تھا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

"ڈیڈی! کیا ضروری ہے جس کالج میں داؤد نے ایڈمیشن لیا میں اور ثمن بھی وہیں ایڈمیشن لیں۔ آپ کے ریسورسز سے سہی مگر میں اسی کالج سے پڑھوں؟" جھکے سر، جھکی نظروں سے بات کرتے کرتے آخر میں اس نے ہونٹ کا کنارہ دانتوں تلے دبا کر ڈرتے ہوئے نظریں اٹھائی تھیں۔

"نہیں۔۔۔ یہ بالکل ضروری نہیں۔" فوراً" جواب آیا تھا۔

"اگر یہ ضروری نہیں تو پھر میرا ایڈمیشن وہاں نہ کرایا جائے، جہاں یہ وہ دونوں پڑھ رہے ہیں۔"

"ٹھیک۔۔۔ مگر اس کی وجہ؟" کچھ سوچنے کے بعد سکندر بولے تھے۔

"وجہ۔۔۔ ڈیڈی! میں اسکول کے پہلے پانچ سال یہ ہی سنتی آئی تم داؤد کی کزن ہو؟ اور پھر "ثمن تمہاری کزن ہے؟"۔۔۔"

اس نے لوگوں کے حیرت بھرے لہجے کی بھرپور نقل اتاری تھی۔ سکندر ہنسے تھے۔

"میں یہ بات مزید نہیں سننا چاہتی۔" بے زاری سے آگاہ کیا گیا۔

"اوکے! میں دیکھتا ہوں، تمہارا ایڈمیشن پھر کہاں کرایا جا سکتا ہے۔" وہ اس بات کے جواب میں کھل کر مسکرائی تھی۔

"میں جانتی تھی آپ میری بات سمجھ جائیں گے۔" ان کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر وہ جذباتی ہو کر بولی تھی۔ جواباً" سکندر نے پیار سے اس کی بکھری ہوئی لٹوں کو کانوں کے پیچھے کیا۔

وہ صرف قد اور عمر میں ہی بڑی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں اور بھی کچھ ایسی چیزیں تھیں جو بڑی ہوئی تھیں جیسے کہ عزت نفس۔۔۔ اور کچھ چیزوں میں اور کمی واقع ہوئی تھی جیسے کہ اعتماد۔۔۔

سکندر بچپن میں اس کا اسکول نہیں بدل سکے تھے مگر اب وہ اس کو دوبارہ اسی صورت حال کا شکار ہونے سے بچا ضرور سکتے تھے سو انہوں نے وہ ہی کیا تھا۔۔۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم نے کہاں سے لی ہے؟" تین سالہ بیٹی کے ہاتھ میں چاکلیٹ دیکھ کر مریم نے پوچھا تھا۔

"علی کی پاکٹ سے۔" اس نے مریم کی ایک نند کے بیٹے کا نام لیا تھا۔

مریم الجھی تھی۔ "اس نے خود دی آپ کو؟"

وہ اس سوال پر ماں کا منہ دیکھنے لگی تھی۔

"میرا مطلب ہے کہ علی نے خود آپ کو اپنی پاکٹ سے چاکلیٹ لینے دی؟"

"نو" اس نے نفی میں سرہلایا تھا۔ "میں نے اسے بتائے بغیر لی ہے۔"

اور مریم کا چلتا ہوا سانس اچانک رک گیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی ہوشیاری کا اندازہ کر سکتی تھی۔ اس نے چوری کی تھی۔

باپ کی دی ہوئی چیزوں کو چرا کر کمرے میں بند ہو کر کھانے میں اور کسی دوسرے کی چیز کو چرا کر کھانے میں جو فرق تھا۔ وہ مریم بخوبی سمجھ سکتی تھی مگر وہ نہیں سمجھ سکتی تھی۔ وہ بچی تھی جو سکھایا گیا۔۔۔ اس نے وہی کیا۔

ایک زوردار تھپڑ مریم نے تین سالہ بچی کے منہ پر دے مارا تھا۔

"خبردار! آئندہ اگر تم نے کسی کی چیز بتائے بغیر لی تو؟"

اس نے بری طرح اسے ڈانٹا تھا۔

ہنی سہم گئی تھی مگر وہ روئی نہیں تھی۔ یہ پہلا تھپڑ تھا جو اس نے چوری کر کے ماں کو بتانے پر کھایا تھا۔ اس کے کچے ذہن پہ ایک اور نیا سبق ذہن نشین ہوا تھا۔ وہ یقیناً آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔ اور اس رات سوتے ہوئے مریم کی بیٹی کے گال پر کسی اور کے ہاتھوں کا نہیں۔۔۔ مریم کے اپنے ہاتھوں کا نشان تھا۔

اس چیز نے اسے کچھ زیادہ تکلیف دی تھی۔ اس رات مریم نے سوچا اب سجاد آئے گا تو وہ اس سے ہنی کے اسکول میں ایڈمیشن کی بات کرے گی۔

اور جب سجاد آیا تو۔ سب سے پہلی بات اس نے یہ ہی کی تھی مگر۔

"مریم! ہنی اسکول نہیں جا سکتی۔"

"کیوں؟" مریم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ سجاد انکار کر سکتا ہے۔

"تم جانتی ہو اس خاندان کی کوئی لڑکی آج تک اسکول نہیں گئی تو۔۔۔"

"وہ اس لیے اسکول نہیں گئیں سجاد! کیونکہ ان کی ماں "مریم" نہیں تھی۔" شدید مشتعل ہو کر اس نے بات کاٹی تھی۔

"دیکھو مریم۔"

"ہرگز نہیں سجاد۔۔۔ ہرگز۔۔۔ ہرگز نہیں کوئی دلیل نہیں مانوں گی کوئی بات نہیں سنوں گی تمہاری۔۔۔ کم از کم اس موضوع پر۔۔۔ کوئی سمجھوتا نہیں ہوگا۔ تمہیں ہر حال میں میری بیٹی کا داخلہ اسکول میں کروانا ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں جائیداد سے عاق ہونا پڑے یا کچھ اور کرنا پڑے۔۔۔ تم کرو گے۔"

سخت انداز میں مریم نے کہا تھا۔ اس کے انداز کو دیکھتے ہوئے اس وقت تو سجاد خاموش ہو گیا تھا مگر اس کے بعد جب بھی مریم نے اس بارے میں بات کی سجاد نے کبھی اسے واضح جواب نہیں دیا۔

مریم کے بہت زیادہ اصرار پر اس نے مریم سے کہا کہ وہ ہنی کو گھر میں ہی مونٹیسوری کروائے۔ وہ اسے کتابیں لادے گا۔ اور مریم حیران ہوئی تھی کہ کس طرح ہر مسئلے کا حل اس شخص کے پاس ہوتا تھا ناسوائے مریم کے مسئلوں کے۔۔۔ مریم مان گئی تھی۔ ماننے کے علاوہ اور کیا کر سکتی تھی وہ۔

سجاد نے اسے کورس کی کتابیں لادیں اور ساتھ ہی مریم سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اسے چھپ کر پڑھائے۔۔۔ کسی کو معلوم نہ ہو مگر مریم کو عجیب ضد سی ہو گئی تھی۔ اس نے چھپانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

اور بس اسی بات کی دیر تھی۔

طوفان تو جیسے اس گھر کی کھڑکیوں' دروازوں کے باہر تھما ہوتا تھا بس کھڑکیاں' دروازے کھلنے کی دیر ہوتی تھی۔

اس کی کلر بکس۔۔۔ کورس کی بکس۔۔۔ کاپیاں۔۔۔ پنسلیں۔۔۔ کلرز سب کو اٹھا کر ہنی اور اس کی ماں کو سامنے کھڑا کر کے آگ لگا دی گئی تھی اور اس کی ساس نے سینہ ٹھونک کر کہا تھا کہ اب وہ پڑھا کر دکھائے بیٹی کو۔ اس خاندان کی روایت کو۔۔۔ رسم کو توڑ کر دکھائے۔

وہاں کاپیاں اور کتابیں نہیں جل رہی تھیں۔ وہ مریم کے خواب تھے جو جل رہے تھے۔ یہ مریم کی ازدواجی زندگی کا سب سے تکلیف دہ دن تھا۔ ہنی اس رات۔۔۔ ساری رات اپنی کلرز بکس۔۔۔ اسٹوری بکس کے لیے روتی رہی۔۔۔ نیند میں بھی سسکتی رہی۔

ایک ماں کے لیے کیا یہ کم آزمائش تھی۔ اس رات مریم کو احساس ہوا کہ اپنی بیٹی کی ایسی زندگی کی ذمہ دار وہ خود تھی۔۔۔ صرف اور صرف وہ خود تھی۔

مریم کی بیٹی پانچ سال کی ہو چکی تھی۔ یہ اس کے لیے تکلیف دہ بات تھی کہ پانچ سال کی ہو کر بھی اس نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی۔ گو کہ مریم نے اسے زبانی بہت کچھ سکھایا تھا۔ مگر وہ اس کی ویسی تربیت گھر بیٹھ کر نہیں کر سکتی تھی جیسی کسی بچے کی اسکول میں ہوتی ہے۔

ہنی کی پانچویں سال گرہ مریم کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوئی تھی۔ ہر سال ہنی کی برتھ ڈے والے دن سجاد ضرور گھر آتا تھا۔ کیا تھا وہ کیک نہیں کاٹتے تھے اور ہنی خوبصورت سا کسی پری کی طرح کا ڈریس پہن کر کیک نہیں کاٹتی تھی مگر پھر بھی اس کا باپ ہر برتھ ڈے پہ اسے چوری چوری گفٹ دے کر ہیپی برتھ ڈے کہتا تھا۔

مگر اب کی بار۔۔۔

جیسے ہی سجاد نے ہنی کو گفٹ پکڑایا اور اسے ہیپی برتھ ڈے کہنا چاہا۔۔۔ مریم نے اس کے ہاتھ سے گفٹ چھین کر دیوار پہ مارا۔ وہ ہکا بکا رہ گیا تھا۔

"مجھے طلاق چاہیے۔" صرف تین لفظ بولے تھے اس نے اور ایک بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تھا مگر مریم پہ اثر نہیں ہوا تھا۔

"مجھے طلاق چاہیے۔" اس نے دوبارہ سجاد کو باور کرایا تھا۔ "تم نہیں دو گے تو یاد رکھنا میرا ذہن بہت کام کرتا ہے۔"

اسے وارننگ دے کر وہ کمرے سے چلی گئی تھی۔

وہ سجاد کی محبت کا بوجھ اٹھا اٹھا کر تھک چکی تھی۔

سجاد کے جانے تک ان دونوں میں پھر کوئی بات نہیں ہوئی تھی مگر جاتے ہی سجاد نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ مریم کا ذہن کتنا کام کرتا ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کہاں سے' کب اور کیسے اپنے گھر کال کی تھی کیونکہ اس کی اس کے گھر اور ماں باپ سے بات صرف وہ ہی کرواتا تھا۔

پتا تو تب اسے چلا جب اسے اس کے باپ نے فون کر کے بتایا کہ مریم کے بھائی پولیس کی مدد سے اسے لے کر جا چکے ہیں۔

اور زندگی میں پہلی بار سجاد ابراہیم نے اپنے پیروں کے تلے سے زمین کھسکتی ہوئی محسوس کی تھی اور اس پہلی رات اس نے جاگ کر سوچا تھا۔

کہ کیا واقعی ہی میں اس نے مریم سے محبت کی تھی؟

☼ ☼ ☼

پورے چھ سال۔۔۔ چھ سال بعد اس نے لاہور کی زمین پہ قدم رکھا تھا۔ اپنی پانچ سالہ بچی کی انگلی پکڑے وہ اس عمارت کو دیکھ رہی تھی جو کبھی اس کی جنت تھی۔ مریم نے عمارت کے ماتھے پہ جگمگاتے سنہرے رنگ سے لکھے حروف کو دیکھا۔۔۔ وہ نام کبھی اس کا سرتیم ہوا کرتا تھا۔ واپسی کا سفر پچھتاوں کا ہوتا ہے۔۔۔ مریم نے دیکھ لیا تھا۔

وہ "مریم شہباز علوی" تھی۔ وہ ثمن کا ہاتھ پکڑ کر علوی ہاؤس میں داخل ہوئی تھی۔ وہ ثمن کا علوی ہاؤس میں پہلا اور مریم کا آخری قدم تھا۔ جواب کبھی بھی وہاں سے نکلنے کے لیے رکھا نہیں گیا تھا۔

وہ لوٹ آئی تھی۔۔۔ واپس آ گئی تھی۔ شہباز علوی کی شہزادی لوٹ آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں کے درمیان فاصلہ اتنا نہیں تھا' جتنا وہ

دونوں اس وقت محسوس کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کے سامنے چند فٹ کے فاصلے پہ بیٹھے وہ دو نفوس۔ خود کو کسی خلیج جتنے گہرے اور وسیع فاصلے پہ محسوس کر رہے تھے۔

سجاد آیا تھا اس سے بات کرنے... ایک آخری بات اور ملاقات۔ لیکن ابھی۔ اس وقت وہ آخری بات کہنی مشکل ہو رہی تھی۔

وہ مریم سے کہنا چاہتا تھا ایسا مت کرے۔ وہ علیحدگی کا مطالبہ نہ کرے۔ کچھ اور صبر کرے۔ چند دن اور برداشت کرے۔ مگر۔ ابھی وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا یہ سب اس سے کس منہ سے کہے۔

اس نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ مریم جیسی لڑکی کیسے اس کی فیملی کے ساتھ ایڈجسٹ کرے گی۔

اس نے صرف مریم سے محبت کی تھی۔ اندھادھند۔ بغیر سوچے سمجھے۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔ اور بدلے میں "محبت" کے بجائے "تاوان" وصول کر رہا تھا۔

اور آج وہاں بیٹھے... وہ حیران ہو رہا تھا کہ مریم نے کیسے وہاں چھ سال گزار لیے تھے۔

"تم اگر مجھے کمپرومائز کا سبق پڑھانے آئے ہو تو سن لو۔ یہ سبق میں بہت پہلے سیکھ چکی ہوں۔" اسے مراقبے سے باہر لانے والی مریم کی آواز تھی، وہ چونکا تھا۔ ایک گہرا سانس بھر کر اس نے سر اٹھا کر مریم کو دیکھا۔

"مریم! ٹھیک ہے، تم وہاں نہیں رہنا چاہتیں، مت رہو۔ تم ہنی کو پڑھانا چاہتی ہو۔ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں مگر پلیز سیپریشن (علیحدگی) کی بات نہ کرو۔" وہ اسے سمجھانے والے انداز میں بولا تھا۔

"تو تم مجھے اپنے ساتھ رکھنے پر تیار ہو؟" اور یہاں اس مرنامی غبارے میں سے ساری ہوا نکل جاتی تھی۔

"تم یہیں رہ لو۔ میں۔"

"کوئی بھی لڑکی شادی کے بعد ایسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی سجاد! اس مسئلے کا جو بہترین حل ہو سکتا تھا۔ میں نے وہی تمہارے سامنے رکھا ہے۔ تم بیوی نہ تو ڈزرو کرتے ہو اور نہ ہی افورڈ کر سکتے ہو۔"

ٹھیک کہا تھا اس نے۔ سجاد مان بھی گیا تھا اور سمجھ تو وہ بہت اچھی طرح سے گیا تھا۔ سو جلد ہی مریم کو طلاق کے پیپرز مل گئے تھے۔

وہ ہنی کا خرچا اٹھانے پر تیار تھا۔ مریم نے اسے روکا نہیں۔ مریم پہلے بے وقوف تھی۔ اب نہیں۔ اسے خود مختار ہونے میں وقت درکار تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کا باپ اس عمر میں پھر سے اپنی بیٹی کے ساتھ اس کی بیٹی کا بھی خرچ اٹھائے۔

ثمن کے آنے سے عنایا کو شراکت داری برداشت کرنا پڑی تھی اور یہ اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ اور یہ کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہوتا بالخصوص اس کے لیے جو بلا شراکت غیرے راج کر رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

طلاق کے پیپرز ملنے پر یقیناً" کسی بھی عورت کو خوشی نہیں ہوتی۔ سو مریم کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ اسے دکھ ہوا تھا۔ اور اس نے کئی راتوں کو آنسوؤں میں بھگتا ہوا پایا تھا۔ طلاق ہنی کی تعلیم کی قیمت تھی جو اس نے چکائی تھی۔ اس نے ہر چیز برداشت کی تھی۔ غصہ، مار، جبر، ناانصافی۔ وہ سب کچھ جو اس کی ذلت کو سہتا تھا مگر اس کی بیٹی... اس خاندان کی دوسری لڑکیوں جیسی ہوتی... جاہل... ان پڑھ... ناخواندہ۔

بات اب اس کی ذات سے بڑھ گئی تھی۔ اس کے لیے محبت سے شادی اور پھر طلاق تک کا سفر اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا کہ تکلیف دہ ثمن کا ان پڑھ ہونا تھا۔

مریم اب طلاق یافتہ تھی مگر اس نے اس کے بعد اپنی زندگی کے آگے فل اسٹاپ نہیں لگایا تھا۔ اس نے اسکول ٹیچر سے اپنا کیریئر شروع کیا تھا۔ چھ سال بعد وہ یہ ہی کر سکتی تھی۔ اور جب ثمن نے اولیول کلیئر کیا تو وہ انجینئرنگ یونیورسٹی کی پروفیسر بن چکی تھی۔

ثمن اس کا دوسرا رخ تھی۔ خوبصورت، ذہین، حاضر دماغ... اور علوی خاندان کی وراثت کی

وارث۔
وہ محسن سجاد تھی۔ جس نے ماں اور باپ دونوں سے اگر کچھ لیا تھا تو وہ ذہانت ہی تھی۔

وہ جوں جوں اس ڈائری کو پڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے کی زمین جیسے زلزلے کی زد میں آنا شروع ہو گئی تھی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اس قدر پرابلمز کا شکار ہو سکتی تھی۔ بلکہ نہیں 'پرابلمز کا شکار نہیں کہنا چاہیے 'وہ مکمل طور پر سائیکک تھی۔

بے تحاشا نفسیاتی الجھنوں کا شکار ایک Paradox پرسنالٹی۔

مریم نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما ہوا تھا اور اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ جو کچھ اس ڈائری میں لکھا تھا 'وہ سچ تھا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ وہ سچ ہی تھا۔

اور اس سچ کو وہ ساری عمر جان ہی نہ پاتی 'اگر وہ ڈائری مریم تک نہ پہنچتی تو۔

آنسو اس کی ساکت آنکھوں سے قطرہ قطرہ گر کے پھسل رہے تھے۔

تکلیف کی کوئی شدت تھی 'جسے مریم نے کسی زہر کی طرح اپنے جسم میں پھیلتا ہوا محسوس کیا تھا۔ وہ اب کرسی سے ٹیک لگائے اک بے بسی 'اک بے چارگی کے عالم میں بیٹھی تھی۔

اس کے جسم کو بار بار جھٹکے لگ رہے تھے اور ایسا شکست کے احساس کے ساتھ ساتھ رونے کی وجہ سے بھی ہو رہا تھا۔ ساری عمر مریم نے غلط اندازے ہی لگائے تھے۔

مریم نے اپنے کندھوں پہ دو گرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔

اس نے مریم کے کندھوں کو تسلی کے سے انداز میں دبایا مریم نے مڑے بغیر کندھے پہ دھرے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ یوں جیسے وہ اس لمس کی زبان سمجھ گئی ہو۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔" مریم کے سامنے آتے ہوئے اس نے مریم کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں محبت سے لیتے ہوئے کہا۔ مریم نے وہ ہی ہاتھ اس کے ہاتھوں سے نکال کر اس کے بالوں میں پھیرتے ہوئے اس کے گال پہ رکھا تھا۔

اور پھر۔ بھری ہوئی آنکھوں سے آہستگی سے سر ہلایا تھا۔ یوں جیسے اس کے ٹھیک ہو جانے کا یقین ہو۔

اس نے ایک نظر پھر اس گہرے نیلے رنگ والی ڈائری کی طرف دیکھا تھا۔

آنکھوں میں موجود پانی کی سطح کچھ اور بلند ہوئی تھی۔ مریم نئے سرے سے تکلیف کا شکار ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"عالیہ! خدا کے لیے ایسا مت کرو۔ میں مر جاؤں گا تمہارے بغیر۔ ایسا مت کرو۔" فون کے دوسری طرف اس آواز کو سن کر اور اس آواز میں موجود بے چارگی کو محسوس کر کے اس نے کتنی تسکین محسوس کی تھی۔ کاش کوئی جان سکتا۔

"میں نے تم سے صرف دوستی کی تھی زین۔ صرف دوستی۔ محبت کا اظہار تو دور کی بات۔ میں نے تمہیں کبھی یہ احساس بھی نہیں دلایا تو پھر تم کیسے مجھے بلیم کر سکتے ہو۔"

"تم سمجھنے کی کوشش کرو عالیہ۔ میں بہت چاہتا ہوں تمہیں۔ تم۔ تم خوش رہو گی میرے ساتھ۔ بہت خوش رکھوں گا میں تمہیں۔" وہ ہی التجائیہ۔ فریاد کرتا ہوا لہجہ۔

"زین! تم سمجھ نہیں رہے۔ شادی تو ابھی دور دور تک میرے پلان میں نہیں ہے۔ اور میں نے کبھی بھی اس پوائنٹ آف ویو سے نہیں سوچا۔ پلیز زین۔ ایم سوری۔"

"عالیہ! ایسا مت کرو۔ دیکھو پلیز ایسا مت کرو۔"

اس نے اچانک سیل فون کان سے ہٹایا تھا۔ چند لمحے مسکراتے لبوں کے ساتھ سیل فون کو دیکھتی رہی۔ زین کی منتیں سن کر تسکین محسوس کرتی رہی پھر۔ اس نے کال کاٹ کر سیل فون میں سے سم نکالی اور دانتوں

سے چبا کر اسے ڈسٹ بن میں تھوک دیا تھا۔ یوں جیسے وہ سم نہیں 'اندر کا زہر ہو۔

اسے کوئی فکر۔ کوئی پروا نہیں تھی کہ زین اسے تلاش کر سکتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جان سکتا تھا کیونکہ وہ سم زین نے خود اپنے نام پہ نکلوائی تھی۔ اور اتنی سی عقل تو اس میں تھی کہ وہ اپنا نام 'پتا زین کو غلط بتاتی۔

زین اس کے پاگل پن کا شکار ہونے والا پہلا مرد تھا۔ مگر وہ آخری ہرگز نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

"اگر آپ بائیں طرف والا پورشن پھلانگ کر چھت پہ بنے کمرے میں داخل ہونا چاہیں تو اس کے لیے آپ کو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑے گا۔ کیونکہ کمرا باہر سے مقفل ہے مگر کمرے کی واحد کھڑکی کا ڈھیلا بولٹ بالکل اسی طرح کام کرتا ہے جس طرح لاک کی چابی کرتی۔ کھڑکی کے باہر لگے ہینڈلز کو پکڑ کر دو جھٹکے دینے سے کھڑکی کھل جاتی ہے۔

وہ کمرا اس کی ملکیت ہے۔ وہاں پہ اس کی بہت سی پرانی اور وہ چیزیں رکھی ہوئی ہیں جو اس نے چوری کی تھیں۔

یہ بات میرے علم میں کیسے آئی؟ ۔ وہ ایسے آئی کہ وہ میری دوست ہے مگر پھر بھی اس نے کمرے اور اس کے راز کو مجھ سے چھپایا۔ یہ بات ایک دن مجھے اس کا پیچھا کرنے پہ پتا چلی تھی۔ دراصل وہ کمرا گھر والوں نے لاک کیا ہوا ہے اور وہاں کاٹھ کباڑ کے علاوہ اگر کچھ ہے تو وہ اس کی چیزیں ہیں۔ وہ اس کمرے میں جانے کے لیے اسی کھڑکی کا راستہ استعمال کرتی ہے۔

اگر آپ بائیں طرف ٹیرس پھلانگ کر اس کمرے میں داخل ہوں تو سامنے ہی دیوار پہ ایک بہت بڑا بورڈ نظر آئے گا آپ کو۔ ایسا بورڈ جس پہ نشانہ بازی کی مشق کی جاتی ہے۔ اس پہ۔"

اس سے اگلی سطور پڑھ کر داؤد بھونچکا رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ کیفیت اس کی پہلے صفحے سے ہی تھی مگر اب کی بار صحیح معنوں میں وہ ہل کر رہ گیا تھا۔

سطور پڑھ کر وہ الجھا اور الجھتے ہوئے اس نے دوبارہ وہ ہی سطریں پڑھیں اور پڑھتے ہی ڈائری بند کر کے اٹھا۔

اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر اس نے کسی کی غیر موجودگی کا اطمینان کیا اور پھر چوکھٹ پہ پاؤں رکھ کر وہ بائیں طرف والے ٹیرس پہ کود گیا۔ ٹیرس سے اوپر اس کمرے کو سیڑھیاں جاتی تھیں جس کا ذکر ڈائری میں تھا۔ دبے قدموں سے چلتے ہوئے وہ کمرے تک پہنچا۔ دو تین جھٹکوں کے بعد کھڑکی کھل گئی تھی۔ وہ اندر پھلانگا اور لائٹ آن کی تھی۔

جیسے ہی داؤد لائٹ آن کر کے پلٹا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ساکت رہ گیا تھا۔

اس کے عین سامنے وہ ہی بورڈ دیوار پہ نصب تھا۔ اسے یاد تھا کہ بورڈ گرینڈپا نے انہیں لا کر دیا تھا اور وہ تینوں اس پہ نشانے بازی کی پریکٹس کیا کرتے تھے۔ وہ دراصل بچوں کی ایک گیم تھی۔

وہ دھیمے قدموں سے چلتا ہوا اس بورڈ تک پہنچا۔ بہت آہستگی سے اس نے بورڈ کے درمیان میں بنے سرخ رنگ کے دائرے میں واضح لکھے گئے نام پر انگلی پھیری تھی۔

وہ نام۔

داؤد مرتضیٰ تھا۔

اس بورڈ کے سارے خانوں میں لڑکوں کے نام لکھے تھے۔ سب سے پہلے خانے میں زین۔ مدثر پھر علی۔ اور اسی طرح سب خانے ایک دائرے کی شکل میں مکمل ہوئے تھے اور ان سب پہ سرخ مارکر سے بڑے بڑے کراس لگے ہوئے تھے مگر داؤد کا نام۔ اس پہ کراس نہیں لگا ہوا تھا۔ وہ وہاں کھڑا اس پزل کو حل کرنے کی کوششوں میں تھا۔ کیوں اس کے نام پہ کراس نہیں تھا۔ اور وہ عین درمیان میں۔ سینٹر میں کیوں لکھا گیا تھا؟

☆ ☆ ☆

وہ ایک گھریلو تقریب تھی۔ حسب معمول وہ تینوں اکٹھے بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ

مناسب ہوگا کہ داؤد اور ثمن باتوں میں جبکہ عنایا سننے میں مصروف تھی۔

چند لمحوں بعد وہ بے زار ہو کر اٹھ گئی۔ وہ دونوں سائنس کے حوالے سے کسی نئی آنے والی ریسرچ پر بات کر رہے تھے اور اسے اس ریسرچ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اپنا گلاس اٹھا کر وہ ان دونوں سے معذرت کرتے ہوئے اٹھ گئی۔

چند لمحے وہ لان میں ادھر سے ادھر اکیلی چکر لگاتی رہی تھی۔ اسے کچھ پریشان کر رہا تھا۔ مگر وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔

اور پھر رک کر درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے اس نے ثمن کو دیکھا۔ یقیناً" وہ غضب ڈھا رہی تھی۔ اور پھر ایک وقفے کے بعد اس نے داؤد کو دیکھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ بہت اچھے لگ رہے تھے۔ یکدم عنایا کے منہ کا ذائقہ بدلا تھا۔

پتا نہیں اچانک اسے کیا ہوا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی ان دونوں تک آئی تھی۔

"داؤد! تایا بلا رہے ہیں" اس کے سر پہ جا کر وہ خاصی کرخت ہو کر بولی تھی۔ ثمن اور داؤد نے بیک وقت اسے دیکھا اور پھر داؤد اٹھ گیا تھا۔

داؤد کے اٹھتے ہی اس نے مسکرا کر ثمن کو دیکھا اور کوئی بات کرتے ہوئے وہ اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھنے لگی تھی مگر اچانک اس کا پاؤں پھسلا تھا۔ کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ سے چھوٹا اور ثمن کے سارے کپڑے خراب ہو گئے۔

"اوہ گاڈ۔ سوری۔ سوری ثمن۔" وہ بوکھلا کر ہاتھوں سے اس کے کپڑے صاف کرنے لگی تھی۔

"اٹس اوکے۔ میں چینج کر آتی ہوں" ثمن ناگواری سے اٹھتے ہوئے بولی تھی۔ ثمن کے اٹھتے ہی اس نے دل میں ایک گہرا سکون اترتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ وہ دونوں اب اکٹھے نہیں تھے۔

☼ ☼ ☼

"ثمن کی برتھ ڈے آ رہی ہے۔"

"تو پھر۔؟"

"اس کے لیے گفٹ لینا ہے داؤد۔!"

"یار! یہ گفٹ وفٹ لڑکیوں کے کام ہیں۔ میں اسے باہر واک پہ لے جاؤں گا۔ اتنا ہی کافی ہے اس کے لیے۔" وہ قدرے لاپروائی سے بولا۔

"تو تم اسے واک پہ لے جاؤ گے بطور گفٹ؟" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولی تھی۔

"اسپیشل لے کر کیا جانا یار!" وہ اٹھ کر کھڑکی تک آیا۔ "روز ہی لے کر جاتا ہوں۔" دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پہ ٹکا کر وہ باہر دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ اور عنایا کے عین سر کے اوپر بم پھٹا تھا۔ اگر داؤد اس وقت اس کی شکل دیکھ لیتا تو یقیناً سب جان جاتا۔

"عنایا!" جب وہ کافی دیر تک نہ بولی تو بے ساختہ داؤد نے مڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں!"

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں سوچ رہی ہوں' تمہارے ساتھ چلی جاؤں اس کے لیے گفٹ لینے۔ تم فری ہو؟"

"ہاں۔ تم چلو میں ذرا سلیپر چینج کر کے آتا ہوں۔" وہ مسکرایا۔ عنایا کی جان فنا ہوئی تھی۔

"اوکے!" مدھم آواز میں کہتے ہوئے وہ وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ڈائری؟" کیک کاٹنے کے بعد ثمن نے عنایا کا دیا ہوا گفٹ کھولتے ہوئے حیرانی سے کہا تھا۔ وہ مسکرائی۔

"پرفیومز' جیولری' بیگز دے دے کر تھک گئی۔ سوچا اس دفعہ کچھ نیا ہو!"

"آئی لائیک اٹ۔" ثمن نے ریپر کو پوری طرح سے پھاڑ کر پیچھے کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ ایک گہرے نیلے رنگ کی ڈائری تھی۔

"کیا کرو گی تم اس کا؟" داؤد اچانک آیا تھا۔ ثمن اور عنایا نے بیک وقت اسے دیکھا تھا۔

"جب عنایا یہ گفٹ لے رہی تھی تو میں نے اسے منع کیا تھا کہ ثمن کیا کرے گی اس کا۔ مگر اس نے کہا' نہیں یہ ہی دینی ہے۔"

"ہمم۔! اچھی لگی مجھے۔"

"لیکن تمہاری یہ ٹائپ نہیں۔ آئی مین ڈائری لکھنے والی لڑکیوں جیسی۔"

"سو واٹ۔ کبھی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔"

"ہاں۔ ہاں تم اس میں غزلیں لکھنا۔ ویسے بھی تمہیں نیا نیا شوق ہوا ہے نا اردو شاعری کا۔" ثمن بے اختیار ہنسی تھی۔

"جو بھی لکھوں گی۔ یہ پرسنل ہوگا۔" وہ داؤد کو دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ دونوں بھول گئے تھے کہ وہاں ایک تیسرا نفس بھی موجود تھا۔

☼ ☼ ☼

"رائنہ پلیز! تم کیوں بریک اپ کر رہی ہو۔ ایسا کیا ہو گیا جو یوں تم مجھے چھوڑ رہی ہو۔ پلیز ایسا مت کرو۔"

"سوری! مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے سیریس ہو جاؤ گے۔ میں نے تمہیں صرف دوست سمجھا تھا مگر تم نے تو حد کر دی۔ پرپوزل بھجوا دیا۔ "اٹس انف ناؤ۔" وہ ہی کسی مرد کا فریاد کرتا ہوا لہجہ اور وہ ہی اس کا مغرورانہ انداز۔

پھر سے کسی "مرد" کا دل ٹوٹا تھا۔ پھر سے اس کے دل کو تسکین پہنچی تھی۔

اس کے لیے ہر مرد کسی ٹارگٹ کی طرح ہوتا تھا۔ اور جب وہ یہ ٹارگٹ پورا کر لیتی تھی تو بورڈ پہ لکھے نام پر بڑا سا کراس لگا دیتی تھی۔

اور یہ سلسلہ کہاں تک چلنا تھا اور کہاں تک پہنچنا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں ثمن اور عنایا میں سے کون زیادہ اچھی لگتی ہے" وہ پاپا کے اس سوال پہ یکدم حیران ہوا تھا۔

"کیا مطلب؟۔"

"سی اے مکمل کر چکے ہو۔ ایک اچھی پوسٹ پہ۔ ایک ہینڈسم سیلری لے رہے ہو۔ میرے خیال میں جو کچھ تم نے اچیو کرنا تھا کر چکے۔ فیوچر پلاننگز میں شادی بھی ہے یا نہیں؟"

وہ اس وضاحت پہ مسکرایا تھا۔

"کس کے فیوچر پلانز میں شادی نہیں ہوتی پاپا۔ ضرور ہے۔"

"تو پھر ثمن کے لیے بات کروں یا عنایا۔؟" وہ ان کے سوال پر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تھا۔

"ثمن پاپا!" چند لمحے بعد جواب آیا تھا۔ مرتضیٰ صاحب یہ ہی جواب توقع کر رہے تھے۔ اس جواب پہ ایک گہرا سانس لے کر انہوں نے جیسے خود کو تیار کیا تھا۔

تم انٹرسٹڈ ہو اس میں؟"

"نہیں۔ آئی تھنک ایسی بات نہیں بلکہ کسی بھی انسان سے آپ ثمن اور عنایا میں سے چوائس کا کہیں گے۔ اس کی چوائس ثمن ہی ہوگی۔ شی از پرفیکٹ۔"

"اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ وہ پرفیکٹ ہے۔ اس لیے تم عنایا کے لیے سوچو تو؟" اب کی بار اس نے سنجیدگی سے باپ کو دیکھا۔

"داؤد! ثمن کے لیے پرپوزلز کی کمی نہیں۔ اس جیسی خوبصورت' ذہین اور سافٹ نیچرڈ لڑکی کے لیے کوئی بھی بخوشی۔ آسانی سے راضی ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں تم عنایا کے لیے سوچو۔ زبردستی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی میں یہ ہی چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا بھائی کل کو اپنی بیٹی کی وجہ سے کسی مشکل کا شکار ہو۔"

داؤد خاموش ہو گیا تھا۔ وہ اسے ہیرا چھوڑ کر کوئلہ اپنانے کو کہہ رہے تھے۔ عنایا ثمن جتنی خوبصورت نہیں تھی۔ نہ ہی اتنی ذہین اور لائق فائق۔ وہ کیسے اس لڑکی کو اپنی لائف پارٹنر کے طور پہ پسند کر لے جس کا اکیڈمک ریکارڈ انتہائی خراب ہو اور جو تین بار بی

اے کی انگلش میں سپلی لے چکی ہو' کانفیڈنس اس میں نہیں تھا۔ اور جو نفسیاتی مسائل تھے وہ الگ۔۔۔ پھر بھی وہ چاہتے تھے کہ وہ عنایا کے لیے سوچے۔۔۔ اور وہ بھی ثمن جیسی بہترین چوائس چھوڑ کر۔۔۔

☼ ☼ ☼

اس کے سامنے بچپن کی تصویروں کا البم کھلا پڑا تھا اور وہ سوچ سوچ کر۔۔۔ بڑے حساب کتاب سے۔۔۔ یاد کرکے واقعات کو تحریر کرتی جارہی تھی۔۔۔ اسی گہرے نیلے رنگ والی ڈائری میں۔۔۔

بچپن کے کئی ایسے واقعات تھے جو اس کے ذہن سے معدوم ہو چکے تھے مگر پھر بھی وہ ذہن پر زور دے کر انہیں لکھنے کی کوشش کررہی تھی اور اسی کوشش میں ڈائری کے پہلے صفحات پہ اس نے الجھن اور بے چینی سے کئی لکیریں کھینچ دی تھیں۔ وہ کسی خاص مقصد کے لیے یہ ڈائری لکھ رہی تھی۔ یہ ڈائری ہی تھی جو اسے "بچا" سکتی تھی۔ اسے وہ "دے" سکتی تھی جو حقیقت کی دنیا میں ناممکن تھا۔

وہ ڈائری نہیں آب حیات تھا۔ ایسا آب حیات جسے پیتا کوئی اور۔۔۔ اور جی اٹھتی وہ۔۔۔ لافانی ہوجاتی ۔ہمیشہ زندہ رہتی۔۔۔

☼ ☼ ☼

"ثمن!"

"جی ممی!" وہ دونوں اس وقت ٹی وی لاؤنج میں موجود تھیں۔ مریم کے پکارنے پہ ثمن نے آواز کم کرکے جواب دیا تھا۔

"ادھر آؤ!" مریم نے بہت پیار سے اسے بلایا۔

وہ مسکراتے ہوئے اٹھی پاس بیٹھتے ہی مریم نے نرمی اور محبت سے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"داؤد کیسا لگتا ہے تمہیں؟" مریم نے سرسری سا پوچھا۔

"کس حوالے سے ممی؟" وہ مسکرائی۔

مریم نے چشمے کے اوپر سے اسے دیکھتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اسے اندازہ تھا کہ وہ اپنی اولاد سے گھما پھرا کر بات نہیں کرسکتی تھی۔

"مرتضیٰ بھائی چاہ رہے ہیں کہ عنایا کے لیے پرپوزل لے جائیں بٹ اس سے پہلے انہوں نے مجھ سے بات کی ہے۔ میرے خیال میں ان کا فیصلہ درست ہے ثمن! مگر میں جاننا چاہتی ہوں کہ کہیں تم اس فیصلے سے ہرٹ تو نہیں ہوگی؟"

وہ مریم کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس بات پہ سر جھکا گئی۔

"نہیں ممی! وہ میرا دوست ہے صرف۔" اسی طرح سر جھکائے بولی۔

"اگر تم ہرٹ ہوئی بھی ہونا ثمن! تو برداشت کرلو۔ زندگی صرف برداشت کا نام ہے۔ وہ لوگ blessed ہوتے ہیں ثمن! جن کے دل میں اتنی ہمت اور حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ کسی دوسرے کے لیے کچھ کرسکیں۔"

وہ ثمن کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر کہہ رہی تھی۔ اور ثمن بہت اچھی طرح سے سمجھ رہی تھی۔

"ممی! میں آپ کا سر نہیں جھکنے دوں گی۔" اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مریم کا چہرہ تھام کر کہا اور مریم نے بے ساختہ اس کا منہ چوما تھا۔

☼ ☼ ☼

"اس کی شخصیت دو رخی ہے کسی سکے کی طرح۔ ہتھیلی پہ رکھا ہو تو اس کا دوسرا رخ نظر نہیں آسکتا۔ دنیا ایک وقت میں ایک ہی رخ دیکھ سکتی ہے۔ اور دنیا وہ ہی دیکھتی ہے جو آپ اسے دکھانا چاہتے ہیں اور جو آپ اس سے چھپانا چاہیں۔۔۔ وہ کبھی سامنے نہیں آسکتا۔ دنیا اسے اسی پالشڈ روپ میں دیکھتی تھی جو وہ دکھانا چاہتی تھی۔ اسے خود کو بہت اچھی طرح سے چھپانا آتا تھا۔ وہ کتنی Maniac (جنونی) کتنی Insane (پاگل) ہے۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی جان سکتا ہے۔

اسے آج تک۔۔۔ ابھی تک چیزیں چرانے کی بیماری ہے۔ اور میں آج تک ڈانٹ کھا رہی ہوں۔ بچپن کی محرومیوں نے اسے ایک ایک سائیکو کیس بنادیا ہے۔

علی' زین' مدثر اور وہ سارے نام جو اس بورڈ پہ لکھے گئے تھے۔ وہ سب ان مردوں کے نام تھے جو اپنی اپنی جگہ بہت مضبوط شخصیت کے حامل سمجھے جاتے تھے۔ کوئی اس کی کسی دوست کا بھائی تھا تو کوئی کالج فیلو اور کوئی اس کا ٹیچر۔ یہ سب وہ مرد تھے جنہیں دنیا عزت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اور اس نے انہیں بے عزت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ ان سے ہونے والی گفتگو کو ریکارڈ کرکے ان ہی کے ایف بی اکاؤنٹ پر ڈال دیتی تھی اور اس کے بعد کیا گنجائش رہتی تھی۔۔۔

اور رہی بات داؤد کی۔۔۔

خاندان کا کون سا ایسا مرد یا عورت تھی جس کی زبان پہ داؤد کا نام نہ ہو۔ جو داؤد کی تعریفوں میں رطب اللسان نہ ہو۔ اب ضرورت صرف یہ جاننے کی ہے کہ کب داؤد کے نام پر ریڈ کراس لگتا تھا اور موسٹ امپورٹنٹ کیسے؟؟؟۔۔۔

اس کا اگلا شکار کون تھا' یہ بتانے کی اب ضرورت نہیں۔

☼ ☼ ☼

داؤد نے ایک گہرا سانس بھر کر ڈائری بند کی تھی' کنفیوژن ہونے یا نہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں بچی تھی۔ وہ سب آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ وہ صرف پریشان تھا۔۔۔

سیریس کنڈیشن صرف یہ ہی نہیں ہوتی کہ انسان آئی سی یو میں ہو۔ دل کی دھڑکن کا گراف بے ترتیب ہو اور انسان وینٹی لیٹر پر ہو۔۔۔ سیریس کنڈیشن یہ بھی ہوتی ہے کہ انسان ذہنی طور پر اتنا بیمار ہو اور کسی کو معلوم تک نہ ہو' اس سے زیادہ خطرناک بات ۔۔۔ ۔۔۔ اور کوئی نہیں ہوتی۔

داؤد کا پریشان ہونا فطری تھا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ پاپا کو بتانا چاہیے' سکندر چاچو کو یا پھر خود ہی۔۔۔ بغیر کسی کو بتائے اس مسئلے کو حل کرلینا چاہیے۔۔۔

وہ ذہین نہیں جینئس مانا جاتا تھا مگر پھر بھی یہ بات اسے کافی دیر بعد سمجھ میں آئی تھی کہ اسے یہ بات مریم پھپھو کو بتانا چاہیے۔ ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا جو اس مسئلے کو بہترین طریقہ سے حل کرپاتا۔

☼ ☼ ☼

عنایا بی اے میں پاس ہوجاتی یا ٹاپ کرلیتی' تب بھی خزینہ کی یہ حالت نہ ہوتی' جو داؤد کا پرپوزل آنے پہ ہوئی تھی۔

یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز تھا۔ سارا خاندان اس موقع پہ جمع تھا اور سب ہی خوش بھی تھے۔ چھوٹے بڑے سب۔ وہ اس خاندان کے لیے بہت ہی خوشی کا دن تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ سامنے اسٹیج پہ عجیب سے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ جہاں عنایا اور داؤد بیٹھے تھے اور ان کے درمیان شہباز علوی بیٹھے ہوئے تھے۔ ثمن کے اندر اک احساس تھا جو گھل گھل کر اس کے وجود کو کھائے جارہا تھا۔ عنایا "وہ" لے چکی تھی' جو اسے مطلوب تھا۔ بے چینی اور اضطراب سے وہ اپنے ناخن کترنے

لگی تھی۔
زندگی میں یہ پہلی بار تھا کہ وہ اپنے جذبات پہ قابو نہیں پا رہی تھی۔ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ وہ کرنے کے سے انداز میں کرسی پہ بیٹھی تھی مسلسل آگے پیچھے ہلتے ہوئے اس نے یک دم اچانک اک تیز سی نظر اسٹیج پر ڈالی تھی۔ داؤد عنایا کو انگوٹھی پہنا رہا تھا اور ساتھ ہی ذرا سا جھک کر اسے کچھ کہہ رہا تھا۔

اس کا رنگ فق ہوا تھا اور رنگ تو عنایا کا چہرہ بھی ہوا تھا۔ داؤد نے بات ہی ایسی کی تھی۔

"میں ڈائری پڑھ چکا ہوں۔" اس کے ساتھ ہی اس نے انگوٹھی پہنائی تھی۔

عنایا بے یقینی سے اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں واضح لرزش اتری تھی جسے وہ قابو نہیں کر سکی تھی۔ اسے محسوس ہوا تھا کہ ارد گرد موجود لوگ شور ہنگامہ سب کچھ جیسے بھک سے اڑ گئے تھے۔

وہاں صرف سناٹا تھا اور سناٹے میں شور کی سی کیفیت پیدا کرتی ہوئی اک آواز۔

"میں ڈائری پڑھ چکا ہوں۔" وہ اتنی گھبرائی کہ اپنے ہاتھ پر موجود داؤد کے ہاتھ کا لمس تک محسوس نہیں کر پا رہی تھی۔

"عنایا!" داؤد نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا تھا اور وہ بری طرح چونکی تھی

☼ ☼ ☼

"کتنے دنوں کے لیے جا رہی ہو ثمن!" مریم نے اسے پیکنگ کرتے دیکھ کر کہا تھا۔

ثمن بچپن سے چھٹیوں میں اپنے باپ کے پاس جایا کرتی تھی۔ ابھی بھی اس کا سمسٹر ختم ہوا تو سجاد نے اس کے لیے ٹکٹ بھیجا تھا۔

"معلوم نہیں ممی!" وہ تھکے سے انداز میں ہاتھ روک کر بولی تھی۔

"ہمیشہ سے تم اتنی ہی بے زار ہوتی ہو اپنے ددھیال جاتے وقت مگر پھر بھی جاتی ضرور ہو۔"

"ممی! میرا وہاں جانے کو یا پھر پاپا سے ملنے کو دل نہیں چاہتا' میں تو وہاں صرف پاپا کے بیٹوں کو تنگ کرنے اور اپنے ددھیال والوں کو زچ کرنے جاتی ہوں۔ جب پاپا میری کیئر کرتے ہیں میری جائز' ناجائز بات مانتے ہیں مجھ سے لاڈ کرتے ہیں تو ممی! ان لوگوں کے تپے ہوئے سرخ چہرے دیکھ کر بڑا سکون ملتا ہے مجھے۔ انہوں نے بہت برا کیا تھا نا آپ کے ساتھ۔"

"ثمن!" مریم ششدر تھی۔ "تم ابھی تک نہیں بھولیں بیٹا!"

"کیسے بھول سکتی ہوں ممی!" یک دم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

مریم یک لخت لاجواب ہوئی تھی۔

چند لمحوں بعد اس نے آگے بڑھ کر بیڈ پر سر جھکائے بیٹھی ثمن کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے سب سے بہترین انتقام کیا ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"تمہاری گرینڈ مدر نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو پڑھا کر دکھاؤں اور آج جب تم وہاں جاتی ہو تو تم مریم کی بیٹی بن کر جاتی ہو۔ اک ذہین پڑھی لکھی لڑکی کے طور پر۔ یہ ان لوگوں کے منہ پہ ایک بھرپور تھپڑ ہے ثمن! اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو گا؟" ثمن مدھم سا مسکرائی اور ہلکے سے سر کو ہلایا تھا۔

"چلو پیکنگ کرتے ہیں اب۔" چند لمحوں بعد وہ بشاشت سے بولتے ہوئے اس کے کپڑے اور چیزیں بیگ میں رکھنے میں مدد کرنے لگی تھی۔

"یہ نہیں رکھنی کیا؟" اس کی سائیڈ ٹیبل پر موجود نیلی ڈائری اٹھا کر مریم نے پوچھا تھا۔

"نہیں رہنے دیں۔" ثمن نے مصروف سے انداز میں سر اٹھا کر دیکھا اور پھر ایک غیر ضروری چیز سمجھتے ہوئے جواب دیا تھا اس کی پیکنگ مکمل ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پھپھو!"

"آؤ داؤد"

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"کیا بات ہے داؤد؟" مریم کچھ حیرانی سے بولی تھی۔

"وہ پھپھو یہ۔" اس نے آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ کمر سے پیچھے نکال کر مریم کے سامنے کیے تھے۔

"یہ۔ یہ تو ثمن کی ڈا۔"

"مریم پھپھو!" اس نے مریم کی بات کاٹی تھی۔

"آپ یہ پڑھ لیں۔"

اس نے ڈائری مریم کے ہاتھ میں دی۔

"میرے خیال میں آپ کے علاوہ دوسرا کوئی شخص نہیں' جسے یہ ڈائری پڑھنی چاہیے۔" مریم نے حیران ہوتے ہوئے ڈائری داؤد کے ہاتھوں سے لی تھی۔

"ایسا بھی کیا ہے اس میں' جو تم مجھے پڑھنے کو کہہ رہے ہو۔" نسبتاً" ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے مریم نے ڈائری کھڑے کھڑے کھولی۔

شروع کے چند صفحات آڑی' ترچھی لکیروں سے بھرے تھے۔

اور پھر کچھ دیر بعد بے اختیار اس نے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھاما تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ داؤد نے پیچھے سے آ کر بہت نرمی سے اس کے کندھوں کو تسلی کے سے انداز میں دبایا تھا۔

اور اس نے داؤد کا ہاتھ تھپتھپا کر جیسے اس لمس کی زبان کو سمجھنے کا اظہار کیا تھا۔ اس طرح وہ ڈائری مریم تک پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں عین منگنی کی انگوٹھی پہناتے وقت مجھے یہ بات نہیں بتانی چاہیے تھی داؤد! ہارٹ بھی فیل ہو سکتا تھا میرا۔" وہ دونوں اس وقت لانگ ڈرائیو پر آئے تھے بلکہ یوں کہنا چاہیے تھا کہ داؤد اسے لے کر آیا تھا۔

رشتہ بدلتے ہی جذبات کیسے بدلتے ہیں۔ یہ اب داؤد نے سمجھا تھا۔

خزاں کا موسم تھا اور وہ دونوں ایک پارک میں چہل قدمی کر رہے تھے۔ زرد پتے ان کے پیروں کے نیچے آ کر ان دونوں کے درمیان موجود خاموشی کو توڑنے کی کوشش میں تھے' جب ہی عنایا یک دم بولی تھی۔

"تمہارا ری ایکشن دیکھنا چاہتا تھا۔" اس نے رک کر ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگاتے ہوئے عنایا کو دیکھا۔ لمبے بالوں کی فرنچ ٹیل بنائے سرخ رنگ کی ہائی نیک جرسی میں۔ سرخ رنگ کی ہی بڑی بڑی بالیاں پہنے ہوئے وہ خاصی جاذب نظر دکھ رہی تھی۔

"تمہیں مجھ پہ ٹرسٹ ہے ناداؤد! میں ایسی۔"

"مجھے تم پر ٹرسٹ ہے عنایا! اور میں تمہارے ساتھ ہوں۔ چاہے جو بھی ہو۔ تم جیسی بھی ہو' اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"کیا واقعی تمہیں فرق نہیں پڑتا؟" وہی اس کا مخصوص مدھم سا ہچکچاتا لہجہ۔

"نہیں!" مختصر مگر ٹھوس جواب۔ وہ بے اختیار مسکرائی۔

"سوچ لو۔ شیئرنگ مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ کیٹ کو مار سکتی ہوں تو۔" مسکراتے ہوئے' شرارت بھرے لہجے میں بولی تھی۔

داؤد بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ "محترمہ! میرا مرنے کا نہیں' تمہیں مارنے کا پروگرام ہے۔"

اس کو دوبارہ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا تھا۔

"دیکھتے ہیں کون مرتا ہے اور کون کسے مارتا ہے۔"

چلتے چلتے پاؤں کی زوردار ٹھوکر سے راستے میں موجود پتھر کو اڑاتے ہوئے وہ بولی تھی۔

"ہاں! دیکھتے ہیں کہ کس کا داؤ۔ کس پہ۔ کب کیسے اور کہاں تک چلتا ہے۔"

اب کی بار دونوں نے ایک دوسرے کی طرف ایک گہری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا تھا۔

✲ ✲ ✲

پورے اٹھارہ سال بعد اس کے فون کی اسکرین پہ مریم کا نام جگمگایا تھا۔

وہ نمبر ابھی تک اس کے پاس محفوظ تھا۔ نہ صرف نمبر بلکہ یادوں کے نام پہ پتا نہیں کیا کیا تھا جو اس نے محفوظ کر رکھا تھا۔ کال ریسیو کرتے ہی اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ اس سے کیا کہے۔ سلام کرے' خیریت پوچھے یا پھر۔ "ہیلو"

"تم سے طلاق لیتے وقت میں نے سمجھا تھا کہ میں نے اس دوزخ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے اپنے اور اپنی بچی پر بند کر دیا ہے سجاد! مگر نہیں۔ میری بچی کی زندگی کو آلودہ کرنے کے لیے وہ چند سال ہی کافی تھے۔ جو اس نے اس دوزخ میں گزارے تھے۔"

"مریم!" وہ یوں مریم کو پھٹ پڑنے والے انداز میں بولتا دیکھ کر وہ پریشان ہوا تھا۔

"تمہاری بیٹی سائیکی ہے ' کلیپٹومینک ہے ' پیرانوئڈ کس ہے وہ۔ اور اس سب کے ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری وجہ سے ثمن۔"

اس سے آگے مریم بات نہیں کر سکی تھی۔ فون کو غم اور غصے سے دور پھینکتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

اٹھارہ سال گزر جانے کے بعد بھی اسے محسوس ہوا تھا کہ جیسے وہ وہیں کھڑی تھی' جہاں سے چلی تھی۔

یوں جیسے کہ کسی دائرے کا سفر تھا۔ زندگی کو نئے سرے سے شروع کرنا تھا۔ اسے ثمن کو ٹھیک کرنا تھا۔ اس کا علاج کروانا تھا۔ سفر کو پھر سے شروع کرنا تھا۔

تین سال کی عمر میں اپنے کزن علی کی پاکٹ سے چاکلیٹ چرانے والی وہ بچی۔ جس نے محض تین سال کی عمر میں ہی یہ سیکھ لیا تھا کہ جو چیز ملتی نہیں' اسے چرایا جاسکتا ہے اور جب چوری کرنے پہ اس نے ماں سے تھپڑ کھایا تو اس نے ایک نیا سبق سیکھا تھا۔

"چوری کر کے ماں کو نہیں بتانا۔"

وہ ماحول جس میں ثمن رہ رہی تھی' اس کے اردگرد موجود بچوں کو سب کچھ میسر تھا۔ رشتوں سے لے کر چیزوں تک۔ سب کچھ۔

اور اس کے پاس کیا تھا؟

ثمن کی شخصیت میں سب سے بڑی دراڑ اس کے باپ کی پیدا کردہ تھی۔

یہ وہ شخص تھا جس نے ثمن کو سکھایا کہ چیزیں کیسے لوگوں سے چھپائی جاتی ہیں۔ مریم نہیں جانتی تھی مگر ثمن آج تین سال کی عمر سے ہی ایک ماہر چور بن چکی تھی۔

قصور ان لوگوں کا تھا جنہوں نے ثمن کو وہ ماحول دیا۔ جس نے اسے چور بنایا۔ ثمن نے کبھی بھی خود کو "غلط" نہیں سمجھا تھا۔ جن چیزوں سے اسے محروم کیا ۔ چھینا گیا وہ اب انہیں لیتا' چراتا یا پھر چھینتا۔ حق سمجھتی تھی۔ نفسیاتی مریضوں کا یہ ہی سب سے بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ اپنے علاوہ باقی سب کو غلط سمجھتے ہیں۔

اور پھر جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی۔ باپ کی عدم توجہ۔ عرصے بعد گھر آنا اور گھر آکر بھی اس کے مقابلے میں اس کے کزن (جو کہ لڑکے تھے) ان کو فوقیت دینا۔ یہ سب اس میں زہر بھرتا گیا۔

پھر کمرے میں بند ہو کر چند گھنٹوں کا پیار کسے یاد رہتا ہے اسے مردوں سے بھی نفرت ہوتی گئی اور اسی نفرت نے وہ رخ اختیار کر لیا کہ وہ عزت دار مرد کو بے عزت' کر کے چھوڑتی رہی۔ چاہے وہ زین ہو' علی ہو یا پھر شہ۔

داؤد یقیناً" اس کا اگلا شکار ہوتا مگر اس کی قسمت اچھی تھی۔

ثمن بہت ذہین تھی' بچپن سے ہی وہ جانتی تھی کہ چیزوں کو کیسے چھپایا جاتا ہے سو آج تک کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا تھا کہ وہ "کیا" تھی۔

اگر کسی کو معلوم ہو سکا تھا تو وہ عنایا تھی عنایا سکندر علوی۔

ایک کند ذہن ڈل اور لاپروا سی لڑکی۔

عنایا سکندر علوی' جو کبھی بھی کسی بھی گریڈ میں اے پس نہیں لے سکی تھی۔

✲ ✲ ✲

گاڑی سبک رفتاری سے چل رہی تھی۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور سڑکوں پہ گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس روشن ہونے لگی تھیں۔

اس نے ایک نظر ساتھ والی سیٹ پہ سوئی ہوئی لڑکی کو دیکھا اور بے اختیار مسکرایا۔ وہ بچپن سے ہی ایسی تھی معصوم اور لاپروا۔ وہ یقیناً" معصوم ہی تھی' ورنہ کوئی بھی لڑکی اپنے منگیتر کے ساتھ لانگ ڈرائیو پر کم از کم یوں سوتی ہوئی نہ پائی جاتی۔

مگر وہ عنایا سکندر تھی۔

اس کی فرنچ ٹیل سے بال نکل کر اس کے چہرے پر دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔ داؤد نے خواہش کی کہ کاش وہ ڈرائیو نہ کر رہا ہوتا تو اس کے چہرے سے بالوں کو ضرور ہٹاتا۔ سر جھٹک کر اس سے نظریں ہٹاتے ہوئے اس نے نظریں سڑک پر جمائیں۔

"میں داؤد مرتضیٰ۔ خاندان بھر کا سب سے ذہین' لائق اور فائق سمجھے جانے والا لڑکا۔ جو مشکل سے مشکل سوال چٹکیوں میں حل کر سکتا ہے۔

کیمسٹری کے بور ترین فارمولے حفظ کر سکتا ہے۔ فزکس کے لاز اسے بھولتے نہیں اور جس نے سی اے محض چھ سالوں میں کلیئر کر لیا تھا اور جو مشکل سے مشکل پہیلیوں کو بھی حل کر سکتا ہے۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ثمن کیا تھی۔ وہ یہ نہ جان سکا۔

اور میرے بائیں پہلو میں موجود لڑکی یہ کیا ہے؟

بچپن سے ہم تینوں دوست ہیں' میں بھی ثمن کے اتنا ہی نزدیک ہوں جتنا کہ عنایا مگر پھر بھی میں جان نہ سکا۔

سمجھ نہ سکا کہ وہ کیا کرتی رہی عنایا کے ساتھ۔

اور عنایا۔ کیا کچھ برداشت نہیں کیا اس نے۔

خزینہ آنٹی کی ڈانٹ۔ ثمن کی زیادتیاں۔ خاندان بھر کی ملامت اور پھر میرا رویہ۔

بے ساختہ اس نے برابر سوئی لڑکی کو ہمدردی سے دیکھا۔

"جو بھی ہے عنایا! تم ہی میری حق دار تھیں۔ تم نے اگر مجھ سے محبت کی تھی تو تمہیں "میں" ہی ملنا چاہیے تھا۔ اور اگر میں وہ ڈائری نہ پڑھتا تو۔" بے ساختہ داؤد نے جھرجھری لی تھی۔

✲ ✲ ✲

اور اگر داؤد وہ ڈائری نہیں پڑھتا تو نہ جانے کیا

ہوجاتا۔۔۔ مگر داؤد وہ ڈائری کیسے نہ پڑھتا۔۔۔ میں نے وہ ڈائری لکھی ہی اسی لیے تھی کہ داؤد۔۔۔ وہ ڈائری پڑھتا۔

میں عنایا سکندر۔۔۔ جو بچپن سے لے کر آج تک کسی ایک کام کو صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکی تھی۔ جسے بے وقوف' کند ذہن اور کم عقل سمجھا جاتا تھا۔ جب بات اس کے سروائیول کی آئی تو وہ ہر وہ کھیل کھیل گئی جو عام حالت میں کبھی۔۔۔ کھیل تو کیا سوچ بھی نہ پاتی۔

ہاں! یہ میں ہوں عنایا سکندر علوی اور یہ کسی ڈائری کے الفاظ نہیں۔ میں خود آپ سے مخاطب ہوں۔ چند باتیں ایسی ہیں' جو مجھے آپ کو بتانی ہیں صرف اور صرف آپ کو۔

بچپن سے لے کر آج تک میں ثمن کی زیادتیوں کا شکار ہوتی رہی۔ اس کے پاگل پن کا شکار رہی۔ وہ جب علوی ہاؤس میں آئی تھی تو میں نے اسے اور اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی ناپسند کیا تھا' مگر ہم دونوں میں فرق تھا کہ اسے اپنے جذبات چھپانے آتے تھے' مجھے نہیں۔۔۔ میں شروع ہی سے ہی ایسی بچی تھی' جو ہر بات کا رد عمل فوراً" اور بغیر سوچے سمجھے دیا کرتی تھی۔ ثمن کو اگر میں نے دھکا دیا تھا تو وہ محض ایک "ری ایکشن" تھا جو کوئی بھی ایسا عام بچہ کرتا' جو داؤد سے قریب ہوتی۔ مگر ثمن۔۔۔ اس نے میری طرف دوستی کا ہاتھ بدلہ لینے کے لیے بڑھایا تھا اور یہ اس کے چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کا سرد سا تاثر تھا' جس نے مجھے خوف زدہ کیا تھا اور میں جواباً" "فرینڈز" کہہ کر اس سے ہاتھ نہیں ملا سکی تھی۔

وہ ثمن ہی تھی جو آج تک میری مختلف چیزیں چرایا کرتی تھی اور اس کی میتھ کی کاپی چرانا۔ یہ میرا رد عمل تھا اس بات کا جب اس نے میری کاپی چرا کر چھپائی تھی۔ میں بھی اس کی ویسی ہی انسلٹ کروانا چاہتی تھی جیسی میری کلاس میں ہوئی تھی۔

اور جہاں تک تعلق تھا کیٹ کا۔ میں نے واقعی اسے نہیں مارا تھا۔ اسے ثمن نے ہی مارا تھا۔

اسے زہر دیا گیا تھا۔ کیا یہ ثمن کے لیے مشکل تھا؟ میں نے جب کیٹ کو لان میں لیٹے دیکھا تو اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا اور پاس ہی اس کے دودھ کا برتن موجود تھا۔ مجھے سمجھنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

کیٹ کو تکلیف سے بچانے کے لیے اس اذیت سے نکالنے کے لیے۔ میں نے اس کا گلا دبا دیا تھا۔ میں نہیں سوچ سکتی تھی کہ میرے اس فعل سے کیا ہونے والا تھا۔ مگر ثمن تو سوچ سکتی تھی۔ ذہین تھی نا وہ' اس نے سب کچھ پلان کر رکھا تھا۔ جیسے ہی اسے محسوس ہوا کہ اب کیٹ مر چکی ہے وہ درخت کے پیچھے سے چیختی ہوئی آئی اور۔۔۔ آگے آپ جانتے ہیں۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ نیلی ڈائری تو ثمن کی تھی تو پھر اس کو لکھنے والی عنایا کیسے ہو گئی؟

میں نے جب ثمن کے لیے برتھ ڈے گفٹ خریدا تھا تو میں نے ڈائری نہیں ڈائریاں خریدی تھیں۔ دو ایک جیسی ڈائریاں۔

داؤد میرے ساتھ تھا مگر میں نے اس سے یہ چھپایا تھا۔ میں جانتی تھی کہ ثمن کبھی بھی ڈائری نہیں لکھے گی۔ داؤد نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ واقعی اس ٹائپ کی نہیں تھی۔ مگر مجھے داؤد کو یہ ہی تاثر دینا تھا کہ یہ ڈائری ثمن کی ہے اور میں اس میں کامیاب رہی تھی۔

میں نے اراداتاً" ڈائری لکھی تھی اور اسی لیے لکھی تھی کہ وہ داؤد تک پہنچے۔ میرے پاس کوئی اور طریقہ نہیں تھا جس سے میں داؤد کو سب کچھ بتا پاتی۔ اگر میں اسے سامنے بٹھا کر یہ باتیں بتاتی تو وہ کبھی یقین نہ کرتا کیونکہ سب ہی جانتے تھے کہ میں احساس کمتری کا شکار تھی۔

اور جب میں نے یہ ڈائری مکمل کی تو میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ میں اسے داؤد تک کیسے پہنچاؤں مگر اس دن جب سب۔۔۔

ایک منٹ۔۔۔ میں اس سے پہلے آپ کو ایک اور بات بتانا چاہتی ہوں۔

داؤد کا پورشن تینوں پورشنز کے درمیان تھا۔ ہمارا دائیں طرف کا جبکہ ثمن' مریم پھپھو اور گرینڈ پا کا پورشن بائیں طرف کا تھا۔

اور جب داؤد دائیں طرف کا ٹیرس پھلانگ کر آیا تو میں بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ مجھ سے ملنے آیا ہے۔ اس وقت میں ڈائری ہی لکھ رہی تھی۔

اچانک میرے ذہن نے کام کیا تھا۔ میں ڈائری کو کھول کر خود چھپ گئی تھی۔

داؤد کو یہی لگا کہ میں کمرے میں موجود نہیں اور میری توقع کے عین مطابق وہ ڈائری کو دیکھ کر چونکا تھا اور پھر یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس نے ڈائری اٹھا بھی لی تھی۔

مگر مجھے معلوم ہے جب اس نے ڈائری اٹھائی ہوگی تو وہ اسے ثمن کی ڈائری سمجھا ہوگا اور چونکا بھی اسی بات پہ ہوگا کہ ثمن کی ڈائری میرے کمرے میں؟

اور میں اسے اسی طرح چونکانا چاہتی تھی کہ وہ یہ ہی سمجھے کہ وہ ڈائری ثمن کی ہے۔ اگر وہ جانتا کہ وہ ڈائری میری ہے تو وہ کبھی اسے وہاں سے نہیں اٹھاتا اور کبھی بھی پڑھنے میں انٹرسٹڈ نہ ہوتا کیونکہ میں تو تھی عام سی' ڈل سی لڑکی۔ میری ڈائری میں پڑھنے لائق کیا ہو سکتا تھا۔ ہاں البتہ ثمن کی ڈائری پڑھنے کے قابل ہوتی اور میں اسی مقصد کے لیے اسی کے ساتھ گفٹ لینے گئی تھی۔

میں جانتی ہوں' جب اس نے ڈائری کھولی ہوگی تو فوراً" میری ہینڈ رائٹنگ پہچان گیا ہوگا اور اسے اس طرح جھٹکا لگا ہوگا جیسے الیکٹرک شاک سے لگتا ہے۔

میں اسے حیران ہی تو کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ تب ہی وہ یہ ڈائری پڑھ سکتا تھا۔ یہ میری زندگی کا پہلا اور آخری "داؤ" تھا۔

داؤد! مجھے مل چکا ہے اور اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں کہ اسے یہ بتاؤں کہ یہ سب کچھ دراصل میرا پلان کیا ہوا تھا۔ وہ ڈائری کا رکھنا "اتفاق" سمجھ رہا ہے اور میں چاہتی ہوں' وہ ایسا ہی سمجھتا رہے۔

کیونکہ۔۔۔ زندگی میں کبھی کبھی آپ کو صحیح کام کے لیے تھوڑا سا غلط ہونا پڑتا ہے۔ کوئی نہ کوئی داؤ کھیلنا پڑتا ہے اور جب جنگ ہو سروائیول (بقا) کی تو انسان کی عقل خود بخود کام کرنا شروع کر دیتی ہے اور وہ بقا کے راستے ڈھونڈ لیتا ہے۔"

یہ کہانی تھی ایک کند ذہن بچی کی جو کہ کبھی بھی اے پلس نہیں لے سکی مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ زندگی میں کچھ نہیں کر سکتی۔ عنایا کے گرینڈ پا نے ٹھیک کہا تھا کہ "اللہ جب کچھ لیتا ہے تو بدلے میں دوسری چیزیں اس سے بڑھ کر دیتا ہے" سو عنایا کو بھی کچھ ملا تھا کیا۔۔۔؟ یہ آپ خود فیصلہ کریں۔

کہانی ختم ہوئی۔ مگر نہیں۔۔۔ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔۔۔ یہ تو چلتی رہتی ہے جب تک زندگی چلتی ہے اور زندگی ہے کیا؟

عنایا کے لیے داؤد۔۔۔ داؤد کے لیے اس کے اپنے' مریم کے لیے ثمن۔۔۔ اور ثمن کے لیے۔۔۔ اس کی وہ دنیا جہاں وہ حکمران بن کر باقی سب سے غلاموں جیسا سلوک کرتی تھی۔

اور میرے لیے۔

زندگی کسی سیدھی سڑک کا نام نہیں' جہاں کبھی کبھار کوئی موڑ آ جایا کرتا ہے۔۔۔ زندگی بار بار گرنے۔۔۔ گر کر سنبھلنے اور سنبھل کر اٹھ جانے کا نام ہے۔"

"کیا نہیں ہے۔۔۔؟"

عفت سحر طاہر

جسے مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز، زارا اور ایزد۔ صالحہ، امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہے۔ صالحہ مر چکی ہے۔ ابیہا اس کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ، ابیہا کو امتیاز احمد کے سپرد کر جاتی ہے۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد، ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کر کے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب، معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

رباب، ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ زارا کے اصرار پر معیز احمد مجبوراً رباب کو کالج پک کرنے آتا ہے تو ابیہا دیکھ لیتی ہے۔ وہ سخت غصے میں امتیاز احمد کو فون کر کے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے۔ اتفاق سے وہ فون معیز احمد اٹینڈ کر لیتا ہے۔ ابیہا اپنی اس حرکت پر سخت پشیمان ہوتی ہے۔ معیز رباب میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔

صالحہ ایک شوخ الھڑ سی لڑکی ہے۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند ہے مگر اس کے گھر کا ماحول روایتی ہے۔ اس کی دادی اور تائی کو اس کا امتیاز احمد سے بے تکلف ہونا پسند نہیں ہے۔ امتیاز احمد بھی اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر وہ ان کی مصلحت پسندی اور نرم طبیعت کو بزدلی سمجھتی ہے۔ نتیجتاً وہ امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی سے ہوتی ہے۔ مراد صدیقی اسے اپنے آئیڈیل کے قریب محسوس ہوتا ہے۔ وہ اس کی طرف مائل ہونے لگتی ہے۔ صالحہ کی ضد پر شازیہ اس کی ماں

سے مراد کا ذکر کرتی ہے۔ وہ غصے میں صالحہ کو تھپڑ مار دیتی ہیں۔
امتیاز احمد اپنے فلیٹ پر ایبہا کو بلواتے ہیں مگر ایبہا وہاں معیز احمد کو دیکھ کو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ معیز نے ایبہا کو صرف از خود طلاق کا مطالبہ کرنے پر مجبور کرنے کے لیے وہاں بلایا ہوتا ہے۔ اس کا ارادہ قطعاً "غلط نہ تھا مگر بات پوری ہونے سے قبل ہی امتیاز احمد ڈرائیور کی اطلاع پر وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ معیز بہت شرمندہ ہوتا ہے۔
امتیاز احمد' ایبہا کو لے کر وہاں سے چلے جاتے ہیں۔
ایبہا کالج میں رباب اور اس کی سہیلیوں کی باتیں سن لیتی ہے' جو محض تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے "ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرتی ہیں۔ عموماً "یہ ٹارگٹ رباب کو اس کی خوب صورتی کی وجہ سے دیا جاتا ہے' جسے وہ بڑی کامیابی سے جیت لیا کرتی ہے۔
صالحہ کی ہٹ دھرمی سے گھبرا کر اس کے والدین امتیاز احمد سے اس کی تاریخ طے کر دیتے ہیں۔ مگر وہ امتیاز احمد کو مراد کے بارے میں بتا کر ان سے شادی کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ امتیاز احمد' دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کرکے صالحہ کا راستہ صاف کر دیتے ہیں مگر شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھانے لگتا ہے۔
ایبہا' معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرا کر زخمی ہو جاتی ہے۔
مراد صدیقی جواری ہوتا ہے۔ وہ صالحہ کا بھی سودا کر لیتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ایبہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے' مگر پھر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے پولیس مراد کو پکڑ کرلے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کرنے لگتی ہے۔ فیکٹری میں ساتھ کام کرنے والی ایک سہیلی کسی دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے۔ جو امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ صالحہ کی سہیلی اسے امتیاز احمد کا کارڈ دیتی ہے جسے صالحہ محفوظ کر لیتی۔ ایبہا میٹرک میں ہوتی ہے جب مراد رہا ہو کر واپس آجاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ایبہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً "آجاتے ہیں اور ایبہا سے نکاح کرکے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ اس دوران معیز بھی ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ امتیاز احمد' ایبہا کو کالج میں داخلہ دلوا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ صالحہ مر جاتی ہے۔
معیز احمد' ایبہا کا اسپتال لے کر جاتا ہے مگر وہاں پہنچ کر عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایبہا اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ ایبہا کا پرس ایکسیڈنٹ کے دوران کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے' نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ امتیاز احمد دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ایبہا کو ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر بحالت مجبوری حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔
وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں' زور زبردستی کرکے ایبہا کو اپنے راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ایبہا روتی پیٹتی ہے' مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔
امتیاز احمد' معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ایبہا کو گھر لے آو۔ وہ متذبذب ہو جاتا ہے۔ سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد انتقال کر جاتے ہیں۔ مرنے سے قبل وہ ایبہا کے نام پچاس لاکھ روپے' گھر میں حصہ اور دس ہزار ماہانہ کر جاتے ہیں۔ جس سے سفینہ اور ناراض ہو جاتی ہیں۔ معیز' ایبہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے' مگر وہ اسے نہیں مل پاتی۔ ایبہا کا موبائل بھی حنا کے گھر میں گم ہو جاتا ہے۔ معیز باتوں باتوں میں رباب سے اس کے بارے میں پوچھتا ہے' وہ اس کی رہائش سے لاعلمی کا اظہار کرتی ہے' مگر حسد میں غیر ارادی طور پر اس کی تعریف کر جاتی ہے۔
عون خاندان والوں کے بیچ ثانیہ سے معافی مانگنے کا اعلان کرتا ہے۔ ثانیہ سخت جز بز ہوتی ہے۔

ساتویں قسط

ایبہا کا رونا اس کے بعد ہسٹریائی انداز میں چیخنا چلّانا اور چلاتے ہی جانا۔
اس سب پر حواس باختہ تو "اپنے" ہوتے ہیں۔ ماما تو گھاگ شکاری تھیں' بیٹھی سگریٹ کے کش لگاتی رہیں۔ رو رو کے اس نے آنکھیں سُجالیں۔ چیخ چیخ کر گلا بیٹھ گیا۔ وہ ہار کر تھک گئی تو ماما نے گھر میں پارلر والی بلوالی۔ پانچ گھنٹوں کی محنت کے بعد اس کا فیشل ہو گیا۔ بالوں کی کٹنگ مینی کیور پیڈی کیور ہوا تو ساتھ ہی زندگی میں پہلی بار اس کی بھنووں کو دھاگے نے چھوا۔ اب تو صورت حال یہ تھی کہ وہ ذرا بھی آواز نکالتی تو ماما غرّا اٹھتیں۔
اور ایبہا تو اپنے خوب صورت بالوں کو زمین پہ بکھرا دیکھ کر ہی گونگی ہو گئی تھی۔
درحقیقت اس میں اب مزید احتجاج کی ہمت بھی نہ رہی تھی۔ جو کچھ انہوں نے کرنا تھا وہ تو ہو کر ہی رہا۔
"اب بتائیں میم۔" بیوٹیشن فاتحانہ انداز میں اسے ماما کے سامنے کرتے ہوئے پوچھنے لگی جیسے وہ اسی کی "پروڈکشن" ہو۔
ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "ویری گڈ۔"
وہ سب یقیناً "ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے تھے۔
"احسان مانو میرا۔ یہ رانی شکل لے کر باہر جاتیں تو کوئی بھیک بھی نہ دیتا۔" ماما نے اسے قد آدم دیوار گیر شیشے کے سامنے دھکیلتے ہوئے حقارت سے کہا۔
وہ خود ترسی کا شکار' خوف زدہ سی آئینے میں نظر آتے اجنبی سے عکس کو دیکھ کر منہ پہ ہاتھ رکھ کے بمشکل چیخ روک پائی۔
"یہ جلوہ اور قاتل ادائیں لے کے کسی سیٹ پہ بیٹھو گی تو دیکھنا کیسے تمہارے قدموں میں نوٹوں کے ڈھیر لگتے ہیں۔" ماما کی آواز پگھلے سیسے کی طرح اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔
"پلیز۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ پلیز مجھے جانے دیں یہاں سے۔" وہ دفعتاً "ان کے آگے ہاتھ جوڑتی بلک اٹھی۔
"ہنہ۔" انہوں نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔ "کہاں جاؤ گی؟ یہاں سے باہر جاتے ہی شکار ہو جاؤ گی۔ کوئی سونگھ کے' مسل کے کوڑے کے ڈھیر پہ پھینک دے گا۔ پھر ہاتھ جوڑنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔" وہ بولتی نہیں زہر اگلتی تھیں۔
ایبہا کے قریب آئیں تو وہ سہم سی گئی۔ گدی سے اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر انہوں نے اس کا چہرا اپنے قریب کیا۔
"میرے لیے کام کرو گی تو تمہاری مرضی کے بغیر تمہاری عزّت نہیں بیچوں گی۔ مگر اپنی مسکراہٹ اور ادائیں ضرور بیچنی پڑیں گی تمہیں۔" وہ اس کے کان میں کہہ رہی تھیں۔ عجیب سرسراتا ہوا سا لہجہ۔
ایبہا کے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔ گھگھی بندھ گئی۔
"پلیز۔ پلیز۔" انہوں نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا تو تکلیف کی شدت سے ایبہا کی چیخ نکل گئی۔
"بس۔ اس کے آگے ایک بھی پلیز نہیں۔ دو ہی آپشن ہیں تمہارے پاس۔ یا تو اداؤں کا سودا کر لو یا پھر آج رات ہی پارٹی بلوا کے تمہارا سودا کرتی ہوں۔" وہ بے حد سفاک تھیں اور جابر بھی۔
ایبہا کی ساری ہمت جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ اچھی طرح جان گئی تھی کہ اب زندگی کس کے زیر نگیں گزرنے والی تھی۔ اس کی وارڈروب میں نت نئے ڈریسز آگئے۔ اسے پبلک ڈیلنگ کے اسرار و رموز ماما نے سکھائے۔ جنہیں سن کر وہ گھبرا گئی۔ مگر یہ بہرحال طے تھا کہ وہ اس دلدل میں اترنے والی تھی۔
اسی شام حنا بھی لوٹ آئی۔ بہت فریش' اڑتی پھرتی تتلی کی طرح۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر لائٹ جلائی تو

آنکھوں سے بازو رکھے لیٹی ایبہا چونک کر دیکھنے لگی۔
حنا نے اس کا یکسر بدلا حلیہ دیکھ کر سیٹی بجائی تو وہ بجلی کی سی تیزی سے بستر سے اتر کر اس کی طرف آئی۔
"حنا... حنا... مجھے بچالو پلیز... مجھے یہاں سے جانا ہے۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔" اسے جیسے امید کی آخری کرن دکھائی دے گئی۔ وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اسے یقین تھا وہ ضرور اسے اس دلدل میں دھنسنے سے بچائے گی۔
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اور آواز میں التجا بلکہ رحم کی بھیک تھی۔ حنا نے لحہ بھر کو آنکھیں بند کرکے گہری سانس بھری۔ پھر اسے دیکھ کر تلخی سے بولی۔
"انسان بھی نا بہت ناشکرا ہے۔ جتنا ملتا جائے اتنا ہی حریص ہوتا جاتا ہے۔ یہ مل گیا تو وہ کیوں نہ ملا... یہ ملا وہ ملتا تو اچھا تھا۔"
اس کے طنز و تلخی سے بھرپور انداز پر ایبہا بھیک کر رو دی۔
"میں نے تو کبھی کچھ نہیں مانگا۔ اپنی استطاعت سے بڑھ کے حرص نہیں کی۔ مجھے بس اس گندگی سے بچالو حنا!"
"بچا کے ہی تو لائی ہوں یہاں۔ ورنہ تم ہو کون؟" حنا نے گہرے طنز سے کہتے ہوئے اسے گھورا۔
"اماں ابا تک تو جانتی نہیں ہوا پتا۔ گھر والے ہاسٹل میں ڈال کے بھولے ہوئے تھے۔ ابھی بھی میں ساتھ نہ لاتی تو لوٹ کا مال سمجھ کے کوئی لے گیا ہوتا تمہیں۔" حنا کی زبان کے جوہر اس پر اب کھلے تھے۔
"تم نے بھی تو وہی کیا ہے۔ اگر کوئی غیر کرتا تو اتنا گہرا دکھ نہ پہنچتا مجھے۔ تم تو میری بہت اچھی دوست ہو حنا!" ایبہا دکھ کی انتہا پر تھی۔
"دیکھو۔ نی زمانہ سب غرض کے رشتے ہیں۔ یہ دوستی وغیرہ اب صرف قصے کہانیوں میں ہے اور دوسری بات یہ کہ میں تمہیں اغوا کرکے یا زبردستی یہاں لے کر نہیں آئی۔" حنا نے نخوت سے کہا۔
"مگر میں اب یہاں نہیں رہنا چاہتی حنا!" وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔
"میں نے تمہیں اول روز ہی باور کرا دیا تھا کہ اس گھر میں آدمی آتا تو اپنی مرضی سے ہے، مگر جانے کی پرمیشن صرف اور صرف میم ہی دے سکتی ہیں۔" یہ حنا کی دیدہ دلیری تھی۔ وہ اس کے سامنے اب ماما کو میم کہہ رہی تھی۔
"میں یہ سب نہیں کر سکتی حنا! تم جانتی ہو مجھے۔" وہ گھگھیا کر بولی۔ وہ معافی کی ہر حد تک جا سکتی تھی۔ اگر حنا اسے میم کے چنگل سے نجات دلا دیتی۔
"صرف پہلا قدم اٹھاتے خوف آتا ہے پھر تو فل انجوائے منٹ ہے۔ تم نے دیکھا نہیں چھوٹا بچہ بھی صرف پہلا قدم اٹھانے سے ہی ڈرتا ہے۔ اس کے بعد بخوشی دوڑتا ہے۔ تم بھی یہ کڑوا گھونٹ پی لو۔ اس کے بعد سارے میٹھے گھونٹ بھی تمہارے ہی ہیں۔"
وہ بے حد اطمینان سے اسے مشورہ دے رہی تھی۔ پھر اسے گویا اس کی خوش قسمتی کا احساس دلاتے ہوئے بولی۔
"اور تم تو لکی ہو کہ صرف آفس سیکریٹری بن کے ادائیں دکھانے کی جاب ملی ہے۔ مجھے جب میری سوتیلی ماں میم کے پاس "جاب" کے لیے چھوڑ کے گئی تھی تو میری انا اور خودداری کو آتے ہی میم نے اپنے ڈرائیور کے آگے ڈال دیا... سوچ سکتی ہو تم؟ جب تک میرے اندر سے سیلف ریسپکٹ ختم نہیں ہو گئی۔ مجھے اس بھوکے کتے کے سامنے ہڈی کی طرح ڈالے رکھا۔" وہ چیونگم کا ریپر اتارتے ہوئے بہت سکون سے اپنی آپ بیتی سنا رہی تھی۔
ایبہا کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اور اب... اب میں تمہارے سامنے ہوں۔ ایک پالش شدہ نئی نکور حنا۔ وہ ڈرائیور بھی ہاتھ باندھے میڈم میڈم کرتا پھرتا ہے اب۔"
اس کی خوش فہمی کے عجیب ہی انداز تھے۔ ایبہا کو کراہیت آئی۔ وہ بے اختیار حنا سے دو قدم دور ہٹ گئی۔
"اور وہ تمہارے پچا...؟" جانتے ہوئے بھی ایبہا نے ہکلا کر پوچھ ہی لیا۔
"ہنہ... چچا..." حنا کے منہ سے اس نے پہلی بار گندی گالی سنی تھی۔
"یتیم لڑکی بن کے پہلی بار اس کتے سے مدد مانگی تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ حرام کی کمائی نہیں محنت کا پیسہ ہے۔ ایسے ہی غریبوں یتیموں پہ نہیں لٹا سکتا۔ پھر جب اپنی چمڑی دکھائی تو اس نے دمڑی نکالنے میں ایک منٹ نہیں لگایا۔ یہ دنیا نیکوں کے لیے ہے ہی نہیں میری جان! اور تم تو ویسے بھی بے وقوف ہو۔ اس روز میں نے آفر بھی کی تھی۔ ایک دو گھنٹے اس کمینے چچا پر لگاتیں تو پرس بھر کے لوٹاتا تمہیں۔ آرام سے اگزیمز دیتیں اور ساتھ یہ پارٹ ٹائم بھی جاری رہتا۔" حنا کی گراوٹ کی کوئی حد نہ تھی۔
ایبہا کی رنگت تو یہ سب ماورائے انسانیت گفتگو سن کر سفید پڑ گئی۔ مانو خون کا ایک قطرہ نہ ہو جسم میں۔ وہ پیچھے ہٹ کے بستر پر ٹک گئی۔ تھوڑی دیر اور کھڑی رہتی تو شاید گر ہی جاتی۔
"چلو۔ کہیں آؤٹنگ پہ چلتے ہیں۔ تمہارا موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا اور فریش ایر میں کچھ بہتر سوچ بھی سکو گی۔"
"تم یہاں سے دفع ہو جاؤ حنا! میری پہلی اور آخری خواہش یہی ہے کہ تم مجھے دکھائی نہ دو۔" ایبہا نے نفرت سے اسے دیکھا۔ غلاظت میں لتھڑی نظر آتی تھی وہ۔ گندے رشتوں کو باپ، بھائی اور چچا کے پردوں میں چھپا کر کاروبار کرنے والی۔
اسے خیال آیا۔ تب ہی سیفی اس کے بھائی کہنے پر تلملایا کرتا تھا۔ مگر حنا کا دل کبھی اس گناہ سے نہ لرزا تھا۔
"اوکے بیسٹ آف لک۔ ویسے بھی یہ جگہ دوستیاں نبھانے کے لیے نہیں ہے اور میری جو ڈیوٹی تھی۔ وہ تو میں پوری کر چکی۔" وہ شانے اچکا کر اطمینان سے کہتی چلی گئی تو خود کو پوری طرح بے بس محسوس کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کیا کر رہے ہو...؟" رباب کی فریش سی آواز بھی اسے فریش نہیں کر پائی۔ آج وہ صحیح معنوں میں امتیاز احمد کی سیٹ پر آکر بیٹھا تو بے حد ڈسٹرب تھا۔ وہ اپنے باپ کی سیٹ پر بیٹھنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔ مگر اس کمرے سے اٹھتی باپ کی مہک اور ان کی یادوں نے اسے مجبور کیا کہ وہ یہیں بیٹھے۔ ورنہ اس کا اپنا آفس بھی موجود تھا۔ وہ مودی صاحب کے ساتھ سر کھپا رہا تھا، جو اس کی غیر موجودگی اور امتیاز احمد کی ناگہانی موت کے باعث فیکٹری کا کام سنبھال رہے تھے۔ اس عرصے میں معیز کی عدم دلچسپی کے باعث کئی کنٹریکٹ منسوخ کرنے پڑے تھے جس کی وجہ سے کافی نقصان بھی ہوا تھا۔ مودی صاحب نہ صرف منیجر کی پوسٹ پر تھے بلکہ امتیاز احمد کے دوست بھی تھے۔ اس لیے معیز کے دل میں ان کے لیے احترام تھا تو وہ بھی اسے اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتے تھے اور بزنس کے اسرار و رموز سمجھاتے تھے۔ ایسے میں رباب کا فون آنا... وہ سچ مچ ڈسٹرب ہوا تھا۔
"اچھا۔ ایسا ہے کہ میں تھوڑا بزی ہوں۔ تم بعد میں کال کرنا، بلکہ میں فارغ ہو کے خود ہی کرلوں گا۔"
معیز کا ذہن مودی صاحب کے مشوروں میں الجھا ہوا تھا۔ رباب کو اس نے عجلت میں جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی اوکے، خدا حافظ کہہ کر وہ دوبارہ مودی صاحب کی طرف متوجہ ہوا تھا۔
رباب نے بے اعتباری سے اپنے سیل فون کو دیکھا۔ اسے اپنی شدید ہتک محسوس ہوئی۔

ایسے تو اسے زندگی میں کبھی کسی نے نہ ٹرخایا تھا۔ وہی ہر ایک کو جوتے کی نوک پر رکھا کرتی تھی۔ وہ لب کچلنے لگی۔

اسے دھیان آیا۔ معیز وہ پہلا لڑکا تھا جس کی طرف وہ خود بڑھی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے تو وہ انہی کے دلوں سے کھیلی تھی جن کی نظروں میں اپنے لیے ستائش دیکھی تھی۔ وہ ابھی معیز کی طبیعت صاف کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دوبارہ کال ملائی مگر اب کی بار معیز نے اس کی کال اٹینڈ کرنے کی بھی زحمت نہ کی تھی۔

مارے غصے کے رباب کے ہاتھ کانپنے لگے۔

اور ایسا غیض و غضب کے عالم میں اس کے ساتھ ہمیشہ ہی ہوتا تھا۔ اس نے معیز کو گالی دیتے ہوئے موبائل ایک طرف اچھال دیا۔

"دیکھ لوں گی معیز احمد تمہیں بھی۔ اپنے جوتوں کی خاک چٹاؤں گی تمہیں اور پھر ایک زوردار ٹھوکر تمہارا مقدر ہوگی۔" اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

اسی وقت دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکی اور جلدی سے گہری سانس بھر کے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

"رباب۔ اگر بزی نہیں ہو تو۔" ماما تھیں۔ مگر ان کی بات آدھی منہ میں ہی رہ گئی۔ اندر آتے ان کا پاؤں کسی چیز پر پڑا اور کچھ چٹخنے کی سی آواز آئی تو وہ بے اختیار بات ادھوری چھوڑ کر اپنے پاؤں کے نیچے دیکھنے لگیں۔

"اوہ نو۔ یہ تو تمہارا موبائل فون ہے رباب۔" انہوں نے تاسف سے کہتے ہوئے اسے دیکھا تو اس کے تنے ہوئے تاثرات دیکھ کر بے اختیار اس کے نزدیک آئیں اور اس کے چہرے کو انگلیوں سے چھوا۔

"کیا ہوا ہے رباب! کسی فرینڈ سے جھگڑا تو نہیں ہو گیا؟"

"آپ بتائیں۔ کیا کہنے آئی تھیں؟"

اس نے ان کے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے عام سے انداز میں پوچھا تو ماما نے ایک بار پھر تیس ہزار کے کچرا بنے موبائل کو ایک نظر دیکھا۔ وہ جانتی تھیں کہ اب وہ لاکھ سر پٹختیں رباب انہیں اپنے معاملے کا ایک لفظ بھی نہ بتانے والی تھی۔

"ہاں۔ میں پوچھ رہی تھی اگر فری ہو تو ذرا میرے ساتھ مارکیٹ تک چلو۔ موسم بدل رہا ہے کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔"

انہوں نے بھی ہمیشہ کی طرح صرفِ نظر ہی کیا۔ وہ جانتی تھیں شدید غصے میں رباب انتہائی نقصان ہی کرتی تھی۔

"نہیں مام! میرا بالکل بھی موڈ نہیں ہے شاپس کھنگالنے کا۔ آپ زری کو لے جائیں۔"

اس کا انکار صفاچٹ تھا۔ ساتھ ہی اس نے انہیں فل ٹائم ملازمہ زری کو لے جانے کا مشورہ دے دیا۔

"کم آن جان! تم ساتھ چلو۔ موڈ فریش ہو جائے گا۔ مجھے پتا ہے تم غصے میں ہو۔ اور میرے جانے کے بعد اکیلے مزید کڑھو گی۔"

انہوں نے پیار سے کہا تو رباب نے سر جھٹکا اور ان کی بات کا جواب دیے بغیر بستر پر پڑا ریموٹ اٹھا کر دیوار گیر ایل سی ڈی آن کر لیا اور خود تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

یعنی یہ اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتی ہیں۔

انہوں نے تاسف سے اپنی لاڈلی اور خود سر بیٹی کو دیکھا۔ اکلوتی بیٹی ہونے کے ناتے انہوں نے تو اسے پیار دیا ہی تھا۔ مگر اس کے باپ کے بے جا لاڈ نے اسے انتہا درجے کا خود سر بھی بنا دیا تھا اور بھائی بھی ہر ضد پوری کرنے کو تیار۔

وہ گہری سانس بھرتی باہر نکل گئیں۔ رباب ایک ٹک اسکرین کو دیکھ رہی تھی، مگر اس کا دماغ کہیں اور ہی اڑانیں بھر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عون نے اسے اپنی طرف کھینچا تو وہ اس ناگہانی آفت پر ششدر رہ گئی اور ابھی سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ دروازہ کھٹکھٹایا جانے لگا۔

"شش۔۔۔" عون نے بے اختیار اس کے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے خاموش رہنے کو کہا تو وہ جو اس ساری افتاد پر ابھی تک حواس باختہ سی کھڑی تھی کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

"عون۔۔۔" باہر سے ماموں جان کی آواز پر ثانیہ کو مزید جھٹکا لگا۔ اسے یکبارگی احساس ہوا کہ وہ کیا سنگین غلطی کر بیٹھی ہے۔

"سو گئے ہو کیا۔۔۔ فائل لانے کو کہا تھا تم سے۔" وہ اونچی آواز میں پوچھ رہے تھے۔ عون نے ہاتھ میں تھامی فائل ثانیہ کے سامنے لہرا کر گویا سارا معاملہ بتایا۔

"یہی لے کر جا رہا تھا کہ تمہارا نزول ہو گیا۔" سرگوشی میں کہا تو ثانیہ نے دانت پیس کر دھیمی آواز میں کہا۔

"دروازہ کھولو۔"

"کھول دیتا ہوں۔ مگر پھر باہر والوں کو تم ہی صفائیاں پیش کرنا کہ آدھی رات کو میرے کمرے میں کیا کر رہی تھیں۔ اوپر سے دروازہ بھی لاکڈ۔۔۔" شرارت سے کہہ کر بڑی فرماں برداری سے دروازے کی طرف بڑھا جیسے ابھی کے ابھی لاک کھولنے کا ارادہ ہو۔

ثانیہ نے گڑبڑا کر اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک دیا۔ عون کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تو جھنجلا کر ثانیہ نے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

ماموں جان کے دور جاتے قدموں کی آواز آئی تو ثانیہ نے گہری سانس بھر کے فوراً" دروازے کی طرف پیش قدمی کی، مگر عون فی الفور اس کی راہ میں ایستادہ ہو گیا۔

"اس بدتمیزی کا مطلب۔۔۔؟" وہ تلملائی مگر عون بڑے موڈ میں تھا۔

"اور اب میں تمہاری اس ادا کو کیا سمجھوں۔۔۔؟"

"میں صرف تمہارے معافی والے ڈرامے کا پوچھنے آئی تھی اور بس۔" وہ تلخ تھی۔ خالص چاکلیٹ کی طرح کڑوی۔ جبکہ اسے اپنے کمرے میں یوں تنہا اپنے مقابل پا کر عون میاں یونہی شوخ ہوئے جا رہے تھے۔

"تو کیا اب ساری عمر معاف نہیں کرو گی؟" بڑے لاڈ سے پوچھا۔ نظر بڑی فرصت سے اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ مجھے یوں فضول مردوں کی طرح گھورو مت۔۔۔" اس نے عون کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کرتے ہوئے جھنجلا کر انگشت شہادت اٹھا کر کہا تو وہ ہنسنے لگا۔

"اسٹوپڈ! بیوی ہو تم میری۔۔۔" مگر ثانیہ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی نہ آئی تھی اور نہ چہرے پر کوئی انسانوی لالی پھیلی۔ اس کے برعکس اس نے خشک انداز میں عون کی تصحیح کی۔

"بیوی نہیں۔ منکوحہ۔"

"مائنڈ یو بی بی عالمہ فاضلہ! ایک نامحرم لڑکی سے بیوی بننے کے درمیان نکاح ہی کا رشتہ ہوتا ہے جو الحمدللہ ہمارے درمیان موجود ہے۔"

عون کا لہجہ ہلکا پھلکا تھا۔ ثانیہ نے بمشکل خود کو ٹھنڈا رکھا۔ ورنہ جواب تو بہت اعلا تھے اس کے پاس۔

"دیکھو یہ ڈرامے بازی چھوڑ دو۔ تم سب کے درمیان کمزور مردوں کی طرح مجھ سے معافی مانگو گے؟"

وہ اس مجنوں کے جانشین کو کسی بھی طور اس عمل سے باز رکھنا چاہتی تھی جس کا انعام اسے ثانیہ کی رخصتی کی شکل میں ملنا تھا۔ سو لہجے کو ذرا دھیما رکھا۔ عون نے مسکراہٹ دبائی اور بھولپن سے بولا۔

"تو پھر طاقت ور مردوں کی طرح ابھی اکیلے میں ہی مانگ لیتا ہوں۔"

"دیکھو عون۔۔۔!" وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتی کچھ کہنے لگی تھی کہ وہ ٹوک گیا۔

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ مت دیکھو۔ اور ابھی فرمائش کر رہی ہو کہ دیکھوں۔ تم بھی نا۔ بہت ہی بیوی ہو۔"

ثانیہ کا جی چاہا کوئی شے اٹھا کر اپنے ہی سر پہ دے مارے۔ اس جیسی سنجیدہ فطرت کی مالک لڑکی کے لیے عون کا یہ رویہ بہت غیر سنجیدہ تھا۔

"مجھے غصہ مت دلاؤ عون!" بے اختیار ہی غصے کی لالی لیے وہ قدرے اونچی آواز میں بولی۔ کچھ کچھ بے بسی کا بھی شکار تھی۔

اس نے تو عون کا کچھ اور ہی تصور اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا۔ مگر ادھر تو مسلسل ایک جلد باز، جذباتی اور نظرباز (ثانیہ کے خیال میں) قسم کے عون عباس سے پالا پڑ گیا تھا۔

"میں ابھی شادی کے جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتی۔ تم چاہتے ہو کہ میں لندن نہ جاؤں۔ او کے ڈن۔ مگر صبح تم مجھ سے کوئی معافی نہیں مانگو گے اور نہ ہی میری رخصتی کا مطالبہ کرو گے۔" اس کا انداز دو ٹوک تھا۔ عون نے گہری نگاہ اس پر ڈالی۔

"مگر کوئی وجہ بھی تو ہو تمہاری بات ماننے کی۔" وہ بولا تو اب کی بار لہجے میں سنجیدگی بھری لاپروائی تھی۔ ثانیہ چڑ کر بولی۔

"یہ وجہ کیا کم ہے کہ میں خود اپنی رخصتی سے انکار کر رہی ہوں۔ تمہیں تو فوراً" شوہروں کی طرح میری بات کو انا کا مسئلہ بنا لینا چاہیے اور خود اس رخصتی سے انکار کر دینا چاہیے۔"

"کیا تم کسی۔۔۔ آئی مین کوئی اور ہے تمہاری زندگی میں؟" لمحہ بھر کے توقف کے بعد عون نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا تو ثانیہ کی رنگت میں غصے کی سرخی گھل گئی۔

"تم سے میں ہر انتہائی سوچ کی توقع کر سکتی ہوں۔" اس نے تلخی سے کہا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے پرے ہٹنے کا کہا۔

"او کے۔ یعنی تمہاری زندگی میں صرف میں ہوں۔" وہ مطمئن ہوا۔ "تو پھر کیا مسئلہ ہے یار! کیوں سیدھے سادے معاملے کو گنجلک بنا رہی ہو۔"

ثانیہ نے دانتوں پر دانت جمائے پھر خود پر ضبط کرتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے۔ تم جو محض پانی کو سطح سے دیکھ کر اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہو۔ یہ سمجھے بغیر کہ پانی میں اترے بغیر اس کی گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔"

وہ اسے ہاتھ سے دھکیل کر دروازے کی طرف بڑھی تو عون نے اس کا وہی ہاتھ اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں تھام لیا۔ ثانیہ بے اختیار پلٹی تو اسے اپنے مد مقابل پایا۔

اس کے ملبوس سے اٹھتی گہری دلکش خوشبو اس کے نتھنوں میں گھستی چلی گئی۔

"چلو مان لیا میں نے بے وقوفی کی تھی۔ مگر اب میں پانی میں اتر کر اس کی گہرائی ماپنا چاہتا ہوں تو تم کیوں راستے میں رکاوٹ کھڑی کر رہی ہو؟" اس کا لہجہ دھیما تھا۔

وہ اس کی قربت پر شرمائی نہ گھبرائی۔ اس کے برعکس اسے گھورتے ہوئے اپنے لفظوں پر زور دے کر بولی۔
"تم صرف یہ جان رکھو کہ میں اس شادی میں فی الحال۔۔۔ زیرو پرسنٹ بھی انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ اگر اپنی اور میری زندگی برباد کرنا چاہتے ہو تو بصد شوق اپنا ڈراما پورا کرلو۔ مگر اتنا جان لینا عون عباس۔۔۔ زبردستی کے سودے میں سب دل جسم ہی ہاتھ آیا کرتے ہیں۔"
اپنا ہاتھ کھینچتے ہوئے اس نے ناب گھما کر لاک کھولا اور دروازہ کھول کر چلی گئی۔
بات کچھ بھی نہ تھی۔
عون نے اگر پہلے شادی سے انکار کیا تو پھر بعد میں برضا۔۔۔ ورغبت مان بھی گیا تھا مگر ثانیہ نے شاید اس بات کو انا کا مسئلہ ہی بنا لیا تھا۔ کوئی اور مرد ہوتا تو ثانیہ کی اس قدر خود سری پر تین لفظ منہ پہ دے مارتا۔
مگر ہائے۔۔۔ ادھر عون عباس تھا۔ جس کا جگر عشق کے تیر نے چھلنی کر دیا تھا اور وہ ہر قیمت پر علاج بھی اسی ستمگر سے چاہتا تھا۔
ابھی بھی وہ وہیں کھڑا سنجیدگی سے ثانیہ کے لفظوں پر غور کر رہا تھا۔۔۔ اور صبح اپنے اور ثانیہ کے والدین کے سامنے جب وہ پیش ہوا تو اس نے بڑی سنجیدگی اور صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔
"میں ثانیہ کی خوشی میں خوش ہوں۔ اگر وہ فی الحال رخصتی نہیں چاہتی تھی تو پرابلم۔ میں نے لاعلمی میں جو دکھ اسے پہنچایا ہے شاید اس کی بھرپائی تک وہ اپنے دل کو اس رشتے کو نبھانے کے لیے راضی نہ کرپائے۔ اس لیے میں اسے وقت دینا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے اچھی طرح جان لے، سمجھ لے اور اپنی مرضی کا فیصلہ کرے۔ میں ہر حال میں اس کا انتظار کروں گا۔"
وہ بڑے مدبرانہ انداز میں کہہ رہا تھا اور جیسے اس نے سارا ملبہ ثانیہ پر گرایا۔ ثانیہ کا تو دانت پیس پیس کر برا حال تھا۔
مگر بہر حال۔۔۔ رخصتی کا معاملہ تو ٹل گیا۔ کمرے میں ثانیہ نے ٹہلتے ہوئے لمبے سانس لے کر خود کو نارمل کیا اور سوچنے کی کوشش کی۔
موبائل کی میسج ٹون پر وہ موبائل اٹھا کر دیکھنے لگی۔
عون کا میسج جگمگا رہا تھا۔
"پرندوں کی نظر کمال کی ہوتی ہے مگر دانہ دیکھ کر وہ جال کو بھول جاتے ہیں اور اسیر ہو جاتے ہیں۔۔۔ مجھے یقین ہے تم جو اتنی عقل مند بنتی ہو، میری پسپائی کے پیچھے محبت کے بچھے جال میں نہ پھنسیں تو کہنا۔۔۔ میں تو تمہاری بے اعتنائی کے باوجود اسیرِ محبت ہوں دیکھنا تمہیں کیسے محبت سے اپنی محبت کا شکار کرتا ہوں۔ آئی ڈیرو انف لو یو لیڈ ی۔"
پورا میسج پڑھنے تک نہ صرف ثانیہ کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا تھا بلکہ بی پی بھی شوٹ کر گیا۔ اتنے غصے سے اس نے عون کا میسج ڈیلیٹ کیا کہ گویا موبائل کے بٹن کی جگہ عون کی گردن دبا رہی ہو۔
"ہنہ۔۔۔ تم کیا جانو عون عباس! محبت ہے کس چڑیا کا نام؟"

✡ ✡ ✡

ڈرائیور اسے سیفی کے آفس چھوڑ گیا۔ یہ کوئی بہت بدلی ہوئی ایمہا تھی۔
ماڈرن سی۔ خوب صورت انداز میں کٹے بال سلیقے سے شانوں پہ بکھرے ہوئے تھے۔ رو رو کر سوجی آنکھوں پہ ڈارک سن گلاسز۔

ٹراؤزر اور پنک ٹاپ میں ملبوس وہ گاڑی سے اتری۔ اپنا بیگ شولڈر پہ ڈالا۔ ڈرائیور اس کا منتظر کھڑا تھا۔ وہ مرجانے کو تھی۔
اس کا دل کر رہا تھا اسی پارکنگ لاٹ میں دھاڑیں مار مار کے رونے لگے۔ اس نے سر اٹھا کے اونچی شاندار بلڈنگ کو دیکھا۔
سیفی کو اس کے آنے کی خبر تھی۔ وہ خود باچھیں پھیلائے دروازے میں ہی اس کے استقبال کو موجود تھا۔ ڈرائیور اسے دیکھ کر مؤدبانہ واپس ہو لیا۔
"واؤ۔ یقین نہیں آتا۔ میں تو پہلی بار تمہیں دیکھ کر ہی لٹ گیا تھا۔ اب تو قیامت بن گئی ہو۔" سیفی مخمور سا تھا۔ اس کی نگاہ ایمہا کے بنا چادر کے وجود سے لپٹی جا رہی تھی۔
وہ بے اختیار سمٹی۔ مگر نہ دوپٹہ نہ اسکارف۔
اس کے دل سے نوحے اٹھے۔۔۔ بے آواز آہیں اور چیخیں۔ سیفی نے اس کے شانے پر بازو پھیلانا چاہا۔
"میں خود چل سکتی ہوں۔" وہ سختی سے بولی تو لمحہ بھر حیران ہونے کے بعد وہ ہنس دیا۔
"اوکے۔ ایزیووش۔ چلو باقی اسٹاف سے تمہارا تعارف کروادوں۔"
اسے یقیناً "میم" کی طرف سے ہدایات مل چکی تھیں۔ تب ہی وہ حد میں ہی رہا۔
ایک قیامت کا مرحلہ طے کرنے کے بعد۔۔۔ پورے اسٹاف سے مل کر اب وہ اپنے چھوٹے مگر ویل ڈیکوریٹڈ کمرے میں بیٹھی تو آنکھیں پھر بھر آئیں۔
اس نے گلاسز اتار کر ٹشو سے تھپتھپا کر آنکھیں خشک کیں اور گہری سانسیں بھرتی خود کو نارمل کرنے لگی۔
پچھلے ایک ماہ میں وہ میم کی اصلیت کے ساتھ ساتھ یہ بھی جان چکی تھی کہ محض رونے سے کچھ بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ اللہ کی ذات کے بعد اگر اسے یہاں سے کوئی بچا سکتا تھا تو وہ خود اس کی اپنی ہمت اور ہوشیاری ہی ہو سکتی تھی اور اب وہ جو ہو رہا تھا اس پر ماتم کناں ہونے کے بجائے کوئی لائحہ عمل طے کرنا چاہتی تھی جس پر عمل کرکے وہ خود کو اس دلدل میں مزید دھنسنے سے بچا سکتی۔

✡ ✡ ✡

رباب کی طبیعت کی خرابی کا سن کر زارا اس کی عیادت کو آئی تو اسے گم صم پایا۔
"اب تم ہی پوچھو اس سے۔ کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ۔ جب بھی مزاج کے خلاف کوئی بات ہو جائے یہ یونہی ڈپریشن کا شکار ہو جاتی ہے۔"
ماما نے اسے رباب کے متعلق بتایا تھا۔ وہ محض سرہلا کر اس کے کمرے میں آئی تو رباب نے اسے پہلی بار اپنے گھر میں دیکھ کر کسی حیرت یا خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بس وہی ہیلو کے جواب میں روایتی سا ہائے۔
"کیا ہوا رباب! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" زارا نے پیار سے پوچھا۔
سفیر احسن کی لاڈلی بہن کے وہ بھی بہت ناز نخرے دیکھتی تھی۔ رباب نے لمحہ بھر کو کچھ سوچا۔ پھر منہ بسور کر بولی۔
"میرا دل بہت دکھا ہوا ہے زارا۔" زارا بے ساختہ مسکراتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی۔
"کس نے اتنی جرات کی کہ رباب احسن کا دل دکھا سکے۔" رباب نے اسے دیکھا۔
"تمہیں بتا تو دوں۔ مگر تم بھی کچھ کر نہ سکو گی۔"
"میں سفیر احسن کی سسٹر کے لیے اپنی پوری کوشش کرنا چاہوں گی۔" زارا نے نرمی سے کہا۔

سے زارا کو جھٹکا لگا۔
"معیز احمد۔" رباب کے ہونٹوں سے نکلنے والے نام نے زارا کو جھٹکا لگایا۔
"وہ بہت ظالم شخص ہے۔ ایک تو فون پر میرے ساتھ۔ روڈلی بی ہیو کیا اور دوسرے اس کے بعد میری کوئی کال اٹینڈ نہیں کی اور وعدے کے باوجود کال بیک نہیں کی۔" وہ بہت معصومیت سے کہہ رہی تھی۔ زارا کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔
"ہاں۔ یہ بندہ میرے چارج کی حدود میں آتا ہے۔ اس کا تو میں کورٹ مارشل بھی کرواسکتی ہوں۔"
وہ مسکرا کر بولی تو رباب نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھاما۔
"سچی۔؟"
"آف کورس۔ اب تم دیکھنا سب ٹھیک ہوجائے گا۔ میرے خیال میں فیکٹری کے معاملات کی وجہ سے کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ ہوئی ہوگی۔ ابو کے بعد اب انہیں ہی سب کچھ دیکھنا ہے۔ بزی ہوں گے وہاں۔"
اسے تسلی دینے کے ساتھ زارا نے بھائی کی طرف سے صفائی بھی پیش کی تو رباب کو کچھ اطمینان ہوا اور زخمی انا کو بھی تھوڑا مرہم ملا۔
"پھر بھی یار! اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔ لڑکیوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں۔ اتنی بے رخی سے ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔" اس نے بڑے انداز سے زارا کو باور کرایا کہ "کچھ ہے" معیز اور اس کے درمیان۔
اور زارا کو یہ راز کو پا کر دلی مسرت اور اطمینان ہوا کہ سب کچھ اس کی سوچ کے مطابق ہو رہا تھا۔
"اوکے۔ تم ٹینشن مت لو۔ اٹھو۔ ذرا لانگ ڈرائیو پہ چلتے ہیں۔ فریش ہو کر پھر پلاننگ کریں گے کہ میرے بھائی صاحب کو راہ پہ کیسے لانا ہے۔"
زارا نے مسکرا کر کہا تو وہ فوراً" اٹھ گئی۔ اس کے واش روم میں جانے کے بعد زارا خود ہی سوچوں کے تانے بانے بنتی مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

آج بہت دنوں کے بعد سفینہ نے اسے مخاطب کیا تو معیز کا دل اطمینان سے بھر گیا۔
"آفس کا کام کیسا چل رہا ہے؟"
"ٹھیک ہے ماما! مودی صاحب کی وجہ سے بہت حوصلہ ہے مجھے۔"
وہ مسکرایا بہت عرصے بعد وہ تھکان سے پاک ایک مسکراہٹ تھی۔
"ہوں۔" انہوں نے چائے لے کے آتی زارا کو دیکھا۔ ابھی وہ لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہوئے تھے۔
"تم نے رباب سے کوئی مس بی ہیو کیا ہے۔" ان کی بات بہت غیر متوقع تھی۔ معیز چائے کا کپ تھامتے ہوئے چونکا۔ پھر ذرا سا سوچنے کے بعد شانے اچکائے۔
"ایسا تو کچھ نہیں ہوا۔ مودی صاحب سے ڈسکشن کے دوران اس کی کال آئی تو میں بات نہیں کرسکا اور بعد میں بات کرنے کا کہہ دیا تھا۔"
"تم نے اسے کال بیک کا کہا تھا تو پھر کی کیوں نہیں؟" تفتیشی انداز۔
معیز کو حیرت ہوئی۔ "اس نے آپ سے شکایت کی ہے؟"
"وہ بہت ڈسٹرب ہے آپ کے رویے سے۔ آج میں اس سے ملنے گئی تھی۔" زارا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
"اس میں ڈسٹربنس والی کون سی بات ہے۔ میں اس وقت فارغ نہیں تھا' نہیں بات کرسکا۔" معیز نے لاپروائی سے کہا۔

زارا کو رباب جیسی شدت معیز کے انداز و اطوار میں کہیں دکھائی نہ دی۔
"وہ کل سے آپ کی کال کا ویٹ کر رہی تھی۔" زارا نے جتایا۔
"کم آن زارا! اتنی ہی ضروری بات تھی تو وہ مجھے دوبارہ کال کرلیتی۔ مجھے واقعی بعد میں یاد نہیں رہا تھا۔" معیز نے بات ختم کردی۔
"یہ کوئی عام سی بات نہیں ہے معیز! تمہاری بہن کی سسرال کا معاملہ ہے۔" سفینہ نے بات کو آگے بڑھایا تو معیز کو ہلکی سی جھنجلاہٹ نے گھیرا۔
"آپ میری رباب سے دوستی کو بہن کی سسرال سے الگ ہی رکھیں ماما! میں اس سے زارا کی نند کے حوالے سے نہیں بلکہ ایک فرینڈ کے حوالے سے ملتا ہوں۔"
"تمہارے سمجھنے سے رشتہ بدل نہیں جائے گا معیز!" سفینہ نے اسے جتایا۔
"وہ سفیر کی بہت لاڈلی بہن ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے' رباب کا بہت خیال رکھنے کو۔" زارا خوامخواہ ہی حساس ہو رہی تھی۔
"تو تم رکھو اس کا خیال۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں ہے۔" معیز اب اس موضوع سے چڑنے لگا تھا۔
زارا کو اس کا انداز برا لگا۔ تب ہی وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھ کے چلی گئی۔
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو معیز! تمہاری رباب سے الگ طرح کی دوستی ہے' مگر ہے گی تو وہ سفیر کی بہن اور زارا کی نند ہی نا۔"
سفینہ نے سنجیدگی سے اسے سمجھایا۔
"اوکے ماما! میں اسے کال کرلوں گا اور سمجھالوں گا۔" معیز کو بات ختم کرنے کا یہی طریقہ سمجھ میں آیا۔
"کوشش کرو کہ تم دونوں کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ ڈیولپ ہوجائے۔ میرا تو ارادہ ہے کہ زارا اور سفیر کے ساتھ ہی تم دونوں کی شادی بھی کردوں۔"
معیز کے تاثرات میں سنجیدگی اتر آئی۔
"جیسا چل رہا ہے ویسا چلنے دیں ماما! میں فی الحال اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میرے لیے دوسرے مسئلے ہی کافی ہیں۔"
"ہاں۔ تمہارے باپ کے چھوڑے ہوئے مسئلے۔ جن میں سب سے سرفہرست ایم مراد کو ڈھونڈنا ہے۔"
وہ طنزاً" بولیں۔ ان کی بی پی آئی ڈی کمال تھی۔
"آپ کو برا تو لگے گا مگر یہ حقیقت ہے۔ آپ درست کہہ رہی ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔
"دفع کرو اسے۔ مٹی ڈالو اس لڑکی پر۔ وصیت کا کیا ہے۔ عدالت میں جاکے دعوا کرو کہ یہ لڑکی مرچکی ہے' دو گواہ پیش کرو اور اس کا حصہ اپنے نام کروالو۔ جو بے وقوفی تمہارے باپ نے کی ہے' اسے آگے مت بڑھاؤ۔"
سفینہ انتہائی سوچ کی مالک تھیں۔ اب بھی تلخی سے بولیں تو معیز کی نگاہ میں تاسف اتر آیا۔
"وہ ابو کی وصیت ہے ماما! اور دنیا کی عدالت میں تو شاید میں جھوٹ بول ہی لوں' مگر کیا روز قیامت اللہ کی عدالت میں یہ بول پاؤں گا کہ اس جائیداد پر میرا حق تھا؟" سفینہ لمحہ بھر کو چپ ہوگئیں۔ پھر معاندانہ انداز میں بولیں۔
"لیکن اگر مرنے والا اپنے بچوں کی حق تلفی کرتے ہوئے کسی اور کے نام جائیداد کردے تو اسلام ہمیں اجازت دیتا ہے۔ ہم اسے چیلنج کرسکتے ہیں۔"
"ابو نے کسی کی بھی حق تلفی نہیں کی ہے ماما! یہ آپ اچھی طرح جانتی ہیں۔ کاروبار ہم دونوں بھائیوں کے نام ہے۔ گلبرگ کا پلاٹ آپ کے نام ہے۔ آپ کے اور زارا کے لیے بینک میں اماؤنٹ الگ سے ہے۔ یہ اتنا شاندار

گھر ہمارا ہے۔"

معیز کو مرے ہوئے باپ کے لیے ماں کا انداز اچھا نہیں لگا تھا مگر بہر حال وہ نرمی سے بولا۔

"اور اس منحوس کا کیا کرو گے جس کے نام پچاس لاکھ چھوڑے ہیں تمہارے باپ نے۔ مہینے کا دس ہزار الگ سے اور اس گھر میں بھی حصہ داری دے ڈالی اور تمہاری نظر میں کوئی حق تلفی ہوئی ہی نہیں کسی کی۔" سفینہ بھڑک اٹھیں۔

"بمشکل اٹیکسی اس کے حصے میں آتی ہے ماما! آپ ٹینشن مت لیں۔ ویسے بھی وہ بالکل لاپتا ہو چکی ہے۔ نہ تو ہمارے کانٹیکٹ میں ہے اور نہ ہی اس کے ہاسٹل اور کالج سے اس کا پتا چل سکا ہے۔"

معیز نے ان کے غصے کو دیکھتے ہوئے فی الفور مفاہمت کی راہ اپنائی۔

"مرجائے۔ اللہ کرے مرجائے کہیں۔ پہلے اس کی ماں نے میری زندگی برباد کی۔ پھر اس منحوس کے زندگی میں آتے ہی میرا شوہر چل بسا۔ خدا نہ کرے کبھی اس کے منحوس قدم میرے گھر میں پڑیں۔" سفینہ بددعاؤں پر اتر آئیں پھر رک کر اسے گھورا۔

"اور تم۔ اس کا پتا کرتے پھر رہے ہو ہر جگہ؟"

"مجبوری ہے ماما! ایسے تو ساری عمر اس سے جان نہیں چھوٹ سکے گی۔ میں بھی اس معاملے کو اب ختم کرنا چاہتا ہوں۔" معیز نے سچ بتایا۔

"اور۔ اس خط میں امتیاز نے کیا لکھا تھا؟"

سفینہ کے دل میں وہ خط پھانس کی طرح گڑا ہوا تھا' جسے معیز نے کسی کو دیکھنے بھی نہیں دیا۔ پہلے تو سفینہ اس سے ناراض تھیں۔ اس لیے نہیں پوچھا' مگر اب جبکہ وہ اس سے بات چیت شروع کر چکی تھیں تو اس سے پوچھ ہی لیا۔

معیز چپ ہو گیا۔ کندھوں پر رکھا بوجھ بہت محسوس ہونے لگا۔

"وہ ہر حال میں ایبہا کو اس گھر میں لانے کے خواہش مند تھے ماما! اور انہوں نے مجھے اس بات کا پابند بنایا ہے۔"

"ارے ہٹو۔ پابند بنایا ہے۔ مر کھپ گئی۔ جان چھوٹ گئی ہماری۔ تمہارے باپ کی آنکھوں پر تو صالحہ کے عشق کی پٹی بندھی تھی۔ صالحہ کی بیٹی اسی جیسی ہو گی۔ بھاگ گئی ہو گی کسی اور کے ساتھ۔" سفینہ نے حقارت سے کہا۔

معیز نے ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ تین چار گھونٹ میں خالی کر کے تپائی پہ رکھ دیا۔

"مگر یہ بھی طے ہے کہ اگر وہ آگئی تو بہر حال اس کا اس گھر میں بھی حصہ ہے۔ اسے یہاں رہنے سے ہم روک نہیں سکتے۔" معیز نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو اس کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی۔

اسے احساس ہو رہا تھا کہ ایک لڑکی۔۔۔ بلکہ جوان اور خوب صورت لڑکی اس کی وجہ سے پتا نہیں کن حالوں میں پہنچ چکی تھی اور اب تک اس کے ساتھ کیا حالات پیش آچکے ہوں گے۔

اسے امتیاز احمد کی ایبہا کے لیے محبت یاد آتی تو دل ندامت اور بے چینی سے بھرنے لگتا۔ وہ خوابوں میں امتیاز احمد کو بہت بے چین کیفیت میں دیکھتا تھا۔

یا پھر اسپتال میں جب ان کی طبیعت بہت خراب تھی تو ان کے آخری الفاظ "ایبہا کو لے آؤ معیز۔۔۔" وہ کئی بار سوتے میں ہڑبڑا کے اٹھا تھا۔ وہ کیا کہتا۔ ایبہا کو تو اس نے خود گم ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

اور اب جبکہ وہ اسے ڈھونڈ کر اس کا حصہ اسے دے کر اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا تو وہ گم ہو گئی تھی۔

"کاش! ابھی تم بھی ہماری زندگی سے گم ہو جاؤ۔" اس کے کانوں میں اپنی ہی آواز گونجی تو وہ گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"رباب سے بات ضرور کر لینا۔ اور اب تم ذہن میں یہ بات ضرور رکھو معیز! کہ میں رباب کو اس گھر کی بہو بنانا چاہتی ہوں۔" سفینہ نے اسے باور کرایا تو وہ کچھ کہے بنا کمرے کی طرف چل پڑا۔ جاتے ہی اس نے رباب کو کال کی۔ اور اس نے اپنے نئے سیل فون پر وہ کال یوں جلدی سے اٹینڈ کی جیسے اسی کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ مگر لب و لہجہ خفا خفا۔ ناز و انداز سے پُر۔

"ہاں۔ بتاؤ۔ کیوں فون کیا ہے؟"

"آئم سوری رباب! پہلے تو میں بزی تھا اور بعد میں مجھے کال کرنا یاد نہیں رہا۔ رئیلی سوری۔" معیز نے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا تو وہ چیخی۔

"واٹ۔ تم مجھے بھول گئے تھے معیز احمد۔۔۔؟" وہ بے یقین تھی۔

معیز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"تمہیں نہیں بھولا' کال کرنا بھول گیا تھا۔"

"جو بھی ہو معیز! تم نے میرا دل دکھایا ہے۔ مجھے دو دن تک ڈسٹرب رکھا ہے۔ اس کی پنالٹی تو تمہیں دینا ہی پڑے گی۔" وہ ٹھونس بھرے لہجے میں بولی۔ تو معیز ہنس دیا۔ "اوکے ڈن۔ جو تم کہو۔"

"تو پھر کل کا دن صرف میرے لیے۔ بلکہ تم میرے رحم و کرم پر ہو گے۔ میں جہاں چاہے تمہیں لے جاؤں۔"

"اوں۔ یہ تو تھوڑا سا مشکل ہو جائے گا۔" وہ اس کی سزا پر تھوڑا سا سوچ کر بولا۔

رباب نے تیزی سے کہا۔ "تم مجھ سے پرامس کر چکے ہو۔"

"میں کب مکر رہا ہوں یار!" معیز کا انداز صلح جویانہ تھا۔

"لیکن تم سمجھ سکتی ہو کہ میں آج کل بزنس کے حوالے سے کن مشکلات کا شکار ہوں۔ بمشکل توجہ دے پا رہا ہوں اور ایسے میں آفس نہ جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" رباب نے منہ بنایا۔

"تمہاری کون سی لاکھوں کی ڈیلنگ کینسل ہو رہی ہے۔ بہانے مت بناؤ معیز!"

"اچھا تھوڑی سی چھوٹ دے دو۔ یوں کرتے ہیں کہ آف ڈے تمہارے ساتھ آؤٹنگ کے لیے رکھ لیتے ہیں۔"

"ہنہ۔ کسی کو اس کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے اپنے کام چھوڑ کر آنا پڑتا ہے۔ آف ڈے کسی کے نام کیا تو کیا کیا۔" وہ بدستور منہ پھلائے ہوئے تھی۔ معیز نے کوفت سے گہری سانس بھری۔ پھر جان بوجھ کر بولا۔

"اوکے۔ جیسی تمہاری مرضی۔ سنڈے کو بھی میں اپنا آرام چھوڑ کے آنے والا تھا۔"

"اوکے۔ اوکے۔۔۔" وہ جلدی سے بولی۔ مبادا معیز اپنا پروگرام بدل ہی نہ لے۔ "گزارہ کر لیتے ہیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" وہ مسکرا دی۔

"ہاں۔ لیکن آئندہ کے لیے میری ایک بات یاد رکھنا۔ ہماری دوستی کے درمیان زارا اور سفیر کا رشتہ نہیں آنا چاہیے۔" معیز نے آخر میں جو نصیحت کی تھی اسے سن کے رباب چونک گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سودی صاحب! میں نے یہ دونوں کنٹریکٹس کی ڈیٹیلز پڑھ لی ہیں۔ میرے خیال میں تو خالد اینڈ سنز ہماری شرائط پہ پورے اترتے ہیں۔"

سودی صاحب کو اپنے سامنے والی نشست پہ بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے معیز نے کہا تو وہ مسکرا دیے۔

"شاباش۔ بہت ٹھیک اندازہ لگایا ہے آپ نے۔"
"اور یہ سفیان اینڈ کمپنی کا مالک سفیان حمیدی ہی ہے نا...؟" معیز نے سوچتے ہوئے پوچھا تو انہوں نے اس کی تائید کی۔
"جی ہاں اور میرے خیال میں آپ ایک آدھ دفعہ کسی میٹنگ میں ان سے مل بھی چکے ہیں۔"
"ہاں... بہت چالاک شخص لگا تھا مجھے۔" معیز کو یاد تھا۔
"بہرحال۔" اس نے گہری سانس بھری اور بولا۔
"مجھے خالد اینڈ سنز کا پروپوزل اچھا لگا ہے۔ آپ دو تین روز تک ان کے ساتھ میٹنگ رکھوائیں۔ پھر کنٹریکٹ بھی سائن ہو جائے گا۔"
"او کے۔" موری صاحب نے دونوں فائلز اٹھالیں اور اپنے ساتھ لے گئے۔

☼ ☼ ☼

"کیا بکواس کر رہے ہو۔ وہ ہمارا پروپوزل کیسے ریجیکٹ کر سکتا ہے۔ اتنے زیادہ مارجن کو وہ کیسے نظرانداز کر سکتا ہے۔ ہم مارکیٹ سے زیادہ ریٹ پر ان کا مال اٹھانے کو تیار تھے۔" سیفی فون پر کسی سے الجھ رہا تھا۔
"سر! میں نے خود فائل چیک کی ہے۔ آپ کا پروپوزل ریجیکٹ ہو گیا ہے۔" وہ آہستہ آواز میں بتا رہا تھا۔ اسے کسی کے اچانک آجانے کا بھی ڈر تھا۔
"یہ تو پتا ہی ہو گا۔ تمہیں کس کمپنی کا پروپوزل پسند آیا ہے انہیں۔" سیفی نے اپنا غصہ دباتے ہوئے پوچھا۔
"سوری سر جی! منیجر صاحب دوسری فائل اپنے کمرے میں لے گئے ہیں۔ یہ فائل آپ کو واپس بھجوانی ہے۔ اس لیے پی اے کے روم میں پڑی تھی۔"
وہ گڑبڑایا تو سیفی نے گالی دیتے ہوئے فون رکھ دیا۔ اسے درحقیقت معیز احمد پر شدید غصہ تھا۔ وہ تین سالوں سے امتیاز احمد کے ساتھ کاروبار کر رہا تھا اور بہت فائدے میں تھا مگر اس معیز احمد نے سیٹ سنبھالتے ہی گڑبڑ کرنا شروع کر دی تھی۔
کچھ سوچتے ہوئے اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی۔

☼ ☼ ☼

"کمال ہے یار! تیری بزنس پارٹی ہے۔ اس میں میرا کیا کام۔" عون بدکا تو معیز نے اسے گھورا۔
"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے اور بس۔"
"مجھ پہ ایسا کون سا برا وقت آگیا ہے کہ میں اپنے ریسٹورنٹ کی رنگینیاں چھوڑ کر تیری بورنگ بزنس پارٹی میں چل پڑوں۔" عون ہاتھ نہیں آرہا تھا۔
"کم آن یار! مجبوری ہے۔ پہلے تو ابو ہی یہ سب ہینڈل کرتے تھے۔" معیز نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔
"مگر میں وہاں کروں گا کیا؟" عون نے بیچارگی سے پوچھا تو معیز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ "بس ایک معتبر سا بزنس مین بن کے پارٹی اٹینڈ کرنا اور کیا۔"
"زندگی میں دو لوگ میری زندگی میں بہت خاص ہیں اور دونوں ہی میری زندگی اجیرن کیے ہوئے ہیں۔" عون نے چڑ کر کہا۔
"میں اور بھابھی۔" معیز نے یقین سے کہا۔
"ظاہر ہے۔ اس ہٹلر کی نانی کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔" عون کو دل کے پھپھولے پھوڑنے تھے ' سو بات کو

گھسیٹ کر اپنے مطلب پہ لے ہی آیا۔
"اچھی بھلی ہماری شادی کی شہنائیاں بجنے والی تھیں۔ مگر اس کی فضول سی ضد کے پیچھے اتنے خوبصورت دن گزرتے جا رہے ہیں۔"
"ویسے مائنڈ نہ کرنا۔ وہ تو پھر اچھی ہے۔ جو ریجیکٹ ہونے کے بعد بھی تجھے منہ لگا رہی ہے کوئی اور لڑکی ہوتی تو اب تک تجھے سیدھا کر چکی ہوتی۔"
معیز نے آرام سے کہا تو وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولا۔ "اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔"
"تو مسئلہ کیا ہے۔ تو معافی مانگنے کو راضی تھا پھر بھی بات نہیں بنی؟" معیز کو اس کی شکل پر ترس آیا۔
"اسے اب میری کسی بات' کسی وعدے پر یقین نہیں اور نہ ہی اعتراف محبت پر۔" عون نے منہ لٹکایا۔
"تم جیسے جلدباز اور جذباتی بندے کی یہی سزا ہونی چاہیے۔ ایک نظر اسے دیکھ کر ایسے فٹ سے انکار بھجوایا کہ کسی سے مشورہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" معیز نے اسے لتاڑا۔
"شرمندہ ہوں۔ پچھتا رہا ہوں' اب اور کیا چاہتے ہو تم لوگ۔" عون نے اسے یوں آنکھیں دکھائیں جیسے وہ ثانیہ کے ساتھ ملا ہوا ہو۔
معیز نے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔
"میری سمجھ سے تو تمہاری یہ اسٹوری باہر ہے۔"
"یہ مردوں کی باتیں ہیں میری جان!" عون نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے کہا تو معیز نے اسے گھورتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹکا۔
اور طنزیہ بولا۔
"اور تف ہے ایسی مردانگی پر جس سے ایک پانچ فٹ چھ انچ کی لڑکی پٹائی نہیں جا رہی۔"
"لڑکی نہیں' بیوی۔" عون نے تصحیح کی۔ "لڑکی ہوتی تو اب تک پٹ چکی ہوتی۔ وہ بیوی والے نخرے دکھا رہی ہے یار! اور میں شوہروں کی طرح ہی وہ نخرے اٹھانے پر مجبور۔"
معیز اس کی شکل دیکھ کر ہنسنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"میم پلیز! میں اس آفس میں جاب نہیں کر سکتی۔" تیسرے دن ہی ایمہا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہاں آنے والے ہر شخص کی حریص نگاہیں اسے چیونٹیوں کی طرح اپنے وجود پر رینگتی محسوس ہوتی تھیں۔
"پھر وہی بکواس۔ میں نے تمہیں سمجھایا تھا ڈارلنگ کہ میں اس موضوع پر اب کوئی بات نہیں کروں گی۔" ماما نے اسے پچکارا تو ایمہا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کا وجود لرزنے لگا تھا۔
"وہ جگہ میرے لیے نہیں ہے۔ وہاں آنے والا ہر مرد مجھے احترام کی نہیں بلکہ ایک مرد کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور مجھے اب پتا چلا ہے کہ مرد کی نگاہ کتنی حریص ہوتی ہے۔"
"فضول ڈائیلاگ بازی بند کرو۔ تمہارا تو کام ہی یہی ہے۔ وہاں آنے والوں کو چارم کرنا۔ اپنے جال میں ایسا پھانسنا کہ وہ کہیں جا ہی نہ پائیں۔" ماما نے اسے گھرکا۔
"میں کہیں اور جاب کر کے گزارہ کر لوں گی۔" ایمہا نے امید بھری نظروں سے انہیں دیکھا مگر ادھر رحم کی ایک رمق بھی نہ تھی۔
"بکواس مت کرو۔ خدا نے تمہیں یہ خوبصورتی محض گزارہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ عیش کرنے اور عیش

کرانے کے لیے دی ہے۔ ناشکری مت بنو۔"
پھر انہوں نے اسے آرڈر دیا۔
"سیفی بتا رہا تھا کل اس کی کوئی بزنس پارٹی ہے۔ تمہیں بھی اس کے ساتھ جانا ہوگا۔"
"مم۔ میں۔۔۔" ایپھا کی روح پرواز کرنے لگی۔
"ایسی جگہوں پر بہت بڑے بڑے بزنس مین آتے ہیں اور یہی جگہیں ہوتی ہیں جہاں تم اپنی خوبصورتی کا جادو چلا کر اپنے لیے بھی فائدہ حاصل کر سکتی ہو اور ہمارے لیے بھی۔"
وہ اطمینان سے کہہ رہی تھیں۔
"میں نے حنا سے کہہ کے تمہارا ڈریس سلیکٹ کر لیا ہے۔ اب میں تمہارے منہ سے ایک لفظ نہ سنوں۔ ورنہ حنا سے تم سن تو چکی ہوگی۔ یہاں کے کتے ہی نہیں نوکر بھی بہت بھوکے ہیں۔"
وہ سفاکی سی بولیں تو ان کا مطلب سمجھ کر ایپھا کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

☼ ☼ ☼

بزنس پارٹی کیا تھی۔ رنگ و بو کا ایک طوفان تھا۔ مترنم ہنسی' بے باک قہقہے۔
معیز عون کو لے کر یہاں آتو گیا مگر اب اسے مودی صاحب کی بات یاد آرہی تھی۔
"بزنس مین ہر قسم کی اور ہر کسی کی پارٹی میں نہیں جایا کرتے۔ ریپوٹیشن پہ اثر پڑتا ہے۔"
مگر معیز کو شوق ہو چلا تھا کہ ایک بزنس پارٹی بھی اٹینڈ کر کے دیکھے۔ اس طرح شاید کچھ تجربے میں بھی اضافہ ہوتا۔
یہی بات اس نے عون سے بھی کہی تھی۔
مگر اب جب نشے میں لڑکھڑاتی' آدھے حواس اور آدھے لباس میں ایک آنٹی ٹائپ خاتون زبردستی معیز کے گلے کا ہار ہونے لگیں تو عون کو ہنسی آنے لگی۔
"اچھا۔ تو یہ تجربے حاصل کرنے آیا ہے یہاں۔" اب معیز نے اس عورت سے کیسے پیچھا چھڑایا اور اسے دوسری میز پر چھوڑ کے آیا۔ یہ وہی جانتا تھا۔ اس کی واپسی پر بھی عون ہنس رہا تھا۔
"پتا نہیں کوئی اپنی اصلی بیوی بھی لے کے آیا ہے یہاں کہ نہیں۔ سب ہی کی بغل میں ایک حور شمائل ہے۔" معیز تپا ہوا تھا۔ بھلا بزنس پارٹی میں عورتوں کا کیا کام۔
"ایک واحد تو مومن ہے جو اپنے یار کو ساتھ لایا ہے۔" عون کو اس کا چہرہ دیکھ کر پھر ہنسی آئی۔
"شٹ اپ یار! یہ ماحول تو میرے ذہن میں بھی نہیں تھا۔" وہ بے زار ہو رہا تھا۔
"ہر بزنس پارٹی میں یہ سب نہیں ہوتا میری جان! مودی صاحب نے ٹھیک کہا تھا۔ بندہ دیکھ کے ہامی بھرنی چاہیے۔"
عون نے اسے سمجھایا۔ پھر اس کی توجہ بھٹکی۔
آنے والے شخص کے ساتھ بے حد خوبصورت اور ماڈرن لڑکی تھی۔
سب ہی فطری طور پر ان کی طرف متوجہ تھے۔ مگر عون کے لیے دلچسپی کا باعث اس لڑکی کی گھبراہٹ تھی۔ وہ اپنے پارٹنر سے دو قدم پیچھے چل رہی تھی اور جب وہ کسی سے اس کا تعارف کراتا تو وہ اپنے پارٹنر کی اوٹ میں کھڑی رہتی۔ جیسے ڈری سہمی سی ہو۔
"کمال ہے۔ آج کی پارٹی میں ایسی لڑکی بھی آسکتی ہے۔" عون نے سر دھنا تو کولڈ ڈرنک ختم کرتا معیز چونکا۔

"کیسی لڑکی؟" عون نے اشارہ کیا۔ آنے والے دونوں افراد کی ان کی جانب پشت تھی۔ وہ کسی سے مل رہے تھے۔

"لگ رہا ہے اس لڑکی کو زبردستی پارٹی میں لایا ہے یہ بندہ۔"
عون نے کہا۔ وہ دونوں دلچسپی سے دیکھنے لگے۔ لڑکی کا انداز اب بھی وہی تھا۔ سب سے بچ کے چلنا۔ خود میں سمٹنا اور نروس ہونا۔
"یہ سفیان حمیدی ہے۔" معیذ نے اس مرد کا تعارف کرایا۔
"اور ساتھ اس کی بیوی ہوگی۔" عون نے اندازہ لگایا۔
"اونہوں۔ بیوی ہوتی تو ابھی کسی اور کے ساتھ خوش گپیاں لگا رہی ہوتی۔" معیذ نے نگاہ پھیرلی۔
"یار! لڑکی کچھ دیکھی دیکھی سی لگ رہی ہے۔" عون نے گردن موڑ کر ایک بار پھر پیچھے دیکھا۔ وہ لڑکی اب ایک ٹیبل کے گرد رکھی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اور اس کا سائیڈ پوز عون کے سامنے تھا۔
"مہمانوں سے مت دیکھو۔ یہاں جو عورتیں آتی ہیں وہ دیکھنے سے نہیں بلکہ نہ دیکھنے سے ناراض ہوتی ہیں۔ اس لیے تم بھی چاہو تو اس کی سیٹ پہ جاکے کوئی پرانی واقفیت نکال سکتے ہو۔" معیذ نے اسے اچھا خاصا ریگیڈ ڈالا تو وہ آنکھیں دکھانے لگا۔
"السلام علیکم!" اس قدر اچانک سلامتی پر دونوں ہی چونکے۔ وہ سفیان حمیدی تھا۔
معیذ نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو عون نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ ان ہی کے پاس بیٹھ گیا۔
"بہت شکوہ ہے جی ہمیں آپ سے۔ سالوں سے ہم آپ کے والد صاحب کے ساتھ بزنس کر رہے تھے اور آپ نے ہمیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال پھینکا۔" وہ ہلکے سے نشے میں لگ رہا تھا۔
"سالوں نہیں سیفی صاحب! صرف تین سال۔" معیذ نے پرسکون انداز میں تصحیح کی۔
سیفی نے آنکھیں سکیڑ کر معیذ کو دیکھا جیسے نظروں سے اسے تولنا چاہتا ہو۔
"چلیں۔ صرف تین سال سے ہی سہی۔ مگر ہم مارکیٹ سے زیادہ قیمت پر آپ کا مال اٹھا رہے تھے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔
"دیکھیں مسٹر سیفی! اس پارٹی میں آپ انجوائے کرنے آئے ہیں تو جاکر انجوائے کریں۔ بزنس کی باتیں ہم تب کریں گے جب آپ مکمل حواس میں ہوں گے۔" معیذ نے سرد مہری سے جواب دیا۔
"ہو ہو۔" وہ بے ہنگم انداز میں ہنسا۔ "زیادہ تو نہیں پی۔ اور یہ نشہ کیا کرے گی۔ اصل نشہ تو میں اپنے ساتھ لے کے آیا ہوں۔ آپ آئیں۔ آپ کا بھی تعارف کراتا ہوں۔"
وہ رازدارانہ انداز میں بولا تو عون نے بے اختیار معیذ کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً "اپنے ساتھ آنے والی لڑکی کی بات کر رہا تھا۔
"نو تھینکس۔" معیذ کا انداز خشک تھا۔
"آئیں تو۔ آپ کا دل خوش ہوجائے گا۔ آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ ایسا کورا اور بے داغ حسن ہے۔" سیفی کی اپنی بھی جیسے رال ٹپک رہی تھی۔ ان دونوں کو کراہیت محسوس ہونے لگی۔

معیذ بھڑکا۔
"تم ہمیں سمجھ کیا رہے ہو؟ کہیں اور جاکے اپنا کاروبار کرو۔"

عون نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے اسے ٹھنڈا رہنے کا اشارہ کیا اور آہستہ سے بولا۔
"وہ نشے میں ہے۔ تم تو ہوش میں ہو۔ پرسکون رہو۔"
وہ ان لوگوں میں سے تھا جو ذرا سے نشے میں بھی لڑھک جاتے ہیں۔ تب ہی اوٹ پٹانگ اول فول بولے جارہا تھا۔ معیذ نے اپنا موبائل اور کی چین اٹھائی۔
"کدھر؟"
"کہیں اور بیٹھتے ہیں یار!" وہ بے زار تھا۔
عون ہنسا۔
"یار! جیسا دیس ویسا بھیس۔ ویسے اس کی آفر بری نہیں ہے۔"
"مگر ثانیہ کو خاصی بری لگے گی۔ اگر ابھی میں اسے کال کرکے بتاؤں تو۔" معیذ اسے دھمکاتے ہوئے بولا تو وہ گڑبڑایا۔
"مذاق کر رہا ہوں یار!"
سیفی کسی کے بلانے پہ وہاں سے اٹھ کے گیا تو وہ دونوں پرسکون ہوگئے۔
"بس طے ہے کہ آئندہ سے موودی صاحب طے کریں گے کہ مجھے کس پارٹی میں جانا چاہیے اور کس میں نہیں۔" معیذ نے تہیہ کرلیا۔
"ہاں۔ جب تک تم بڑے نہیں ہوجاتے۔" عون نے لقمہ دیا۔
"پتا نہیں یار! عورتوں کی یہ کون سی قسمیں ہیں جنہیں گھر کی چار دیواری کے بجائے شمع محفل بننے میں زیادہ مزا آتا ہے۔" معیذ کو سیفی کی باتوں پر تاسف ہو رہا تھا۔
اسی وقت چٹاخ کی آواز کے ساتھ کسی تھپڑ کی آواز گونجی تو سب کی طرح ان کی گردن بھی ادھر کو گھومی۔
سیفی کی سیکریٹری نے خوامخواہ بے تکلف ہوتے ایک ادھیڑ عمر آدمی کو تھپڑ دے مارا تھا۔
سیفی کا نشہ ہرن ہوگیا۔ جواباً" اس نے اپنی سیکریٹری کو زوردار تھپڑ مارا تو وہ لڑکھڑا کے نیچے گر گئی۔ پھر تو سب جیسے سکتے میں آگئے۔
پھر کسی نے سیفی کو سنبھالا اور کچھ لوگ بات ختم کرانے کو بیچ میں آگئے۔
"او گاڈ! عورت کی اتنی تذلیل۔" معیذ کا دل مکدر ہونے لگا۔
وہ عون کو لیے فوراً" اٹھ گیا۔
"کوئی مجبور لڑکی ہوگی جو اس کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔" عون نے تبصرہ کیا۔ پھر الجھ کر بولا۔
"مگر یار! دور سے دیکھی دیکھی لگ رہی ہے۔ جیسے میں پہلے بھی کہیں مل چکا ہوں۔"
"تم دور سے ہی دیکھو۔ جس نے قریب سے دیکھنا چاہا۔ اس کا حال دیکھا ہے نا تم نے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆

"تم سے کس نے کہا کہ تمہاری ماں سے میری پسند کی شادی تھی۔ میری خالہ کی بیٹی تھی وہ۔ بڑوں کی خواہش پر میں نے فرماں برداری سے سر جھکا دیا تھا۔" مامون الرشید کے کہنے پر اس نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ کتنی آسانی سے انہوں نے تاریخی حقائق جھٹلائے تھے۔

"گستاخی معاف ابا جان! اماں بے شک آپ کی خالہ زاد تھیں' پڑوس میں رہتی تھیں' لیکن دادا جان اور نانا جان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی' یہ آپ کے ساتھ میں بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ دونوں ہم زلف آمنا سامنا تک پسند نہ کرتے تھے۔" اس نے اماں کی دی ہوئی معلومات کا بروقت فائدہ اٹھایا تھا۔

"ہاں' لیکن میں نے تمہاری دادی اور نانی کی خواہش پر سر جھکایا تھا۔ اپنے بچوں کو اٹوٹ رشتے میں باندھنا ان کی دلی خواہش تھی۔" مامون الرشید نے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

"بجا فرمایا آپ نے' لیکن کیا آپ یہ بتانا پسند کریں گے کہ نانا جان کی عدم موجودگی میں آپ گرما گرم سموسے اور کچوریاں لے کر نانی جان کے ہاں کیوں جاتے تھے؟ حالانکہ نانی جان کو تو بازاری پکوان سخت ناپسند تھے۔" اس نے چہک کر پوچھا تھا۔

"گرما گرم سموسوں اور کچوریوں کا یہاں کیا ذکر۔" مامون الرشید ذرا سا گڑبڑائے تھے۔

"اور اماں کی ایف اے کی انگلش کلیئر کروانے کے لیے آپ نے کیوں اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

حالانکہ آپ جانتے تھے کہ اماں کی انگریزی اتنی کمزور ہے کہ وہ قیامت تک بھی انگلش کا پیپر دیتی رہیں گی تب بھی پاس نہ ہو پائیں گی۔ آپ کو اس بات کی بھی پروا نہ تھی کہ چھ مہینے تک لگاتار دو گھنٹے روزانہ آپ اماں کو انگلش کی ٹیوشن دیتے تھے اور رزلٹ کے بعد نانا جان آپ سے پوچھیں گے نہیں کہ برخوردار آخر تم روزانہ دو گھنٹوں میں پڑھاتے کیا تھے۔" اس نے "پڑھاتے" پر زور دیتے ہوئے معنی خیز انداز میں ابا کو مخاطب کیا۔ مامون الرشید اس بار صرف اسے گھور ہی پائے۔

"اور جن دنوں آپ کے اپنے ایم اے کے فائنل پیپرز ہونے والے تھے تب آپ اماں کو پیپر دلوانے کے لیے اپنے پیچھے اسکوٹر پر بٹھا کر پانچ میل دور امتحانی سینٹر پر چھوڑنے جاتے تھے اور نہ صرف چھوڑنے جاتے تھے' گھنٹے بعد واپس بھی لینے جاتے تھے۔"

"ایک گھنٹے بعد نہیں' ڈھائی تین گھنٹے بعد۔" مامون الرشید بیٹے کی بات سن کر ماضی کی حسین یادوں میں کھو سے گئے تھے۔ درمیان میں بیٹے کی تصحیح کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ہارون نے انہیں ایسے مسکرا کر دیکھا گویا کہہ رہا ہو کہ دیکھا پکڑا گیا نا چور۔ مامون الرشید سٹپٹاتے ہوئے ماضی کی یادوں سے باہر نکلے تھے۔

"تم موضوع سے ہٹ رہے ہو۔ میں فالتو باتیں سننا پسند نہیں کرتا۔" انہوں نے اسے خشک انداز میں مخاطب کیا۔ دل ہی دل میں مرحومہ بیوی پر غصہ بھی آیا جو جانے کب بیٹے کو اپنی لو اسٹوری حرف حرف سنا چکی تھی۔

"میں تمیز الدین کو زبان دے چکا ہوں۔" وہ پھر موضوع کی طرف پلٹے تھے۔

"کیوں' ان کی اپنی زبان کہیں کھو گئی ہے کیا۔" ہارون نے چڑ کر پوچھا تھا۔

"ہارون الرشید۔" مامون صاحب دھاڑے۔ وہ خفا سا ہو کر چپ ہو گیا۔

"تمہیں سوچنے کے لیے تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔" اس بار وہ قدرے نرم پڑے تھے۔

"اور اگر تین دن بعد بھی میرا جواب انکار میں ہوا تو؟" اس نے باپ کو دیکھا۔

"تو میں تمہیں عاق کر دوں گا۔" انہوں نے سرد مہری سے باور کروایا۔

"پھر مہلت کا میں نے اچار ڈالنا ہے' رکھیں اپنے پاس ہی۔" وہ روہانسا ہو گیا تھا۔ مامون الرشید چند لمحوں تک خاموشی سے بیٹے کو تکتے رہے۔ پھر انہوں نے گہری سانس اندر کھینچتے ہوئے خود کو "کول ڈاؤن" کرنے کی کوشش کی۔

"دیکھو بیٹا ہم تین دن سے ایک لاحاصل بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ جانے کیوں تم مجھ پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہارے لیے اچھا ہی سوچوں گا نا اور میرے کون سے دو تین بیٹے ہیں۔ اکلوتی اولاد ہو تم میری۔ تمہیں کسی اچھی سی لڑکی کا ساتھ مل جائے تو تمہارے ساتھ ساتھ میری زندگی بھی پرسکون انداز میں گزرے گی۔ تمہاری ماں زندہ ہوتی تو اور بات تھی۔ کرتے پھرتے تم اپنی پسند کی شادی۔ ہم بڈھے بڑھیا ایک دوسرے کا سہارا ہوتے' لیکن اب میں تمہارے مستقبل کے بارے میں تم سے زیادہ فکر مند ہوں۔ کسی ایسی ویسی لڑکی کو پسند کر لیا تو تمہاری جوانی کے ساتھ میرا بڑھاپا بھی خراب ہو جائے گا۔ میاں! مجھے اپنے لیے خدمت گزار اور سعادت مند بہو چاہیے اور تمیز الدین کی بیٹی میں یہ دونوں خوبیاں ہیں۔ بہت پیاری بچی ہے نور العین۔ صورت اور سیرت دونوں میں یکتا۔ میں تو خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا کہ اس نے مجھے بہو ڈھونڈنے کی زحمت سے بچا لیا۔ تمہاری ماں تو ہے نہیں۔ میں کہاں تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈتا پھرتا۔ تمیز الدین نے تو مانو میری ساری پریشانی ختم کر دی۔"

"انہوں نے آپ کی نہیں اپنی پریشانی ختم کی۔" اس نے چڑ کر مامون صاحب کی بات کاٹی تھی۔ مامون الرشید نے اسے تیکھی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ "کوئی وضع دار شخص اپنی بیٹی کا رشتہ خود پیش کر سکتا ہے کیا اور آپ نے بھی جھٹ سے یہ رشتہ قبول کر لیا۔" وہ خفا ہوتے ہوئے بولا۔ مامون الرشید نے بہت مشکل سے اپنا غصہ ضبط کیا تھا۔

"تمیز الدین نے اپنی بیٹی کے لیے ہرگز تمہارا رشتہ نہ مانگا تھا۔ اس نے مجھ سے صرف یہ کہا تھا کہ میری نظر میں کوئی معقول نوجوان ہے تو میں اسے بتاؤں۔ وہ اپنی بچی کے رشتے کے لیے پریشان تھا۔"

"اور آپ نے فٹ سے میرا نام لے دیا۔ ان کی پریشانی ختم اور میری پریشانی شروع۔"

"تم مجھے اپنے انکار کی کوئی ٹھوس وجہ بتاؤ تو میں کچھ سوچ سکتا ہوں۔" مامون الرشید آج اس بحث کو منطقی نتیجے پر پہنچانے کے خواہش مند تھے' سو رسانیت سے بیٹے کو مخاطب کیا۔ "ان کی فیملی بہت کنزرویٹو ہے' میں کسی ایسے خاندان سے رشتہ نہیں جوڑ سکتا۔" اس نے قطعیت بھرا جواب دیا۔ مامون الرشید اس بار اپنا غصہ ضبط نہ کر پائے تھے۔

"تمیز الدین کا گھرانہ اسلامی اقدار سے بہرہ ور اور دین کی صحیح روح سے آشنا ہے۔ اگر کنزرویٹو سے تمہاری مراد یہ ہے کہ وہ گھرانہ دین دار گھرانہ ہے تو یہ کوئی خامی تو نہیں۔ ارے تم شکر کرو کہ تمیز الدین نے تم میں کوئی قابل ذکر خوبی نہ ہوتے ہوئے بھی تمہیں سند قبولیت بخشی' الٹا اس رشتے میں میں میخ نکال رہے ہو۔" مامون الرشید نے بیٹے کو قہربار نگاہوں سے گھورا تھا۔ وہ اس بار خاموش کھڑا رہا۔ البتہ چہرے کے زاویے بری طرح بگڑے ہوئے تھے۔

"دو تین دن تک سوچ لو صاحبزادے اگر انکار کی کوئی ٹھوس وجہ ذہن میں آتی ہے تو مجھے بتا دینا۔ ورنہ۔"

"انکار کی وجہ میں آپ کو بتا چکا ہوں ابا جان۔ تین دن بعد بھی میرا جواب یہی ہوگا۔ کیا آپ چاہتے ہیں میری زندگی کا وہی حشر ہو جو شائستہ بھابھی نے مرتضیٰ بھائی کا کیا ہے۔" اس نے جھنجلاہٹ کے عالم میں باپ کی بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا۔

"کیا ہوا ہے مرتضیٰ کی زندگی کو؟ اچھی بھلی تو گزر رہی ہے۔ شائستہ سلجھی ہوئی بچی ہے۔ سلجھے ہوئے دین دار گھرانے سے تعلق ہے۔ دو پیارے پیارے بچے ہیں۔ کیا کمی ہے مرتضیٰ کی زندگی میں۔" مامون

الرشید اچنبھے کے عالم میں پوچھ رہے تھے۔ ہارون بس انہیں دیکھ کر ہی رہ گیا وہ جو فیصلہ کر چکے تھے اس سے پیچھے ہٹنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ چاہے وہ کتنی ہی دلیلیں دے کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرلیتا۔ اب اسے اپنی حکمت عملی تبدیل کرنی پڑے گی۔ فی الوقت تو دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ اس سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ وہ ان کے ساتھ مزید نہ الجھ سکتا تھا۔ سو منظر سے ہٹ جانے میں ہی عافیت جانی تھی۔ "میں چلتا ہوں۔" نروٹھے پن سے انہیں مخاطب کر کے وہ کمرے سے نکلنے لگا۔

"تین دن کی مہلت ذہن میں رکھنا برخوردار۔" انہوں نے پیچھے سے پکارا۔ ہارون نے مڑ کر جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لاؤنج میں بھولا بیٹھا سبزی بنا رہا تھا۔ ہارون کو آتے دیکھا تو مصنوعی فکرمندی چہرے پر طاری کی۔

"خیر تو ہے ہارون بھائی۔" بڑے صاحب بہت زور زور سے بول رہے تھے۔ آوازیں یہاں لاؤنج تک آرہی تھیں۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ اس نے بہت تشویش کے عالم میں دریافت کیا تھا۔

"اگر تمہارا نام بھولا پڑ ہی گیا ہے تو ہر وقت بھولپن کی ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں بھولے۔ جب تمہارے کانوں تک آوازیں پہنچ رہی تھیں تو ماجرے کا بھی تمہیں بخوبی علم ہو گا۔ فالتو سوال کر کے میرا دماغ نہ کھاؤ اور آکر دروازہ بند کرو‘ میں باہر جا رہا ہوں۔" وہ درشتی سے کہتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھا۔

بائیک روڈ پر لایا تو ارادہ دوستوں کی طرف جانے کا تھا۔ مگر یار دوست منہ کے بگڑے زاویے دیکھ کر اس کی وجہ ضرور دریافت کرتے‘ پھر اس کا خوب مذاق بھی اڑاتے۔ موڈ خوش گوار ہوتا تو چلو دوستوں کے ہنسی مذاق کو بندہ انجوائے کرلیتا‘ لیکن اس وقت تو وہ غصے اور بے بسی کی انتہاؤں پر تھا۔ اگر چار سال پہلے اماں داغ مفارقت نہ دے چکی ہوتیں تو وہ اپنی بات منوانے کے لیے ان ہی کا سہارا لیتا کہ سخت مزاج ابا حضور صرف ان ہی کے سامنے موم بن جاتے تھے انہیں اماں سے کتنی محبت تھی‘ یہ بات وہ بخوبی جانتا تھا۔ اکلوتی اولاد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اماں کی گہری سہیلی کے رتبے پر بھی فائز تھا اور کتنی ہی بار اماں شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اسے اپنی اور مامون الرشید کی لو اسٹوری سنا چکی تھیں۔ وہ بھی نہایت دلچسپی سے محبت کی یہ معصوم داستان سنتا۔ جس کا آغاز گرما گرم سموسوں اور کچوریوں سے ہوا تھا اور اختتام نکاح کے دو بولوں پر۔ حالانکہ ہارون کے نانا اور دادا ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ ہارون کی نانی اور دادی نے اپنے اختیارات استعمال کر کے محبت کی اس معصوم کہانی کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیا اور حیرت انگیز طور پر جب دونوں ہم زلف سمدھی بنے تو تعلقات میں کافی بہتری آئی‘ پہل نانا مرحوم کی طرف سے ہوئی‘ وہ بیٹی کے باپ تھے سو تلخ نوائی چھوڑ کر شیریں بیانی کا سہارا لیا اور دادا جی مرحوم کی اعلا ظرفی کہ انہوں نے پھر کبھی سمدھی کے خلاف محاذ نہ کھولا۔ یوں مامون الرشید اور عائشہ بیگم کی محبت کا انجام بخیر ہوا‘ لیکن اپنی جوانی میں محبت کو پالینے والے ابا ادھیڑ عمری میں ایسے سخت دل نکلے کہ ہارون کسی حسین مہ جبین کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کا روادار نہ ہو سکا۔ حالانکہ ابا کی طرح اسے بھی محبت اور محبت کی شادی کا از حد ارمان تھا۔ یونیورسٹی لائف میں اس کی ڈیشنگ پرسنالٹی پر بہت سی لڑکیاں مرمٹی تھیں‘ وہ تو اسے مامون الرشید کے ہاتھوں مرمٹنے کا شوق نہ تھا۔ سو لڑکیوں سے دامن بچاتے بچاتے دوستوں کے حلقے میں زاہد خشک کے خطاب سے نوازا گیا‘ لیکن دل میں تو ارمان دبے تھے نا۔

مامون الرشید کو اس کے ارمانوں سے یقیناً" کوئی سروکار نہ تھا۔ ان کے نزدیک صرف اپنی زبان کی اہمیت تھی۔ جو وہ تمیزالدین صاحب کو دے چکے تھے۔ تمیزالدین ان کے دیرینہ دوست تھے۔ والد بزرگوار کی دوستی کے لحاظ میں ہارون بھی ہمیشہ ان سے بہت تمیز اور

تہذیب سے پیش آتا۔ ہفتے میں ایک بار تمیز الدین صاحب کا ان کی طرف چکر لگتا تو دو بار مامون الرشید ان کے دولت کدے کو رونق بخشتے۔ ہارون کبھی باپ کو لے کر ان کے ہاں جاتا تو کبھی تمیز الدین صاحب کو گھر ڈراپ کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کے سر آتی، لیکن آج تک اس نے ان کے گھر کی دہلیز عبور نہ کی تھی۔ اسے ہمیشہ دروازے سے ہی رخصت کر دیا جاتا، وہ کبھی کبھار مامون الرشید سے شکوہ بھی کرتا۔

"اتنی گرمی میں آپ کے دوست کو چھوڑ کر آرہا ہوں، لیکن مجال ہے جو ایک گلاس پانی پلانے کے لیے دو گھڑی گھر کے اندر بلایا ہو۔ آج میں نے اپنے منہ سے پانی مانگا تو کسی بچے کو آواز دے کر دروازے پر ہی پانی کی بوتل اور گلاس منگوالیا اور جیسے ہی میں نے پانی پیا فوراً" میرے ہاتھ سے گلاس لیا اور "شکریہ بیٹے تم نے اتنی گرمی میں مجھے چھوڑنے کی زحمت کی" کہہ کر کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے آپ کے دوست سے اتنی بے مروتی کی توقع نہ تھی ابا جان۔" وہ افسوس اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں باپ کو مخاطب کرتا۔

"ہاں تو اور کیا کرتا تمیز الدین! بچیوں والا گھر ہے اور پھر گھر میں پردے کی سخت پابندی کی جاتی ہے۔ جوان جہان لڑکے کو گھر کے اندر کیسے گھسائے وہ۔" مامون الرشید پر اس کی ناراضی کا مطلق اثر نہ ہوتا اور خیر وہ بھی بات کر کے بھول بھال جاتا۔ تمیز الدین صاحب یا ان کے خاندان سے اسے کیا لینا دینا تھا۔ صحیح معنوں میں حواسوں پر بم تو تب گرا، جب مامون الرشید نے اسے آگاہ کیا کہ وہ تمیز الدین صاحب کی بیٹی سے اس کا رشتہ طے کرنے والے ہیں۔ وہ دن اور آج کا دن گھر میں نہ ختم ہونے والی بحث چھڑ چکی تھی۔ وہ انکار کر کر کے تھک چکا تھا۔ مگر مامون الرشید اپنے اقرار پر ڈٹے ہوئے تھے۔ اگر وہ اس کے لیے کوئی ڈھنگ کا گھرانہ ڈھونڈتے تو ہو سکتا ہے ہارون ان کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا، اصل مسئلہ یہی تھا کہ تمیز الدین فیملی کسی طور ہارون کے معیار پر پوری نہ اترتی تھی۔ وہ جدید دور کا لڑکا تھا۔

شریک حیات کے حوالے سے اس کے کچھ خواب تھے۔ سولہویں صدی کے کسی نمونے سے شادی کرنے سے بہتر تھا کہ وہ کنوارا ہی رہ جاتا، پھر خاندان میں شائستہ بھابھی کی صورت ایسی مثال موجود تھی جس کو دیکھتے ہوئے وہ کسی دقیانوسی گھرانے میں شادی پر تیار نہ ہو سکتا تھا۔ شاید تمیز الدین فیملی سے اس کے اتنا چڑنے کی وجہ بھی اس کے لاشعور میں چھپا یہی خوف تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ اس کی شادی شدہ زندگی مرتضیٰ بھائی کی طرح گزرے۔ مرتضیٰ بھائی بڑی پھوپھو کے منجھلے صاحبزادے تھے۔ شادی سے پہلے کیا شوخ طبیعت پائی تھی۔ بذلہ سنج، حاضر جواب، پہننے اوڑھنے کے شوقین۔ اچھی خاصی پرسنالٹی کے مالک تھے۔ پھوپھو نے ان کے لیے اپنی رشتے کی نند کی بیٹی کا انتخاب کیا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ شائستہ بھابھی کا خاندان دین کی طرف رجحان رکھنے والا خاندان ہے۔ خود شائستہ میں بھی خاندان کا رنگ جھلکتا تھا۔ وہ حافظہ قرآن تھیں۔ پنج وقتہ نمازی، بچیوں کے دینی مدرسے میں پڑھاتی تھیں۔ دینی محافل میں درس دینے کے لیے بلائی جاتی تھیں۔ اس وقت ہارون کو یہ باتیں قطعاً" قابل اعتراض نہ لگتی تھیں۔ لیکن جب مرتضیٰ بھائی کی شادی شدہ زندگی کا حال سامنے آیا تو وہ قطعاً" خوش گوار نہ تھا۔ شائستہ بھابھی خود کو بہت عالم فاضل سمجھتی تھیں اور دوسروں کو جاہل مطلق۔

اچھے بھلے مسلمانوں کو اپنی بنائی ہوئی دین کی کسوٹی پر پرکھتیں اور مسترد کر دیتیں۔ مرتضیٰ بھائی پر مسلسل طنز اور طعنوں کی بوچھاڑ کیے رکھتیں۔ مرتضیٰ کو زبردستی اپنی لائن پر لانے کی کوشش میں وہ اپنے ساتھ ساتھ انہیں دین سے بھی برگشتہ کر بیٹھیں۔ پہلے مرتضیٰ بھائی پانچ میں سے دو تین نمازیں تو پڑھ ہی لیتے تھے۔ اب جمعہ کی نماز کے لیے بھی مشکل سے گھر سے نکلتے۔ گھر کا حال ہر وقت ابتر رہتا۔ شائستہ بھابھی خود دینی محفلیں اٹینڈ کرنے نکل جاتیں پیچھے گھر کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ پھوپھو جو بڑے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ مجبوراً" مرتضیٰ بھائی کے پاس آکر رہنے لگیں۔ انہوں نے شائستہ کا انتخاب کیا سوچ کر کیا تھا اور وہ کیا نکلیں۔ بے چاری ٹھنڈی آہیں بھرنے کے سوا کچھ نہ کر سکتی تھیں۔

ہارون کی پہلے مرتضیٰ بھائی سے اچھی خاصی دوستی تھی، لیکن اب وہ شائستہ بھابھی کی وجہ سے وہاں جانے سے اجتناب کرتا تھا۔ وہ نصیحتیں کرنے سے باز نہ آتی تھیں اور ہارون کو ان کی نصیحتوں میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور تمیز الدین فیملی سے رشتہ جوڑنے کا مطلب تھا کہ شائستہ بھابھی جیسی کوئی خاتون اس کے سر پر مسلط ہو جائے۔ زندگی انسان کو ایک بار ملتی ہے۔ ایک غلط فیصلہ کر لیا جائے تو خمیازہ عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بات وہ اپنے ابا حضور کو کیسے سمجھاتا۔

☼ ☼ ☼

اس نے پھوپھو سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ شاید جو بات وہ اپنے والد بزرگوار کو نہ سمجھا پا رہا تھا، وہ پھوپھو اپنے برادر محترم کو سمجھا دیتیں۔ اسے پھوپھو کی مدد درکار تھی۔ وہ ان کا لاڈلا بھتیجا تھا۔ اس مشکل وقت میں وہ ضرور اس کے کام آتیں۔ جس وقت پھوپھو کے ہاں پہنچا خوبیٔ قسمت شائستہ بھابھی گھر پر موجود نہ تھیں۔ پانچ سالہ زوہیب اور چار سالہ کاشان کارٹون دیکھنے میں مگن تھے۔ پھوپھو پاس بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر دادی اور پوتے خوش ہو گئے۔

"بہت دنوں بعد شکل دکھائی۔" اس کے سلام کا جواب دے کر پھوپھو نے شکوہ کیا تھا۔ وہ دل میں شرمندہ ہو گیا۔ آج بھی اس کی اپنی غرض یہاں کھینچ لائی تھی۔

"بس پھوپھو کیا بتاؤں، آپ کے بھیا حضور نے زندگی کو مشکل میں ڈالا ہوا ہے۔ کسی چیز کا ہوش ہی نہیں رہا مجھے۔" اس نے سرد آہ بھر کر پھوپھو کو مخاطب کیا۔

"کیوں ایسا کیا کر دیا میرے بھیا حضور نے؟" پھوپھو نے مسکرا کر پوچھا۔

"بتاتا ہوں پھوپھو! ذرا تفصیل طلب بات ہے، پہلے میں اپنے پارٹنرز سے تو مل لوں۔"

اس نے کاشان کو گود میں بٹھایا اور زوہیب کو بھی ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب کیا۔

"کتنے اچھے کارٹون آرہے ہیں مرتضیٰ چاچو! مما گھر پر نہیں ہیں نا اس لیے ہم کارٹون دیکھ رہے ہیں۔ مما تو ٹی وی دیکھنے نہیں دیتیں۔" زوہیب نے اسے مخاطب کیا۔

"مما کے ہوتے ہوئے کارٹون دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے پارٹنر!" اس نے پیار سے اس کے بال بکھیرے۔

"ہارون۔" پھوپھو کو ہنسی تو آئی مگر اسے تنبیہی انداز میں ٹوکے بنا نہ رہ پائیں۔

"دادو ہمارے لیے چوڑے (پکوڑے) بنا رہی ہیں، آپ بھی چوڑے کھائیں دے نا ہارون چاچو۔" کاشان نے پوچھا تھا۔

"آپ کی دادو کے ہاتھ کے چوڑے ضرور کھائیں گے۔ پھر آپ لوگوں کو بائیک پر باہر گھما کر بھی لائیں گے، پہلے آپ کی دادو سے اپنا مسئلہ ڈسکس کر لیں۔" وہ پھوپھو کی طرف مڑا تھا اور پھر مختصراً" انہیں اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تھا۔

"میں بہت امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں پھوپھو۔ ابا جان کو سمجھائیں کہ وہ اپنا فیصلہ بدل ڈالیں۔ ورنہ میرا حال بھی مرتضیٰ بھائی والا ہو گا۔ میری تو اماں بھی حیات نہیں، جو میرے بچوں کو چوڑے (پکوڑے) بنا کر کھلا سکیں۔ تمیز الدین صاحب کا خاندان بالکل شائستہ بھابھی کے خاندان جیسا ہے اور تو اور تمیز الدین صاحب وضع قطع کے اعتبار سے بھی شائستہ بھابھی کے والد میں ملتے ہیں۔ اگر ان کی دختر بھی شائستہ بھابھی جیسی ہوئی تو میں تو بے موت ہی مارا جاؤں گا۔"

"تمہارے مفروضے بے بنیاد بھی تو ہو سکتے ہیں میرے چاند۔ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔" ساری کتھا سن کر پھوپھو نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

"یہ محاورہ میری سمجھ سے تو باہر ہے پھوپھو۔ پانچوں انگلیاں برابر ہی تو ہوتی ہیں' یہ دیکھیں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں ملائی تھیں۔ پھوپھو کو ہنسی آگئی تھی۔

"بس آپ پہلی فرصت میں ہمارے گھر آئیں۔ ابا جان کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ وہ میری تو بات سننے تک کے روادار نہیں۔"

"اچھا تم فکر نہ کرو' میں آؤں گی مامون بھائی سے بات کرنے۔" پھوپھو نے اسے تسلی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وعدے کے مطابق پھوپھو اگلے ہی دن آگئی تھیں۔ ہارون کو امید تھی کہ مامون الرشید بہن کی بات کو سنجیدگی سے سنیں گے۔ لیکن اس کی حیرت اور افسوس کی کوئی حد نہ رہی' جب انہوں نے پھوپھو کی بات کو بہت سرسری انداز میں سنا تھا۔

"میں اس کا باپ ہوں' اس کے لیے کوئی نامناسب فیصلہ کیوں کرنے لگا۔ اس قصے کو چھوڑو' تم یہ بتاؤ' مجتبیٰ کا کاروبار کیسا جارہا ہے' کچھ دنوں پہلے میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی' تو کچھ پریشان لگ رہا تھا۔" مامون الرشید نے عفت سے ان کے بڑے بیٹے کی بابت دریافت کیا تھا۔

"ہاں بھائی! مارکیٹ کی ایک پارٹی پیسے دبا کر بیٹھی تھی' مگر اللہ کا شکر ہے معاملہ حل ہوگیا۔" پھوپھو نے جواب انہیں دیا تھا' مگر دیکھ وہ ہارون کی طرف رہی تھیں جو منہ پھلائے بیٹھا تھا۔

"شادی زندگی بھر کا معاملہ ہے بھائی! اگر ہارون کے دل کی خوشی نہیں ہے تو زبردستی کیوں کرتے ہیں اس کے ساتھ؟" خفا بھتیجے کی شکل پر نظر ڈالتے ہوئے عفت نے ایک بار پھر مامون صاحب کو موضوع کی طرف لانے کی کوشش کی۔

"تو ہارون کے دل کی خوشی کیا ہے؟ یہ کہاں شادی کرنا چاہتا ہے؟ بتائیے مجھے اس لڑکی کا نام پتا۔۔۔ میں وہاں رشتہ لے جاتا ہوں۔" مامون الرشید نے بھی خفگی سے بیٹے کو دیکھا تھا۔

"لڑکی پسند کرنے کی آپ نے مجھے اجازت ہی کب دی ابا جان! یونیورسٹی میں ایک سے ایک اچھی لڑکی موجود تھی' لیکن کالج' یونیورسٹی کی محبت کو تو آپ خرافات گردانتے تھے۔ آپ کے نزدیک تو صرف خالہ کی بیٹی سے محبت شرعاً "جائز" ہے۔ اب میری کوئی خالہ ہی نہیں تو بیٹی۔۔۔"

"ہارون الرشید۔" اس کی بے سروپا بات پر مامون الرشید اسے خفگی سے ٹوکے بنا نہ رہ پائے۔

"میں نے تمہیں کب کہا کہ خالہ کی بیٹی سے محبت جائز ہے؟" وہ بہن کے سامنے اس ذکر پر ذرا جزبز ہوئے تھے۔

"لیں' یعنی وہ بھی ناجائز ہے۔" ہارون نے حیرت سے آنکھیں پھاڑیں۔ عفت نے بہت مشکل سے ہنسی ضبط کی تھی۔ دونوں باپ بیٹا کس لایعنی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

"بہرحال میں آپ کو بتائے دیتا ہوں کہ مجھے پڑھی لکھی' خود اعتماد اور ماڈرن بیوی چاہیے' تمیز الدین صاحب کی بیٹی سے شادی کرکے میں نے لوگوں میں اپنا مذاق نہیں بنوانا۔" وہ نروٹھے پن سے قطعیت بھرے انداز میں بولا۔

"پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔" مامون الرشید کو اس بار صحیح معنوں میں تاؤ چڑھا تھا۔ "تم نے نور العین کو دیکھا تک نہیں۔ اپنے ذہن میں اس کا فرضی خاکہ بنا رکھا ہے' کبھی اسے شائستہ سے ملاتے ہو' کبھی کوئی اور بے پر کی اڑاتے ہو۔ محض مفروضوں کی بنیاد پر ہیرے جیسی لڑکی کا ساتھ ٹھکرا رہے ہو۔ عفت سمجھاؤ تم ہی اپنے بھتیجے کو۔" مامون الرشید نے بہن کو مخاطب کیا۔

وہ بے چارگی سے بھائی اور بھتیجے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ دونوں کے درمیان چھڑی بحث میں انہیں اپنا وجود بالکل بے معنی لگ رہا تھا' لیکن بالکل غیر متوقع طور پر ہارون نے اپنی ٹون بدلی تھی۔

"آپ نے مجھے تین دن کی مہلت دی تھی نا ابا جان۔ ابھی ڈیڑھ دن باقی ہے' میں اس پرپوزل پر مزید غور کرتا ہوں ان شاء اللہ کل شام کو اپنے جواب سے آگاہ کردوں گا۔" اس نے اس بار بہت ادب اور تمیز سے باپ کو مخاطب کیا۔ عفت نے حیران ہو کر بھتیجے کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بتا رہی تھی کہ ان کا یہ ہونہار اور ذہین بھتیجا کچھ سوچ چکا ہے۔ مامون الرشید البتہ اس جواب پر خوش ہوگئے تھے۔

"میں اپنی بات پر قائم ہوں کل مہلت کا آخری دن ہے۔ مجھے قائل کرنے کے لیے کوئی معقول دلیل ذہن میں آئے تو میرے پاس آنا ورنہ تمہاری پھوپھو نور العین کو انگوٹھی پہنا کر شادی کی تاریخ طے کر آئیں گی۔"

مامون الرشید نے اسے مخاطب کیا۔ وہ سنجیدگی سے سر ہلا کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

اگلی شام کو کہنے کے مطابق وہ مامون الرشید کے کمرے میں حاضری دینے پہنچ گیا تھا۔ مامون الرشید کتاب پڑھنے میں مشغول تھے اس کی آمد پر کتاب اپنے سرہانے رکھی اور پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"تم یقیناً" اپنے جواب سے آگاہ کرنے آئے ہو اور مجھے یقین ہے کہ یہ جواب اثبات میں ہی ہوگا۔" انہوں نے اسے مخاطب کیا لیکن ان کے چہرے سے ہی ظاہر تھا کہ اپنی کسی بات کے بارے میں وہ خود زیادہ پُریقین نہیں جب ہی ہارون کی بات سن کر انہیں حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

"واقعی تم اس رشتے پر بخوشی راضی ہو؟؟" انہیں لگا کہ انہیں سننے میں کچھ غلطی ہوئی ہے۔ تب ہی حیرت اور خوشی سے دوبارہ بیٹے کو مخاطب کیا۔

"بالکل ابا جان! میں راضی ہوں' لیکن میری ایک شرط بھی ہے۔" ہارون نے انہیں مزید خوش کرنا مناسب نہ سمجھا تھا۔

"کیسی شرط؟" مامون الرشید نے اسے عینک کے شیشوں کے اوپر سے جھانکا۔

"آپ نے کہا تھا نا کہ میں نور العین کو بغیر دیکھے کیسے اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگا سکتا ہوں' بس اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شادی سے پہلے کم از کم ایک بار نور العین کو دیکھ لوں۔ تصویر نہیں بلکہ بالمشافہ ملاقات۔" اس نے رک رک کر مگر ٹھوس لہجے میں باپ کو مخاطب کیا۔

"تم جانتے ہو' تم کیا کہہ رہے ہو؟" کچھ لمحوں تک اسے خونخوار نگاہوں سے تکنے کے بعد وہ سرد لہجے میں بیٹے سے مخاطب ہوئے۔

"مجھے بخوبی احساس ہے کہ میں کیا کہہ چکا ہوں۔ میں اپنی ہونے والی شریک حیات کو ایک بار دیکھنا چاہتا ہوں' یہ میرا شرعی حق ہے' جس سے نہ آپ مجھے روک سکتے ہیں' نہ تمیز الدین صاحب کو اس بات پر اعتراض ہونا چاہیے۔ میں ان کی بیٹی سے صرف اسی صورت شادی کروں گا' اگر وہ مجھے اس سے ملاقات کی اجازت مرحمت فرمادیں گے۔"

وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔ مامون الرشید خاموشی سے بیٹے کا چہرہ تکتے رہے۔ وہ ان کی شکوہ کناں نگاہوں کا مفہوم سمجھ سکتا تھا۔ دل میں ذرا سا احساس ندامت جاگا جس کو اس نے فوراً" ہی تھپک کر سلا بھی دیا۔

"میں نے تمہارے لیے جو مناسب سمجھا وہی فیصلہ کرنا چاہا' لیکن تم نئی نسل کے لوگ' جانے کیوں والدین کی پسند پر بھروسا نہیں' ٹھیک ہے' میاں! جاؤ خوش رہو۔" مامون الرشید نے ٹھنڈا سانس بھرا' پھر دوبارہ سرہانے رکھی کتاب اٹھالی۔

ہارون بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہا۔ آج کا معرکہ اتنی جلدی نمٹ جائے گا۔ اسے اندازہ ہی نہ تھا۔ وہ چند لمحوں تک منتظر کھڑا رہا کہ شاید مامون الرشید کچھ اور کہیں۔ لیکن وہ لب بھینچے کتاب کی ورق گردانی میں مشغول ہو گئے۔

ہارون چپ چاپ وہاں سے کھسک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے انہیں بہت ہرٹ کیا ہے' لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ مامون الرشید اس سے زیادہ دنوں کے لیے خفا نہ رہ پائیں گے۔ سو وہ دل میں اٹھتی پچھتاوے کی لہر کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

آج بہت دنوں بعد اس کا ذہن ہر قسم کی فکر سے آزاد تھا۔ اتنے دنوں سے بلاوجہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہا تھا۔ یہ معاملہ اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

"واہ ہارون میاں واہ! اسے کہتے ہیں عقل کا درست اور بروقت استعمال۔" اس نے خود کو شاباشی دی تھی۔ اس رات وہ بہت گہری اور پرسکون نیند سویا تھا۔

اگلے دن آفس میں بھی اس کا موڈ بہت خوش گوار رہا۔ آفس سے واپسی پر دوستوں کی طرف نکل گیا۔ وہاں باہر ڈنر کا پروگرام بن گیا۔ اس نے دیر سے آنے کا جتانے کے لیے گھر فون کیا۔ فون بھولے نے اٹھایا تھا۔

"بڑے صاحب تو تمیز الدین صاحب کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ وہ آئیں گے تو میں انہیں بتا دوں گا کہ آپ دیر سے آئیں گے۔ پھر آپ کی روٹی تو نہ پکاؤں نا ہارون بھائی۔" بھولے نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں' میں کھانا باہر ہی کھاؤں گا۔" اس نے بشاش لہجے میں جواب دیا تھا۔

کتنی طمانیت ملی تھی یہ خبر سن کر کہ مامون الرشید اس وقت تمیز الدین صاحب کے ہاں گئے ہیں۔ وہ جانے اپنے دوست سے کن الفاظ میں معذرت کریں گے' یہ تو یقیناً "نہ کہہ پائیں گے کہ ان کا ناخلف بیٹا تمیز الدین صاحب کی بیٹی سے بالمشافہ ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ پھر انکار کا کیا سبب بتائیں گے۔ کچھ لمحوں تک وہ سوچتا رہا تھا۔ پھر ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ مامون الرشید کا مسئلہ تھا اس کا نہیں۔ وہ دوستوں کی کمپنی انجوائے کرنے لگا۔ رات گئے اس کی واپسی ہوئی تھی۔

"ابا جان آ گئے؟" اس نے پوچھا۔

"کب کے آ گئے جی۔ اب تو سو رہے ہیں۔ میں آپ کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔" بھولے نے بڑی سی جمائی لیتے ہوئے کہا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح مامون صاحب نے اس کے دروازے پر زوردار دستک دیتے ہوئے اسے باآواز بلند پکارا تھا۔

"آج سنڈے ہے ابا جان! آفس کا آف۔" اس نے نیند میں جھومتے ہوئے بمشکل دروازہ کھول کر انہیں آگاہ کیا۔ وہ جب سے ریٹائر ہوئے تھے۔ دنوں کی گنتی اکثر بھول جاتے تھے۔

"میں ناشتے کی میز پر انتظار کر رہا ہوں۔ فریش ہو کر فوراً آؤ۔" مامون صاحب نے گویا اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ اس نے اثبات میں سر تو ہلا دیا۔ لیکن جیسے ہی مامون صاحب پلٹے وہ بنا دروازہ بند کیے واپس آ کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ نیند کا سلسلہ جہاں سے ٹوٹا تھا وہیں سے جڑ گیا۔ بمشکل پانچ سات منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ مامون الرشید پھر اس کے سرہانے کھڑے اس کا شانہ ہلا رہے تھے۔

"دس بجنے والے ہیں۔ ہارون! اور گیارہ بجے تمہاری ملاقات ہے۔"

"میری ملاقات۔ مگر کس سے؟" اس نے مندی مندی آنکھیں کھول کر پوچھا۔

"آج گیارہ بجے تمہیں نور العین سے ملنے جانا ہے۔"

"ملنے تو میں چلا جاؤں گا' مگر آپ نے کیا کہا کس سے ملنے جاؤں؟" وہ یقیناً "ابھی تک حالت نیند میں ہی تھا۔

"نور العین' تمیز الدین کی دختر" آج تم تمیز الدین کے ہاں مدعو ہو۔" مامون الرشید نے اسے سنجیدگی سے آگاہ کیا اور اس کی نیند تو جیسے ٹھک سے اڑ گئی۔ نیند بھی اور شاید دماغ کا فیوز بھی' جب ہی تو حیران پریشان نگاہوں سے باپ کو تکتا رہا۔

"ہاں۔ تم نے ہی خواہش ظاہر کی تھی اس سے ملنے کی۔ آج گیارہ بجے وہاں چلے جانا۔"

مامون الرشید کہہ کر واپس پلٹ گئے تھے۔ وہ چند لمحوں تک وہیں کھڑا حیرت کے سمندر میں غوطہ زن رہا۔ پھر ان کے پیچھے ہی باہر لپکا تھا۔ مامون صاحب ناشتے کی میز کے پاس پہنچ چکے تھے۔ بھولا ٹیبل پر ان کا ناشتا لگا رہا تھا۔

"وہ مان گئے ابا؟" ہارون نے روہانسا ہو کر پوچھا۔ مامون الرشید نے کرسی سنبھالتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"لیکن وہ میرا مطلب ہے کہ میں یعنی اگر میں۔" بوکھلاہٹ میں اس کے منہ سے خاصا بے ربط سا فقرہ نکلا تھا۔

"ہاں برخوردار! تمہارا مطالبہ اتنا ناجائز بھی نہ تھا۔ یہ حق تمہیں تمہارے مذہب نے دیا ہے اور تمیز الدین فیملی مذہب پر صرف نام کی حد تک عمل پیرا نہیں' بلکہ وہ مذہب کی صحیح روح سے آشنا ہے۔"

مامون الرشید کو تو موقع ملنا چاہیے تھا۔ تمیز الدین فیملی کی شان میں قصیدے پڑھنے کا' ہارون کی تو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ آگے کیا کہے۔ اس کی چال اسی پر الٹ چکی تھی اور کتنے بھولے تھے اس کے ابا جان۔ تمیز الدین صاحب کے ہاتھوں بے وقوف بنتے جا رہے تھے۔ اپنے خوبرو' پڑھے لکھے اور برسر روزگار بیٹے کو پلیٹ میں رکھ کر انہیں پیش کرنے جا رہے تھے جانے ان کی بیٹی میں کیا کمی تھی جو اسے رشتہ مل کر نہیں دے رہا تھا۔ جب ہی تو وہ ہارون سے ملاقات تک کروانے پر رضامند ہو گئے تھے۔ سوچ سوچ کر ہارون کی بے بسی اور جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

"ہارون بھائی! آپ کا ناشتا بنا دوں۔" بھولے نے اسے مخاطب کیا۔

"میرا تو خیال ہے ناشتا رہنے دو' تمیز الدین کے ہاں تم ظہرانے پر مدعو ہو اور وہ لوگ کھانا جلد کھانے کے عادی ہیں۔"

"آپ نے تو کہا تھا کہ گیارہ بجے مجھے وہاں جانا ہے۔" اس نے غصے میں باپ کو مخاطب کیا۔

"وہ تو تمہیں جگانے کے لیے کہا تھا۔ گیارہ نہ سہی بارہ بجے تک تمہیں وہاں موجود ہونا ہے۔" انہوں نے کہا۔ وہ بے دم سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

"پھر ناشتا رہنے دوں صاحب؟" بھولے نے مطلب کی بات پوچھی۔ ہارون نے بنا جواب دیے اسے گھورنے پر اکتفا کیا تھا۔

"بھولے بیٹا! کمرے سے میرا چشمہ اور گھڑی اٹھا لاؤ۔" مامون الرشید کا ناشتا ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے بھولے کو مخاطب کیا۔ وہ تابع داری سے سر ہلاتا ان کے کمرے کی طرف مڑا تھا۔

"سوچ رہا ہوں' پہلے ڈاکٹر حیات کی طرف چلا جاؤں۔ صبح سے سر میں درد محسوس ہو رہا ہے' کہیں بلڈ پریشر نہ بڑھ رہا ہو۔"

انہوں نے خود کلامی کی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو ہارون تشویش میں مبتلا ہو کر باپ کی خیریت ضرور دریافت کرتا۔ دوا میں بے قاعدگی کرنے پر انہیں ذرا سی ڈانٹ پلاتا' پھر خود انہیں ڈاکٹر حیات کے کلینک لے جاتا' لیکن آج وہ دل کی تشویش دل میں دبائے بے زار شکل بنائے بیٹھا رہا۔

بھولے نے مامون الرشید کو عینک اور گھڑی لا تھمائی تھی۔ وہ ہارون پر اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ذرا ٹائم سے نکل جانا بیٹے! اور ذرا ڈھنگ کے حلیے میں جانا۔ اب معاملہ صرف تمہارے دیکھنے تک محدود نہیں رہا' ظاہر ہے بچی بھی تمہیں دیکھے گی تو تمہیں اس کے معیار پر بھی پورا اترنا ہو گا۔" انہوں

نے اسے مخاطب کیا۔ ہارون نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر انہیں دیکھا مگر چپ ہی رہا۔

"اور بے فکر ہو کر جاؤ۔ میں اور تمیز الدین آج اسلام صاحب کا حال پوچھنے جائیں گے۔ جس وقت تم تمیز الدین کے ہاں جاؤ گے' وہ گھر پر موجود نہیں ہوگا۔ ہم دونوں نے یہی مناسب سمجھا۔ اس طرح نہ تمہیں الجھن ہوگی' نہ تمیز الدین کو' امید ہے تمہاری آج کی ملاقات بخیر و خوبی نمٹے گی۔"

مامون الرشید اسے رسانیت سے آگاہ کرتے ہوئے چلتے بنے۔ ان کے جانے کے بعد وہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔ کچھ لمحوں بعد خالی پیٹ کی صدا سنی تو دھاڑا تھا۔

"بھولے"

"جی ہارون بھائی!" بھولا کچن میں تھا' وہیں سے جوابی ہانک لگادی تھی۔

"دو پراٹھے اور آملیٹ' دو منٹ کے اندر ٹیبل پر موجود ہونے چاہئیں۔" اس نے وارننگ کے سے انداز میں ناشتا مانگا تھا۔

"آپ پہلے بتاتے جی۔ جب بڑے صاحب نے کہا تھا ناشتا رہنے دو۔ تب چپ رہے اب میں ناشتا کرنے لگا ہوں۔ دو ہی انڈے بچے تھے۔ میں نے اپنے لیے آملیٹ بنا لیا۔ آپ یوں کریں' نکڑ والی دکان سے دو انڈے پکڑ لائیں' میں جلدی جلدی ناشتا کر کے آپ کا بھی ناشتا بنا دوں گا۔"

بھولے نے جیسے احسان عظیم کیا تھا۔ ہارون کرسی کو ٹھوکر مارتا ہوا اٹھا۔ ٹھوکر ذرا زور سے لگی پاؤں کا انگوٹھا دکھنے لگا تھا۔ کمرے میں واپس آکر بیڈ پر ڈھے سا گیا۔ کچھ دیر بعد جھنجلاتے ہوئے اٹھا تھا۔ وارڈ روب کھول کر سب سے گھسی پٹی جینز کے ساتھ ایک ٹی شرٹ کھینچ کر باہر نکالی۔ واش روم میں شاور کے نیچے کھڑے ہو کر وہ پانی کے ساتھ اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ بھی بہا دینا چاہتا تھا۔ کافی دیر تک بھی جب وہ واش روم سے نہ برآمد ہوا تو بھولے نے تشویش کے عالم میں باتھ روم کا دروازہ بجا دیا تھا۔

"آجائیں ہارون بھائی! غصہ تھوک دیں۔ میں نے ناشتا بنا دیا ہے۔" وہ تولیے سے سر رگڑتا باہر نکلا' بھولے کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا۔ پھر چپ چاپ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال بنائے' والٹ اور بائیک کی چابی اٹھائی۔

ہارون جلتا بھنتا گھر سے باہر نکلا تھا۔ کتنی دیر تک سڑکوں پر فضول میں بائیک دوڑاتے ہوئے پیٹرول برباد کرتا رہا۔ پھر غصے کے عالم میں بائیک تمیز الدین صاحب کے گھر کی طرف موڑ دی۔

"ٹھیک ہے یوں تو یوں ہی سہی۔" وہ دل میں سوچ چکا تھا کہ اپنی بے زاری اور ناگواری تمیز الدین صاحب کی بیٹی پر ظاہر کر دے گا۔ لڑکی عقل مند ہوئی تو خود ہی پیچھے ہٹ جائے گی۔ بھلے سے بعد میں علم ہونے پر مامون الرشید خفا ہوتے رہیں۔ زیادہ سے زیادہ دس پندرہ دن تک خفا رہ لیتا تھا۔ انہوں نے۔

☼ ☼ ☼

بائیک ایک طرف کھڑی کر کے دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا تھا۔ تمیز الدین صاحب کا آٹھ نو سالہ بھتیجا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

"اندر بتاؤ کہ میں آیا ہوں۔" اس نے بچے کو سنجیدگی سے مخاطب کیا۔

"آپ کون؟" بچے نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے دریافت کیا۔ اتنے میں ایک بچی دوڑتی ہوئی آئی تھی۔ ہارون کو دیکھ کر قدرے سٹپٹائی' پھر بچے کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

"یہ ہارون بھائی ہیں ڈفر نور آپی والے۔" سرگوشی اتنی بلند تھی کہ ہارون کی سماعتوں تک بآسانی پہنچ گئی تھی۔

"السلام علیکم بھائی۔۔۔ اندر آئیں نا' یہاں کیوں کھڑے ہیں۔" بچی نے تمیز سے سلام کر کے ہارون کو اندر آنے کی دعوت دی۔

بچہ تمیز الدین فیملی کا ہی لڑکا تھا۔ اسے یوں اندر بلانے پر متذبذب' مگر بچی نے فوراً "لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کھینچا اور ہارون کو اندر آنے کا راستہ دیا۔ ہارون خووان بچوں کی معیت میں دہلیز پار کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اندر پردے دار خواتین موجود ہوں گی۔ یوں منہ اٹھا کر گھر میں گھسنا بدتہذیبی نہ تصور کی جائے' مگر اگلے ہی پل اس نے اس سوچ کو ذہن سے جھٹکا' وہ یہاں تمیز تہذیب کا مظاہرہ کرنے قطعاً" نہیں آیا تھا۔ سو گردن اٹھا کر گرد و پیش کا جائزہ لیتا اندر داخل ہوا'

لیکن یہ بدتہذیبی شمار میں نہ آسکی کہ کوئی اس کا جائزہ لینے کو موجود نہ تھا۔ طویل گیلری سنسان پڑی تھی۔ پھر دائیں طرف اچانک ایک دروازہ نمودار ہوا۔

"آئیں بھائی! ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔ میں امی اور تائی امی کو بلاتی ہوں۔" بچی واقعی بہت تمیز یافتہ تھی۔ لائٹ پنکھا آن کر کے وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔

ہارون نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر خود کو ذرا سا پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ کچھ لمحوں بعد قدموں کی آہٹ ہوئی۔ ہارون ذرا سا سیدھا ہوا' مگر آنے والی اب بھی وہی بچی تھی' ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے تھی' جس کے وسط میں پانی کا گلاس تھا۔

"پانی پیئں بھائی۔" اس نے ٹرے ہارون کی جانب بڑھائی۔

"گڈ گرل۔" ہارون نے بے ساختہ اس کی تعریف کی۔ اس وقت وہ واقعی شدید پیاس محسوس کر رہا تھا۔ اس نے گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا۔ بچی گلاس خالی ہونے کے انتظار میں منتظر کھڑی رہی۔

"کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟" ٹھنڈا پانی پی کر مزاج پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ پھر وہ بچی تھی بھی بہت پیاری اور جس سلیقے سے وہ ہارون کو اٹینڈ کر رہی تھی۔ ہارون متاثر ہوئے بنا نہ رہ پایا۔

"میں ام ایمن ہوں۔ نور آپی کی کزن۔ وہ میرے تایا ابو کی بیٹی ہیں۔" اس نے اپنی دانست میں مفصل تعارف کروایا تھا۔

"ام ایمن۔۔۔ بہت پیارا نام ہے۔" ہارون نے جیسے باقی کے تعارف میں دلچسپی نہ لی۔ مایوسی ام ایمن کے چہرے پر واضح پڑھی جاسکتی تھی۔

"نور آپی بہت اچھی ہیں۔ شام کو ہم سب بچوں کو ہوم ورک کرواتی ہیں۔ ہم ضد کریں تو فرنچ فرائز بھی بنا کر دیتی ہیں۔"

اس سے پیشتر ہارون کوئی جواب دے کر اس کی مایوسی میں مزید اضافہ کرتا دو خواتین اندر داخل ہوئی تھیں۔ وہ پانی کا گلاس میز پر رکھتے ہوئے بلا ارادہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ساتھ ہی سلام بھی کر ڈالا۔

"وعلیکم السلام' جیتے رہو۔" قدرے بڑی عمر کی خاتون نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ وہ یقیناً" تمیز الدین صاحب کی اہلیہ تھیں۔

"بیٹھو بیٹا! کھڑے کیوں ہو؟" تمیز الدین صاحب کی بیگم نے پرشفقت انداز میں اسے مخاطب کیا۔ ان کے چہرے پر عجیب سا تقدس اور ملائمت چھائی ہوئی تھی۔ ہارون مودب سا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"بہت بچپن میں دیکھا تھا تمہیں۔ تمہاری اماں اور میں اچھی سہیلیوں میں شمار ہونے لگے تھے۔ پھر مامون بھائی کا ٹرانسفر راولپنڈی ہو گیا۔ تمیز الدین صاحب اور مامون بھائی میں تو خط و کتابت کے ذریعے رابطہ برقرار رہا۔ ہم عورتیں گھرداری کے چکر میں الجھی رہتی ہیں۔ بیاہ خواہش کے تمہاری اماں سے رابطہ استوار نہ رہ پایا۔ بس ان کے انتقال کی خبر سنی۔ کتنے دن تک تو یقین نہ آیا۔ وہ تو بہت متحرک خاتون تھیں۔ زندگی سے بھرپور بہت پیاری۔"

بیگم تمیز الدین کی آنکھوں میں نمی سی چمکی تھی۔ خود ہارون چند لمحوں تک کچھ نہ بول پایا۔ اماں بھولتی تو کسی پل نہ تھیں' لیکن کسی اور کے منہ سے ان کا ذکر عجیب جذباتی کر دیتا تھا۔ چند لمحوں کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔

"تمیز الدین صاحب تمہاری بہت تعریف کرتے ہیں۔ یقیناً" تمہاری تربیت کا سرا تمہارے والدین کے سر جاتا ہے۔ سعادت مند اولاد بھی نعمت خداوندی

ہوتی ہے۔"

"تو جی سعادت مندی کا سرٹیفکیٹ بھی مل گیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔" ہارون ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گیا۔ ماحول اس کی خواہش کے برعکس بن چکا تھا۔ وہ اپنی شکل پر چھائی بے زاری نوٹس کروانا چاہتا تھا۔ مگر موقع محل نہ بن رہا تھا۔

"اور سنائیں جاب کے علاوہ کیا مصروفیات ہیں آپ کی۔" خاموش بیٹھی چچی صاحبہ نے انٹرویو کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس نے اپنی کسی "مشکوک سرگرمی" کے متعلق بتا کر انہیں مشکوک کرنا چاہا تھا۔ مگر جب بولا تو صرف اتنا۔ "فارغ وقت میں دوستوں کی طرف نکل جاتا ہوں۔ ویسے فارغ وقت ملتا کم کم ہی ہے۔"

"آپ کی والدہ کے انتقال کے بعد گھر کے انتظام و انصرام سنبھالنے میں مشکل تو درپیش ہوتی ہوگی؟" چچی صاحبہ نے پوچھا تھا۔

وہ کیا کہتا' ظاہر ہے وقت تو اب تنگ ہو رہی تھی' شاید اسی لیے ماموں صاحب اس کی شادی کے درپے تھے۔ ان کے سوال پر بس سرہلانے پر اکتفا کیا تھا۔ کچھ دیر تک اسی طرح رسمی سوال جواب کا سیشن ہوتا رہا تھا۔ پھر بیگم تمیزالدین نے اسے مخاطب کیا۔

"کھانا تیار ہے بیٹا۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی' آؤ پہلے کھانا کھالو۔"

"کھانے کا تکلف رہنے دیں آنٹی! ویسے بھی میں نے ناشتا دیر سے کیا تھا۔" اس نے خالی پیٹ کی صدائیں نظرانداز کرتے ہوئے شائستگی سے جھوٹ بولا۔

"چلو' ہمارا ساتھ دینے کو تھوڑا بہت کھالینا۔" وہ مسکراتے ہوئے اٹھی تھیں۔

ہارون کو بھی اٹھتے ہی بنی' دونوں خواتین کی ہمراہی میں اس نے ڈرائنگ روم سے ڈائننگ روم کا سفر طے کیا۔ بڑا سا ہال کمرہ تھا۔ جس کے وسط میں دسترخوان چنا ہوا تھا۔ ابھی تک لڑکی سامنے آنے کے آثار دور دور تک نہ تھے۔ دسترخوان پر ام ایمن سمیت چچی محترمہ کے تین بچے مؤدب بنے بیٹھے تھے۔

"آپ لوگوں نے بلاوجہ اتنا اہتمام کیا۔" وہ ذرا شرمندہ ہوا تھا۔

"نہیں بھائی کوئی خاص اہتمام نہیں ہے۔ ہم لوگ تو خود ایک وقت میں کئی طرح کے کھانے بنانے کے خلاف ہیں۔ چکن پلاؤ بنایا ہے۔ مگر اکثر لوگوں کو چاول پسند نہیں ہوتے تو کوفتوں کا سالن ہے اور میٹھے میں کھیر باقی یہ رائتہ سلاد تو دسترخوان کی زینت بڑھانے کو ہوتے ہی ہیں۔" باتونی اور ہنس مکھ چچی نے اس بار اسے بے تکلفی سے مخاطب کیا۔

"چلو بسم اللہ کرو بیٹے!" بیگم تمیزالدین نے اس کی جانب چاولوں کی ڈش بڑھائی اور اس نے بسم اللہ پڑھ کر کھانے کا آغاز کیا تو پھر اپنا ہاتھ روک ہی نہ پایا۔ کھانا بہت عمدہ اور لذیذ تھا۔ کتنے عرصے بعد اس نے گھر کا پکا ہوا اتنا ذائقے دار کھانا کھایا تھا۔ وہ بھول گیا کہ کچھ دیر پہلے اس نے ناشتا دیر سے کرنے کا بتاتے ہوئے بھوک نہ ہونے کا اعلان کیا اور بیگم تمیزالدین نے — کہا تھا کہ وہ ان کا ساتھ دینے کو ہی بیٹھ جائے اور اب یوں لگ رہا تھا کہ وہ سب اس کا ساتھ دینے کو بیٹھے ہیں۔

"کھانا بہت مزے کا ہے۔ میں نے بھوک نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کھالیا۔" ہارون کو آخر کار کچھ یاد آیا تو شرمندہ ہوتے ہوئے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

"کھیر اور لو بیٹا۔" بیگم تمیزالدین نے یقیناً" طنز نہیں کیا تھا۔ مگر وہ بری طرح شرمندہ ہوگیا۔ دو بار پیالی بھر کر کھیر پہلے ہی لے چکا تھا۔

"نہیں آنٹی! بالکل گنجائش نہیں۔" اس نے شائستگی سے معذرت کی۔ پھر رخصت ہونے کا بہانہ بھی سوچنے لگا۔ جس سوچ کے تحت اس گھر کی دہلیز پار کی تھی۔ اسے عملی جامہ پہنانا ممکن نہ تھا۔ ان بھلی خواتین سے کوئی شخص کیسے نامناسب رویہ اختیار کرسکتا ہے۔ اسے انکار کا کوئی اور بہانہ سوچنا تھا۔ ان کی پردے دار بیٹی سے ملاقات کی اب وہ خود میں اخلاقی جرات نہ پاتا تھا۔ اگر وہ ان کی بیٹی سے شادی کا ارادہ نہیں رکھتا تو اسے کوئی حق نہ پہنچتا تھا کہ وہ اسے دیکھنے کا مطالبہ کرے۔

چچی جان کی معیت میں وہ دوبارہ ڈائننگ روم سے ڈرائنگ روم میں آن پہنچا تھا اور اب وہ رخصت کی اجازت لینا چاہتا تھا۔

"بیٹھو ہارون! اب چائے پلاتے ہیں آپ کو۔"

"نہیں جی' چائے کی بالکل گنجائش نہیں۔ کھانا بہت پیٹ بھر کر کھالیا۔" وہ واقعی اب بالکل رکنے کے موڈ میں نہ تھا۔

"ہماری نور کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔ کھانا اسی نے بنایا ہے۔" چچی نے مسکرا کر آگاہ کیا۔ وہ جواباً" مسکرا بھی نہ سکا۔ اب تک۔ جس ذکر سے بچنے پر شکر منا رہا تھا۔ وہ ذکر چھڑ گیا تھا۔

"میں اب چلتا ہوں' دراصل سنڈے کو ابا جان کے ساتھ۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی کہ اسی لمحے بیگم تمیز الدین کے ہمراہ چائے کی ٹرے اٹھائے ان کی بیٹی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

"یہ نورالعین ہے میری بیٹی!" بیگم تمیزالدین نے تعارف کروایا تھا۔ نورالعین نے دھیرے سے سلام کیا تھا۔

ہارون نے سٹپٹاتے اور بوکھلاتے ہوئے جواب تو دے دیا' لیکن وہ دل میں سخت شرمندگی محسوس کررہا تھا۔ رشتے سے انکار کے لیے کیسی نامناسب شرط رکھ دی تھی۔ ضمیر مسلسل ملامت کررہا تھا اور دل اکسا رہا تھا کہ چپکے سے اس پری وش پر دوسری نگاہ بھی ڈال لی جائے۔ وہ عبایا اور اسکارف پہنے ہوئے تھی۔ فقط چاند سا چہرہ حجاب سے باہر تھا۔ چہرے پر عجیب سی ملائمت' ملاحت اور پاکیزگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ کے ساتھ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ہارون بھی نگاہوں اور دل کو قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوا بیٹھ گیا۔

"چچی جان' کھانا پکانے کا کریڈٹ مجھے دے رہی تھیں۔ مجھے فی الحال اتنی اچھی کوکنگ نہیں آتی۔ صرف پلاؤ میں نے بنایا ہے۔ وہ بھی امی اور چچی سے طریقہ پوچھ کر۔ دراصل پڑھائی کی وجہ سے کچن میں جانے کا موقع کم ملتا تھا۔" وہ دھیرے سے بولی تھی۔

ہارون نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ کیا صاف گوئی کا یہ مظاہرہ اسے متاثر کرنے کی کوشش تھی یا اپنے آپ کو پُراعتماد ثابت کرنے کی۔ ہارون نے اندازہ لگانا چاہا۔ شاید وہ اپنے آپ کو پراعتماد ثابت کرنے کی کوشش تو کررہی تھی۔ لیکن اس کی پلکوں کی لرزش اور ہاتھوں کی کپکپاہٹ ہارون کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ پائی۔

"اس پیاری سی لڑکی کو کس امتحان میں ڈال دیا تھا اس نے۔" دل ہی دل میں خود کو لعنت ملامت کرتا وہ اٹھ گیا۔ اب اس کے لیے مزید وہاں بیٹھنا ممکن نہ رہا تھا۔ اک آخری نگاہ اس صبیح چہرے پر ڈال کر وہ بیگم تمیزالدین اور چچی محترمہ کو اللہ حافظ کہتا وہاں سے نکل گیا تھا۔

اب اسے رہ رہ کر اپنے خراب حلیے کا خیال آرہا تھا۔ ماموں الرشید نے کہا تھا کہ ڈھنگ کے حلیے میں وہاں جانا' بچی بھی تمہیں دیکھے گی۔ اگر وہ بچی کو پسند نہ آیا تو؟ دل میں ایک لمحے کو خیال آیا تھا۔ اللہ نہ کرے۔۔۔ اس نے بے ساختہ سوچا۔

"اچھا جی!" دل شرارت سے مسکرایا۔ وہ جھینپ کر ہنس پڑا تھا۔ تسلیم کرنا مشکل تھا۔ لیکن سچ یہی تھا کہ پہلی نگاہ میں ہی اس کے دل کے ساتھ ہاتھ ہوگیا تھا۔ لو ایٹ فرسٹ سائٹ کا ہمیشہ مذاق اڑانے والا ہارون الرشید پہلی نگاہ میں ہی گھائل ہوگیا تھا۔

اگرچہ نورالعین کی شخصیت ویسی نہ تھی' جیسی وہ اپنی لائف پارٹنر کے لیے پسند کرتا تھا۔ اسے ایک پُراعتماد اور ماڈرن بیوی درکار تھی' جو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکے' لیکن وہ نورالعین کو شادی کے بعد اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال سکتا تھا۔

باپ کے گھر میں وہ ان کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی پابند تھی۔ شادی کے بعد وہ اس کی دسترس میں ہوگی۔ وہ اسے جس ماحول کا عادی بنانا چاہے گا' بنالے گا۔ لڑکیوں کی شخصیت میں تو ویسے بھی بہت لچک ہوتی ہے۔ ہر عورت شائستہ بھابھی جیسی خرانٹ تھوڑی ہوتی ہے۔

اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اتنے دنوں سے

بلاوجہ نور العین کو شائستہ بھابھی سے ملا رہا تھا۔ کہاں شائستہ بھابھی اور کہاں نور العین۔۔۔ وہ نور العین کو سوچتے ہوئے مسکرایا اور جس وقت وہ مامون الرشید کے پاس پہنچا تو یہ۔۔۔ جھینپی ہوئی مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

"مجھے آپ کا فیصلہ قبول ہے ابا جان۔" اس نے ان کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا۔ پچھلے کتنے دنوں سے وہ باپ کو کتنا ستا رہا تھا۔ لیکن والدین کا ظرف اولاد کی سوچ سے بھی بڑا ہوتا ہے۔ بغیر کچھ جتائے مامون الرشید نے اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

"خوش رہو' آباد رہو' تمہاری ماں زندہ ہوتی تو خوشی سے پھولے نہ سماتی۔" وہ بے تحاشا خوش ہوتے ہوئے بھی مرحومہ بیوی کو یاد کرکے رنجیدہ ہو گئے۔

"یہ لیں جی گلاب جامنیں کھائیں' میں نے ٹی وی میں طریقہ دیکھ کر بنائی ہیں۔" اسی وقت بھولا بھی پلیٹ لیے آن موجود ہوا۔

مامون الرشید نے ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں ڈالی۔ بڑی مشکل سے نگلی' پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوا باہر نکالا۔

"یوں کرو بھولے بیٹے! مٹھائی بازار سے لے آؤ اور ٹی وی پر بس ڈرامے وغیرہ دیکھا کرو۔" انہوں نے اس کے ہاتھ میں پیسے تھماتے ہوئے سرسری سے انداز میں نصیحت کی تھی۔

بھولا سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ دونوں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھل کر ہنس پڑے تھے۔

☆ ☆ ☆

بڑی پھوپھو نور العین کو انگوٹھی پہنا کر شادی کی تاریخ طے کر آئی تھیں۔ مامون الرشید اس نیک کام میں ہرگز دیر نہ چاہتے تھے۔ ہارون اب فرماں بردار بیٹا تھا۔ باپ کی رضا میں راضی تھا۔

"مبارک ہو انکل! بہت اچھی جگہ ہارون کا رشتہ طے ہوا ہے۔ نور العین کو تو میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ جس مدرسے میں' میں نے پڑھایا ہے' وہاں نور العین قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر پڑھنے آتی تھی۔"

اس روز وہ مامون الرشید کو لے کر پھوپھو کے ہاں گیا تو شائستہ بھابھی نے مامون الرشید کو مبارک باد دی تھی۔ آج بہت دنوں بعد وہ گھر پر تھیں۔ مامون الرشید نے خوش دلی سے مبارک باد قبول کی تھی' لیکن ہارون کچھ بے سکون سا ہوا۔ نور العین کے بارے میں پتا چلا تھا کہ اس نے اکنامکس میں ماسٹرز کیا تھا۔ لیکن اب شائستہ بھابھی بتا رہی تھیں کہ وہ کسی مدرسے وغیرہ بھی جاتی تھی۔ کہیں وہ بھی شادی کے بعد شائستہ بھابھی والی روش نہ اپنا لے۔ محض ایک جھلک میں وہ نور العین کی جس معصومیت پر فدا ہوا تھا۔ وہ جھلک واقعی صرف ایک جھلک ہو' حقیقت میں نور العین اس سے بالکل مختلف ہو۔ چند لمحوں میں ہی اس نے کیا کچھ نہ سوچ لیا تھا۔

اسی وقت مسجد سے اذان کی صدا بلند ہوئی۔ مامون الرشید نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہ غائب دماغی سے ٹی وی دیکھنے لگا۔

"اذان ہو رہی ہے ہمایوں! کم از کم ٹی وی کا والیوم ہی کم کر دو۔" شائستہ بھابھی نے اسے مخاطب کیا۔ وہ جیسے یک دم چونکا' پھر شرمندہ سا ہو کر ٹی وی آف کر دیا۔

"آپ کے دونوں صاحب زادے نظر نہیں آ رہے اور پھوپھو کہاں چلی گئیں؟" اس نے پھوپھو کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں۔

"پھوپھو تمہاری کچن میں ہیں اور میرے بیٹے ناظرہ پڑھنے مدرسے گئے ہیں' تم سناؤ' شادی پر کیسے راضی ہو گئے۔ پہلے تو شادی کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔" شائستہ بھابھی کا موڈ آج خاصا خوشگوار تھا۔ اسے دوستانہ انداز میں مخاطب کیا۔

"بس ابا جان کا حکم تھا' کیسے ٹالتا۔" اس نے سعادت مند اولاد ہونے کا تاثر دیا۔ شائستہ بھابھی طنزیہ سی ہنسی ہنس دی تھیں۔

"جانتی ہوں بھیا! کتنے سعادت مند ہو تم۔ بے چارے مامون انکل اپنے دکھڑے ہمیں آ کر روتے ہیں۔ ویسے شکر کرو کہ نور العین جیسی لڑکی کا ساتھ

نصیب ہو رہا ہے۔ تمہاری زندگی میں سدھار لے آئے گی۔ ورنہ تم نہ نماز کے نہ روزے کے' بس نام کے ہی مسلمان ہو۔ یہی حال تمہارے بھائی کا ہے۔ جانے تم لوگوں کو اپنی عاقبت کا خیال کیوں نہیں آتا' اب دیکھو اذان ہوتی ہے' نماز پڑھنے کے بجائے گھر میں ہی بیٹھے ہو' اگر تمہیں پتا چلے کہ بے نمازی کے لیے کتنی سخت وعید۔۔۔"

"شائستہ بھابھی! مجھے نمازی بنانے کے چکر میں کہیں آپ کی نماز قضا نہ ہو جائے۔" اس نے بے زاری سے ان کی بات کاٹی تھی۔

"استغفر اللہ۔۔۔ تم جیسوں کو تو نصیحت کرنا ہی فضول ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کر چلی گئیں۔

ہارون ایک لمحے کو شرمندہ بھی ہوا۔ دل ہی دل میں خود بھی استغفار پڑھی۔ یہ سچ تھا کہ وہ باقاعدگی سے نماز نہیں پڑھتا تھا' لیکن شائستہ بھابھی تو ایسے شروع ہو جاتی تھیں جیسے وہ دائرہ اسلام سے ہی خارج ہو' حالانکہ وہ جب بھی نماز پڑھتا بہت خشوع و خضوع سے پڑھتا' دل میں ارادہ بھی باندھتا کہ اب کوئی نماز قضا نہ کرے گا' مگر ارادہ' ارادہ ہی رہتا۔ عادت چھوٹ جاتی۔ کچھ دنوں بعد پھر شروع کرتا' مگر جانے کیوں تسلسل قائم نہ رہتا۔

وہ دل میں نادم بھی ہوتا تھا۔ مگر شائستہ بھابھی کے انداز پر بری طرح چڑ جاتا۔ وہ ہر بار ایسے طنز کے تیر چلاتی تھیں' جیسے دنیا میں واحد مسلمان ہونے کا شرف صرف انہیں حاصل ہو۔ اب بھی باہر برآمدے میں سے ان کی آوازیں آ رہی تھیں۔ نصیحتوں کا رخ ساس کی جانب ہو گیا تھا۔

"حد ہوتی ہے امی! ابھی اتنی دیر سے کچن میں کھڑی کام کر رہی تھیں۔ اب نماز کا وقت آیا تو بیٹھ کر نماز پڑھ رہی ہیں۔ تھوڑی سی مشقت اللہ کے نام برداشت کرلی جائے تو کیا حرج ہے۔ شدید معذوری اور محتاجی کے عالم میں بیٹھ کر نماز ادا کرنے کی اجازت ہے' جب دنیا کے سارے کام۔۔۔"

شائستہ بھابھی کا وعظ جاری تھا۔ ہارون سے ضبط نہ ہو سکا' وہ اٹھ کر برآمدے میں آ گیا۔

"پھوپھو کے گھٹنوں میں کتنی تکلیف ہے' یہ آپ سے بہتر اللہ جانتا ہے۔ صرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنا ہوتی تو پھوپھو پڑھ لیتیں' لیکن پھوپھو کے لیے بیٹھنے کے بعد کھڑا ہونا بہت مشکل ہوتا ہے۔ بنا سہارا لیے کبھی اٹھتے دیکھا ہے انہیں آپ نے' جہاں تک کچن میں کھڑے ہونے کی بات ہے تو یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔ جو پھوپھو کو نبھانی پڑتی ہے۔ گستاخی معاف' لیکن آپ جتنی اہمیت حقوق اللہ کو دیتی ہیں' اگر حقوق العباد کو بھی دے لیں تو یہ گھر رہنے کے قابل بن جائے۔"

ہارون عموماً" ان سے الجھتا نہ تھا' لیکن آج ضرورت سے زیادہ ہی بول گیا۔ شائستہ بھابھی نخوت سے "ہونہہ" کرتی وضو کرنے چل پڑی تھیں۔

"ہارون میرے بچے! طبیعت میں برداشت کا مادہ پیدا کر۔" پھوپھو خوف زدہ ہو گئی تھیں کہ کہیں شادی کے بعد اس کا حال بھی مرتضیٰ بھائی والا نہ ہو۔ "صحیح ہی تو کہہ رہی ہے بہو دنیا کے سب کام بھی تو لشتم پشتم نپٹا لیتے ہیں۔ اللہ کے حضور ساری رعایت لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ جا میرے بچے تو بھی وضو کرکے نماز پڑھ۔ کسی کی ضد میں اللہ کو ناراض تھوڑی کیا جاتا ہے۔ یہی بات مرتضیٰ کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔"

پھوپھو افسردگی سے کہتی قبلہ رخ کھڑی ہو گئیں۔ انہوں نے نماز کی نیت باندھی تو ہارون بھی ٹھنڈا سانس بھرتا گھر سے باہر نکلا۔ جماعت نکل چکی تھی۔ مگر نماز تو ادا کی جا سکتی تھی نا۔

نماز پڑھ کر وہ مامون الرشید کو ساتھ لیے واپس گھر چلا گیا۔ حالانکہ پھوپھو کھانے کے لیے روکتی رہ گئیں۔ مگر اس کا دماغ بری طرح الجھ رہا تھا۔ یہ انکشاف کہ نور العین شائستہ بھابھی والے مدرسے جاتی رہی ہے' اسے اضطراب میں مبتلا کر رہا تھا۔ شائستہ بھابھی نے اس کی تعریف کی تھی اور ان کے لبوں سے اس کی تعریف سن کر وہ اس کی اچھائی کے بارے میں مشکوک ہو گیا تھا۔

شادی کے دن قریب آرہے تھے' وہ ساری منفی سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر شادی کی تیاریوں میں دلچسپی لینے لگا۔

☼ ☼ ☼

وہ مشکوک تو تھا ہی کہ اس کا میٹر گھمانے کو ایک اور واقعہ پیش آگیا۔ تمیزالدین صاحب کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ شادی کے بعد بھولے کا گھر میں رہنا مناسب نہیں۔ انہوں نے بھولے کو اپنے بہنوئی کی دکان پر ملازمت دلوانے کی بھی پیش کش کر ڈالی۔

بھولے کا اور ان کا ساتھ سولہ' سترہ برس پرانا تھا' جن دنوں مامون الرشید ٹرانسفر ہو کر راولپنڈی گئے تھے۔ سرکاری رہائش گاہ کے ساتھ سرونٹ کوارٹر بھی بنا ہوا تھا۔ بھولے کا والد ان کا چوکیدار بھی تھا' باورچی بھی اور مالی بھی۔ اوپر تلے کے نو بچوں میں بھولا آخری نمبر پر تھا۔ گھر میں ڈھیر سارے بہن بھائیوں میں اسے کوئی اہمیت نہ ملتی۔ وہ اکثر باپ کے ساتھ کوٹھی کے اندر آجاتا۔ عائشہ بیگم کو وہ گول مٹول بھولا بھالا بچہ بہت پیارا لگتا تھا۔ وہ اس سے بہت پیار سے پیش آتیں۔ کھانے کو چیزیں دیتیں۔ اسٹور روم سے ہارون کے پرانے کھلونے اسے نکال کر دے دیتیں۔

بھولا ان سے اتنا مانوس ہو گیا تھا کہ اب وہ دن کا بیشتر وقت ان کے ساتھ گزارنے لگا۔ وقت گزرتا گیا۔ بھولا اب ان کے گھر کا فرد ہی بن گیا تھا۔ جب مختصر علالت کے بعد عائشہ بیگم کا انتقال ہوا تو ہارون کے ساتھ دھاڑیں مار' مار کر رونے والا بھولا بھی تھا۔

ریٹائرمنٹ کے بعد مامون الرشید ہارون کے ساتھ اپنے آبائی شہر واپس آنے لگے تو بھولے نے بھی ساتھ آنے کی ضد باندھ لی۔ بیتے برسوں میں عائشہ بیگم اور مامون الرشید نے بھولے کو پڑھانے کی بھی بہت کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دماغ پڑھائی میں نہ چلتا تھا۔ ہاں گھر کے کام میں وہ بھاگ بھاگ کر کرتا تھا۔ اس کے ماں' باپ نے بھی مامون الرشید کی منت کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔

"آپ کی صحبت میں رہے گا صاحب جی تو تمیز' تہذیب سیکھ کر انسان کا بچہ بن جائے گا۔ اس کے بڑے بھائیوں کا تو آپ کو حال معلوم ہی ہے۔ ایک کو سگریٹ کی لت لگ چکی ہے تو دوسرے کو چرس کا نشہ۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں رہ کر یہ بھی ان جیسا ہی نہ بن جائے۔ بس اسے دو وقت کی روٹی کھلا دینا جی اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے' آپ کا خدمت گار بن کر رہے گا۔" بھولے کا باپ بہت عاجزی سے مامون الرشید سے مخاطب تھا۔

مامون الرشید کو بھولے سے لاکھ انسیت سہی مگر وہ اسے ساتھ لے کر جاتے ہوئے ہچکچا رہے تھے پرائی اولاد کی ذمہ داری اٹھانا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن ہارون نے باپ کو قائل کرلیا تھا۔ ماں کے بغیر گھر میں ویسے ہی وحشت کا راج تھا۔ وہ باپ' بیٹا اپنے خیالوں میں کھوئے رہتے۔ بھولے کے دم سے گھر میں کسی قدر رونق کا احساس ہوتا۔

یہاں آکر اندازہ ہوا کہ بھولے کو ساتھ لانے کا فیصلہ غلط نہ تھا۔ گھر کے کاموں کی ذمہ داری بھولے نے از خود اپنے ذمے لے لی۔ صفائی ستھرائی اور اوپر کے کاموں کے لیے ملازمہ آتی تھی۔ لیکن کچن کا چارج بھولے کے پاس تھا۔ وہ دونوں باپ' بیٹا تو لاکھ پھوہڑ تھے کہ انڈا تک فرائی نہ کرسکتے۔ بازاری کھانے کھا کر معدے پر ظلم کرنے سے بہتر تھا کہ بھولے کے ہاتھ کے بنے گھر کے پکے کھانے صبر شکر کرکے کھالیے جائیں۔

مامون الرشید ہر ماہ ایک معقول رقم بھولے کے باپ کو بجھوا دیتے تھے اور یہاں بھولے کو جس بھی چیز کی ضرورت پڑتی بلا جھجک بڑے صاحب یا ہارون بھائی سے کہہ دیتا۔ دو مہینے بعد دو چار دن کے لیے ماں باپ سے ملنے چلا جاتا اور ان دو چار دنوں میں ہی گھر کا نظام ٹھپ ہو کر رہ جاتا۔

اور اب تمیزالدین صاحب کی طرف سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ بھولے کو شادی سے پہلے گھر بدر کردیا جائے۔ ہارون تو یہ مطالبہ سنتے کے ساتھ ہی آگ بگولا ہو گیا۔

"آپ نے انہیں بتایا نہیں کہ بھولا کوئی ملازم نہیں' اس گھر کا فرد ہے۔ بچپن سے وہ ہمارے ساتھ رہ رہا ہے۔ ہم اسے کیسے گھر سے نکال سکتے ہیں۔" وہ مامون الرشید کے سامنے غصے کا اظہار کررہا تھا۔

"اصل مسئلہ تو یہی ہے ہارون کہ بھولا ملازم نہیں' اس گھر کا حصہ ہے۔ ملازم اپنے کام نپٹا کر اپنے گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ بھولا چوبیس گھنٹے یہاں پر رہتا ہے۔ اب بھولا بچہ نہیں رہا۔ ماشاءاللہ بالغ اور سمجھ دار ہے۔ نورالعین پردے دار لڑکی ہے۔ کسی نامحرم کے ساتھ ایک چھت تلے رہنا مناسب نہیں لگتا' دیکھا جائے تو تمیزالدین کا مطالبہ اتنا بھی ناجائز نہیں۔" مامون الرشید رسانیت سے گویا ہوئے تھے۔

"تمیزالدین صاحب اپنی شریعت' اپنے گھر پر نافذ کریں۔ شادی کے بعد نورالعین میری مرضی کے مطابق زندگی گزارے گی۔" وہ تڑخ کر بولا تھا۔ بھولے نے الگ رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں۔

"میں نے تو جی ہارون بھائی کی شادی کے متعلق کتنے پروگرام بنائے تھے۔ بھابھی کے چاؤ چونچلے اٹھانے کے لیے اماں جان تو حیات نہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ میں اماں جان کی کمی پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ ایک مہینے تک بھابھی جان کو کچن میں گھسنے نہ دیتا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ بھابھی جان کو میرا وجود ہی گوارا نہ ہوگا۔" وہ ہارون کے آگے دکھے دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے بھولے! یہ آرڈر تمہاری بھابھی کا نہیں' ان کے ابا حضور کا ہے۔ ایک بار شادی ہو لینے دو' پھر دیکھتا ہوں کہ کون ہم پر اپنی مرضی مسلط کرسکے گا۔"

"تو شادی کے بعد آپ مجھے واپس بلالیں گے نا ہارون بھائی۔" بھولے کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

"کیوں نہیں بھولے۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔" اس نے بھولے کو تسلی دی تھی۔

بھولا خوش ہو کر دوبارہ سے شادی کی تیاریوں میں مگن ہو گیا۔ ہارون کے یار دوست بھی شادی کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرنا چاہتے تھے۔ دلہن والوں کے ہاں مہندی لے جانے کے لیے وہ ایک جیسے کرتا شلوار پہننے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔

"تمہارے دوستوں نے جو ہلا گلا کرنا ہے یہاں ہمارے گھر آکر کریں۔ دلہن والوں کے گھر جاکر ہلڑ بازی کرنے کا کیا تک بنتا ہے بھلا۔ تمہیں تو جیسے تمیزالدین کے گھر کے ماحول کا اندازہ نہیں؟" مامون الرشید نے ہارون کی خواہش جان کر اچنبھے کا اظہار کیا۔

"ابا جان! میرے دوست کوئی انوکھی بات تو نہیں کررہے۔ شادیوں کا یہی دستور ہوتا ہے۔ میں انہیں منع کروں گا تو مذاق اڑائیں گے میرا۔"

"مذاق اڑائیں گے تو اڑالیں۔ ایسے نامعقول لڑکوں سے دوستی کر ہی کیوں رکھی ہے۔ اسلام بے شک خوشی منانے سے نہیں روکتا بیٹے! لیکن خوشی کے نام پر خرافات کی اجازت نہ میں دوں گا' نہ تمیزالدین۔" مامون الرشید بے لچک لہجے میں بولے تھے۔

ہارون دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے یہ شادی اپنا جذباتی اور احمقانہ فیصلہ لگنے لگی تھی۔ کاش وہ تمیزالدین صاحب کی بیٹی کو دیکھنے کی فرمائش نہ کرتا تو شادی سے انکار کے اپنے فیصلے پر قائم رہتا۔ نورالعین کی ایک جھلک پر دل ہار بیٹھا' مگر کیا وہ اس لڑکی کو اپنی پسند کے سانچے میں ڈھال لے گا۔ بڑا سا سوالیہ نشان اس کی آنکھوں کے سامنے چکراتا پھرتا۔

پھر آخر وہ دن بھی آگیا جب وہ نورالعین کو اپنے سنگ رخصت کروا کر لے آیا۔ سہاگ رات وہ نورالعین کا حسن دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ اسے لگا کہ اس کی کسی نیکی کے انعام کے طور پر اللہ نے اسے کوئی حور عطا کردی ہے۔ لیکن اس کے حسن کے قصیدے پڑھنے سے پہلے اس نے نورالعین کو یہ باور کروانا ضروری سمجھا تھا کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں شوہر کی پسند' ناپسند اور رائے کو ترجیح دے گی۔

"ان شاءاللہ آپ کو کسی معاملے میں مجھ سے کوئی

شکایت نہ ہوگی۔" نورالعین نے شرمگیں مسکراہٹ کے ساتھ یقین دلایا تھا۔

"ان شاء اللہ۔" اس نے بھی سرہلایا۔ پھر دوبارہ بیوی کے حسین مکھڑے پر نگاہ ڈالی۔ ان شاء اللہ سے ماشاء اللہ کا مرحلہ طے ہوگیا تھا اور اگلے دن جب بڑی پھوپھو نے پیار بھری شرارت سے دلہن کے بارے میں اس کی رائے جانتے ہوئے پوچھا تھا۔

"خوش تو ہونا بیٹے!"

"الحمد اللہ پھوپھو بہت خوش۔" اس نے طمانیت بھرے لہجے میں اعتراف کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی لگ رہی ہوں۔" نورالعین میک اپ کو فائنل ٹچ دے کے پیچھے مڑی تھی۔ وہ تو پہلے ہی ڈریسنگ ٹیبل میں اس کے عکس کو مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ سوال سن کر مسکرادیا۔

"اتنی خوب صورت لگ رہی ہو کہ اگر میں شاعر ہوتا تو فوراً اک غزل کہہ ڈالتا۔" نورالعین جھینپ کر ہنس پڑی تھی۔

"چلیں آپ ابا جان کو بتا دیں کہ ہم جا رہے ہیں۔ میں اتنے اپنا عبایا پہنتی ہوں۔"

آج نورالعین کے ماموں کے ہاں ان کی شادی کے اعزاز میں دعوت تھی۔ اس نے ہارون کی فرمائش پر نیوی بلیو کامدانی سوٹ پہنا تھا اور تیار ہو کر وہ اتنی دمک رہی تھی کہ ہارون کو اس کے چہرے سے نگاہیں ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔

"ابا جان کو تو میں بتا کر آتا ہوں لیکن عبایا مت پہنو۔ اس سوٹ کا دوپٹا اتنا چھوٹا تو نہیں۔ دوپٹا ہی اچھی طرح اوڑھ لو۔"

ہارون نے فرمائش کی تھی۔ اس کے لاشعور میں یہ خواہش دبی تھی کہ اس کی بے پناہ حسین بیوی ماڈرن بھی لگے اور جانے کیوں برقع یا عبایا ہارون کے ماڈرن ازم کے تصور پر پورا نہ اترتا۔ نورالعین شوہر کی فرمائش پر چپ سی ہوگئی تھی۔

"کیا ہوا ہے میں نے کوئی انہونی بات کر دی ہے کیا؟" ہارون ذرا خفا ہوتے ہوئے بولا۔ وہ اس بار بھی خاموش رہی۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار نمایاں تھے۔

"میں شوہر ہوں تمہارا۔ میری مرضی کو تمہیں فوقیت دینی چاہیے۔ یہ بات میں تمہیں پہلے ہی باور کروا چکا ہوں۔"

ہارون یکلخت سنجیدہ ہوگیا تھا۔ بات اگرچہ معمولی تھی لیکن وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ نورالعین اس کی کسی بات کو کتنی اہمیت دیتی ہے۔ اس کا لائف اسٹائل ہارون کی خواہش کے مطابق ہونا چاہیے تھا۔ اگر شادی کے شروع میں ہی وہ نورالعین کو یہ باور نہ کروا سکا تو آئندہ ایسا کرنا اور مشکل ہو جاتا۔

"کیا ہوا کس سوچ میں پڑ گئیں۔" ہارون نے اسے خفگی بھرے انداز میں مخاطب کیا۔

"ارے نہیں ہارون! کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ ظاہر ہے میرے لیے آپ کی پسند مقدم ہے۔ میں نہیں پہنتی عبایا۔" نورالعین مسکرائی تھی۔ ہارون اپنے خشک رویے پر دل میں شرمندہ سا ہوا۔ کتنی آسانی سے تو وہ مان گئی تھی۔

"اچھا۔ میں ذرا ابا جان سے ایک بار پھر پوچھ لوں۔ ویسے تو انہوں نے کھانے کا منع کر دیا تھا کہ بھوک نہیں ہے۔ اگر کہیں گے تو میں اوون میں انہیں چاول گرم کر کے دے دوں گی۔ بس دو منٹ لگیں گے آپ اتنے جرابیں جوتے پہنیں۔" وہ جلدی سے کمرے سے باہر گئی اور ایک منٹ بعد ہی واپس آگئی۔

"کہہ رہے ہیں بھوک نہیں ہے۔" اس نے ہارون کو بتایا۔

"ہاں ابا جان رات کو کم ہی کھانا کھاتے ہیں۔ وہ دودھ لے لیں گے۔" ہارون جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے بولا۔ نورالعین نے سرہلا دیا۔ سلیقے سے دوپٹا اوڑھ کر ہاتھ میں ہینڈ بیگ لیے وہ جانے کو بالکل تیار تھی۔

"آؤ جاتے جاتے ابا جان کو اللہ حافظ کہہ لیں۔" ہارون اسے ساتھ لیے پھر ماموں الرشید کے کمرے میں

جا پہنچا۔

"اچھا ابا جان! چلتے ہیں۔ رات کو دیر ہو سکتی ہے۔ آپ سکون سے سو جائیے گا میں چابی لے کر جا رہا ہوں۔" ہارون نے انہیں مخاطب کیا۔ وہ کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھے۔ ہارون کی بات سن کر سراٹھا کر انہیں دیکھا اور گردن ہلا دی۔

"بہو! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ بیٹے وقت کی پابندی سیکھو۔ کتنا ٹائم ہوگیا ہے۔ میزبانوں کو زیادہ انتظار کروانا مناسب نہیں ہوتا۔" ماموں الرشید نے بیٹے کے پیچھے کھڑی بہو کو دیکھا تو ٹوکے بنا نہ رہ پائے۔

"تیار تو ہوں ابا جان!" نورالعین نے حیرانی سے سسر کو دیکھا۔ جانے اس کی تیاری میں انہیں کون سی کسر نظر آئی تھی۔ ہارون نے بھی گردن موڑ کر حیران پریشان بیوی کو دیکھا۔

"ابھی تم مجھ سے کھانے کا پوچھنے آئیں۔ اب ہارون کے ساتھ پھر چلی آئیں۔ دیر کیوں کرتی ہو۔ جا کر اپنا برقعہ وغیرہ پہنو۔" ماموں الرشید کے کہنے پر نورالعین نے پریشان ہو کر ہارون کو دیکھا۔ وہ بھی قدرے سٹپٹا گیا تھا۔

"رات کا ٹائم ہے ابا جان! اندھیرے میں کہاں کسی کو اتنا نظر آئے گا۔ میں نے سوچا آج گاؤن نہیں پہنتی۔" نورالعین نے فراخ دلی سے گاؤن نہ لینے کا قصور اپنے کھاتے میں ڈالا۔

"لاحول ولا قوۃ میری بہو بے پردہ ہو کر گھر سے نکلے گی۔ بیٹی برا مت ماننا ہارون کی مرحومہ ماں بڑھاپے کے عالم میں بھی پردہ کرتی تھی۔ میں تو تمہیں برقعہ لیتے دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ کیا خبر تھی کہ تم بھی برقعے کو فیشن ایبل ہونے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتی ہو۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ اتنا ہار سنگھار کر کے میں تمہیں بغیر پردے کے گھر سے نکلنے دوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔ اپنے میاں کو تو تم نے جیسے تیسے منالیا لیکن جب تک تمہارا بڈھا سسر زندہ ہے تمہیں برقعے کے بغیر گھر سے نکلنے کی ہرگز اجازت نہیں۔" ماموں الرشید کو اچھا خاصا غصہ آگیا تھا۔

شادی کے بعد نورالعین نے پہلی بار ان کا یہ روپ دیکھا تھا۔ ہارون بھی ان کے غصے سے خائف ہوگیا تھا سو الزام اپنے سر لینے کے بجائے چپ کا کھڑا رہا۔

"آپ ناراض نہ ہوں ابا جان! میں عبایا لے لیتی ہوں۔" نورالعین مرے مرے لہجے میں بولی تھی۔

"تم برقعہ پہن کر آؤ۔ میں بائیک نکالتا ہوں۔" ہارون اس سے نگاہیں چراتا کمرے سے نکلا تھا نورالعین بھی اس کے پیچھے باہر نکلنے لگی۔ وہ ذرا آگے گیا تو نورالعین نے پلٹ کر سسر کو دیکھا۔

"تھینک یو ابا جان!" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ممنونیت کا اظہار کیا۔ ماموں الرشید مسکرا دیے تھے۔

"جاؤ اب دیر نہ کرو۔" انہوں نے پیار سے کہا۔ وہ سرہلاتی تیزی سے آگے بڑھی۔

"کیا کمال کے ایکٹر ہیں ابا جان۔" اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی اور اپنے بیڈ پر نیم دراز ابا جان کے بہو بیگم کے متعلق عین یہی خیالات تھے۔

اگلے دن ہارون کے آفس جانے کے بعد سسر بہو نے ہنستے ہوئے یہ واقعہ پھر دوہرایا تھا اور دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

نورالعین نے گھر کی ذمہ داریاں بطریق احسن اٹھالی تھیں۔ وہ نہ صرف اچھی بیوی تھی بلکہ بہت اچھی بہو بھی تھی۔

ماموں الرشید کے کھانے پینے، وقت پر دوا دینے کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ فارغ وقت میں انہیں بھرپور کمپنی بھی دیتی تھی۔ ان کے ساتھ ٹاک شوز دیکھتی کچھ ان کے تبصرے سنتی کچھ اپنے تبصرے انہیں سناتی۔ ان کے ماضی کے قصے بہت ذوق و شوق سے سنتی۔ ہارون کی مرحومہ والدہ کی باتیں ملازمت کے دوران ماموں الرشید کی اصول پسندی کے قصے۔ ہارون کے بچپن کی شرارتیں۔ وہ بار بار بھی یہ باتیں سن

کر بور نہ ہوتی۔

"تم واقعی ابا جان کی باتیں سن کر بور نہیں ہوتیں۔ ان کے پاس بھی چند پرانے قصے ہیں۔ مجھے تو یہ سب باتیں ازبر ہوگئیں۔" ہارون اس کے ریشمی بالوں کی لٹ انگلی پر لپیٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ وہ دھیرے سے مسکرادی۔

"بات میرے بور ہونے کی نہیں ہے ہارون! بات ابا جان کی بوریت دور کرنے کی ہے۔ جوانی میں انسان کے پاس کرنے کو بہت کچھ ہوتا ہے' بڑھاپے میں کچھ کرنے کو نہیں ہوتا انسان صرف بیتی باتوں اور یادوں کو تازہ کرسکتا ہے۔ اس ناسٹلجیا کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں' ہم اتنا تو کرسکتے ہیں کہ اپنی بھاگتی دوڑتی زندگی میں سے چند لمحے نکال کر ان کے ساتھ ان کے ماضی میں جھانک لیں اور سچ پوچھیں تو میں واقعی بور نہیں ہوتی۔ جب آپ ایک اچھی کتاب بار بار پڑھ سکتے ہیں تو بیتی آپ بیتی سے کیوں لطف اندوز نہیں ہوسکتے۔"

وہ بول رہی تھی اور ہارون اس کے ملائم لہجے میں کی جانے والی باتوں کو سن کر مسحور ہو رہا تھا۔

"بولتی رہو۔ کتنا خوب صورت بولتی ہو تم۔ تمہاری آواز سن کر میرے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگتی ہیں۔"

"شاعر بننے کی ضرورت نہیں ہارون' اچھا بیٹا بھی بننے کی کوشش کریں۔" وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی تھی۔

"ابا جان کو ٹائم دیا کریں۔ آپ ان کی اکلوتی اولاد ہیں۔ آپ کو دیکھ کر ان کی آنکھیں محبت سے چمکنے لگتی ہیں اور آپ کے پاس ان کے لیے دو گھڑی کی فرصت نہیں ہوتی۔ صبح سے شام تک انسان کتابیں پڑھ کر وقت نہیں گزار سکتا۔ انہیں آپ کی کمپنی بھی چاہیے۔"

نورالعین اسے سب سے پہلے "اچھے بیٹے" کے روپ میں دیکھنے کی خواہش مند تھی۔ بہت پیار اور رسانیت سے وہ اسے اس کی لاپروائی اور کوتاہی کا احساس دلا رہی تھی۔

"جو حکم جناب کا صحیح کہتی ہو۔ میں ابا جان کو ٹھیک سے وقت نہیں دے پاتا۔ آئندہ انہیں کمپنی دینے کی بھرپور کوشش کروں گا۔" ہارون نے اپنی غلطی بخوشی تسلیم کرتے ہوئے اس کی درستی کا یقین بھی دلا دیا۔

"گڈ بوائے۔" نورالعین نے شرارت سے شوہر کو چھیڑا۔

"تم مجھے ہر پل حیران کرتی ہو۔ میں سوچتا تھا کہ تم ایک شرمائی لجائی سمٹی سمٹائی بہت ڈرپوک قسم کی لڑکی ہوگی جس کو بدلنے میں مجھے بہت محنت درکار ہوگی۔ مجھے صرف تمہاری خوب صورتی نے متاثر کیا تھا' لیکن یار تم تو ایک "کمپلیٹ پیکیج" ہو۔" ہارون نے محبت بھری نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی اور اسے "شرمائی لجائی" لڑکی بننے میں فقط دو سیکنڈ لگے تھے۔

وہ محبت سے اس کے چہرے پر پھیلتے حیا کے رنگوں کو دیکھنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج سنڈے تھا آفس کا آف۔ وہ بھرپور نیند لے کر بیدار ہوا۔ نورالعین کچن میں اسپیشل قسم کا ناشتا بنانے میں مصروف تھی۔ وہ فریش ہو کر مامون الرشید کے پاس لاؤنج میں آگیا۔ وہ اخبار پڑھ رہے تھے۔ وہ ان سے اخبار کا ایک صفحہ لے کر خبریں ڈسکس کرنے لگا۔ ملازمہ باہر صحن کا فرش دھو رہی تھی۔ نورالعین نے شادی کے بعد ایک بار ملازمہ ہٹانے کی بات کی تھی' لیکن مامون الرشید نہ مانے۔

"جمیلہ بیوہ عورت ہے۔ کئی برسوں سے کام کر رہی ہے۔ اسے بے روزگار کرنے کا فائدہ۔ بھلی عورت ہے۔ تمہارے ساتھ اور کام بھی نمٹا لیا کرے گی۔ تم اکیلی جان کیا کچھ دیکھو گی۔ ہارون کی ماں ہوتی تو اور بات تھی وہ تو اب تک تمہیں بستر سے پاؤں نیچے نہ اتارنے دیتی۔"

"ہاں تو خیر سے جب دو چار مہینوں بعد تم "خوش خبری" سنا دو گی تب تم سے جھاڑو پونچھا تھوڑی ہوسکے

"ابا جان! آج آپ کے کہے بغیر سا آئل لگا کر پراٹھا ہی نہ بنا دوں' کبھی کبھار کی بدپرہیزی تو چلتی ہے نا!" نورالعین مامون الرشید سے مخاطب تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی وہ واپس کچن میں چلی گئی اتنے میں ہی دروازے کی بیل بجی تھی۔ جمیلہ جھاڑو رکھ کر دروازے پر گئی واپس آئی تو چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

"باہر جی کوئی عبدالباسط صاحب آئے ہیں۔" اس نے لاؤنج میں آکر بتایا۔

"عبدالباسط' کون صاحب ہیں۔ کیا کہہ رہے ہیں کس سے ملنا ہے۔" ہارون حیران ہوتے ہوئے گیٹ پر گیا تھا۔

"السلام علیکم ہارون بھائی!" باہر صاف ستھرے کپڑوں میں سلیقے سے بال بنائے بھولا کھڑا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" ہارون نے پرتپاک انداز میں سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے گلے سے لگایا تھا۔

"جمیلہ بی بی تو کہہ رہی تھیں۔ کوئی عبدالباسط صاحب۔" ہارون کو اچانک یاد آیا تو گردوپیش میں ایک متلاشی نگاہ ڈالی پھر جیسے ذہن میں جھماکا سا ہوا دوبارہ بھولے کو دیکھا جھینپی ہوئی مسکراہٹ بھولے کے لبوں پر موجود تھی۔

"میرے ابا نے میرا نام عبدالباسط ہی رکھا تھا ہارون بھائی۔ امتیاز صاحب نے دکان پر مجھے بھولا نام بتانے سے منع کردیا۔ کہتے ہیں اتنا خوب صورت نام ہے عبدالباسط۔ بھولے نام سے تو پرسنیلٹی ہی ڈاؤن ہوجاتی ہے۔" بھولے نے جھینپتے ہوئے بتایا تھا۔

"اچھا جی۔ آئیں آئیں عبدالباسط صاحب۔" ہارون مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آیا۔

"دیکھیں ابا جان! عبدالباسط صاحب ہمیں شرف ملاقات بخشنے آئے ہیں۔" وہ لاؤنج میں آکر چہکا۔

"ہارون بھائی نے تو جی مذاق ہی بنا لیا۔" بھولے نے مسکراتے ہوئے مامون صاحب کو سلام کیا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر اسے پُرشفقت انداز میں گلے سے لگا لیا۔

"پھر عبدالباسط صاحب گھر واپس تشریف کب لا رہے ہیں۔ ہم آپ کی واپسی کے شدت سے منتظر ہیں؟"

ہارون نے شگفتگی سے اسے مخاطب کیا۔ شادی ہوچکی تھی اور اب بھولے کو گھر میں نہ رکھنے کے کسی دباؤ کو وہ قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ مامون صاحب ہارون کی بات سن کر قدرے پریشان ہوئے تھے۔ جانے بھولا ہارون کی بات کا کیا جواب دیتا ہے' لیکن بھولے کے چہرے پر مطمئن سی مسکراہٹ پھیلی۔

"ہارون بھائی! اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے جی۔ شروع شروع میں تو میں بہت اپ سیٹ تھا جی۔ آپ لوگ بھی بہت یاد آتے تھے اور گھر بھی' لیکن آہستہ آہستہ دل لگ ہی گیا۔ امتیاز صاحب اچھی سیلری دیتے ہیں۔ دکان پر درجن بھر ملازم ہیں اور میں ان سب کا سپروائزر ہوں جی۔" بھولے نے فخریہ انداز میں آگاہ کیا۔

"تمہاری انگلش بہت اچھی ہوگئی ہے بھولے! نہ صرف انگلش بلکہ پرسنیلٹی بھی۔" ہارون نے شرارتی انداز میں اسے چھیڑا۔

"ہاں ہارون بھائی! میں اپنے گھر گیا تو گھر والے بھی حیران ہوگئے۔" بھولے نے خوش ہو کر بتایا۔ مامون الرشید اور ہارون مسکرادیے۔

"یہاں تو جی آپ لوگوں پر بوجھ تھا اور ساری عمر بوجھ ہی بن کر رہتا تھا۔ ایک وقت سالن اور دو وقت روٹی پکانا بھی کوئی کام تھا جی۔ بڑے صاحب اتنے معمولی کام کی ڈھیر ساری اجرت بے بے کو بھجوا دیتے تھے۔ اب کام کر کے پیسے ملتے ہیں تو لگتا ہے محنت کی کمائی ہے۔ بے بے تو اب میرا رشتہ بھی ڈھونڈ رہی ہے۔" بھولے نے آخر میں شرماتے ہوئے آگاہ کیا۔

"پہلی بات تو یہ ہے بھولے بیٹے! کہ تم ہم پر بوجھ نہیں تھے یہ فضول بات آئندہ زبان پر مت لانا' لیکن یہ سچ ہے کہ یہاں رہتے ہوئے تمہارا کوئی مستقبل نہ تھا۔ اللہ آئندہ زندگی میں تمہارے لیے اور ترقی کی راہیں کھولے۔ دکان پر کام کا تجربہ حاصل کرلو۔

تھوڑے بہت پیسے جوڑلو کچھ حصہ ہم ڈال دیں گے اور تمہیں چھوٹی موٹی کوئی دکان ہی کروا دیں گے۔"
مامون الرشید نے اسے محبت سے مخاطب کیا۔
ہارون نے مسکراتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔
"بھولا آیا ہے۔ اس کے لیے بھی زبردست سا ناشتا بناؤ۔" اس نے نورالعین کو مخاطب کیا۔
"کیوں نہیں اور بھولے سے کہیں' یہ اب بھی اس کا گھر ہے۔ ہر ویک اینڈ پر کھانا یہاں کھایا کرے۔" نورالعین نے کہا تھا۔ ہارون نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☼ ☼ ☼

ہارون کے دوست واصف کی منگنی کا فنکشن تھا۔ واصف کی فیملی خاصی ایڈوانس تھی۔ چچا کی بیٹی سے منگنی ہو رہی تھی۔ سب دوستوں کے ساتھ اس نے ہارون کو بھی اس کی بیگم کے ساتھ انوائٹ کیا تھا۔
"مکس گیدرنگ ہوگی نورالعین وہاں جا کر کیا کرے گی۔ ویسے بھی آج میری طبیعت صحیح نہیں۔ ہر پندرہ منٹ بعد مجھے چائے کی طلب ہو رہی ہے۔ بہو خدمت کے لیے لایا ہوں یا کسی ایرے غیرے کی منگنی کا فنکشن اٹینڈ کروانے کے لیے۔" ہارون نے ڈرتے ڈرتے باپ سے نورالعین کو اپنے ہمراہ لے جانے کے متعلق پوچھا تھا۔ مگر انہوں نے فوراً" ہی صاف جواب دے دیا تھا۔
"ابا جان کو کیسے پتا چلا کہ مکس گیدرنگ ہوگی۔ میں نے تو ذکر بھی نہیں کیا تھا۔" ہارون نے نورالعین کے سامنے اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ وہ قدرے سٹپٹائی تھی مگر اگلے ہی پل کندھے اچکا کر بے نیازی سے جواب دیا۔
"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ ابا جان نے اندازہ لگایا ہوگا آج کل کا دستور بھی تو یہی ہے۔"
"ہاں دستور تو یہی ہے' لیکن ابا جان جانے کیوں میری خواہش پوری نہیں ہونے دیتے میرا دل کرتا ہے کہ میں جہاں بھی جاؤں تمہیں بھی اپنے ساتھ لے کر جاؤں۔ ایسی حسین بیوی ہے میری۔ لوگ جانے کیا سوچتے ہوں گے کہ میں تمہیں کیوں دنیا کے سامنے لاتے ہوئے ہچکچاتا ہوں۔" ہارون آج سخت بدمزہ ہو رہا تھا۔
"میرا حسن' میرا ہار سنگھار صرف آپ کے لیے ہے ہارون! دنیا جو مرضی سوچے مجھے اس کی پروا نہیں اور آپ کو بھی نہیں ہونی چاہیے۔" نورالعین نے آج قدرے سنجیدگی سے اسے باور کروانا چاہا تھا۔
"یار وائف! آج کل ہر کوئی لائف میں ماڈرن سی بیوی کا ساتھ چاہتا ہے۔ تم کسی سے کم تو نہیں جو میں تمہیں سب سے چھپا کر رکھوں۔"
ہارون اس کا نقطہ نظر سمجھ ہی نہ پایا تھا۔ نورالعین ٹھنڈا سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ ہارون کی کسی بات کی مخالفت کرنا اسے غصہ دلانے کے مترادف ہوتا ہے۔ وہ اس کی نفسیات سمجھ چکی تھی۔ اس لیے بحث کے بجائے چپ رہنے کو ترجیح دیتی تھی ویسے بھی اپنی بات منوانے کے لیے شفیق سے سسر کا کندھا تو میسر تھا ہی۔
جو بات وہ ہارون سے خود نہ کہہ سکتی مامون الرشید سے کہہ دیتی اور اس کی خواہش کے مطابق وہ ہارون کی کسی بھی الٹی سیدھی فرمائش کو رد کرتے ہوئے اس کی طبیعت ہی صاف کر دیتے۔ ہارون بیوی کے سامنے مزید "عزت افزائی" کے ڈر سے بحث کو طول ہی نہ دیتا۔

☼ ☼ ☼

دل مسوس کر اکیلا ہی واصف کی منگنی میں چلا آیا تھا۔
"بھابھی کو کیوں نہیں لایا۔" ہر کسی نے چھوٹتے ہی یہ سوال پوچھا تھا۔
"اس کی طبیعت کچھ صحیح نہیں تھی۔" ہارون ہر کسی کو شرمندہ شرمندہ سی وضاحت دیتا رہا۔ منگنی کا فنکشن بہت دھوم دھام سے ہوا تھا۔ واصف اور اس کی منگیتر نے ایک دوسرے کو انگوٹھیاں پہنائیں تو نوجوان نسل نے "ہاؤ' ہو" کرتے ہوئے آسمان سر پر اٹھا لیا۔
خوب تالیاں بجیں۔ گہما گہمی' رونق اور ہنگامہ تھا۔ دلہن کی کزنز' اس کی سہیلیاں اپنے حسن کی بجلیاں مہمانوں پر گراتی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتیں خوب قہقہے لگاتی پھر رہی تھیں۔ لڑکے بھی خوب شغل لگا رہے تھے' لیکن جانے کیوں ہارون کو اس ہنگامے سے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔
"یار واصف کی تو لاٹری نکل آئی۔ کیسی حسین منگیتر ہے اس کی' خود تو ویسٹ انڈیز کا کھلاڑی لگتا ہے۔" خاور نے اسے اور نجیب کو مخاطب کیا۔
"اچھا بس بھئی اپنے یار کو ویسٹ انڈین تو نہ کہہ۔" نجیب ہنسا تھا۔
"چل ویسٹ انڈین نہ سہی بنگالی سہی' مگر منگیتر دیکھ کیا گوری رنگت ہے۔ پہلوئے حور میں لنگور والی کہاوت فٹ ہو رہی ہے۔" خاور نے واصف کا مذاق اڑایا تھا۔
"ارے بھائی میرے' یہ سب بیوٹی پارلر کے میک اپ کا کمال ہے' ورنہ بھابھی واصف کی فرسٹ کزن ہیں۔ رنگ روپ میں اتنا فرق نہیں ہوگا۔" نجیب نے ماہرانہ رائے دی۔ ہارون چپ چاپ دوستوں کے تبصرے سن رہا تھا۔
"چل رنگ روپ کو چھوڑ' مگر واصف موٹو کے مقابلے میں بھابھی جان کیسی سلم اور اسمارٹ ہیں۔ ایسے ہی تو چاچے کی بیٹی سے منگنی پر راضی نہیں ہوا ہو رہا یار۔ دیکھ ذرا کیسی باچھیں کھل رہی ہیں جیسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔" خاور ہنسا تھا۔
ناگواری کی شدید لہر نے ہارون کو اپنی لپیٹ میں لے لیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ نجیب کوئی بہت زیادہ "نظر باز" قسم کا بندہ نہیں ہے۔ کمنٹس پاس کرنا اس کی عادت ہے' شاید ماحول کا اثر تھا کہ وہ کچھ زیادہ شوخ ہو رہا تھا ابھی واصف اور اس کی منگیتر کے پاس جا کر مبارک باد دیتا تو بہت شائستگی اور ادب سے دوست کی منگیتر کو مخاطب کرتا' لیکن پھر بھی واصف کی غیر موجودگی میں اس نے اس کی منگیتر کی شکل و صورت' رنگ روپ حتیٰ کہ سراپے پر بھی اظہار خیال کیا تھا۔ مرد جتنا مرضی شریف ہو۔ نگاہ پر کنٹرول کرنا اس کے لیے خاصا مشکل ہوتا ہے اور بے تکلف دوستوں کے سامنے تو زبان بھی آؤٹ آف کنٹرول ہو جاتی ہے۔
ہارون نے دل ہی دل میں شکر کیا تھا کہ وہ مامون الرشید کی بات مان کر نورالعین کو اپنے ساتھ نہیں لایا اور جب واصف کی امی کو وہ تینوں دوست مبارکباد دینے گئے تو انہوں نے بھی اس سے پوچھا تھا کہ وہ اپنی نئی نویلی دلہن کو آج کے فنکشن میں کیوں لے کر نہیں آیا۔
"میں پھر کسی دن نور کو آپ سے ملوانے لے آؤں گا آنٹی۔ بات دراصل یہ ہے کہ نورالعین پردہ کرتی ہے۔ اس لیے میں نے آج کی گیدرنگ میں اسے ساتھ لانا مناسب خیال نہیں کیا۔"
ہارون نے بہت اعتماد سے' شرمندہ ہوئے بغیر بیوی کو ساتھ نہ لانے کی وجہ بتا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

نورالعین جائے نماز پر قبلہ رخ بیٹھے' آنکھیں موندے' دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے بہت جذب سے دعا مانگنے میں مصروف تھی۔ ہارون جو لیپ ٹاپ کھولے آفس کے کسی کام میں مصروف تھا کام بھول بھال کر کتنی دیر سے بیوی کی موہنی صورت کو تکے جا رہا تھا۔
"اتنی دیر سے کیا دعائیں مانگی جا رہی ہیں جناب۔ کبھی شوہر نامدار کے لیے بھی کوئی دعا کر لیا کریں۔"
اس نے اسے مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔
نورالعین نے آنکھیں کھولیں۔ مسکرا کر اسے دیکھا دعا کا اختتام کرتے ہوئے چہرے پر ہاتھ پھیرا' پھر جائے نماز تہہ کرتے ہوئے اس کے پاس بیڈ پر آ بیٹھی۔
"اگر میں کہوں کہ اس وقت میں آپ کے لیے ہی کچھ مانگ رہی تھی تو؟" اس نے کہا۔
"مثلاً" کیا؟" ہارون نے اشتیاق سے پوچھا۔
نورالعین نے مسکراتے ہوئے نفی میں گردن ہلا دی۔

"نہیں بتاؤں گی۔"

"واقعی نہیں بتاؤ گی؟" ہارون نے مصنوعی انداز میں دھمکایا۔

"آپ جانتے ہیں ہارون! مجھے چند ہی دنوں میں آپ سے کتنا پیار ہو گیا ہے۔" نورالعین نے اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات کی۔

ہارون مسکرا دیا۔ اس کی بیوی اظہار کے معاملے میں کنجوس نہ تھی۔ عورت ہونے کے باوجود وہ برملا ہارون سے اپنی محبت کا اقرار کر لیتی تھی اور اس کا یہ اقرار ہارون کے اندر طمانیت بھر دیتا' جواباً" ہارون کے پیار کے اظہار میں بھی مزید شدت اور وارفتگی آجاتی۔

"جن سے پیار ہوتا ہے نا ہارون! انسان ان کے لیے بہت حساس ہو جاتا ہے وہ اپنے محبوب کے لیے ہر بھلائی چاہتا ہے۔"

"تو یہی تو پوچھ رہا ہوں محترمہ! میرے لیے کون سی بھلائی مانگی ہے۔" ہارون نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"میں نے خدانخواستہ آپ کے اندر کوئی خامی نہیں دیکھی ہارون! میں تو خود اللہ کی بہت گناہ گار بندی ہوں۔ نماز کے لیے کھڑی ہوتی ہوں تو کبھی دھیان ہانڈی چولہے میں لگا ہوتا ہے تو کبھی ذہنی رو کہیں اور بھٹک جاتی ہے۔ ایک دوبار گھر میں آپ کو نماز پڑھتے دیکھا تو آپ کا نماز میں انہماک دیکھ کر مجھے آپ پر رشک آگیا' لیکن شاید میری ہی نظر لگ گئی جو اس دن کے بعد آپ نے ایک نماز نہیں پڑھی۔" نورالعین نے اس کی نماز نہ پڑھنے کا قصور فراخدلی سے اپنے کھاتے میں درج کر لیا۔

"یار! تم یاد دلا دیا کرو نا۔ میں ادھر ادھر کے کاموں میں لگ کر نماز پڑھنا بھول جاتا ہوں۔" ہارون قدرے شرمندہ ہوا تھا۔

"میں ابھی اللہ سے یہی دعا مانگ رہی تھی کہ ہم دونوں میاں بیوی کے دل میں دین کی سچی لگن پیدا ہو۔ شوہر اور بیوی میں آپس کی محبت بھی اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ باقی نعمتوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ عاجزی بھرا شکرانہ ہم پر واجب ہے۔ ہارون اور نماز سے زیادہ اچھا طریقہ کیا ہو سکتا ہے اپنی عاجزی کے اظہار کا اور اس کی نعمتوں کے اقرار کا۔"

"درست کہتی ہو۔ اللہ نے تو مجھے دنیا میں ہی ایک حور عطا کر دی ہے اور وہ حور اتنی نیک پروین ہے کہ اس کا جنت میں داخلہ بالکل پکا ہے۔" ہارون لیپ ٹاپ ایک طرف کرتے ہوئے اٹھا تھا۔

"کہاں چلے؟" اسے بیڈ سے اترتا دیکھ کر نورالعین نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے دوسری دنیا میں بھی اسی حور کا ساتھ درکار ہے۔ وضو کرنے جا رہا ہوں۔ کبھی یہ نہ ہو کہ اوپر جا کر ادھر تم ادھر ہم والی صورت حال درپیش ہو۔ جنت میں اکٹھے چلیں گے یار۔ تم دعائیں مانگتی رہنا' ان شاءاللہ میں بھی صراط مستقیم پر آہی جاؤں گا۔"

ہارون ہنستے ہوئے واش روم میں گھس گیا۔ نورالعین کے لبوں پر بھی پیاری سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ بار بار کی جانے والی نصیحت نہ صرف اپنا اثر کھو دیتی ہے' بلکہ انسان کو کسی حد تک بے زار بھی کر دیتی ہے۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ہارون کو اپنی لائن پر لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کھانے میں کتنی دیر ہے نور! خوشبو ایسی اچھی آرہی ہے کہ بھوک چمک اٹھی ہے۔" وہ کچن میں آکر پتیلی کا ڈھکن اٹھا کر جھانکا۔

"بس پانچ منٹ ہارون! رائتہ' سلاد بنا کر دسترخوان لگاتی ہوں۔ آپ اتنے میں مغرب کی نماز پڑھ کر مسجد سے گھر آئیں گے' کھانا بالکل ریڈی ہو گا۔"

وہ مصروف سے انداز میں جواب دیتی جیسے باجماعت نماز پڑھنا ہارون کا معمول ہی تو ہو۔ ہارون کبھی سنی ان سنی کر دیتا' تو کبھی واقعی نماز پڑھنے چلا ہی جاتا۔ آہستہ آہستہ اس کی کوششیں اور دعائیں رنگ لاتی ہی گئیں۔ ہارون کا دین کی طرف رجحان بڑھنے لگا تھا۔ ہاں فجر کے لیے اسے جگانا اب بھی بڑا مسئلہ تھا۔

"ہارون آپ بہت ویٹ گین کر رہے ہیں۔ یہ نہ ہو کہ چھوٹی موٹی توند ہی نکل آئے۔ کل سے میں آپ کو صبح جاگنگ کے لیے جگاؤں گی۔" فجر کے لیے وہ ہوس بھرے انداز میں جگا کر اس کی بربڑنہ سن سکتی تھی۔ ہاں وزن بڑھنے سے روکنے کے لیے تو بیوی ہونے کا خصوصی حق استعمال کر سکتی تھی اور جب بندہ جاگنگ کے لیے جاگ جائے تو دو سنت اور دو فرض پڑھنے میں بھلا کتنی دیر لگتی تھی۔

ہارون نے شادی سے پہلے سوچا تھا کہ وہ بیوی کو اپنے رنگ میں ڈھال لے گا' لیکن اس کی پیاری سی بیوی نے پیار محبت سے اور اتنے غیر محسوس طریقے سے اسے اپنے رنگ میں رنگ لیا تھا کہ اسے اپنی بدلتی شخصیت کا خود بھی ذرا دیر میں جا کر اندازہ ہوا' لیکن جب اندازہ ہوا تو وہ دل ہی دل میں اپنی بیوی کا مشکور بھی ہوا۔

دوسرے طرف پھوپھو کے گھر کے وہی حالات تھے۔ شائستہ بھابھی کے اندر تقویٰ سے زیادہ زعم تقویٰ تھا۔ وہ حقوق العباد سے پہلو تہی کرتے ہوئے حقوق اللہ پورے کرنے اور کروانے پر زور دیتی تھیں۔ اسی زور زبردستی کی وجہ سے مرتضیٰ بھائی ان کے ساتھ ساتھ دین سے بھی بے زار ہو گئے تھے۔

ہارون کو مرتضیٰ بھائی بہت پیارے تھے اور جن سے پیار ہو' انسان ان کو غلط سمت میں قدم اٹھاتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس کے زرخیز ذہن نے پھوپھو کے گھر کے حالات بہتر بنانے کے لیے ایک راہ ڈھونڈ ہی نکالی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پانی پئیں شائستہ بھابھی! یوں رو رو کر خود کو ہلکان مت کریں۔" نورالعین نے شائستہ بھابھی کے ہاتھ میں زبردستی پانی کا گلاس تھمایا تھا۔

"تم یہ بتاؤ ماموں انکل کب تک آئیں گے۔ خاندان میں وہی سب سے بڑے ہیں۔ مرتضیٰ ان کا بہت ادب کرتے ہیں۔ صرف وہی مرتضیٰ کو سمجھا سکتے ہیں۔ میں تو برباد ہو جاؤں گی نورالعین' میرے بچے' ہائے کیا بنے گا ان کا۔" شائستہ بھابھی پھپھک کر رو پڑی تھیں۔

"ابا جان تو اپنے دوست کے ہاں گئے تھے۔ دیر سے ہی واپسی ہو گی۔ لیکن آپ فکر نہ کریں۔ وہ سمجھائیں گے مرتضیٰ بھائی کو۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ انہیں بیٹھے بٹھائے دوسری شادی کی کیا سوجھی۔" نورالعین تاسف بھرے انداز میں بولی۔

"یہی تو بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔ حالانکہ آج کل تو راہ راست پر آرہے تھے۔ نماز روزہ کرنے لگ گئے تھے۔ مجھ سے لڑائی جھگڑا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب کہتے ہیں' دونوں میں بھرپور انصاف کروں گا' تم فکر نہ کرو' تمہاری کوئی حق تلفی نہیں ہو گی' لیکن تم خود بتاؤ نورالعین! کوئی عورت کسی دوسری عورت کا وجود برداشت کر سکتی ہے اپنے گھر میں۔" وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"مرتضیٰ بھائی شرعاً" کوئی غلط کام تو نہیں کر رہے بھابھی۔ پھر جب وہ کہہ رہے ہیں کہ بھرپور انصاف کریں گے تو آپ کیوں اتنا فکرمند ہو رہی ہیں۔ مذہب اجازت دیتا ہے انہیں دوسری شادی کی۔" کافی دیر سے خاموش بیٹھے ہارون نے لب کشائی کر کے گویا ان کے زخموں پر نمک چھڑکا۔

"پتا نہیں وہ دوسری ڈائن کیسی ہو گی۔ بتا بھی تو نہیں رہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے۔" شائستہ بھابھی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس ان دیکھی عورت کا منہ نوچ لیں۔

ہارون نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی ضبط کی تھی۔

"آپ بالکل بے فکر ہو کر گھر جائیں شائستہ بھابھی! میں اور ابا جان مرتضیٰ بھائی کو سمجھائیں گے۔ دوسری شادی کا بھوت ان کے سر سے اتار دیں گے۔ لیکن آپ وعدہ کریں کہ اب گھر میں بھرپور توجہ دیں گی۔ مرتضیٰ بھائی کا بھی خیال رکھیں گی۔ جب شوہر کو گھر میں بھرپور توجہ نہ ملے۔ تو ہی وہ باہر دلچسپیاں ڈھونڈنے لگتا ہے۔"

ہارون نے انہیں مدبرانہ انداز میں سمجھایا تھا۔ شائستہ بھابھی بس رونے میں مشغول رہیں۔

"آپ برا مت مانیے گا شائستہ بھابھی! مرتضیٰ بھائی

جو کر رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ دار آپ ہی ہیں۔ آپ گھر گھر جا کر دین کی تعلیم دیتی رہیں' لیکن اپنے گھر اور گھر والے کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ نور العین بھی تو ہے۔ پڑوس میں ایک بار اس نے چھوٹا سا درس دیا۔ اب پوری کالونی میں جب بھی خواتین کی کوئی ایسی محفل منعقد ہوتی ہے تو نور العین کو لازمی مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ میری اجازت سے ایسی محفلوں میں شرکت بھی کرتی ہے۔ لیکن ہماری ضروریات اور گھر کی ذمہ داریوں سے غافل نہیں ہوتی۔ اپنے سارے کام پھرتی سے نپٹا کر کھانا وغیرہ پکا کر پھر گھر سے نکلتی ہے اور جب میں دفتر سے گھر آجاؤں' پھر اس کا سارا وقت میرے لیے ہوتا ہے۔ یہ میرے لیے بناؤ سنگھار بھی کرتی ہے۔ تیار ہوتی ہے ہر وقت نماز کے اسٹائل میں دوپٹا اوڑھے سر جھاڑ منہ پہاڑ حلیے میں نہیں رہتی۔"

"اف اللہ۔۔۔ بس کریں ہارون! آپ نے میری شان میں قصیدہ ہی پڑھنا شروع کر دیا۔" نور العین نے سٹپٹاتے ہوئے ہارون کی بات کاٹی۔ ہارون نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اب شائستہ بھابھی کی طرف متوجہ تھا جن کے آنسو تھم چکے تھے اور وہ کسی سوچ میں غرق تھیں۔

"آپ بالکل بے فکر ہو کر گھر جائیں بھابھی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مرتضیٰ بھائی کی زندگی میں آپ کے علاوہ کسی اور عورت کی گنجائش نہیں نکلے گی۔ آپ ان کے بچوں کی ماں ہیں۔ آپ ان سے اور وہ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں' لیکن اب اس محبت کو تجدید کی ضرورت ہے۔ مرتضیٰ بھائی کو اس محبت اور اپنی زندگی میں ان کی اہمیت کا یقین دلائیں' وہ پلٹ کر کسی کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں۔" ہارون پورے خلوص سے انہیں سمجھا رہا تھا۔ یقین دلا رہا تھا۔

شائستہ بھابھی نے آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ اپنے میاں کو پھر سے اپنا بنا لیں گی۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے اس عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ واپس اپنے گھر کو گئیں تو ہارون نے مرتضیٰ بھائی کا نمبر ملایا تھا۔

"سب کچھ ٹھیک ہو رہا ہے باس' لیکن اب آپ کو مزید پھیلنے کی ضرورت نہیں۔ شائستہ بھابھی کو اپنے غلط طرز عمل کا احساس ہو گیا ہے۔ اب پیار محبت سے یہ معاملہ منطقی انجام تک پہنچائیں۔"

وہ ہنستے ہوئے مرتضیٰ بھائی سے مخاطب تھا۔ انہوں نے جانے آگے سے کیا کہا کہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ نور العین اسے مشکوک نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ جب اس نے کال ڈسکنیکٹ کی تھی تو کچھ کچھ معاملہ نور العین کی سمجھ میں آگیا تھا۔

"ہارون!" اس نے خفگی سے میاں کو پکارا۔

"جی جان ہارون۔"

"مجھے دال میں کچھ کالا لگ رہا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کے ذہن کی کارستانی تو نہیں؟" وہ ناراض ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"جان من 'دال میں کالا' پیلا کچھ نہیں تھا بس دال کو تڑکے کی ضرورت تھی۔ وہ میں نے لگا دیا۔ اب امید ہے سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔" ہارون ہنستے ہوئے بولا تھا۔

"آپ بہت خراب ہیں۔" وہ بھی کھسیائی۔

"اب تو جیسا بھی ہوں ڈارلنگ! تمہارا ہی ہوں' لیکن مجھے یہ بھی پتا ہے کہ خراب ہونے لگا تو سدھار لوگی۔ بگڑنے لگا تو سنوار لوگی۔ بکھرنے لگا تو سمیٹ لوگی۔" اس نے نور العین کا ہاتھ پکڑ کر قریب کھینچا تھا۔

"آپ رومانٹک ہونے لگتے ہیں تو آپ کو شاعری سوجھنے لگتی ہے۔ لیکن مجھے ابھی کچن میں بہت کام ہے۔ قصیدہ مکمل کر کے رکھیں۔ وعدہ رات کو پورا سنوں گی۔" نور العین ہنس کر اس کے بال بکھیرتی کچن میں چلی گئی۔

ہارون مسکراتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اگر جنت سے آدم کو نکالنے کا سبب عورت بنی تھی تو اس دنیا میں آدم کے گھر کو جنت بنانے والی بھی عورت ہی ہے۔

اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

۞

۲

دوسری قسط

تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ بھلے والا اور خوب دل والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرہ ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے۔ اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپارہا۔ مسجد میں پاکستان سے آئے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع پر نور محمد بہت گھبراتا ہے۔

عمر شہروز کا کزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہروز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہروز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہروز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہروز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے اصرار پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہوپاتا۔ اسکالرشپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

مکمل ناول
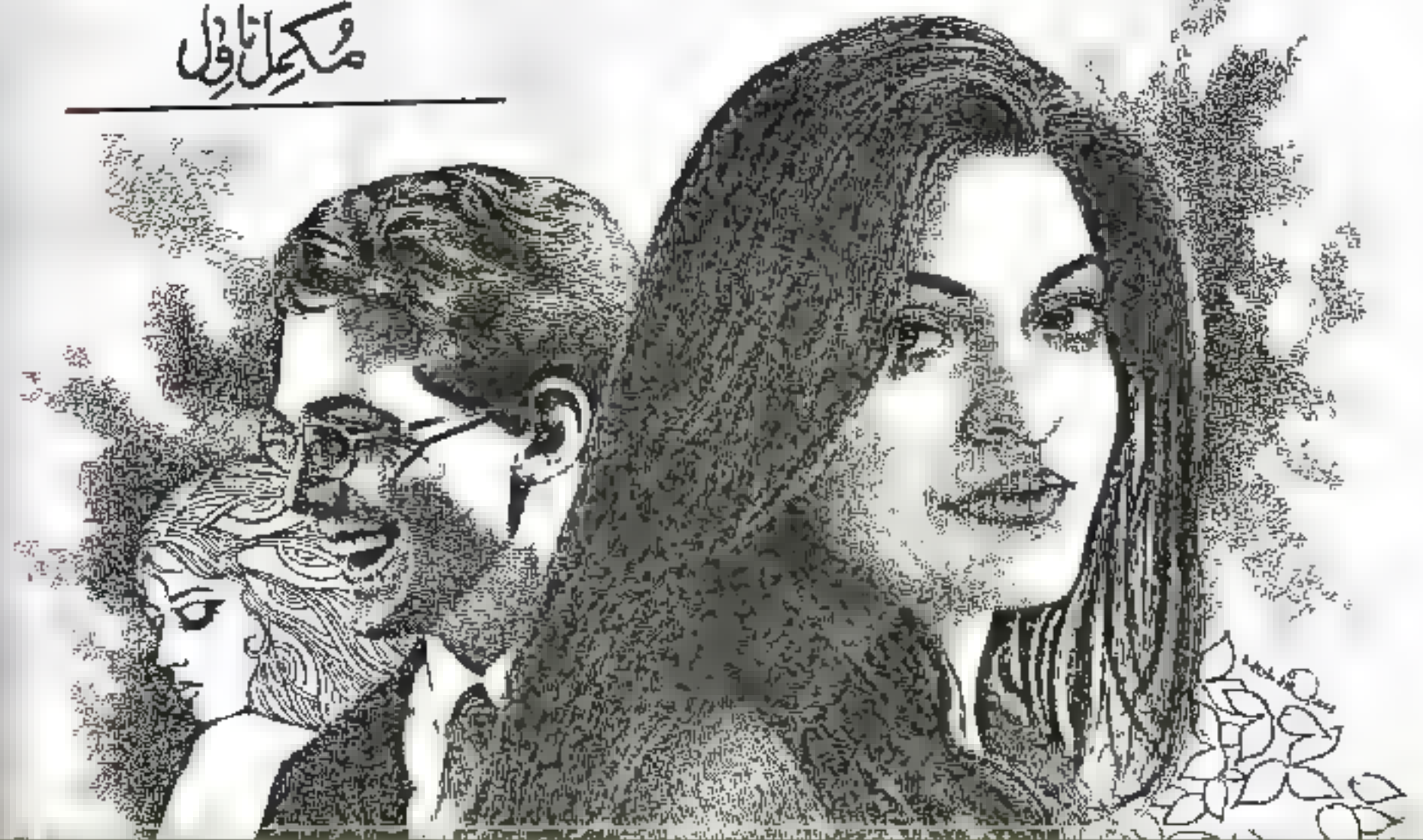
1973ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

زندگی کے بوسیدہ 'اکتاہٹ بھرے۔ الجھے الجھے اوراق پلٹنے کی کوشش کروں تو پہلا ورق ہمیشہ یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے۔ میرے شعور نے زندگی سے پہلا تعارف یہاں سے ہی حاصل کیا تھا۔ 73ء کا زمانہ ہے اور روپ نگر کا علاقہ۔۔۔۔

"تم ہاس مچھی کیوں کھاتے ہو؟" ییتا راؤ مجھ سے پوچھ رہی ہے۔ اس کے سوال میں عجیب سا طنز ہے اور لہجے میں تیکھی سی کاٹ۔ میں بے وقوفوں کی طرح اس کا چہرہ دیکھتا ہوں اور کندھے اچکا دیتا ہوں۔

"یکی چکن۔۔۔۔ مٹن۔۔۔۔ الابلا۔۔۔" وہ مزید بُرا سا منہ بنا لیتی ہے۔

"کیوں۔۔۔؟ تم نہیں کھاتیں؟" میں اس کے قدم سے قدم ملانے کے لیے مزید لمبا ڈگ بھرتا ہوں۔ وہ مزید دو قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔

"چخ۔۔۔۔چخ۔۔۔۔چخ" وہ زمین پر تھوکتی ہے۔ میں اس کے انداز پر ساکت رہ جاتا ہوں۔ وہ الٹے قدموں میری جانب مڑتی ہے۔ لیے 'گھنگھروؤں سے گندھے بال جھٹکا کھاتے ہیں۔۔۔۔ چھن چھن چھن۔۔۔۔ میں سمجھ نہیں پاتا کہ آواز اس کے بالوں سے آئی ہے یا دل ٹوٹ جانے کے باعث میرا سینہ گنگنایا ہے۔ ییتا راؤ کی آنکھوں سے انتہائی ناپسندیدگی جھلکنے لگتی ہے۔

"تمہیں پسند نہیں ہے؟" اس کے تاثرات سے سب عیاں ہے مگر میں پھر بھی پوچھ لیتا ہوں۔

"پسند۔۔۔۔؟" وہ نخوت سے استفہامیہ انداز میں دہراتی ہے اور ہاتھ میں پکڑی نازک چھڑی زمین پر پھینک کر اس میں پاؤں پھنسانے لگتی ہے۔ ننگے پاؤں چہل قدمی کرتے رہنے کے باعث اس کی چپلوں پر بھی مٹی منتقل ہونے لگتی ہے۔ رات بھر کہیں چند آوارہ بادلوں نے رم جھم کا سماں باندھے رکھا ہے۔ صبح کی تازہ دھوپ نے زمین کے آنچل کو خشک تو کر دیا ہے مگر مٹی کے اندر میٹھی سی نمی باقی ہے۔ قدم اٹھاؤ تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے مٹی پر نہیں مٹی کی نرم ہتھیلیوں پر قدم بہ قدم چل رہے ہوں۔ فضا میں جنگلی پھولوں اور گھاس کے ساتھ گیلی مٹی کی خوشبو بھی شامل ہے۔ ہر چیز خوشگوار ہے۔ ناگواری صرف ییتا راؤ کے چہرے پر ہے۔

"یہ ہمارے یہاں کبھی نہیں بنتا۔۔۔۔ ہم نے کبھی اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور جہاں یہ بنتا ہو ہم کبھی وہاں سے گزرتے بھی نہیں۔"

وہ مجھے بتاتی ہے اور مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس کی یہ رائے خوراک کے بارے میں نہیں میرے بارے میں ہے۔ میں اس کے سامنے ہونق نہیں لگنا چاہتا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ہونق ہی لگ رہا ہوں۔ وہ چپل پہن کر آگے بڑھنے کے بجائے واپسی کے لیے پیچھے مڑ جاتی ہے اور میں وہیں کھڑا کا کھڑا رہ جاتا ہوں۔

آج بھی جب کبھی اپنا ماضی کھنگالنے کی کوشش کروں تو پہلا ورق یہاں سے ہی شروع ہوتا ہے اور میں اپنے آپ کو اسی جگہ کھڑا محسوس کرتا ہوں۔ ننھے معصوم دل پر جو لرزتی کیفیت تب طاری ہوئی تھی اس کی کسک آج بھی محسوس ہوتی ہے۔ بچپن کے خوف بڑے عجیب ہوتے ہیں' ان کی خاص اہمیت بے شک نہ ہوتی ہو لیکن وہ محسوس ہوتے ہیں' چبھن دیتے ہیں اور یادوں میں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔۔۔۔ میرے لیے وہ مقام وہ وقت آج بھی ایسا ہی ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

ییتا راؤ سے میری پہلی ملاقات یہاں ہی ہوئی تھی۔ میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ یہاں چھٹیاں گزارنے آیا تھا۔ ہم یارک شائر برطانیہ کے رہنے والے تھے جہاں ویک فیلڈ میں کوئلے کی کانوں سے دور ہٹ کر ہمارا بڑا سا فارم ہاؤس تھا۔ یہ میرا اور گرینی کا انڈیا کا پہلا ٹور تھا۔ گرینڈ پا یہاں پہلے بھی آچکے تھے اور اب بھی تقریباً" ایک سال سے یہاں ہی رہ رہے تھے۔ برٹش آرکیٹکچرل ٹیکنالوجی پروگرام کے ممبر کی حیثیت سے وہ یہاں کسی پروگرام میں حصہ لے رہے تھے۔ یہ کافی بڑا پروجیکٹ تھا اور گرینڈ پا سارا دن سائٹ پر مصروف رہتے یا اپنے آفس میں پنسل اور گراف پیپر

کے ساتھ مگن نظر آتے تھے۔ میں اور گرینی فطرت کی خوب صورتی سے مالا مال روپ نگر سے متاثر تھے لیکن فراغت ہمیں تھکانے لگی تھی تب گرینی نے اس کا ایک اچھا حل ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے گھر کے دالان میں ایک کوچنگ سینٹر کھول لیا۔ یہ گھر ہماری رہائش کے لیے دیا گیا تھا اور کافی بڑا تھا۔ کوچنگ سینٹر کے قیام کے چند دنوں بعد ہی ہمارے دالان میں مقامی بچے بھاگتے دوڑتے نظر آنے لگے۔ ییتا راؤ بھی اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ انگلش اور جغرافیہ پڑھنے کے لیے آتی تھی۔ وہ گرینڈ پا کے انڈین کولیگ کی بیٹی تھی۔ وہ نا صرف بے حد پرکشش تھی بلکہ اس کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی طرح داری تھی۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود سب بچے آپس میں گھل مل گئے تھے لیکن ییتا راؤ کسی کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ وہ شہزادیوں کی سی آن بان لیے زیادہ تر خاموش بیٹھی رہتی۔ وہ عمر میں بھی باقی بچوں سے بڑی تھی اور اس کے انداز میں بھی نخوت جھلکتی تھی جس کی بنا پر باقی بچے اسے ناپسند کرتے تھے لیکن میرا دل نجانے کیوں اس سے دوستی کرنے کے لیے مچلتا رہتا۔

گرینی ویک اینڈ پر ہمیں چہل قدمی کے لیے جنگل کی جانب لے جاتی تھیں دراصل روپ نگر ایک بڑا ہی خوب صورت علاقہ تھا۔ اس کا ظاہری روپ سبزی مائل تھا اور پسماندگی اور سادگی اس کے ہر انداز سے جھلکتی تھی۔ جنوبی پنجاب انڈیا میں واقع یہ خوب صورت علاقہ ستلج کے پانی کی مہمان نوازی سے خوب لطف اندوز ہوتا تھا اسی لیے سبزہ طمانیت کی طرح اس کے چہرے پر بکھرا تھا۔ یہاں کے باسی اس کی لہلہاتی فصلوں کے روپ میں روپ نگر کی فراخدلی سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کی پیشانی پر تیوریاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کناروں سے جھلکتی رہتی۔ روپ نگر کا روپ اتنا سادہ تھا کہ جیسے کوئی صحت مند دیہاتی لڑکی سنہرے بالوں کو چھپائے اپنے حسن سے لاپروا کوئی علاقائی گیت گاتی اپنے کام میں مصروف ہو۔ روپ نگر کے اس روپ کے سامنے ورڈز ورتھ کی 'سولٹری ریپر" بھی پانی بھرتی نظر آتی۔ ییتا راؤ پہ نجانے کیوں اس نے کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔

ہمارے ساتھ پکنک پر جاتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ سپاٹ چہرہ بنائے رکھتی۔ اس کی مسکراہٹ چاند گرہن کی طرح تھی یعنی سال میں کبھی کبھار اور مجھے نجانے کیوں چاند گرہن سے اس درجہ الفت محسوس ہونے لگی تھی کہ میں باقی بچوں کو چھوڑ چھاڑ اس چاند گرہن کے درشن کی خاطر ییتا راؤ کے آس پاس منڈلاتا رہتا۔

وہ بھی ایک ایسا ہی ویک اینڈ تھا جب میں ییتا راؤ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ خود بے کم بات کرتی تھی مگر میری باتوں کا جواب دے دیتی تھی۔ اس کے ہر انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی کرنے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں رکھتی۔ اس نے ہمیشہ ہر اس چیز کے لیے ناپسندیدگی ظاہر کی تھی جو مجھے پسند تھی۔۔۔ جگساپزل' فٹ بال' کامکس' ٹی وی۔۔۔

اسی لیے جب اس نے مجھ سے میری فیورٹ ڈش پوچھی تو میں نے فوراً" چکن کا نام لیا تھا جس پر اس نے بھنویں اچکائیں اور پھر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ نجانے اسے کیا پسند آتا تھا۔ وہ ہم میں سے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔ ہم سب اگر چہل قدمی کرتے تو وہ ملازم سے کہہ کر رسی کا جھولا ڈلوالیتی اور جھولا جھولتی رہتی اگر ہم کھیلنے کے لیے ایک جگہ جمع ہوتے تو وہ چہل قدمی کے لیے آگے نکل جاتی اور دور کسی سنسان گوشے میں جا کر تھاتھاتھیا۔۔۔۔ تھیا تھیا کرتی رہتی' ناچتی اور گنگناتی رہتی۔ وہ کوئی ڈانس فارم سیکھ رہی تھی۔ یہ بات اس کے چھوٹے بھائی نے مجھے بتائی تھی۔ اس کے چکن کے بارے میں ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں اس کی تلاش میں جانے کے بجائے باقی بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتا لیکن میں پتا نہیں کیوں اس کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے اس قدر بے چین تھا۔ وہ مجھے جھولے پر بیٹھی نظر آئی۔ گرینی کچھ بچوں کے ساتھ بکھرے ہوئے جنگلی پھول چن رہی تھیں۔

ممی! یہاں آؤ‘ دیکھو خدا نے ہمیں کتنے خوب صورت تحفے دیے ہیں۔“ انہوں نے مجھے پکارا میں ایک نظر جھولا جھولتی بیتا راؤ پر ڈال کر ان کی جانب آ گیا۔ ان کے ہاتھ میں ٹوکری تھی جس میں مختلف رنگوں کے پھول تھے۔ میں عدم دلچسپی سے ان کی سرگرمی میں حصہ لینے لگا۔

”مسز گرانٹ۔۔۔ یہ کیا ہے؟“ لکشمی نے انگلی سے اشارہ کر کے پوچھا تھا۔ درخت کے تنے کے گرد گھاس میں کچھ چھپا تھا۔ گرینی نے ہاتھ سے گھاس کو ہٹایا۔

”ارے واہ یہ مشرومز ہیں آؤ بچو! دیکھو یہ سب کتنی پیاری ہیں اور کتنی زیادہ بھی۔“

گرینی سب کو متوجہ کر رہی تھیں۔ سب بچے مزید پُرجوش ہو کر اب مشرومز کا خاندان دیکھنے لگے اور مشرومز شاید بچوں کو‘ میں نظر بچا کر ایک بار پھر بیتا راؤ کے پاس آ گیا۔ اس نے وہی سرد سی نگاہ میری جانب اچھالی۔

میں اس کے عقب میں جا کر اسے جھولا جھلانے لگا تھا۔۔۔ صد شکر اس نے مجھے روکا نہیں۔

”تم میری برتھ ڈے پر آؤ گی؟“ میں نے اسے مخاطب کرنے میں پہل کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح میرے لہجے میں اشتیاق تھا۔ میں اور گرینی میری برتھ ڈے پارٹی کے لیے بہت پرجوش تھے۔ بیتا نے چبھتی ہوئی نگاہ مجھ پر ڈالی۔

”ہم کیسے آ سکتے ہیں؟ ہم نان ویجیٹیبل کے علاوہ کچھ نہیں کھاتے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکی پھر مزید گویا ہوئی۔ ”ہم مسز گرانٹ کے پاس صرف پڑھنے کے لیے آتے ہیں‘ ہم نے کبھی تمہارے گھر سے پانی بھی نہیں پیا ہے۔ کچھ کھانا تو دور کی بات ہے‘ پارٹی میں آنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔“ اس لمحے اس کی زبان ہی نہیں اس کی آنکھیں بھی سفاک لگ رہی تھیں۔

”تمہیں کیا پسند ہے؟ اگر چکن ناپسند ہے تو نوڈلز‘ فرنچ فرائز‘ یہ سب بھی ہو گا گرینی خود بنائیں گی۔“ میں نے اسے مطلع کیا تھا۔

”ہم نے کہا نا ہم نہیں آ سکتے ہم ایسے لوگوں کے ساتھ مراسم نہیں رکھتے جو نان ویج سبزیوں کے علاوہ کھاتے ہوں۔۔۔ ہمارے دھرم میں یہ سب ناپسندیدہ ہے اور ہماری ممی جی بھی اس کی اجازت نہیں دیں گی۔“ اس نے گردن جھٹکی تھی۔ میں جھولے کی رسی پکڑے اس کے سامنے آ گیا۔ جھولے کی رفتار آہستہ تھی۔ اس نے میرے چہرے کی جانب دیکھا۔

”تم ایک بار ان سے بات کر کے دیکھو۔“ میرا اشارہ اس کی ممی کی طرف تھا۔ میں منت سماجت پر اتر آیا۔ وہ جھولے سے زمین پر اتر آئی۔ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا تھا لیکن چہرے کے تاثرات ناگوار تھے جو مجھے سب کچھ باور کروا رہے تھے۔

”بیتا! ہم دوست نہیں بن سکتے؟“ میں ایک بار پھر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا تھا۔

”ہم دوست کیسے بن سکتے ہیں؟ میں نے کہا نا ہم نان ویج نہیں کھاتے۔“ اس کا انداز پہلے سے بھی زیادہ سفاک ہو گیا تھا۔ سبزی خور ہونے میں نجانے ایسا کون سا فخر کا حوالہ چھپا تھا۔

”خوراک کی ضرورت جسم کو ہوتی ہے روح کو نہیں‘ کھانے پینے سے دوستی پر فرق نہیں پڑا کرتا۔“

میں نے اتنی بڑی بات کر دی تھی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ رک گئی۔

”ہم یہ سب نہیں جانتے‘ لیکن ہمیں اتنا ضرور پتا ہے کہ ہم کسی نان ویج کھانے والے سے دوستی نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگ جو نان ویج کھاتے ہوں خصلتاً بُرے انسان ہوتے ہیں۔ اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے دوسرے جان دار کو قتل کر دینے والے لوگ مجھے پسند نہیں۔۔۔ ایسے لوگ کسی کے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اپنی خوراک کے لیے دوسرے جان دار کو مارنے والے انسان کے اندر بُرائی کی قوتیں اپنا گھر بنا لیتی ہیں۔ نان ویج کھاتے رہنے سے یہ برائی کی قوتیں اتنی زیادہ طاقت ور ہو جاتی ہیں کہ ایسے انسان کسی کے ساتھ وفادار نہیں رہ سکتے۔ وہ وفاداری کے قابل ہی نہیں رہتے‘ بات اصل میں یہ نہیں ہے کہ ہم تمہیں دوست نہیں بنا سکتے بات اصل میں یہ ہے کہ تم کسی کے دوست بن ہی نہیں سکتے۔۔۔ تم کسی سے وفادار رہ ہی نہیں سکتے‘ مجھے دوست صرف وفادار اچھے لگتے ہیں جو تم کبھی نہیں ہو سکتے تمہارے ساتھ دوستی کرنے سے بہتر ہے‘ میں کسی گھوڑے سے دوستی کر لوں جو سبزی خور بھی ہوتا ہے اور وفادار بھی۔“

اس نے اپنی بات نہیں مکمل کی تھی۔ مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نامکمل کر دیا تھا۔ وہ غرور و تکبر سے تنی گردن لیے آگے بڑھ گئی تھی اور میں وہیں کھڑا رہ گیا تھا۔ فضا میں پھیلی سٹیج کے فراخ دل پانیوں کی مہک جو مجھے بہت بھلی لگا کرتی تھی یک دم کڑوی کڑوی سی لگنے لگی تھی۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔۔۔

”ڈینئل تم میرے دوست بنو گے نا؟ بہترین دوست۔“ میں نے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہلایا تھا پھر ان کی نرمی کو محسوس کر کے اپنی انگلیاں ان میں ڈبو دی تھیں۔ میں بہت محبت سے اس کی پشت کو تھپتھپا رہا تھا۔ وہ اپنی تھوتھنی اور دُم ہلانے لگا۔ مجھے لگا اس نے میری بات کا جواب دیا ہے۔ مجھے بے پناہ خوشی ہوئی۔ میں ہی اس کے ساتھ خوش نہیں تھا وہ بھی میرے ساتھ خوش تھا۔ میں نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ گرینڈپا کے ڈرائیور نے اسے خوشبو دار شیمپو سے نہلایا تھا اور بہت محنت سے اس کے بالوں میں کنگھا کیا تھا۔ گرینی نے اس کی گردن کو سجانے کے لیے ایک خوب صورت بینڈ تیار کیا تھا۔ جو اب اس کی گردن کے گرد بندھا تھا۔ میں نے اسے گرینی کا پرفیوم بھی لگایا تھا۔

یہ جرمن نسل کا ایک چھوٹا سا کتا تھا۔ گرینڈپا کے ایک آسٹریلین کولیگ نے اسے تحفتاً ”میرے کھیلنے کے لیے دیا تھا۔ گرینڈپا اپنے اس کولیگ کو زیادہ پسند نہیں کرتے تھے اور وہ ڈینئل کو شکریے کے ساتھ لوٹا دینا چاہتے تھے‘ لیکن میری ضد سے مجبور ہو کر انہوں نے اسے واپس نہیں کیا تھا۔ میں ڈینئل کی وجہ سے بہت خوش تھا۔

”تم آج کے دن ہمارے پاس آئے ہو اسی لیے ہم تمہاری سالگرہ ہر سال اسی دن منایا کریں گے۔۔۔ 18 اپریل ہی تمہاری سالگرہ کا دن ہو گی۔“

میں اس کے بالوں والے جسم کو چوم رہا تھا۔ ڈرائیور انکل اس کے لنچ کا انتظام کر رہے تھے۔ انہوں نے ایک پیالے میں دودھ ڈالنا شروع کر دیا تھا اور وہ ساتھ ساتھ مسکرا بھی رہے تھے۔ وہ ہمارے گھر کے اکثر کام بہت خوش ہو کر کرتے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔ ان کا نام سکھوِندر تھا اور میں ان کے ساتھ بے تکلف تھا۔

”یہ تمہارا اچھا دوست ضرور بنے گا‘ دوستی کرنا اور اسے مرتے دم تک نبھانا اس کی خصلت میں شامل ہے‘ سیانے کہتے ہیں کتا ایک وفادار جانور ہے۔“ انہوں نے اپنے مخصوص لہجے میں سمجھایا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان زبان کا بڑا مسئلہ تھا۔ وہ مکمل میری بات نہیں سمجھ پاتے تھے اور میں مکمل ان کی‘ لیکن ٹوٹا پھوٹا جو بھی ہم بول پاتے اس سے مفہوم واضح ہو جاتا تھا۔ میں ”وفادار جانور“ پر چونکا۔ بیتا راؤ کا طعنہ یک دم یاد آ گیا تھا۔ اس کے لفظوں کی کرچیاں ابھی تک میرے دل میں چبھ رہی تھیں حالانکہ یہ چوبیس گھنٹے پہلے کی بات تھی۔ ڈرائیور انکل نے سارا دودھ پیالے میں ڈال دیا تھا۔ ان کے اشارہ کرنے پر ڈینئل میری گود سے نکل کر اس کی سمت لپکا۔ چند لمحوں بعد وہ پیالے میں منہ مارنا شروع ہو چکا تھا۔

”ڈینئل نان ویج کھا لیتا ہے؟“ میں نے ڈرائیور انکل سے پوچھا۔ انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔ کبھی کبھی ان کو دیکھ کر لگتا تھا وہ مسکرانے کی کوئی شعوری کوشش نہیں کرتے بلکہ ان کے چہرے کا مستقل رنگ ہی یہ ہے۔ انہوں نے پھیلے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ نفی میں سر ہلایا یعنی وہ میری بات نہیں سمجھ پائے تھے۔ میں نے منہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”نان ویج۔۔۔ نان ویج“ میں نے دہرایا۔ وہ ابھی بھی نہیں سمجھے تھے۔ ڈینئل ہم سے لاتعلق اپنی پیٹ

پوجا میں مصروف تھا۔ ڈرائیور انکل کو اتنا ہی سمجھ آیا تھا کہ میں ڈینئل کی خوراک کے متعلق پوچھ رہا ہوں

"چکن — مٹن — فش" میں نے مزید وضاحت کی۔ انہوں نے قہقہہ لگایا۔

"ہاں تے ہور کیہ 'سب کھائے گا' یہ کتا بڑی سکھ نسل کی چیز ہوتا ہے جی' یہ ہندو مسلم تھوڑی ہے کہ پیٹ سے جڑے معاملات بھی سوچ سوچ کر نبٹائے' سب کھلائیں گے اس کو۔"

میں نے سرہلایا۔ اب کی بار مجھے ان کی مکمل بات سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن مجھے وضاحت درکار نہیں تھی۔ انہوں نے کہہ دیا تھا کہ "سب کھائے گا" میں نے سمجھ لیا تھا۔ ڈینئل نے دودھ ختم کرلیا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ گود میں بھرلیا۔ اس کے منہ کے گرد دودھ کی جھالریں بن گئی تھیں۔ میں اسے صاف کرنا چاہتا تھا لیکن پھر نجانے میرے دل میں کیا سمائی میں نے اسے زمین پر چھوڑ دیا۔ وہ میرے پاؤں کے پاس منہ مارنے لگا۔

میں تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بھی پڑھا تھا کہ کتا ایک وفادار جانور ہوتا ہے اور ڈرائیور انکل کہہ رہے تھے کہ وہ نان ویج کھاتا ہے تو پتا کیوں نان ویج کھانے والوں کو وفادار نہیں سمجھتی تھی۔ میں گھر کے اندر کی طرف بھاگا۔ آخری کونے میں بڑا سا کچن تھا۔ میری منزل وہی کچن تھا۔ میں نے ریفریجریٹر کھول کر دیکھا وہاں ہمیشہ چکن یا میٹ وغیرہ موجود رہتا تھا۔ میں اس میں سے کچھ مقدار لینا چاہتا تھا لیکن وہ جم چکا تھا۔ میں نے چھری کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے چھری نظر نہیں آئی تھی لیکن ایک کونے میں لگے نل کے نیچے کھلے منہ کے برتن میں مچھلی پڑی تھی۔ یہاں اکثر تازہ مچھلی آتی رہتی تھی۔ ہمارا کک یا کبھی گرینی بہت مزیدار مچھلی کے قتلے اور ٹماٹر کی کھٹی ساس بناتے رہتے تھے۔ میں نے بنا سوچے سمجھے وہی مچھلی اٹھالی تھی۔ اس میں بساند تھی اور نل کے نیچے پڑے ہونے کے باعث اس میں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ میں دوبارہ بھاگ کر واپس باہر آگیا۔ ڈینئل باغیچے میں گھاس پر لوٹنیاں لگا رہا تھا۔

"ڈینئل — ڈینئل یہاں آؤ۔" میں نے اسے پچکارا۔ وہ اپنا نام پہچاننے لگا تھا۔ میں نے وہ مچھلی اس کے آگے ڈال دی۔ وہ مچھلی کے پاس آکر اسے سونگھنے اور منہ مارنے لگا۔ اس نے اسے منہ میں پکڑ کر چند بار اچھالا اور اپنی سامنے والی ٹانگوں سے ہلایا جلایا بھی لیکن اس کام کے چند لمحوں بعد وہ مچھلی کو چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اسے گھاس میں کھیلنا تھا۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔

"اسے نان ویج نہیں چاہیے تھا۔"

"مجھے پتا ہے یہاں تمہارا دل نہیں لگ رہا؟ تم اداس ہوگئے ہو نا؟ چند مہینوں کی بات ہے پھر ہم واپس چلے جائیں گے۔"

گرینڈپا نے مجھے تسلی دی۔ مجھے اندازہ تھا وہ میرا بجھا ہوا چہرہ بھانپ کر اندازے لگانے کی کوشش کررہے ہیں۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ مجھے نجانے کیوں اپنے مسائل اپنے منہ سے بتاتے ہوئے ہمیشہ کچھ وقت لگ جاتا تھا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں ہم ہیلووین سے پہلے واپس چلے جائیں گے۔" اب کی بار انہوں نے وعدہ بھی کیا تھا اور ساتھ ہی ہارن پر ہاتھ رکھا۔ فوکسی کے ارد گرد جمع ہونے والے بچے مجھے دیکھ کر مسکرا کر ہاتھ ہلاتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگے۔ ہم نزدیکی بازار سے کچھ خریداری کرکے واپس لوٹ رہے تھے۔ مجھے کچھ رنگین سلیں درکار تھیں۔ گرینڈپا نے اپنی ضرورت کی بھی کچھ چیزیں خریدی تھیں پھر ہمیشہ کی طرح مجھے ٹھیلے والی عورت سے کٹے ہوئے امرود لے کر دیے تھے۔ ٹھیلے والی عورت نجانے ان پر کیا چھڑکتی تھی کہ ان کا ذائقہ مزید اچھا ہو جاتا تھا۔ وہ امرود ابھی بھی کاغذ کے لفافے میں بند میری گود میں جوں کے توں پڑے تھے حالانکہ اب ہم واپس جارہے تھے۔

"تم نے ابھی تک ایک ٹکڑا بھی نہیں لیا ہے — جہاں تک مجھے پتا ہے یہ کافی پسند ہیں نا تمہیں؟"

انہوں نے بھورے بھورے تنگ دھڑنگ بچوں کے پیچھے ہٹ جانے کے بعد گاڑی کو کچے راستے سے اب ایک پتلی سی ٹوٹی پھوٹی سڑک پر چڑھالیا تھا۔ میں نے ان کے سوال پر ان کی جانب دیکھا اور اثبات میں سرہلایا۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا گرینڈپا! یہ میں نے گرینی کے لیے رکھے ہیں۔" میں نے انہیں بتایا تھا اور پھر گلاس ونڈو سے باہر دیکھنے لگا۔

روپ نگر کا ظاہری روپ سبزی مائل تھا جبکہ یہاں بسنے والے براؤن رنگت کے حامل تھے لیکن اس وقت مجھے کچھ بھی نہیں بھا رہا تھا۔ میرا دل عجب کشمکش میں گھر گیا تھا۔ جیتا راؤ نے میری دوستی کا دم بھرنے سے ہی انکار نہیں کیا تھا بلکہ میرا دل توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ہماری گاڑی جھٹکے لے لے کر آگے بڑھ رہی تھی۔ آس پاس کے کچے گھروں میں بسنے والے کسانوں کے کچھ دلیر بچے ابھی بھی گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ جس بچے کا ہاتھ گاڑی کو چھو جاتا وہ فخریہ انداز میں باقی بچوں کو دیکھنے لگتا۔ مجھے آج ان کی شرارتوں میں بھی کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ یہ بچے بھی شاید کسی نان ویج کھانے والے کو ناپسند کرتے ہوں اور مجھ سے دوستی میں قطعا" دلچسپی نہ رکھتے ہوں یہ سوچ کر میں ان کی مسکراہٹوں اور ان کے ہلتے ہاتھوں کا جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔

"ہیلووین کے لیے اس دفعہ زبردست سی منصوبہ بندی کریں گے — میں کوشش کروں گا کہ تمہارے لیے چیزوں کو بڑے اہتمام اور حیران کن بنا سکوں۔"

وہ مجھے خوش کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں یقینا" اپنا آپ میری مردہ دلی کا باعث لگ رہا تھا۔ ہمیں ان سے شکایت رہنے لگی تھی کہ وہ اپنی مصروفیت میں ہمیں اگنور کررہے ہیں۔ دراصل انہیں صبح سے شام تک بہت کام ہوتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ جو وقت بھی گزارتے اس میں ہمیں بھرپور خوشیاں اور اپنی تمام تر توانائی فراہم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ انہیں میری خاموشی سے یقینا" تپ ہورہی تھی۔

"گرینڈپا!" میں نے یکدم انہیں اپنی الجھن میں شامل کرنے کا ارادہ کیا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔

"آپ نے ڈینئل کو دیکھا — وہ بہت پیارا ہے نا۔" میں نے ابتدا کی تھی۔ انہوں نے سرہلایا۔

"میں تمہارے لیے خوش ہوں بالآخر تمہیں اس سرزمین پہ ایک اچھا اور پیارا دوست مل گیا۔"

"آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے گھوڑا لے کردیں گے عربی نسل کا سفید۔" مجھے ان کا وعدہ یاد آیا تھا۔ انہوں نے سرہلایا اور مسکرائے۔

"مجھے یاد ہے میں تمہیں ضرور لے کردوں گا تم اس کا بہت خیال رکھنا۔ وہ جب تین برس کا ہو جائے گا تو ہم اسے ڈربی میں دوڑائیں گے — میں اس کی لگام پکڑ کر اسے ریس کورس لے جاؤں گا وہ ہمیشہ جیت کر واپس آیا کرے گا تمہارا گھوڑا تمہیں کبھی مایوس نہیں کرے گا — ایک وفادار پالتو جانور تمہیں زندگی بھر خوشگوار تجربات سے دوچار کرتا رہے گا۔" یہ وہ بات تھی جسے وہ ہمیشہ دہرانا پسند کرتے تھے۔ میں ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"گھوڑا وفادار جانور ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا تھا۔ وہ اپنے دھیان میں مگن تھے۔

"بے حد مرتے دم تک مالک کا دم بھرتا ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں جیسے سلیوٹ بھی کر ڈالا تھا۔

"گرینڈپا! گھوڑا نان ویج کھاتا ہے؟" میرے تذبذب کی اصل وجہ تو یہ سوال تھا۔

"نہیں' نہیں سبزی خور ہوتا ہے۔ تم اس کی خوراک کے بارے میں فکر مند مت ہو' یہ ڈیوٹی ہم تمہاری گرینی کو دیں گے۔ تم جانتے ہی ہو' وہ ہم سب کے کھانے پینے کا کتنی اچھی طرح سے خیال رکھتی ہیں۔"

وہ میرے مزاج کی شگفتگی کو بحال کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ بول رہے تھے۔ میں نے اب کی بار سرہلایا نہ کچھ بولا۔ میں اگلا سوال پوچھنے سے پہلے کچھ سوچنا چاہتا تھا۔

"ڈینئل بھی نان ویج نہیں کھاتا؟" دونوں باتوں کا

مثل بیتا راؤ کی ولدیت کیسوری سے ہی ملتا تھا۔ گرینڈپا نے بغور مجھے دیکھا۔

"بھوک لگی ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ میں اب بھی فوراً "کچھ نہیں بولا تھا۔ مجھے عجیب طرح کے احساسات نے گھیر رکھا تھا۔ بیتا راؤ کا چہرہ یاد آتا تو ان احساسات کی شدت میں اضافہ ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ میں مزید الجھ گیا تھا۔ گرینڈپا نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے چکن نہیں چاہیے۔" میں نے اپنی پلیٹ گرینڈپا کی جانب کھسکا کر نانا گریپی کی طرف دیکھے اپنا عندیہ ظاہر کیا تھا۔ میرا انداز بجھا بجھا سا تھا جو مجھے خود بھی محسوس ہو رہا تھا یہ کیسے ممکن تھا کہ گریپی کو محسوس نہ ہوتا۔

"مجھے چکن ہی چاہیے۔" اس سے پہلے کہ گریپی مجھے ٹوکتیں گرینڈپا نے فوراً" اپنی پسندیدگی ظاہر کی تھی۔ ٹیبل پر چکن کے تلے ہوئے قتلوں کے علاوہ سوپ اور مختلف سبزیوں کی سلاد بھی موجود تھی۔ میں نے سوپ کا پیالا اپنی جانب کر لیا اور چپ چاپ اس میں موجود کورن کے دانوں کو دیکھنے لگا۔

"چکن کا ذائقہ زبردست ہے۔" گریپی کے اشارہ کرنے کے بعد ہم نے کھانا شروع کیا تھا۔ آج کا ڈنر خانساماں کے بجائے خود گریپی نے تیار کیا تھا۔ چکن کے قتلے اور ٹماٹر کی کھٹی ساس مجھے اور گرینڈپا کو بے حد مرغوب تھی۔ گرینڈپا چکن کی تعریف کر رہے تھے۔ میرا جی للچایا مگر بیتا راؤ کی تکلیف وہ باتیں بھی یاد آ گئیں۔

"تم کسی سے وفادار ہو ہی نہیں سکتے تم اس قابل ہی نہیں ہو۔"

میں نے گھبرا کر سوپ کا چمچ منہ میں رکھا تھا۔ سوپ ابھی گرم تھا۔ مجھے اپنا منہ جلتا محسوس ہوا مگر میں نے تکلیف کا اظہار نہیں کیا تھا کیونکہ میں ان دونوں کے سامنے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مجھے بیتا کی گفتگو نے بے حد الجھا دیا تھا۔

"چکن نہیں لیا تم نے؟ دوپہر کو تم نے سینڈوچ بھی یہ کہہ کر چھوڑ دیا تھا کہ اس میں چکن ہے اب بھی نہیں چاہیے مگر کیوں؟ تمہیں اعتراض کیا ہے مسئلہ کیا ہے تمہارے ساتھ؟"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے گریپی میں نے نان ویج چھوڑ دیا ہے آپ میرے لیے۔"

ابھی میں نے اتنا ہی کہا تھا کہ گریپی نے ہاتھ میں پکڑا کانٹا پلیٹ میں رکھ دیا اور غرا کر بولیں۔

"کیوں؟" مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ میں سوپ کی طرف متوجہ رہا۔

"نان ویج کیوں چھوڑ رہے ہو تم؟" انہوں نے دہرایا۔ "تمہارے بڑھتے ہوئے جسم کو پروٹین کی ضرورت ہے۔ اگر تم یہ سب چھوڑ دو گے تو بونے بن کر رہ جاؤ گے۔ یہ سب کھانے کی چیزیں پروٹین کا ذریعہ ہیں۔ مسٹر گرانٹ ایک منٹ توجہ دیں گے آپ؟"

انہوں نے گرینڈپا کو بھی درمیان میں گھسیٹنے کی کوشش کی۔

"چکن بہت اچھا ہے بلی! تم تھوڑا سا لے کر دیکھو۔" گرینڈپا نے کسی کی جانب دیکھے بنا کہا اور اپنے کھانے کی رفتار کو بھی کم نہیں کیا تھا۔ میں نے سوپ کا ایک اور چمچ بھر کر منہ میں رکھا اور کن اکھیوں سے گریپی کو دیکھا۔ وہ مجھے گھور رہی تھیں۔ میں ان کے آگے خود کو ہمیشہ بے بس محسوس کرتا تھا۔ ان کا میرا پیار بڑا گم صم سا تھا۔ وہ مجھے بہت ٹوکتی تھیں 'بہت ڈانٹتی تھیں اور بہت کم میری بات بنا بحث کے مانتی تھیں مگر میں اگر بیمار پڑ جاتا یا سست نظر آتا تو ان کی نیند اڑ جاتی تھی۔ یہی صورت حال تب ہوتی تھی جب میری کھانے پینے کی روٹین میں کوئی کمی بیشی ہوتی تھی۔ اس لیے انہیں اب بھی بے چینی سی شروع ہو گئی تھی۔ میں جانتا تھا وہ مجھے زبردستی چکن کھانے پر مجبور کر دیں گی اسی لیے میں تیزی سے سوپ پینے میں مگن ہو گیا تھا کہ ڈنر کو جلد از جلد ختم کر کے ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ جاؤں۔

"میری بات سن رہے ہو تم؟ میں دیکھ رہی ہوں بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو تم اسی لیے میں یہاں آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔" ان کی آواز مزید بلند ہوئی تھی۔ "تمہیں اتنی بھی تمیز نہیں رہی کہ اپنے بڑوں کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے یہ سب میری برداشت سے باہر ہے مجھے تم۔"

وہ فربہی مائل تھیں اور غصے میں مزید فربہ دکھنے لگتی تھیں۔ گرینڈپا اس حالت میں ہمیشہ انہیں بابا کارن بلاتے تھے۔ ان کا غصہ دیکھ کر مجھے یکدم رونا آنے لگا۔ میں سوپ کے ساتھ ساتھ آنسو بھی پینے لگا۔

"کم آن میگی! بچہ ہے۔ بھوک لگے گی تو کھا لے گا سب کچھ تم ڈنر کرو کیوں فکر کرتی ہو؟ یہ چکن کھاؤ نا۔" گرینڈپا نے انہیں راضی کرنا چاہا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے اپنی پلیٹ پر جھکی تھیں پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔

"یہ سوپ جو تم پی رہے ہو نا یہ بھی نان ویج ہے پتا ہے کہ نہیں؟" انہوں نے آنکھیں گھمائی تھیں۔ میری آنکھیں پھر بھاری ہونے لگیں۔

"مسٹر گرانٹ! بتائیں ذرا اپنے لاڈلے پوتے کو۔" سوپ میں ساس ڈالتے ہوئے گریپی کا انداز مزید طنزیہ ہو گیا۔

"سوپ بھی نان ویج ہوتا ہے کیا؟" میں نے ملی جلی کیفیت میں گھر کر گرینڈپا کو دیکھا یہ بات حتمی تھی کہ گریپی جھوٹ نہیں بولتی تھیں۔

"ارے نہیں بھئی ایسا کچھ نہیں ہے تم ختم کرو یہ سوپ۔" انہوں نے مجھ سے کہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گریپی کو کچھ اشارہ کیا جو میں نے فوراً" بھانپ لیا۔ میرا دل بالکل ٹوٹ گیا۔ کب سے پلکوں کی باڑھ پر دبک کر بیٹھے آنسو پھسل کر گالوں پر آ گئے۔ میں نے سوپ کا پیالا سامنے سے ہٹا دیا۔

"میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں بڑا ہو گیا ہوں میں نے کہا نا میں نان ویج نہیں کھاؤں گا تو آپ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا کیا میں اپنی مرضی سے کچھ کھا بھی نہیں سکتا؟"

میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں مجھے ٹوکتے میں اٹھ کر باہر آ گیا تھا۔ کچن کے بعد کافی وسیع و عریض ہال تھا۔ میں اس ہال سے گزر کر باہر لان میں آ گیا تھا۔ یہاں کافی خنکی تھی لیکن میں نے پروا نہیں کی میں خاموشی سے درخت کے کٹے ہوئے تنے پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ دن کے وقت جو ماحول خوشگوار لگتا تھا رات کے وقت وہاں عجیب سا خوف چھایا ہوا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے اپنے اردگرد جھینگروں کا مشاعرہ ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا جس سے مجھے مزید خوف ستانے لگا۔ اس سے پہلے کہ میں خوف زدہ ہو کر وہاں سے اٹھ جاتا میں نے گرینڈپا کو آتے دیکھا۔ چند لمحوں بعد وہ میرے قریب آ کر بیٹھ گئے تھے۔ میں نے پرحرارت لمس اپنے اردگرد پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ گرینڈپا نے میری جیکٹ میرے کندھوں پر ڈال دی تھی۔ میں نے منہ مزید بسور لیا یہ میری مصنوعی ناراضی تھی۔

"مجھ سے ناراض ہو؟" وہ پوچھ رہے تھے۔ انہوں نے یقیناً" میرے آنسو بھی دیکھ لیے تھے۔

"گریپی کبھی کبھی مجھے بھی بہت غصہ دلا دیتی ہے۔ جیسے آج اس نے تمہیں دلا دیا وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔"

ان کا اپنا ایک سادہ سا مخصوص انداز تھا۔ میں خاموش رہا حالانکہ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ میں گریپی سے زیادہ اپنے آپ سے خفا ہوں کیونکہ میں لاتعداد برائی کی قوتوں کا گڑھ بن چکا ہوں۔

"جب لوگ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ بہت اشتعال کا باعث بننے لگتے ہیں۔ انہیں بلاوجہ ہر چیز پر تحقیق کرنے کا شوق ہو جاتا ہے کیوں 'کیسے 'کس لیے انہیں یہ بھی نہیں پتا چلتا کہ انہیں چھوٹے بچوں کی طرح ری ایکٹ نہیں کرنا چاہیے۔" وہ بات کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں گردن بھی ہلا رہے تھے۔

"بوڑھے لوگ کتنے بھی بوڑھے ہوں وہ بہت محبت

کرتے ہوئے ہوتے ہیں۔۔۔ ان کی محبت کے بارے میں مشکوک ہونا فضول ہے۔ محبت کو شکوک اور وسوسے راس نہیں آتے۔۔۔ محبت اور مذہب میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔"

میں نے بنا تاثر دیے دیکھنے کا عمل جاری رکھا۔ گرینڈپا کی وضاحت بیکار تھی۔ میں گرینی کی محبت کے متعلق کسی وسوسے کا شکار نہیں تھا۔ بے شک میری ان کی کم بنتی تھی لیکن میں ان کی وجہ سے کبھی رویا نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں گرینڈپا! گرینی بہت اچھی ہیں ۔۔۔ لیکن وہ مجھ پر دھونس کیوں جماتی ہیں؟ میں نے کہا نا نان ویج چھوڑ چکا ہوں میں۔ مجھے چکن نہیں چاہیے تھا۔"

"اچھا! اچھا تو یہ بات ہے' اس کی کوئی خاص وجہ؟ میں تمہاری گرینی کو سمجھادوں گا۔"

ان کا انداز بے حد سرسری تھا اور مجھے ان کی یہی بات پسند تھی۔ وہ کسی چیز کو مسئلہ بناتے تھے اور ہمیشہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں یکدم ان کی جانب مڑا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اپنی زندگی میں کوئی فیصلہ کرتا اور انہیں اس میں شامل نہ کرتا۔

میں نے انہیں سب کچھ بتادیا جیا راؤ سے دوستی کی خواہش اس کی نان ویج کھانے والوں کے لیے نا پسندیدگی اور اپنی آزردہ دلی۔

"ایک ایسی لڑکی جو دوستی کی ابتدا سے پہلے ہی تم میں برائی کی نشاندہی کر رہی ہے ایسی لڑکی کو دوست بنا کر تم کیا کرو گے؟"

میرے خاموش ہو جانے پر وہ تحمل بھرے لہجے میں بولے تھے جب کہ میں پرجوش ہو گیا۔

"مجھے لگتا ہے گرینڈپا! اس بات میں کچھ حقیقت تو ہے۔"

وہ حیران ہوئے تھے۔ میں نے گہری سانس بھری۔ یہی تو کنفیوژن کی وجہ تھی۔

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ "قتل" کبیرہ گناہ ہے۔ جب ہم اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے جان دار کی جان لیتے ہیں تو یقیناً "گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس گناہ کی پاداش میں برائی کے فرشتے ہی پیدا ہوں گے نا یہ برائی کے فرشتے ہمارے اندر برائی یعنی غداری پیدا کرتے ہیں۔ گرینڈپا گھوڑا ایک وفادار جانور ہے اور اس کی خوراک کیا ہوتی ہے جبکہ شیر کیا کھاتا ہے اور اس کی وفاداری کا عالم کیا ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہے ہمارے گھر ایک بلی ہوتی تھی کرسٹل۔" میں نے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی۔

"گرینی کرسٹل کو کبھی گوشت کھانے کو نہیں دیتی تھی۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ پالتو جانور کو گوشت کھلانے سے اس کے منہ کو خون کا ذائقہ لگ جاتا ہے پھر اسے کاٹنے کی عادت پڑجاتی ہے۔"

میرا انداز ایک بار پھر پرجوش ہوا تھا۔ گرینڈپا مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ میری بات مکمل ہوتے ہی انہوں نے گہری سانس بھری۔

"اس لیے تم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ تم چکن' مٹن وغیرہ کچھ نہیں کھاؤ گے؟" وہ پوچھ رہے تھے میں خاموش رہا۔ انہوں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔

"میں وفادار رہنا چاہتا ہوں گرینڈپا ہمیشہ' میں نہیں چاہتا کہ برائی کی قوت یا فرشتے میرے اندر اپنا گھر بنائیں۔"

میں نے سادہ سے لہجے میں کہا تھا۔ وہ ساری گفتگو کے دوران پہلی بار کچھ مطمئن سے نظر آئے۔

"مجھے امید ہے کہ تم میری بات کو جیا راؤ کی بات سے تھوڑی سی زیادہ اہمیت دوگے ورنہ میں تمہاری مدد نہیں کرپاؤں گا۔" میں نے سر ہلایا تھا۔

"میرے بچے وفاداری کوئی سکھائی جانے والی چیز نہیں ہے۔ ارشمیدس کا اصول یا فیثا غورث کا مسئلہ۔ یہ فطرت ہے انسانی فطرت' قدرت نے ہمارے اندر یہ مادہ رکھا ہے۔ ہم انسان پیدائشی طور اپنے اندر لاتعداد خوبیاں لے کر آتے ہیں' وفاداری ان میں سے ایک ہے۔ ہم جب کسی چیز کے ساتھ وفادار رہتے ہیں یہ کچھ بھی ہو سکتا ہے دوست' عقیدہ' کوئی خیال۔ کوئی سوچ یا پھر زمین کا کوئی ٹکڑا' تو ہمیں اس سے سکون ملتا ہے

روح کی بھوک کا توڑ صرف ایک ہے سکون' بدن کو روٹی نہ ملے اور روح کو خوشی نہ ملے تو انسان انسان نہیں رہتا اپنے محور سے ہٹنے لگتا ہے۔ گھوڑا وفادار ہے کیونکہ بنانے والے نے یہ عنصر اس کی فطرت میں رکھ دیا ہے جبکہ شیر کی فطرت میں یہ نہیں ہے۔ یہ جانور ہم سے وفادار نہیں ہیں بلکہ اپنی فطرت سے وفادار ہیں۔ یہ اس عنصر سے وفادار ہیں جو خدا نے ان کی طبیعتوں میں رکھی ہے اس لیے وفاداری یہ ہے کہ ہم اپنی فطرت سے مخلص ہو جائیں تاکہ روح کی بھوک مٹتی رہے' اسے سکون و اطمینان ملتا رہے اور انسانیت اپنے محور سے نہ ہٹے۔"

"گرینڈپا! آپ میری بات۔" میں ان کی بات کاٹ کر کچھ کہنا چاہتا تھا کہ انہوں نے میرے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"قدرت نے انسان کو' تمہیں مجھے ہم سب کو بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور جسے محبت سے تخلیق کیا جاتا ہے نا اس کی فطرت میں بھی صرف محبت رکھی جاتی ہے۔ خدا بھی انسانوں سے یہ توقع نہیں کرتا کہ وہ برائی میں ملوث رہیں۔ اس لیے یہ بات یاد رکھو کہ برائی انسان کی فطرت نہیں ہے۔ خدا ہر بچے کی فطرت کو نیکی کی مٹی سے گوندھ کر تخلیق کرتا ہے۔ ہر بچہ نیکی کے ایمان اور اچھائی کے گمان پہ پیدا کیا جاتا ہے۔ تمہارا کام اس ایمان اور اس گمان کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا ہے۔" انہوں نے لمحہ بھر کا توقف کیا تھا۔ مجھے ان کی سب باتیں سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔

"انسان کا اپنی ذات کے ساتھ اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔"

انہوں نے جھک کر زمین سے کچھ اٹھایا تھا۔ چند لمحوں بعد میں نے انہیں زمین پر کچھ بناتے دیکھا۔ انہوں نے شاید کوئی نوکیلا کنکر اٹھایا تھا جس کی مدد سے وہ زمین پر کچھ بنا رہے تھے۔ اگلے لمحے وہ اپنا کام مکمل کرچکے تھے۔ زمین پر ایک بڑا سا دائرہ نرم مٹی کے قلب میں کھدا ہوا صاف نظر آرہا تھا۔

"یہ دنیا ہے' تمہاری دنیا۔" انہوں نے دائرے کی سمت اشارہ کرکے کہا پھر وہ اس دائرے کے اندر کچھ بنانے لگے تھے۔

"یہ تم ہو خدا کی سب سے خوب صورت تخلیق' حضرت انسان۔" انہوں نے مٹی پر دائرے کے عین اندر اب ایک پانچ کناروں والا ستارہ بنا دیا تھا جو اس دائرے میں محصور تھا اور وہ اس محصور چیز کو حضرت انسان کہہ رہے تھے۔

"تم ساری زندگی بحیثیت انسان اسی دائرے میں قید رہو گے یعنی یہ تمہاری ذات ہے اور تمہاری ذات ہی تمہاری دنیا ہے اور اس دنیا کے ساتھ تمہارا اخلاص ہی تمہاری وفاداری ہے۔ اس وفاداری میں کوئی دوسرا انسان ذمہ دار نہیں ہو سکتا سوائے خود تمہارے' کیونکہ خدا نے تمہیں اس دائرے کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ اس کی وسعت کا اختیار بھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔ کسی انسان کا دائرہ بہت وسیع ہو سکتا ہے' اسی طرح کسی کا بہت مختصر ہو سکتا ہے۔۔۔ اس دائرہ میں کون کون ہو گا اس کا فیصلہ بھی انسان خود کرتا ہے۔ اس کے لیے اس کی خوبیاں' خامیاں' اس کی قوت فیصلہ ہر چیز ذمہ دار ہوتی ہے۔ خود غرض انسان کا دائرہ ہمیشہ مختصر ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے وجود سے پیار ہوتا ہے اپنی ذات سے نہیں اور جسے صرف وجود کی چاہ ہو وہ کسی کا وفادار نہیں ہو سکتا۔ انسانیت کا ہر سبق دراصل ذات ہی سکھاتی ہے ہمیں' اس لیے وفاداری سیکھنی ہے تو اپنی ذات کا احترام کرو' ذات کی خواہشات کا احترام کرو۔ اپنی طلب سے لڑنا' اپنی فطرت سے لڑنے کے مترادف ہے اور یہ کام انسان کے بس کا نہیں' اس لیے اگر تم یہ سوچتے ہو کہ فطرت سے بغاوت کرکے تم وفادار ہو سکتے ہو تو یہ غلط ہے۔"

انہوں نے میری جانب دیکھا اور اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ مجھے دراصل بتانا کیا چاہ رہے تھے۔

"وفاداری سیکھنا چاہتے ہو' وفادار رہنا چاہتے ہو تو اپنے آپ کے ساتھ اخلاص برتو' اس دائرے کے ساتھ اخلاص برتو۔"

وہ اب اس دائرے پر انگلی گھما رہے تھے۔

"یہ دائرہ اس مٹی پر بنا ہے۔ وفاداری سیکھنی ہے تو اس مٹی سے سیکھو۔ مٹی سے زیادہ وفادار کوئی دوسری چیز اس دنیا میں نہیں۔ انسان کا خمیر اس مٹی سے اٹھایا جاتا ہے اور بعد از مرگ اسی مٹی میں دفنایا جاتا ہے۔" انہوں نے اب اس دائرے میں قید ستارے پر انگلی رکھی تھی۔

"یہ تم ہو۔" انہوں نے کہنا شروع کیا تھا۔

"اس مٹی سے بنے ہو۔" انہوں نے پہلے کنارے پر انگلی چلائی۔

"اس مٹی پر بستے ہو۔" اب کی بار بغیر انگلی اٹھائے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئی۔

"اس مٹی پر چلتے ہو۔" ان کی انگلی تیسرے کنارے پر آپہنچی۔

"اس مٹی سے کھاتے ہو۔" چوتھا کنارہ شروع ہو گیا تھا۔

"اس مٹی میں مر جاتے ہو۔" ان کی انگلی آخری کنارے پر پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس ستارے سے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا تھا۔

"کیا دنیا میں واقعی "برائی" کا وجود نہیں ہے۔"

☼ ☼ ☼

"شہوز... تم کیا کر رہے ہو؟" دوسری جانب سے ہیلو کی آواز سنتے ہی اس نے پوچھا تھا گویا اسے یقین تھا کہ فون شہوز نے ہی ریسیو کیا ہوگا۔

"جھگڑا... تم بھی آجاؤ۔" شہوز کی کسی قدر اکتاہٹ بھری آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ زارا کو اندازہ تھا کہ وہ اس وقت اس کی کال کو زیادہ پسندیدہ رسپانس نہیں دے گا۔ اس کا سیل آف مل رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مصروف ہے۔ وہ جانتی تھی شہوز کا "وائیوا" دو ایک دن میں ہونے والا ہے۔ وہ نا صرف محنتی اسٹوڈنٹ تھا بلکہ اپنے پروفیسرز کا فیورٹ بھی تھا۔ پوزیشن ہولڈر ہونے کی وجہ سے اسے اپنا سابقہ ریکارڈ بھی برقرار رکھنا تھا۔ اس نے تھیسز پہ جتنی محنت کی تھی اس سے کہیں زیادہ وہ وائیوا کے لیے کر رہا تھا۔ اسی لیے وہ بہت دنوں سے اسے نظر انداز بھی کر رہا تھا۔ زارا ایسی باتوں پہ دوسری لڑکیوں کی طرح برا نہیں مانتی تھی۔ بلکہ وہ خود بھی اس سے زیادہ رابطہ نہیں کرتی تھی اب بھی اگر مسئلہ نہ در پیش ہوتا تو وہ اسے کبھی ڈسٹرب نہ کرتی۔ وہ خود کافی پریشان تھی لیکن اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

"تو من تیل میسر آگیا تھا میری رادھا کو۔"

"نہیں... تب ہی تو ناچ نہیں رہی بھنگڑا ڈال رہی ہے آپ کی رادھا۔" شہوز کی آواز میں اب تھکن بھی نمایاں تھی۔

"میری رادھا تھک گئی ہے؟" اس نے اپنی پریشانی کو چھپا کر محبت سے کہا تھا۔

"ہائے..." شہوز نے گہری سانس بھری پھر بولا۔

"کچھ مت پوچھو زارا... اتنا کام ہے کرنے والا اور دو دن سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔ میرا ذہن بالکل بلینک ہے۔ عمر کے چکروں میں بڑا وقت ضائع ہوا ہے میرا۔" وہ اپنا دکھڑا رو رہا تھا۔ زارا کو اپنا یاد آگیا۔

"شہوز!" زارا نے اتنا کہہ کر توقف کیا تھا۔ اس کی آواز میں مخصوص سی بے چارگی آگئی تھی جس سے شہوز بطور خاص واقف بھی تھا اور چڑتا بھی تھا۔

"اب کہہ بھی دو کہ کیا پرابلم ہے؟ مجھے پتا ہے میری خیریت پوچھنے کے لیے فون نہیں کیا تم نے اس وقت۔"

اس کے اس طرح کہنے پر زارا نے سامنے لگے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ گیارہ بج رہے تھے۔

"شہوز! تم اس وقت آسکتے ہو میری طرف۔" وہ لجاجت سے بولی تھی جس کا شہوز پر ذرا اثر نہیں ہوا۔

"جی نہیں... اتنی خوب صورت نہیں ہیں آپ کہ میں آپ کی ہر فرمائش پوری کرتا پھروں۔" اس نے صاف انکار کیا۔

"پلیز سیریس یار! ایک پرابلم ہو گئی ہے۔" زارا کی آواز میں لجاجت و منت کی آمیزش تھی۔

"اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا... تم ہو ہی

پرابلمز کا انچی کیس۔" وہ بے پناہ چڑ کر بولا۔ زارا کو بھی غصہ سا آگیا۔

"ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن اس وقت پرابلم کا تعلق مجھ سے نہیں بلکہ تمہارے چہیتے عمر احسان سے ہے۔" وہ غرا کر بولی تھی۔

شہوز کو زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ عمر آج کل شہوز کے وائیوا کی وجہ سے زارا لوگوں کے گھر رہ رہا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے اسے شہوز نے ہی کہا تھا کیونکہ اسے شکایت تھی کہ عمر اس کا بہت وقت ضائع کرتا ہے جبکہ عمر کا کہنا تھا کہ شہوز اس کو ٹائم نہیں دیتا جبکہ وہ ان کے گھر مہمان ہے۔

"وہ بھی تمہارا جڑواں بھائی ہے' تم سے کم نہیں ہے اور ہاں وہ آج کل تم لوگوں کے گھر رہ رہا ہے تو اس کے پرابلمز بھی تم لوگ حل کرو۔ مجھے معاف رکھو اس کے معاملات سے۔" شہوز ابھی بھی زیادہ سنجیدہ نہیں تھا جس کی وجہ سے زارا چڑ رہی تھی۔

"شہوز! تم سمجھ کیوں نہیں رہے۔ بات بہت سیریس ہے۔ عمر نے امائمہ کے ساتھ منگنی توڑ دی ہے۔ وہ انگوٹھی اس سے واپس لے آیا ہے۔" اس نے اگل دیا تھا۔

"واٹ" شہوز اس کی بات سن کر واقعی اچھل پڑا۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟" وہ بے یقین تھا۔

"میں تم سے جھوٹ کیوں کہوں گی شہوز... اس نے واقعی منگنی توڑ دی ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ خود بتایا ہے بلکہ وہ رنگ بھی دکھائی ہے جو منور ماموں نے اس کی طرف سے امائمہ کو پہنائی تھی۔" وہ اسے تفصیل بتا رہی تھی۔

"لیکن کیوں زارا! آئی مین اس نے یہ سب کیوں کیا؟ ابھی تو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا انگیجمنٹ کو۔" شہوز بھی پریشان ہو گیا تھا۔ دل ہی دل میں اسے غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا عمر لاپروا ہے مگر اتنی غیر ذمہ داری کی توقع بھی نہیں تھی اسے عمر سے۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا مگر وہ کافی غصے میں تھا۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ مجھے لگتا ہے اس کا اور امائمہ کا جھگڑا ہو گیا ہے۔"

"شٹ یار! کیا چیز ہے یہ شخص؟ تم فون رکھو۔ میں آتا ہوں تمہاری طرف۔ پتا نہیں ڈیڈی ابھی سوئے ہیں کہ نہیں بائیک پر آنا پڑے گا اس وقت بہرحال میں دیکھتا ہوں۔" وہ کان کو انگلی سے کھجاتے ہوئے سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

زارا کو اس کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ گھنٹہ بھر بعد ہی وہ اس کے سامنے بیٹھا تھا پھوپھا جی سو چکے تھے جبکہ پھپھو کا آپریشن ڈے تھا وہ ابھی تک اسپتال سے نہیں لوٹی تھیں۔ شہوز لاؤنج میں ہی بیٹھ گیا تھا۔ عمر کا قیام گیسٹ ہاؤس یا انیکسی میں نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اوپر والے پورشن کے بیڈ روم میں رہ رہا تھا۔ وہ سو چکا تھا یا جاگ رہا تھا اس کی خبر ان دونوں کو نیچے بیٹھے نہیں ہو سکتی تھی۔

"مجھے زیادہ تفصیل نہیں پتا شہوز! وہ کہیں باہر گیا ہوا تھا جب میں اسپتال سے واپس آئی۔ ڈنر کے وقت بابا نے مجھ سے کہا تھا کہ فون کر کے اس سے پوچھو کہ وہ کہاں ہے تب ہی اس کا ایس ایم ایس آگیا۔ وہ ڈنر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ایک گھنٹے بعد وہ واپس آیا تو اس کا موڈ آف تھا۔ میں نے سرسری سا پوچھا تو وہ پھٹ پڑا۔" زارا اتنا بتا کر چپ ہو گئی۔

"اس نے کیا کہا؟" شہوز کے لہجے میں ہی نہیں انداز میں بھی اکتاہٹ تھی۔

"وہ کہتا ہے وہ یہ شادی نہیں کرنا چاہتا... اس سے نا صرف غلطی ہوئی بلکہ ناشکری بھی کہ اس نے اتنی اچھی اچھی لڑکیوں کو چھوڑ کر ایک ایب نارمل لڑکی کو لائف پارٹنر کے طور پر پسند کیا۔"

زارا اس کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی انگلیاں چٹخاتے ہوئے بتا رہی تھی۔ شہوز کی نگاہ اس کی انگلیوں پر ہی تھی مگر وہ ہمیشہ کی طرح اس کی اس حرکت پر اسے ٹوک نہیں سکا تھا۔ وہ مسلسل کچھ سوچنے میں مگن تھا۔ عمر کی انگیجمنٹ والی تقریب کے بعد اس کی اس سے زیادہ بات نہیں ہوئی تھی۔ اور اب اس کے اس دوست نما کزن نے کیا حرکت کی تھی اس سے وہ بالکل

انجان تھا۔ یقین پریشانی بھی بے حد تھی۔ رشتہ بھیجنے سے لے کر منگنی تک وہ ہر کام میں پیش پیش رہا تھا۔ عمر اس کا کزن تھا تو امائمہ اس کی کلاس فیلو اور فرینڈ تھی' سارا سلسلہ شروع ہونے سے لے کر منگنی تک وہ تین چار بار امائمہ سے ملا تھا۔ وہ اسے بہت خوش تو دکھائی نہیں دی تھی مگر مطمئن ضرور تھی۔ یہ رشتہ یقیناً" اس کی رضامندی سے طے پایا تھا۔

"اب کیا ہوا ہے اس احمق کو؟ مجھے تو ذلیل کر کے رکھ دیا ہے اس نے۔"

شہوز اس کی جانب دیکھ رہا تھا پھر وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں پوچھ کر آتا ہوں۔" شہوز سیڑھیوں کی جانب بڑھا تھا جبکہ زارا نے پریشانی سے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ جانتی تھی اب دونوں کا جھگڑا شروع ہو جائے گا۔

"پاپا سو رہے ہیں۔" سیڑھیاں چڑھتے شہوز کو اس نے بتانا ضروری سمجھا مبادا وہ دونوں اتنا ہنگامہ کریں کہ پاپا اٹھ جائیں اور اس پر غصے کا اظہار کریں۔ شہوز کے عمر کے کمرے میں چلے جانے کے بعد وہ کچھ دیر لاؤنج میں ـــــ ٹہلتی رہی پھر اس سے صبر نہیں ہوا تو وہ بھی دبے قدموں اوپر چلی آئی۔

"اس میں میری کیا غلطی ہے شہوز! تم لوگوں کو مجھے پہلے ہی انفارم کر دینا چاہیے تھا کہ محترمہ امائمہ آفاق ذہنی مریضہ ہیں۔"

وہ شاید شہوز کے استفسار پر بتا رہا تھا۔ انتہائی پرسکون لہجے میں ادا کیا گیا یہ جملہ آخری سیڑھی پہ اس کے کانوں میں پڑا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی کمرے کے دروازے تک پہنچی تھی مگر اندر داخل ہونے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ ان دونوں کے درمیان شدید نوعیت کا جھگڑا ہونے والا ہے۔ ادھ کھلے دروازے سے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا شہوز جارحانہ تیور لیے صاف نظر آ رہا تھا۔ زارا نے ذرا سا آگے ہو کر عمر کو دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ صوفہ کم بیڈ پر آڑا ترچھا لیٹا' گردن میں ہیڈ فون لٹکائے بظاہر ٹی وی میں مگن دکھائی دیتا تھا۔

"ذہنی مریضہ وہ نہیں ہے تم ہو اور غلطی بھی واقعی تمہاری نہیں میری ہے۔ میں الو کا پٹھا ہوں جو تم جیسے ڈھیٹ انسان کے پرسنل افیرز میں بلاوجہ دلچسپی لیتا ہوں۔" شہوز غرا کر بولا تھا۔

"تم چڑ کیوں رہے ہو؟ میں تمہیں تمہاری غلطی سدھارنے کا موقع دے تو رہا ہوں۔" عمر کا انداز پہلے سے بھی زیادہ تپانے والا تھا۔ اب کی بار زارا نے بھی اکتا کر اس کی جانب دیکھا۔ عمر کی لاپروائی اسے اس وقت ذرا بھی نہیں بھا رہی تھی۔

"آپ کو اتنی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آپ فقط اتنا بتا دیجیے کہ اب آپ کون سا گل کھلا کر آئے ہیں کہ آپ کی رنگ واپس کر دی گئی ہے؟"

ایک ایک لفظ پر زور دیتے شہوز کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اسے کچا چبا جائے۔

"مجھے میری رنگ واپس نہیں کی گئی۔ میں اس کو خود واپس لے کر آ رہا ہوں۔ جب وہ لیڈی ڈیانا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں رکھنا چاہتی تو میں اتنی قیمتی رنگ اس کو کیوں دوں۔ میں اپنی رنگ خود واپس لے آیا۔"

وہ ناک چڑھا کر خود وضاحت دے رہا تھا۔ اس کی بات پر شہوز اور زارا دونوں حیران ہوئے۔ زارا تو کمرے میں داخل ہو کر شہوز کے ساتھ آن کھڑی ہوئی حالانکہ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ کمرے کے باہر سے ہی ان کی باتیں سنتی رہے گی۔

"وہ تم سے کوئی رشتہ نہ رکھنا چاہتی تو پھر یہ رنگ پہنتی ہی کیوں؟ یہ بات تمہاری عقل میں نہیں آئی۔" شہوز نے سوالیہ نظروں سے زارا کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کا انداز نہیں بدلا تھا مگر لفظوں کا انتخاب کرتے ہوئے اس نے تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ "زارا! تم ہی اس کو بتاؤ کہ ایسا کچھ نہیں ہے یار۔"

وہ واقعی بہت پریشان ہو گیا تھا۔ زارا عمر کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔ وہ بھی اصل معاملے سے لاعلم تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے عمر! تم واقعی غلط سوچ رہے ہو۔ میں نے کتنی بار امائمہ سے بات کی ہے۔ تم اگر اسے ناپسند ہوتے تو وہ فوراً" اظہار کر دیتی' وہ کوئی دبو قسم

کی لڑکی نہیں ہے۔" زارا نے بوڑھے پن سے بڑی بہن کی طرح اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میں اور ناپسند؟" عمر اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ "میں اسے ناپسند کیسے ہو سکتا ہوں زارا ڈیئر۔ اتنے اچھے لڑکے کے بارے میں اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا ہو گا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میں نے اسے اپنے لیے پسند کیا لیکن اسے اپنی بدقسمتی زیادہ عزیز ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔"

کندھے اچکاتے ہوئے وہ فخریہ لہجے میں بولا تھا۔ شہوز کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔

"کتنے خبیث انسان ہو تم' پتا نہیں کیا سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو؟ اوقات کیا ہے تمہاری اس کے آگے۔"

شہوز کا لہجہ اتنا سخت ہو گیا تھا کہ زارا بھی پریشان ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"شہوز پلیز! اس طرح سے بات مت کرو عمر سے۔" وہ لجاجت بھرے لہجے میں بولی تھی۔ "مجھے لگتا ہے ان دونوں کے درمیان کچھ مس انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی ہے۔"

"میں اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہوں۔ مجھے وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ایسا ہی ہوں شہوز! اب سے نہیں۔ بہت پہلے سے اور میں ایسا ہی رہوں گا مرتے دم تک' میں کبھی اس سانچے میں نہیں ڈھل سکتا جو تم میرے لیے تیار کرتے ہو کیونکہ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا۔ میں جیسا بھی ہوں بہت اچھا ہوں اور ہاں میں صرف اپنے پیرنٹس کے آگے جواب دہ ہوں۔ مجھ سے بلاوجہ آرگیو (بازپرس) کرنے کا حق میں کسی کو نہیں دیتا۔"

عمر کا لہجہ بے حد سرد ہو گیا تھا اور چہرے کے تاثرات بالکل جامد ہو گئے تھے۔ زارا نے ان دونوں کو پہلے کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان دونوں کے درمیان ثالث کا کردار ادا کرتی تھی' لیکن عینی شاہد بننے کا یہ پہلا موقع تھا۔

"تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑا کیوں کر رہے ہو۔ پلیز لڑو مت کرو۔" وہ منمنا کر بولی تھی۔ وہ دونوں میں سے کسی ایک کو بھی قائل نہیں کر سکتی تھی۔

"تم نے سنا ابھی مسٹر عمر نے کیا فرمایا؟ بہتر ہے ہم خاموش رہیں۔" شہوز کو یقیناً" بہت برا لگا تھا۔

"پلیز! تم تو اس طرح مت کہو تم تو جانتے ہو عمر بہت جذباتی ہے۔" زارا کا اتنا کہنا ہی غضب ہو گیا۔

"ہاں عمر جذباتی ہے' اسٹوپڈ ہے' ڈفر ہے۔ سب تھانوں میں اسی کمبخت کی تصویریں لگی ہوئی ہیں؟ او کے ایسے تو ایسے ہی سہی' جس کو مجھ سے بات نہیں کرنی وہ نہ کرے میں اپنے آپ سے بہت خوش ہوں۔ انڈر اسٹینڈ۔" وہ تھنتے پھلا پھلا کر کہہ رہا تھا۔

"زارا! اٹھو یہاں سے آؤ چلیں۔" شہوز نے آگے بڑھ کر یک دم زارا کا بازو پکڑا تھا۔ زارا ہکا بکا ان کی شکلیں دیکھ رہی تھی۔

"تم لوگ ایسے کیوں کر رہے ہو؟ پلیز لڑو مت تم لوگ۔" وہ کچھ کہہ نہیں پائی تھی۔ آنسو ابل ابل کر آنکھوں سے باہر آنے لگے۔ شہوز نے غصے سے اس کا بازو جھٹک دیا اور خود کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

"شہوز! پلیز۔" زارا نے اسے پکارا پھر وہ بھاگ کر دروازے تک گئی تھی۔ شہوز لابی کراس کر کے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ زارا نے ایک بار پھر اسے پکارنا چاہا مگر اس کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا تھا۔ وہ چند لمحے اسی جانب دیکھتی رہی جہاں شہوز نظر آ رہا تھا پھر اس نے عمر کی جانب دیکھا۔

"اس کا دائیوا ہے عمر! پرسوں' ایسے تو وہ پڑھ نہیں پائے گا۔ عمر۔" وہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔ عمر نے تھک کر سر جھکا لیا۔ وہ نادم لگ رہا تھا یا شاید زارا کو وہم ہوا تھا۔ عمر کا مزاج نجانے ایسا کیوں تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں سارا وقت کلاس روم میں بیٹھے رہنا اچھا لگتا ہے؟" سلیمان نے اس کے ساتھ والے ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے ناک چڑھا کر سوال کیا تھا۔ بریک کی وجہ سے کلاس کے زیادہ تر بچے باہر گراؤنڈ میں تھے۔

قبل ان کی کلاس میں داخل ہوا تھا۔ وہ بہت ہنس مکھ اور تیز طرار بچہ تھا۔ چند ہی دنوں میں اس کی تقریباً سب بچوں سے اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ آٹھویں کلاس میں پروموٹ ہونے کے بعد تو سلیمان حیدر پہلے سے زیادہ ہر دلعزیز ہو گیا تھا۔ نیو ایڈمیشن ہونے کے باوجود اس نے تھرڈ پوزیشن لے کر سب ٹیچرز کے دل جیت لیے تھے اور یہی سلیمان حیدر اب اس کے ساتھ بیٹھا پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔

"کیوں؟" سلیمان حیدر نے ایک اور سوال کیا۔ اب کی بار وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔

"میں باہر جا کر کیا کروں گا؟" اس نے سابقہ انداز میں کہا۔ اس کے سامنے اس کا لنچ بکس کھلا پڑا تھا جس میں دو سینڈوچز تھے جبکہ اس کی گود میں کیمسٹری کی کتاب تھی۔ بریک کے فوراً بعد کیمسٹری کا پیریڈ تھا۔

"تم یہاں بیٹھ کر کیا کر رہے ہو؟ کچھ بھی نہیں ناں تو کلاس روم سے باہر جا کر بھی تم بغیر ڈسٹرب ہوئے یہی کام کر سکتے ہو۔"

سلیمان نے اس کے لنچ بکس سے ایک سینڈوچ اٹھا کر اطمینان بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں روزانہ کلاس روم میں ہی لنچ کرتا ہوں؟" وہ اس کی بے تکلفی کا برا مانے بغیر بولا تھا۔

"تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا تم واقعی روزانہ لنچ کرتے ہو؟" وہ اس کی بات سمجھ نہیں پایا۔ سلیمان نے لنچ بکس سے دوسرا سینڈوچ اٹھا کر اسے پکڑایا اور اس کی گود میں پڑی کیمسٹری کی کتاب بند کر دی۔

"تمہاری صحت دیکھ کر نہیں لگتا کہ تم روزانہ لنچ کرتے ہو گے۔" وہ سلیمان کی بات پر جھینپی ہوئی ہنسی ہنسا تھا۔

"میں شروع سے ہی دبلا ہوں۔ مجھے بھوک نہیں لگتی۔" اس نے ایک گھسی پٹی توجیہہ دی تھی۔ سلیمان آدھا سینڈوچ کھا چکا تھا جبکہ اس نے ابھی پہلا لقمہ بھی نہیں لیا تھا۔

[illegible]

"تمہیں کبھی بھوک نہیں لگے گی۔ میں اس طرح بھی نہیں کرتا۔ لنچ کے وقت میں بھول جاتا ہوں کہ کون سا سبق یاد کرنا ہے یا کون سا ٹیسٹ دینا ہے۔ مجھے صرف اتنا یاد رہتا ہے کہ میری امی نے مجھے اتنے مزے کا لنچ تیار کر دیا ہے اور مجھے بریک میں بس لنچ کرنا ہے تو مجھے خود بخود بھوک لگنے لگتی ہے اور سچی بات بتاؤں کہ کبھی کبھی مجھے بریک سے پہلے ہی بھوک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔"

سلیمان سینڈوچ کھاتے ہوئے اسے بتا رہا تھا۔ اس کے اس طرح کہنے پر اس نے بھی سینڈوچ کھانا شروع کر دیا تھا۔

"تمہاری امی نے بہت مزے کا سینڈوچ بنایا ہے۔ میں نے تمہارا لنچ شیئر کیا ہے اور اب تم میرا لنچ شیئر کرو گے، لیکن یہاں کلاس روم میں نہیں۔۔۔ آؤ باہر چلتے ہیں۔"

سلیمان نے اسے آفر دی تھی۔ باہر گراؤنڈ میں جانے کے خیال سے اسے لمحہ بھر کے لیے ہچکچاہٹ محسوس ہوئی، لیکن سلیمان کا انداز اتنا دوستانہ تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکا اور کتاب بیگ کے اوپر رکھ کر باہر آ گیا۔ کلاس رومز کے آگے بنے برآمدے عبور کر کے وہ گراؤنڈ میں آ گئے۔ سارے اسکول کے بچے ادھر ادھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ ان کے کھیلوں کی اقسام بھی مختلف تھیں۔ ایک عجیب قسم کا شور و غل تھا۔ وہ اکیلا ہوتا تو شاید واپس کلاس روم میں چلا جاتا، لیکن سلیمان کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر پایا تھا۔

"آؤ سلیمان! کھیلیں۔۔۔ ادھر آ جاؤ۔۔۔ سلیمان کھیلنا ہے۔۔۔ آج میرے پارٹنر بن جاؤ سلیمان۔"

وہ اس حصے کی طرف آئے جہاں ان کی کلاس کے بچے کھیل رہے تھے تو جیسے شور مزید بڑھ گیا۔ ہر بچہ سلیمان کو اپنے ساتھ کھلانا چاہ رہا تھا۔

"ہم کھیلیں گے مگر ہمیں لنچ تو کر لینے دو۔" سلیمان ابھی کھیلنے کے موڈ میں نہیں تھا اس کا ہاتھ تھامے وہ کسی پر سکون گوشے کی تلاش میں آگے بڑھ گیا۔ جونیئر کلاسز والے حصے میں کافی سکون تھا۔ وہ ایک کلاس روم کے باہر بنے چبوترے پر بیٹھ گئے تب تک اس کا سینڈوچ ختم ہو چکا تھا۔

"تمہارا فیورٹ گیم کون سا ہے؟" سلیمان نے اپنا لنچ بکس کھول کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کوئی بھی نہیں۔ گیم کے لیے تو ٹائم ہی نہیں بچتا پڑھائی اتنی ٹف ہے۔" اس نے سر جھکا کر کہا تھا۔ اسے یقین تھا باقی کلاس فیلوز کی طرح اب سلیمان بھی اس کی اس بات کو مذاق کا نشانہ بنائے گا، لیکن اسے حیرت ہوئی جب سلیمان نے اس کی اس بات سے اتفاق کیا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ حیرانی سے سلیمان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا کہ کہیں وہ اس کا مذاق تو نہیں اڑا رہا، لیکن سلیمان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ وہ اپنے لنچ بکس میں پڑے پراٹھے کی تہیں کھول رہا تھا۔

"تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ پڑھائی تو بے حد ٹف ہو گئی ہے ابھی تو ہم نے بڑی کلاسز میں جانا ہے تب تو شاید ہمیں منہ دھونے کا وقت بھی نہ ملے۔ ابھی ہم اتنی مشکل سے وقت نکالتے ہیں حالانکہ ابھی ہم سیونتھ کلاس میں ہیں۔ نائنتھ ٹینتھ میں ہمارا کیا بنے گا۔"

اس نے پراٹھا کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا اور ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا تھا۔

"میرے ابو کہتے ہیں اس میں زیادہ قصور ہمارا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک کام کرنے کے لیے پیدا نہیں کیا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کے بنائے انسان سب کاموں میں حصہ لیں۔ وہ پڑھائی کریں، کھیلیں کودیں، امی ابو کا ہاتھ بٹائیں، دوستوں سے ملیں جلیں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھیں۔ میرے ابو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کی مشینری اس طرح کی بنائی ہے کہ وہ یہ سب کام کر سکتا ہے۔ ابو یہ بھی کہتے ہیں اگر کوئی اس طرح نہیں کر پاتا تو یہ اسی کا قصور ہوتا ہے۔"

سلیمان نے بات کرتے ہوئے اسے اشارے سے پراٹھے کی جانب راغب کیا تھا۔ وہ پراٹھا کھاتے ہوئے اس کے ابو کی بات پر غور کرنے لگا۔ اس کے ابو سلیمان کے ابو کی طرح کی باتیں نہیں کرتے تھے۔

"انسان کو اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ دو دو تین تین کام اکٹھے کر سکتا ہے۔ میں تمہیں اپنی روٹین کے متعلق بتاتا ہوں جب میں صبح سو کر اٹھتا ہوں تو مجھے جاگنگ کے لیے لے جاتے ہیں۔"

سلیمان نے بتانا شروع کیا تھا۔ اس نے پراٹھے کا نوالہ منہ میں رکھ کر ایک بار پھر حیرانی سے اسے دیکھا۔ اس کے ابو ایسے نہیں کرتے تھے وہ صبح اسے جگاتے ہی رات کو یاد کروایا گیا سبق سننا شروع کر دیتے تھے۔

"ناشتا کر کے میں اسکول آ جاتا ہوں، لیکن بریک میں کچھ نہ کچھ ضرور کھیلتا ہوں۔ میں اگر ایسا نہ کروں تو مجھے سبق یاد نہیں رہتا پھر بریک کے بعد والے پیریڈز میں مجھے یہی ڈر رہتا ہے کہ ٹیچر سے مجھے ڈانٹ نہ پڑے۔" سلیمان مزید کہہ رہا تھا اور وہ مزید حیران ہو رہا تھا۔ سلیمان کو بریک میں نہ کھیلنے کی وجہ سے خدشہ لاحق ہو جاتا تھا کہ کہیں اسے سبق نہ بھول جائے اور ٹیچرز سے اسے ڈانٹ نہ پڑے۔

"گھر جا کر میں کچھ دیر آرام کرتا ہوں پھر پڑھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ جب میں پڑھنا شروع کرتا ہوں تو میں ہر بات بھول جاتا ہوں، بالکل اسی طرح جس طرح میں کھیل کے دوران ہر بات بھول جاتا ہوں۔ اس طرح سے مجھے سب کچھ جلدی یاد ہو جاتا ہے اور بھولتا بھی نہیں ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس طرح سے میرے پاس شام کو پھر کھیلنے کا وقت نکل آتا ہے۔ میرے ابو ٹھیک کہتے ہیں کہ اگر ہم ہر کام ٹھیک طریقے سے مینج کر لیں تو ہم ہر کام کر سکتے ہیں۔"

سلیمان نے اپنی بات ختم کی تو اس نے پراٹھے کے چند نوالے ہی لیے تھے۔

"تم جلدی جلدی کھانا کھاؤ نا پھر ہم ریس لگائیں گے۔ بریک ختم ہونے میں دس منٹ باقی ہیں۔"

سلیمان کے کہنے پر اس نے تیزی سے کھانا شروع کیا تھا۔ اسے سلیمان اور اس کی باتیں دونوں اچھی لگی

...انہوں نے ریس لگائی تھی۔ سلیمان جیت گیا تھا لیکن اسے سلیمان سے زیادہ مزا آیا تھا۔

"جب ہم ایک ہی وقت میں کھا سکتے ہیں' بول سکتے ہیں' سن سکتے ہیں' دیکھ سکتے ہیں تو پھر ہم پڑھائی کے دوران کھیل کے لیے وقت کیوں نہیں نکال سکتے؟"

سلیمان حیدر سے اس کی دوستی اس کی زندگی میں یک دم بے حد خوشگوار تبدیلی لے آئی تھی۔ وہی بچہ جو پہلے کلاس روم میں خاموش بیٹھا کتابوں کی دنیا میں گم رہتا تھا' اب اکثر باتیں کرتا ہوا دکھائی دینے لگا۔ بریک میں وہ باقی کلاس فیلوز کی طرح بہت اچھل کود تو نہیں کرتا تھا' مگر پہلے کی طرح اس نے کلاس روم میں بیٹھے رہنے کی عادت ترک کر دی تھی۔ آؤٹ ڈور گیمز میں وہ اتنا ہوشیار نہیں تھا' لیکن ان ڈور گیمز میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے یہ گیمز سلیمان حیدر سے دوستی ہونے کے بعد کھیلنے شروع کیے تھے۔ ورنہ بہت عرصہ پہلے وہ یہ سب چیزیں چھوڑ چکا تھا۔

سلیمان کے کہنے پر اس نے کورس کی کتابوں کے علاوہ بچوں کے میگزین اور رسالے وغیرہ پڑھنے شروع کر دیے تھے' اور ایسا کرنے میں اسے مزا بھی آ رہا تھا۔ سلیمان حیدر کی معیت میں وہ زندگی کے کچھ مختلف رنگوں کو جاننے پرکھنے کے قابل ہو رہا تھا۔ عمر میں تو وہ بھی اس سے بڑا تھا۔ لیکن وہ کچھ بھی جتانے کا عادی نہیں تھا۔ وہ اسے برابری کی بنیاد پر ٹریٹ کرتا تھا۔ یہی بات اسے اچھی لگتی تھی' ورنہ اس سے پہلے وہ دوستی کے معاملے میں احساس کمتری کا شکار ہو جایا کرتا تھا۔ سب کلاس فیلوز کے ساتھ گھلنے ملنے کا موقع ملا تو اسے احساس ہوا کہ جس طرح سے وہ ان سے خائف رہتا تھا۔ وہ بھی اس سے کچھ نہ کچھ دبے ضرور تھے۔ انہیں لگتا تھا وہ مغرور ہے یا اپنی پڑھائی کا رعب ڈالنے کے لیے ہر وقت کتابوں کی دنیا میں گم رہتا ہے۔ سلیمان حیدر نے ان کے بیچ پل کا کام کیا تھا۔ سلیمان سے چونکہ سب بچوں کی دوستی تھی۔ اس لیے وہ اسے بھی دوست کا درجہ دینے لگے تھے۔ ان ساری چیزوں کا کریڈٹ وہ سلیمان کو دیتا تھا جو اس کا بیسٹ فرینڈ بن چکا تھا۔ وہ دونوں ایک ڈیسک پر بیٹھتے تھے' ایک دوسرے کا لنچ شیئر کرتے تھے۔ کلاس روم سے باہر جانے کے لیے وہ ایک دوسرے کا انتظار کرتے تھے۔

اسے سلیمان کی شخصیت میں موجود توازن بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ نا صرف پڑھائی میں اچھا تھا' بلکہ کرکٹ ٹیم کا اہم کھلاڑی بھی تھا۔ کوئز اور تقریری مقابلوں میں بھی حصہ لینا پسند کرتا تھا۔ بچوں کے رسالوں میں اس کی نگارشات اور مراسلے وغیرہ بھی چھپتے تھے۔ سلیمان کے مقابلے میں وہ صرف پڑھائی میں اچھا تھا۔ کرکٹ' ہاکی جیسے گیمز سے وہ ہمیشہ دور بھاگتا تھا۔ کوئز اور تقریری مقابلوں کو وہ وقت کا ضیاع سمجھتا تھا اور بچوں کے رسالے تو اس نے ہاتھ میں بھی تب پکڑنے شروع کیے تھے' جب سے اس کی سلیمان سے دوستی ہوئی تھی۔ اب یہ عجیب بات تھی کہ سلیمان حیدر کا ذکر اس نے گھر میں نہیں کیا تھا۔ وہ یوں بھی کافی کم گو تھا۔ ابو نے کبھی پڑھائی کے علاوہ کوئی بات کی ہی نہیں تھی اور امی کو ایسی باتوں سے فقط اس حد تک دلچسپی تھی کہ ان کا بیٹا آج کل خوش رہنے لگا تھا۔ پڑھائی کا لوڈ بھی کم نہیں تھا' مگر نجانے کیوں خود بخود سب ٹھیک ہو جاتا تھا۔ پہلے کی طرح وہ اپنی پڑھائی یا کتابوں سے خوف زدہ نہیں رہتا تھا۔ یہ سب کچھ شاید اسی طرح چلتا رہتا' مگر ایک روز ابو کو اس کی خوشی کا راز پتا چل ہی گیا۔

"تم واقعی بہت جینئس ہو۔" سلیمان نے اس کا بائیولوجی کا ٹیسٹ دیکھتے ہوئے اعتراف کیا تھا۔

یہ پہلی دفعہ تھا کہ سلیمان اسے سراہ رہا تھا۔ وہ مسکرا دیا۔ یہ ایک عام سی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکراہٹ میں تشکر تھا' نہ تفاخر' طمانیت تھی نہ خوشی' فقط ایک سادگی تھی۔ تعریف اس کے لیے نئی چیز نہیں تھی۔ لیکن تعریف کو کس طرح وصول کرتا ہے۔ یہ اسے آج تک سمجھ میں نہ آسکا تھا۔ بہت بچپن سے وہ عام طور پر ہر ٹیسٹ میں بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کرتا آیا تھا۔ اس کے فائنل رزلٹ ہمیشہ اسے فرسٹ پوزیشن دلواتے آئے تھے۔ ان سب کے لیے یہ جیسے

ایک طے شدہ امر تھا کہ کوئی اور ٹاپ کر ہی نہیں سکتا۔ سو یہ ایک عام سی بات بن چکی تھی۔ اس میں کسی کے لیے کوئی تھرل یا نیاپن نہیں تھا۔ یہ اسکول کا احوال تھا جبکہ گھر میں تو یہ عام نہیں' بلکہ بے حد عام اور عام ترین بات بن چکی تھی۔ اس کے ابو اس کے ہر چھوٹے بڑے ٹیسٹ کا باریک بینی سے جائزہ لیتے تھے۔ مگر انہوں نے اس کے ٹیچرز کی طرح کبھی اسے "ویل ڈن" نہیں کہا تھا۔ ان کے منہ سے وہ ہمیشہ کیپ اٹ اپ یا اسی قسم کے جملے سنتا آیا تھا اور یہ سب کہتے ہوئے ان کے لہجے میں اگر کوئی خوشی یا اطمینان ہوتا بھی تھا تو وہ جو اسکول کا "سوئٹ جینئس" بچہ تھا کبھی سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ ابو کے چہرے اور آنکھوں کے تنبیہہ دینے والے تاثرات ہی دیکھ اور سمجھ پاتا تھا۔ ایسی صورت میں سلیمان جیسے دوست کی تعریف پر وہ سادگی سے مسکرانا نہ تو اور کیا کرتا۔

"تم اتنی اچھی ڈایاگرامز ڈرا کرتے ہو۔" وہ سمجھ نہیں پایا کہ سلیمان نے سوال کیا ہے یا تعریف..... بہرحال یہ اسے ضرور پتا تھا کہ وہ ڈایاگرامز اچھی بناتا ہے بائیالوجی کے سوالات یاد کرنے سے کہیں زیادہ وہ ان ڈایاگرامز کو بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

"میرے ابو بھی اتنی اچھی ڈایاگرامز ڈرا نہیں کر سکتے جتنی اچھی تم نے کی ہیں۔"

"یہ اتنی اچھی تو نہیں ہیں۔" اب کی بار اس نے بھی بغور اپنے ٹیسٹ کو دیکھا تھا۔

"تم ذرا یہ میرا ٹیسٹ اور میری ڈرا کی ہوئی ڈایاگرامز اپنے ٹیسٹ اور اپنی ڈرا کی ہوئی ڈایاگرامز کے ساتھ رکھ کر دیکھو' تمہیں خود پتا چل جائے گا کہ یہ کتنی اچھی ہیں۔" سلیمان نے اپنا ٹیسٹ بھی اس کے ساتھ رکھا تھا۔ وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ سلیمان کی ڈرائنگ واقعی اچھی نہیں تھی۔ اس کی ڈرا کی ہوئی ڈایاگرامز میں کافی غلطیاں تھیں' مگر پھر بھی وہ اس کا دل رکھنے کی خاطر بولا۔

"یہ بھی اچھی ہیں۔"

"میں اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ یہ کتنی اچھی ہیں۔" سلیمان نے خود اپنا مذاق اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر سلیمان کی بات کی تردید کرتا' وہ مزید کہنے لگا۔

"میری ڈرائنگ بہت خراب ہے۔ مجھے اسکیل کے بغیر کاغذ پر سیدھی لائن ڈرا نہیں کرنی آتی۔ میرا خیال ہے مجھے تم سے ڈایاگرامز بنانی سیکھنی چاہئیں۔"

"مجھ سے؟ میں تمہیں کیسے" اس کی بات پر وہ مسکرایا بھی تھا اور کچھ کہنا چاہا تھا' مگر لفظ ہی نہ مل سکے۔ سلیمان جواب طلب نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔

"ڈایاگرامز تو ڈایاگرامز ہوتی ہیں۔ انہیں سکھایا کیسے جا سکتا ہے۔ اب کی بار جب میں پریکٹیکل نوٹ بک پہ ڈایاگرامز بناؤں گا تو تم بھی دیکھ لینا۔ میں بھی انہیں ویسے ہی ڈرا کرتا ہوں' جیسے تم۔" وہ عام سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ سلیمان نے نفی میں گردن ہلائی۔

"گیمز بھی تو گیمز ہوتی ہیں' مگر ہم ایک دوسرے کو گیمز بھی تو سکھاتے ہیں۔ ہم دونوں کرکٹ کھیلتے ہیں' مگر تم جلدی آؤٹ ہو جاتے ہو جبکہ میں تو اتنا اچھا پلیئر ہوں' اس کا مطلب یہی ہے نا کہ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی صلاحیت ہوتی ہے۔ میرا ہاتھ کرکٹ بیٹ کو جتنا اچھے طریقے سے ہینڈل کر سکتا ہے اتنا پنسل کو نہیں' جبکہ تمہارا ہاتھ پنسل کو زبردست طریقے سے ہینڈل کرتا ہے' مگر بیٹ کو نہیں' دونوں باتوں میں فرق ہے نا' تو پھر سکھاؤ گے مجھے ڈایاگرام بنانا؟"

اپنی بات کو دلیل کے ساتھ بیان کر دینے کے بعد سلیمان نے ایک بار پھر سوال کیا تھا۔ اسے اتنی لاجیکل (منطقی) باتیں کہاں کرنی آتی تھیں۔ اگر آتی ہوتیں تو شاید وہ بیٹ اور پنسل کو مماثل قرار دینے پر زبردست بحث کرتا۔ مگر اب وہ دل ہی دل میں سلیمان کو سراہنے کے علاوہ کچھ نہ کر سکا' ساتھ ہی اس نے یہ اعتراف بھی کر لیا تھا کہ واقعی وہ کرکٹ کھیلنا نہیں جانتا۔

ہاں سکھاؤں گا۔ اگر تم مجھے کرکٹ کھیلنا سکھاؤ تب۔" اس نے یکدم ہی شرط عائد کی تھی۔

"اوکے۔۔۔ ڈن۔" سلیمان نے مسکرا کر فوراً" اس کی بات مان لی تھی۔ وہ بھی مسکرایا۔ اسے کرکٹ کھیلنے کا اتنا کوئی خاص شوق نہیں تھا۔ لیکن چونکہ سلیمان کرکٹ کھیلتا تھا اور بہت اچھی کھیلتا تھا۔ اس لیے اس کے کہنے پر وہ بھی بریک میں کھیل لیا کرتا تھا۔ اب جب سلیمان نے اسے کرکٹ سکھانے کی ہامی بھرلی تھی تو وہ ایک نئی گیم کھیلنے کے شوق میں پُرجوش ہو رہا تھا۔

پچھتر منٹ کی بریک میں کوئی کتنا کھیل سکتا تھا یا کسی کو کتنا سکھا سکتا تھا۔ سلیمان تو گھر جا کر اپنے کزنز اور محلے کے دوستوں کے ساتھ بھی کھیل لیا کرتا تھا' جب کہ وہ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا' سو اسکول میں ہی اگر انہیں بیٹ مل جاتا تو وہ کھیل لیا کرتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کی کلاس میں ایک' دو بچے بیٹ لاتے تھے۔ انہیں خود بھی کھیلنا ہوتا تھا۔ ایک بیٹ صرف اس لیے مختص نہیں کیا جا سکتا تھا کہ سلیمان اسے کرکٹ کے اسرار و رموز سکھا سکے۔ اس کا حل بھی سلیمان نے ہی نکالا۔

"اگر تم ایک بیٹ خرید لو تو ہم اپنی مرضی سے کھیل سکیں گے۔ روز' روز کے مانگنے سے تو نجات ملے گی۔"

اس نے سلیمان کی بات مان کر بیٹ لانے کی ہامی بھرلی تھی مگر اسے نہیں پتا تھا کہ یہ ہاں اسے کس قدر مہنگی پڑنے والی ہے۔

"امی! آپ مجھے ایک بیٹ لادیں گی؟" اس نے کھانا کھاتے ہوئے اسی روز امی سے فرمائش' درخواست کی تھی۔ اس کے ابو اس وقت اکیڈمی میں مصروف تھے۔ امی نے حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ اس قسم کی فرمائش پہلے کہاں کرتا تھا۔ یہ تبدیلی اس میں کب آئی تھی انہیں پتا نہیں چلا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ خوش رہنے لگا تھا۔ یہ بات تو وہ محسوس کر چکی تھیں۔ اس کے کھانے پینے کے معاملات میں نخرے اور سستی بھی پہلے سے کم ہو گئی تھی مگر ایسی فرمائش وہ اس کے ابو سے پوچھے بغیر پوری نہیں کر سکتی تھیں۔ ان کی بیٹی ابو کی لاڈلی تھی۔ وہ ہر چیز دھڑلے سے مانگتی۔ کی جبکہ ان کا بیٹا کوئی چیز مانگ بھی رہا تھا تو ڈرتے ڈرتے اور زیادہ افسوس ناک بات یہ تھی کہ وہ ایک دم ہاں بھی نہیں کہہ سکتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے انکار کر دیں یا فی الحال ٹال دیں۔

"سلیمان مجھے کرکٹ کھیلنا سکھائے گا۔ وہ کرکٹ کا بیسٹ پلیئر ہے۔"

اس نے انہیں بیٹ لانے کی وجہ بھی بتادی تھی۔ وہ ایک بار پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔

"تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟" انہوں نے شاید بات کو ٹالنے کی غرض سے سوال کیا تھا۔

"ٹھیک۔۔۔ ہمیں ابھی سے نائنتھ کلاس کا سلیبس پڑھا رہے ہیں' ناشکل ہے مگر مجھے نہیں لگتا۔"

وہ انہیں تسلی دے رہا تھا۔ امی اس کی پڑھائی کے متعلق سوالات کم ہی کرتی تھیں۔ ایسی ساری باتیں ابو کیا کرتے تھے۔ اس کی امی تو بس اس فکر میں رہتی تھیں کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھا کرے' کھایا پیا کرے اور اپنی عمر کے باقی بچوں کی طرح خوش باش رہا کرے۔ اس کے چہرے پر پھیلے خوشی کے احساس کو دیکھ کر یک دم ہی انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا۔

"تم سلیمان سے کہو' وہ بیٹ لے آئے۔ میں تو مارکیٹ جا نہیں پاؤں گی۔ وہ بیٹ لے آئے گا تو تم اس کو ادائی کر دینا۔" انہوں نے مسکرا کر اسے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے میں اسے کہوں گا کہ وہ مجھے لادے۔"

امی کے اتنی جلدی مان جانے پر وہ مطمئن ہوا تھا۔

"کیا؟" اس کے عقب سے اچانک ہی ابو کی آواز ابھری تھی۔ وہ نجانے کب آئے تھے یہ اسے پتا چل سکا تھا نہ امی کو۔

"بیٹ" وہ فوراً" اپنی دھن میں بول گیا تھا مگر دل ہی دل میں خوف کے احساس نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

"بیٹ کیا کرنا ہے؟" وہ اس کے قریب آگئے تھے پھر انہوں نے اس کے ساتھ والی کرسی کھینچی تھی۔ ان کے چہرے پر وہی تاثرات تھے جن سے وہ ڈرتا تھا۔

"سلیمان مجھے کرکٹ سکھائے گا۔" اس نے ان کے تاثرات سے خائف ہو کر فوراً" کہا تھا۔

"کیوں؟" انہوں نے تیسرا سوال پوچھا۔ اس کا سوال کا جواب وہ اتنی جلدی دے نہیں پایا تھا۔

"وہ۔۔۔ میں۔۔۔ دراصل۔" اس کے پاس جواب تھا بھی نہیں۔

"تم اسکول پڑھنے جاتے ہو یا کرکٹ کھیلنے؟" انہوں نے پہلے سے کہیں زیادہ سرد لہجے میں سوال کیا تھا۔

"بولو۔" اس کے خاموش رہنے پر وہ دھاڑ کر بولے۔

"پڑھنے۔" اس نے بے حد عجلت میں جواب دیا۔ وہ اس کے دائیں جانب بیٹھے تھے۔ ان کا ہاتھ اس کے چہرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس کے جواب دے دینے کے بعد وہ ذرا سا بھی دور نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اس کے کان کو زور سے کھینچا تھا۔

"تو پھر۔۔۔؟ جب پڑھنے جاتے ہو تو بیٹ کیا کرنا ہے؟" اسے کان سے پکڑ کر انہوں نے اسے اپنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس کی امی کا دل تاسف سے بھر گیا تھا۔ وہ اس کی بات ٹال کر اسے بچا سکتی تھیں مگر۔

"بولو جواب دو؟" انہوں نے اسے پہلا تھپڑ رسید کیا تھا۔

"بہت دن سے غور کر رہا ہوں کہ صاحبزادے کے رنگ ڈھنگ بدلے بدلے سے نظر آ رہے ہیں۔ پڑھائی میں دھیان کم کم ہے۔ کتابیں کھولنے کو کہو تو ٹال مٹول سے کام لینے لگتے ہیں۔ اب وہ وجہ سمجھ میں آ رہی ہے۔"

انہوں نے دوسرا تیسرا تھپڑ بھی رسید کر دیا تھا۔ اس کی امی اٹھ کر باہر چلی گئی تھیں۔ ان میں ہمت نہیں تھی کہ وہ بیٹھ کر تھپڑوں کا یہ کاؤنٹ ڈاؤن دیکھ سکتیں۔

"کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ان خرافات سے دور رکھنا ہے خود کو' یہ کام کرنے کے لیے اسکول نہیں بھیجتا میں تجھے' تو میرا بیٹا ہے ظہیر عباس کا نہیں' تجھے بڑا ہو کر عمران خان نہیں بننا' تجھے اپنے باپ کا خواب پورا کرنا ہے اور یہ سلیمان کون ہے؟ بول بتا۔ کون ہے؟ بتا اب مانگے کا بیٹ اب کیسے کا بیٹ لا کر دینے کے لیے؟ بتا۔ بول۔" وہ اسے مسلسل پیٹ رہے تھے۔

"نہیں ابو جی۔ ہائے ابو جی۔۔۔ مت ماریں ابو جی۔" وہ مسلسل چلانے اور رونے میں مصروف تھا۔

☼ ☼ ☼

"آج تمہیں ہوا کیا ہے؟" بے حد اکتا کر بالآخر پوچھ لیا۔ پہلا پیریڈ تھا اور نجانے کیوں سر اظہر ابھی تک کلاس روم میں نہیں آئے تھے۔ وہ انہیں میتھس کرواتے تھے۔ سلیمان کو اس کی خاموشی سے چڑ ہونے لگی تھی۔ وہ منہ لٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے روزانہ کی طرح سلیمان کے لیے اپنے ساتھ والے ڈیسک پر جگہ بھی نہیں رکھی تھی۔ ان سب میں جو بھی پہلے آتا تھا وہ اپنے دوست یا دوستوں کے لیے جگہ ضرور رکھ لیا تھا۔ سلیمان روزانہ لیٹ آتا تھا سو جگہ رکھنے کی ذمہ داری اس کی تھی۔ اس نے چونکہ آج جگہ نہیں رکھی تھی اس لیے نافع اس کے ساتھ والے ڈیسک پر آکر بیٹھ گیا تھا۔ سلیمان کی درخواست پر نافع نے جگہ چھوڑ دی تھی کیونکہ سب ہی کلاس فیلوز ان کی دوستی سے واقف تھے۔ سلیمان کے بیٹھ جانے کے بعد بھی وہ کچھ نہیں بولا تھا۔

"بیمار ہو گیا؟" اس نے پھر پوچھا تھا مگر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اس اثنا میں سر اظہر کلاس میں آگئے تھے۔ وہ ان کے کلاس انچارج تھے۔ رول کال کے بعد انہوں نے نوٹ بکس نکالنے کے لیے کہا تھا۔

"سلیمان! کل سے آپ یہاں نہیں بیٹھیں گے۔" سر نے کہا سلیمان سے تھا مگر منہ اٹھا کر ان کی جانب وہ دیکھنے لگا۔ اگر سر' سلیمان کو اس کے ساتھ بیٹھنے سے منع کر رہے تھے تو اس کا مطلب تھا ان تک آرڈرز آچکے تھے۔

"کیوں سر؟" سلیمان نے منہ بسور کر پوچھا۔ اس طرح کی وارننگز تو ان بچوں کو دی جاتی تھیں جو کلاس

میں پڑھنے سے زیادہ باتیں کرنے میں وقت گزارتے تھے جبکہ وہ دونوں تو کبھی ٹیچرز کو شکایت کا موقع نہیں دیتے تھے۔

"ہم باتیں نہیں کرتے سر! پھر آپ ہمیں ایک ساتھ بیٹھنے کیوں نہیں دے رہے؟" یہ سوال بھی سلیمان نے ہی پوچھا تھا۔ سر نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود مارکر لے کر وائٹ بورڈ کی طرف مڑ گئے۔ سلیمان کا منہ لٹک گیا تھا۔ سارا پیریڈ اسی طرح گزر گیا تھا۔ ان دونوں کے درمیان دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی لیکن پیریڈ آف ہونے کے بعد سر کے کلاس روم سے باہر جاتے ہی سلیمان نے کھل کر غصے کا اظہار کیا تھا۔

"سر اچھا نہیں کر رہے۔ یہ تو بالکل غلط بات ہے۔ جب ہم شکایت کا موقع نہیں دیتے تو پھر ہمیں سزا کیوں دی جا رہی ہے؟" سلیمان نے یہ کہتے ہوئے اس کی مرضی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس سے پوچھ لیتا تو شاید سر اظہر سے اتنی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔ اگلے تین پیریڈز اسی طرح گزر گئے تھے۔ سلیمان اپنی جگہ سے نہیں اٹھا تھا۔ وہ سر اظہر سے ایک بار بات کرنا چاہتا تھا۔ چوتھے پیریڈ کے بعد بریک ہو جاتی تھی۔ بریک میں سلیمان کے کہنے پر اس نے باہر جانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

"آج تو ایک عجیب دن ہے پہلے سر اظہر اور اب تمہیں کیا ہوا ہے۔ کلاس روم میں بیٹھ کر کیا کرنا ہے۔ بس مجھے نہیں پتا، آؤ باہر چلیں۔" سلیمان نے اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔ اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔

"مجھے باہر نہیں جانا۔ تم چلے جاؤ۔" وہ اس کی جانب دیکھے بغیر بولا تھا۔ اس نے اپنا منہ فزکس کی بک میں گھسا رکھا تھا۔

"میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔ آؤ سر اظہر سے بات کریں کہ وہ ہمیں ساتھ بیٹھنے سے کیوں منع کر رہے ہیں۔" سلیمان نے پھر اس کا ہاتھ پکڑا تھا۔

"میں نے کہہ دیا نا مجھے باہر نہیں جانا۔ تم چلے جاؤ۔" اب کی بار اس کے لہجے کی قطعیت نے سلیمان کو حیران کیا تھا۔ وہ برا مان کر باہر کی جانب چل دیا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ جو بات سلیمان سر اظہر سے پوچھنے گیا تھا، وہ بات اسے پہلے ہی پتا تھی۔

"کل سے اگر تم کسی سلیمان کے ساتھ بیٹھے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" اس کے کانوں میں ایک فقرہ گونجا تھا۔ وہ جانتا تھا کل کے بعد ابو یقیناً اس کے کلاس انچارج کے ساتھ بات کریں گے۔ اس کے اندازے کی تصدیق نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے یقین پر اسٹیمپ لگی تھی۔

بریک سے کچھ پہلے سلیمان واپس آگیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چبھن اور کاٹ تھی۔ اس نے اپنا بیگ اس ڈیسک سے اٹھایا تھا اور خاموشی سے کچھ کہے بنا وہ دوسری رو کے ایک خالی ڈیسک پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس دن ان دونوں کے درمیان دوبارہ کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اگلے دن بھی جب وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نظر نہ آئے تو کلاس میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں۔

"تمہاری اور سلیمان کی لڑائی ہو گئی کیا؟" اس سے بھی کچھ کلاس فیلوز نے پوچھا تھا۔ وہ جواب میں "نہیں" کہہ کر خاموش ہو جاتا تھا جبکہ سلیمان نے سب کلاس فیلوز کے درمیان کلاس روم میں علی الاعلان اس بات کا اعتراف کیا تھا لیکن اپنے طریقے سے۔

"وہ لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ میرے ان کے ساتھ بیٹھنے سے ان کی پڑھائی کا حرج ہوتا ہے تو ان کا میرے ساتھ بات نا کرنا ہی بہتر ہے اور ویسے بھی ایک ایسے لڑکے کے ساتھ دوستی رکھنا جسے کوئی گیم نہ کھیلنی آتی ہو، جو فزکس کا ایک نیومیریکل یا میتھ کا ایک کوئسچن غلط ہو جانے پر بچوں کی طرح روتا ہو اور جو کسی کے ساتھ اعتماد کے ساتھ بات نہ کر سکے، دوستی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ایسا لڑکا نارمل نہیں ہو سکتا اور میں کسی ابنارمل کو دوست بنانا نہیں چاہتا۔"

ابو کی مار نے جو دکھ دیا تھا سو دیا تھا لیکن سلیمان کے الفاظ نے تو اسے ادھ موا کر دیا۔ اس کے بعد سے سلیمان نے اسے بالکل نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اگر کبھی اس کی جانب دیکھتا بھی تھا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی کاٹ ہوتی تھی جو اسے توڑ کر رکھ دیتی تھی۔ وہی بچہ جو اپنے خول سے باہر آ کر دنیا کے رنگوں کو دیکھنا پرکھنا چاہتا تھا پھر سے اپنے خول میں دبک گیا۔ زندگی میں ایک بار پھر صرف کتابیں رہ گئی تھیں۔

یہ صورت حال اسے دن بدن پہلے سے زیادہ چڑچڑا اور زود رنج بنا رہی تھی۔ سلیمان کی وجہ سے جو بچے اس کے قریب آئے تھے، وہ بھی اب اسے منہ نہیں لگاتے تھے۔ زندگی پرانی ڈگر پر واپس آگئی تھی۔ وہ خود کو ایک بند گلی میں محسوس کرتا جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ اسے نظر نہیں آتا تھا۔ پہلے کی طرح اس نے اپنا سارا وقت کتابوں کی دنیا میں صرف کرنا شروع کر دیا۔ ایک حساس ذہن رکھنے کی وجہ سے اسے سب کلاس فیلوز کا رویہ ہرٹ کرتا تھا۔ وہ گھنٹوں اس کے متعلق سوچتا لیکن وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ اس نے خاموشی کو اس قدر اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا کہ کسی سے بھی بات کرنا ختم کر دیا۔ کوئی مخاطب کرتا تو بات کا جواب دے دیتا ورنہ اپنی دنیا میں گم رہتا۔ کلاس فیلوز نت نئے نام رکھ کر اسے چڑانے کی کوشش کرتے کوئی خبطی کہتا اور کوئی پروفیسر مگر وہ سب کو اگنور کر دیتا۔ اس صورت حال میں سب سے زیادہ مطمئن ظاہر ہے اس کے ابو ہی تھے۔ وہ گھنٹوں اسے کتابوں میں گم خاموش دیکھتے تو مطمئن ہو جاتے۔ ان کے لیے یہ سب سے زیادہ اہم تھا کہ اس کا رزلٹ سو فیصد آ رہا ہے۔ وہ کبھی بھی نہیں سوچتے تھے کہ ان کا سخت رویہ ان کے بچے کی شخصیت کو کیا نقصان پہنچا رہا ہے۔ وقت مزید آگے بڑھا۔ وہ اب دسویں کلاس میں آگیا تھا۔

☼ ☼ ☼
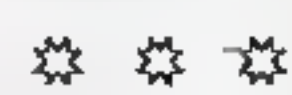
"شہوز کوئی مسئلہ ہے کیا۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا" بھابھی روبانہ نے اسے لاؤنج میں داخل ہوتا دیکھ کر پوچھا تھا۔

شہوز ابھی سو کر اٹھا تھا۔ رات ٹھیک طرح سے نیند نہیں آسکی تھی اس لیے ابھی بھی دماغ مکمل طور پر بیدار نہیں ہوا تھا۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور سارے وجود پہ اتنی کسل مندی چھائی تھی کہ بلاوجہ بیزاری محسوس ہو رہی تھی، غصہ سا آئے جا رہا تھا۔ اسی لیے بھابھی نے اسے دیکھتے ہی سوال کیا تھا۔ امی ٹی وی دیکھنے میں مگن تھیں، بھابھی کے سوال پر اس کی جانب پلٹیں اور اس کو دیکھتے ہی وہ بھی پریشان کن لہجے میں بولی تھیں۔

"کیا ہوا شہوز؟ چہرہ کیسا اترا ہوا ہے۔ سب خیریت ہے نا" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ریموٹ بھابھی کو پکڑایا تھا اور بے چین سے لہجے میں اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ وہ صوفے پر بالکل ان کے ساتھ آ بیٹھا۔

"بخار ہے کیا؟ آنکھیں بھی کیسی سرخ ہو رہی ہیں" انہوں نے اس کے سر ماتھے اور گردن پر باری باری ہاتھ رکھا تھا۔ شہوز کو بخار تھا نہ اس کی طبیعت خراب تھی، مگر ماں کے لمس نے ایسا سکون بخشا تھا کہ اس نے خود کو مزید بیمار ظاہر کرنے کے لیے منہ سا بنا لیا تھا۔ امی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ۔" وہ اس کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھیں حالانکہ اس کا بدن گرم نہیں تھا مگر ماں کا دل بے چین ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہوں امی بس سر میں درد ہے۔ رات کو ٹھیک سے سو نہیں سکا" اس نے تساہل سے کہتے ہوئے ان کی گود میں سر رکھ دیا تھا۔ وہ دایاں ہاتھ نرمی سے اس کے بالوں میں چلانے لگی تھیں۔

"کیوں۔ کیوں نہیں سو سکے۔ کوئی پریشانی تھی کیا۔" وہ اولاد کے معاملے میں بڑی جلدی فکر مند ہو جانے والی ماں تھیں۔ شہوز نے ان کا بایاں ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا۔ ایسا سکون نصیب ہوا تھا کہ ہر مسئلہ حل ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ دنیا کا کوئی علم کوئی سائنس کوئی فلسفہ آج تک کوئی ایسی تھیوری اخذ نہیں کر پایا جو ماں اور اولاد کے تعلق کو ٹھیک سے سمجھ سکے اور واضح کر سکے۔

ماں کے لمس سے ایک ایسی منفرد توانائی حاصل ہوتی ہے جو ساری بیزاری کو اپنے اندر جذب کر کے

خوشیوں کو دوگنا کر دیتی ہے اور پریشانیاں صفر ضرب صفر ہو جاتی ہیں جبکہ آخر میں حاصل جمع کل ملا کے آتا ہے۔ "سکون۔ ڈھیروں سکون"

امی کی انگلیوں سے ایسی ہی توانائی شہروز کے بالوں میں جذب ہونے لگی تھی۔ اس نے آنکھیں موندلی تھیں۔ اسے جس سکون کی ضرورت تھی وہ خود بخود اس کے وجود میں اترنے لگا۔ وہ مسکرایا تھا اور امی کو بھی جیسے ایسی ہی ایک توانائی مل گئی تھی۔ وہ مطمئن ہو گئی تھی۔

ماں کے لمس سے جو توانائی اولاد کو ملتی ہے۔ اولاد کی صرف ایک مسکراہٹ سے ہی ماں کو وہی توانائی مل جاتی ہے۔ اولاد کی محبت تو شاید سمجھ میں آ ہی جائے مگر ماں کی سائنس کو آج تک کوئی سمجھ نہیں سکا۔ وہ اولاد کے لیے پریشان ہو تب بھی روتی ہے اور خوش ہو تب بھی اس کی آنکھیں پانیوں سے ہی بھرتی ہیں۔

"آپ فکر مند نہ ہوں آنٹی۔ یہ بیمار ہے نہ پریشان ہے اسے عمر کی یاد ستا رہی ہے۔ آپ ذرا فون ملائیں اسے اور کہیں کہ "فوراً" گھر واپس آئے ہمارا بچہ اداس ہے۔" بھابھی شرارتی انداز میں کہہ رہی تھیں شہروز نے ناک چڑھائی۔

"رہنے دیں اسے وہاں ہی جہاں وہ ہے۔ آپ کو گھر میں سکون برا لگ رہا ہے۔" اس نے اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔

"لیں آنٹی! سمجھ میں آگئی مجھے شہروز کی بیماری۔ اس کا عمر کے ساتھ جھگڑا ہوا ہے اسی لیے بوتھا اتنا سوجا ہوا ہے۔" بھابھی نے بالکل صحیح تشخیص کی تھی۔ شہروز نے آنکھیں کھول کر ان کی جانب دیکھا پھر مصنوعی انداز میں لمحہ بھر کے لیے مسکرا کر دوبارہ منہ بنالیا۔

"آپ بہت ذہین ہوتی جارہی ہیں۔ دھیان رہے بہروز بھائی کو ذہین عورتوں سے چڑ ہے۔" اس نے انہیں چڑایا تھا وہ اسی کی بھابھی تھیں اس کی بات کاٹ کر بولیں۔

"تم بہروز کی بات کر رہے ہو۔ مجھے تو خود ذہین عورتوں سے بڑی سخت چڑ ہے۔" انہوں نے لفظ "عورت" پہ زور دیا تھا۔

"بس بس اب وہی گھسا پٹا پرانا لطیفہ مت سنائیے گا کہ آپ تو ذہین لڑکی ہیں عورت نہیں۔ ہمیں نہیں آتی ان ڈیڑھ سو سال پرانے لطیفوں پر ہنسی۔" شہروز سابقہ انداز میں بولا تھا۔

"اچھا تو پھر بتاؤ تمہیں کون سا لطیفہ سنایا جائے۔"

"باتیں مت بنائیں اور جا کر میرے لیے ناشتہ بنا کر لائیں۔ بہت سست ہوتی جارہی ہیں آپ۔ بہروز بھائی نے بہت سر چڑھالیا ہے آپ کو۔"

"جی جی بادشاہ سلامت! آپ کے حکم کا ہی انتظار کر رہی تھی" وہ خوش دلی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ایسے مت کہا کرو۔ روبانہ بہت اچھی ہے گھر ہے تو بھابھی نا۔ برا بھی مان سکتی ہے۔" روبانہ کے باہر نکلتے ہی امی نے اسے ٹوکا تھا۔

"امی! میرا دل آج بہت جلا ہوا ہے پلیز آج کوئی اچھی سی بات کریں۔ آج کوئی نصیحت سننے کا دل نہیں کر رہا۔" امی نے اس کے بالوں میں مزید ملائمت سے انگلیاں چلائی تھیں۔

"کیا ہوا ہے شہروز! کیا واقعی عمر سے جھگڑا ہوا ہے؟ وہ بھی دو تین دن سے وہیں تمہاری پھپھو کے گھر جم کر بیٹھا ہوا ہے۔ شکل نہیں دکھائی اس نے بھی۔ پہلے تو کبھی اتنے دن نہیں رکا وہ وہاں۔" انہیں یقین نہیں آیا تھا۔

شہروز نے پھر سے آنکھیں موند لیں۔

"امی میرا وائیوا ہے نا کل۔ میں نے ہی اسے کہا ہے کہ وہیں رہے خبردار جو یہاں آیا۔ وقت برباد کرنے کے علاوہ اس جاہل کو اور آتا کیا ہے۔" وہ چڑ کر بولا تھا۔

"ہم" انہوں نے ہنکارا بھرا پھر گہری سانس لے کر بولیں۔

"کس بات پر جھگڑا ہوا ہے۔؟"

"امی!" شہروز نے آنکھیں کھولیں پھر بیزاری سے بولا۔ "امی جھگڑا نہیں ہوا۔ بتایا تو ہے آپ کو۔"

"بیٹا تمہاری ماں ہوں۔ مائی پھاتاں نہیں ہوں کہ تم آسانی سے بے وقوف بنالو گے اور تمہاری ماں بن جائے گی۔" وہ اب مصنوعی ناگواری لہجے میں بھر کر بولی تھیں۔

"یا خدا یہ سب ذہین عورتیں میرے ارد گرد ہی کیوں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ یہ تو سخت ناانصافی ہے۔ یا اللہ ایک ماں دی وہ بھی ذہین۔ اور بائی داوے مائی پھاتاں کو بے وقوف بنانا آسان ہوتا ہے کیا؟۔ کاش آپ مائی پھاتاں ہوتیں۔" وہ مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے ان کی توجہ اصل بات سے ہٹانا چاہ رہا تھا۔

"بکو مت اور جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔" انہوں نے اسے گھر کا تھا

"امی جھگڑا نہیں ہوا بس کبھی کبھی عمر غصہ بہت دلا دیتا ہے۔ اس کی جلد باز اور جذباتی طبیعت بعض اوقات میرے لیے بہت پریشانیاں پیدا کر دیتی ہے اور پھر وہ اپنی غلطی بھی تسلیم نہیں کرتا' بالکل ہی ڈھیٹ بن جاتا ہے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن ہوا کیا ہے؟" وہ گردن ہلاتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"اس بات کو چھوڑ دیں امی۔ آپ جانتی ہیں' میں نہیں بتاؤں گا۔" اس کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"تمہاری بات کسی حد تک ٹھیک ہے۔ وہ جذباتی تو ہے لیکن ضدی نہیں ہے۔ تمہارے چاچو کی سخت طبیعت نے اس طرح کا بنا دیا ہے اسے۔ اس کو سمجھانا مشکل ہے لیکن جس بات کو سمجھ لیتا ہے پھر اسے آخری حد تک نبھاتا ہے۔ اچھا بچہ ہے مجھے تو پسند ہے میرے لیے تو تم دونوں ایک برابر ہو۔"

وہ بردباری سے اسے سمجھا رہی تھیں۔ شہروز کو ایک بار دل ہی دل میں غصہ آیا۔

"چلیں اس بہانے یہ تو پتا چلا کہ آپ مجھے بھی پسند کرتی ہیں۔" اس نے منہ بنا کر کہا تھا اور دوبارہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا اور آنکھیں موند لی تھیں۔ یہ باتیں امی اس کے اور عمر کے ہر جھگڑے کی تفصیلات سننے کے بعد کیا ہی کرتی تھیں۔ اس کا ذہن پھر الجھنے لگا تھا۔ منگنی ہو جانے کے صرف چند ہی دن بعد اسے اس طرح توڑ دینا کم از کم کوئی شرارت نہیں تھی کہ عمر کو "فوراً" معاف کر دیا جاتا مگر آئندہ کا لائحہ عمل کیا ہو گا اس کا ذہن یہ سوچنے سے بھی قاصر تھا۔

شہروز کی سیل کی بیپ بج رہی تھی۔ اس نے اکتاہٹ بھرے انداز میں یہ سوچ کر سیل اٹھایا تھا کہ شاید عمر کی کال ہو گی۔ عمر نے اس کو اتنا زچ کر دیا تھا کہ وہ اب کچھ دن تک نہ اس کی شکل دیکھنا چاہتا تھا' نہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسکرین پر چمکنے والا نمبر دیکھ کر اسے مزید اکتاہٹ ہوئی وہ اس نمبر سے واقف نہیں تھا۔ وہ یونیورسٹی کی چند ایک کمیٹیوں کا ممبر بھی تھا اس وقت نجانے کس نے کس مقصد کے لیے اس سے رابطہ کیا تھا۔

"ہیلو" اس نے انتہائی بے زاری سے کال ریسیو کی تھی مگر دوسری جانب سے نسوانی آواز سن کر وہ محتاط ہوا۔

"السلام علیکم کیسے ہیں بیٹا شہروز آپ؟"

"وعلیکم السلام۔ الحمد اللہ۔" اس نے ذرا توقف کرتے ہوئے جواب دیا تھا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا کہ یہ کون خاتون ہو سکتی ہیں' وہ یہ آواز پہلی دفعہ سن رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے یہ آواز نہیں سنی تھی یا شاید وہ اس آواز کو پہچان نہیں پا رہا تھا۔ وہ ممی کی کوئی دوست تھیں نا ہی اس کی کوئی آنٹی لگ رہی تھیں مگر وہ جس محبت بھرے انداز میں اس کی خیریت دریافت کر رہی تھیں یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے جانتی ہیں۔

"آپ کی یونیورسٹی کیسی چل رہی ہے؟ وائیوا ہونے والا ہے نا آپ کا۔" وہ پوچھ رہی تھیں۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر شیشۂ مے شیشۂ مے
اور اب شیشۂ مے راہگزر، رنگِ فلک
رنگ ہے دل کا مرے، خونِ جگر ہونے تک
چمپئی رنگ کبھی راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتوں کا، خس و خار کا رنگ
سرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے
اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت
کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے
پھر سے اک بار ہر چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر، راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

فیض احمد فیض

دونوں کو آ سکیں نہ نبھانی محبتیں
اب بڑھ رہی ہیں ہم کو بھلانی محبتیں

سب سر بسر فریب ہیں کیا ان کا اعتبار
یہ پیار، حسن، عشق، جوانی، محبتیں

جانے وہ آج کون سے رستے سے آئے گھر
ہر موڑ، ہر گلی میں بچھانی محبتیں

کن کن رفاقتوں کے دیے واسطے مگر
اس کو نہ یاد آئیں پرانی محبتیں

گزری رُتوں نے زخم ہی اب تک بھرے نہیں
پھر اور کیا کسی سے بڑھانی محبتیں

نفرت کے واسطے کبھی فرصت نہیں ملی
اپنی ہے مختصر سی کہانی، محبتیں

نورین طلعت عروبہ

میری ضیا سے نظر چُراتے تھکا نہیں ہے
وہ ٹھوکروں سے مجھے بجھاتے تھکا نہیں ہے

یہ میری ہمت کہ لڑکھڑائی نہیں ابھی تک
وہ میری رہ میں تھکن بچھاتے تھکا نہیں ہے

مجھے تمنا تھی آسمانوں پہ دسترس کی
مجھے وہ پاتال میں گراتے تھکا نہیں ہے

میں اس کی مٹی میں پھول پھل کے شگفتہ رہتی
مری جڑوں سے مجھے ہلاتے تھکا نہیں ہے

وہ چاہتا تو میں پھول چنتی، میں خواب بُنتی
وہ پیار کے گلستاں جلاتے تھکا نہیں ہے

وہ اب بھی چاہے تو گونج اٹھے یہ گھر ہنسی سے
مگر وہ جذبوں کو چُپ لگاتے تھکا نہیں ہے

حمیدہ شاہین

سب چہروں پر ایک ہی رنگ اور سب آنکھوں کا ایک ہی خواب
پھر بھی جانے بستی بستی مقتل کیوں ہے شہرِ گلاب

جب بھی کبھی شب خون پڑا تو اہلِ چمن خاموش رہے
موسمِ گُل میں جس کو دیکھو "میری شاخیں" "میرے گلاب"

ہم سے کوئی پوچھے تو بتائیں، کیا کچھ ہم پر بیت گئی
کہاں کہاں گہنائے سورج، کہاں کہاں ڈوبے مہتاب

پیاس کی باتیں کہتے سنتے کتنے موسم آئے گئے
کوئی سبیل کرو کہنی بھی، کب تک ذکرِ قحطِ آب

ہم بے در، بے گھر لوگوں کی ایک دعا، بس ایک دعا
مالک! شہرِ گلاب سلامت، ہم پر جو بھی آئے عذاب

افتخار عارف

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"ایک عورت ایک بلی کی وجہ سے جہنم میں چلی گئی۔ اس نے اسے باندھ دیا تھا۔ نہ اسے کچھ کھانے کو دیا، نہ اسے چھوڑا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا لیتی حتیٰ کہ وہ (بھوک سے) مرگئی۔" (بخاری)

بے مثال،

ایک بار ہشام بن الکلبی نے جو مشہور قاضی گزرے ہیں، کہا۔
"میں نے حفظ بھی ایسا کیا کہ کسی نے نہ کیا ہوگا اور مجھ سے بھول بھی ایسی ہوئی کہ کسی سے نہ ہوئی ہوگی۔ میرے چچا ایسے تھے کہ وہ مجھے حفظ قرآن کی اجازت نہ دیتے تھے بلکہ مصر تھے مروجہ علوم میں قابلیت بہم پہنچاؤں۔ پس میں کچھ دنوں کے لیے اپنی خالہ کے ہاں گیا اور وہاں ایک مکان میں یہ قسم کھا کر داخل ہوا کہ جب تک پورا قرآن حفظ نہ کرلوں گا، باہر نہیں آؤں گا تو میں نے تین دن میں پورا قرآن حفظ کرلیا۔
اور بھول کا واقعہ یہ ہوا کہ پچھلے سال میں نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ داڑھی بڑھ گئی تھی اس لیے میں نے اسے مٹھی میں لے لیا تاکہ مٹھی سے باہر بڑھے ہوئے بالوں کو نیچے سے کاٹ دوں لیکن مٹھی سے اوپر کا حصہ کاٹ دیا۔"

لاریب، ماہ زیب۔ چونیاں

قابل غور ہے کچھ،

- ہلکی پھلکی بات، ہلکے پھلکے کھانے کی طرح جلدی ہضم ہوجاتی ہے۔
- جھنجلاہٹ کا سب سے موثر علاج ایک دوست ہوتا ہے، جس پر جھنجلانے کے بعد آپ اس کی گود میں سر رکھ کر ڈھیر سارا رو سکیں۔
- خاموشی ایک ایسا پردہ ہے جس کے پیچھے لیاقت بھی ہوسکتی ہے اور حماقت بھی ہوسکتی ہے۔
- زندگی میں قسم، قدم اور قلم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے۔
- دنیا کے کام ختم نہیں ہوتے مگر انسان ختم ہوجاتا ہے۔
- مجھے دنیا میں سب سے زیادہ محبت اپنی کتابوں سے ہے، کیونکہ انہوں نے اس وقت میرا ساتھ دیا جب میرے اپنوں نے مجھے ٹھکرا دیا۔
- تعجب ہے اس پر جو یہ جانتا ہے کہ دنیا فنا کی جگہ ہے پھر بھی اس سے محبت رکھتا ہے۔
- کوشش کیجیے جن کے ساتھ عمر گزارنے کا سودا کرنا ہو ان سے دل ملیں یا نہ ملیں، ذہن ضرور ملتے ہوں۔
- زندگی گزارنا مشکل ضرور ہے لیکن اپنے رب سے تعلق جوڑنے والے ناکام نہیں ہوتے ہیں۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑپکا

قابل دید،

گاڑی چلاتی ہوئی ایک خاتون کو ٹریفک سارجنٹ نے اشارے سے روکا اور قریب آکر پوچھا۔
"محترمہ! آپ کا کب تک گھر سے باہر رہنے کا ارادہ ہے؟"
"کیا مطلب... تم یہ سوال کیوں کررہے ہو؟" خاتون برہم ہوکر بولیں۔
"خاتون! میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ جب آپ گھر چلی جائیں گی تو کم از کم چھ ہزار دوسری گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ اس ٹریفک کو استعمال کرنے کے قابل ہوجائیں گے۔" ٹریفک سارجنٹ نے شائستگی سے جواب دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

سنہرے موتی،

- کیا تم جانتے ہو بدقسمتی کے علاوہ کون سی بات برداشت کرنا مشکل ہے۔ یہ بھیانک ناشکر گزاری ہے۔ (چنولین)
- ناانصافی کے جواب میں ناانصافی سے کبھی بھی سچی مسرت حاصل نہیں ہوتی۔ (ڈی مارکریٹس)
- اگر نیک نامی کا خیال ہے تو اچھے لوگوں سے مراسم رکھو۔ (جارج واشنگٹن)
- اے رحمان تو فال کیا دیکھتا ہے آدمی کے افعال اور اعمال ہی اس کے فال ہیں۔ (رحمان بابا)

شفاعت بتول نین تارا۔ جام پور

غلط کام،

جنگ عظیم دوم کے زمانے میں ایک امریکی سپاہی فرانس کے ریلوے اسٹیشن پر ریل میں بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ ٹرین بھری ہوئی تھی۔ ایک ڈبے میں ایک فرانسیسی بڑھیا بیٹھی تھی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر اس کا پالتو کتا بیٹھا ہوا تھا۔ امریکی سپاہی میدان جنگ سے تھکا ہوا واپس آرہا تھا۔ اس نے بڑھیا سے بہت ہی اخلاق سے درخواست کی۔
"کیا آپ مجھے اس سیٹ پر بیٹھنے کی اجازت دیں گی؟"
"تم امریکی بہت بدتمیز ہوتے ہو۔ کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ اس پر میرا پیارا کتا بیٹھا ہوا ہے۔"
سپاہی کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا۔ پوری ٹرین میں وہ اپنے لیے جگہ نہ تلاش کرسکا تو دوبارہ بڑھیا کے پاس آیا۔ سیٹ پر بیٹھنے کی دوبارہ اجازت طلب کی۔ بڑھیا نے دوبارہ بے عزتی کردی۔ سپاہی نے نہایت اطمینان و سکون سے اس کا پالتو کتا اٹھایا اور کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اور سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ بڑھیا نے زور و شور سے چلانا شروع کردیا۔ کچھ فاصلے پر ایک انگریز بیٹھا ہوا تھا۔ وہ شروع سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس نے امریکی سے غصے سے کہا۔
"تم امریکی ہر کام غلط کرتے ہو۔ کھانا کھاتے وقت کانٹا غلط ہاتھ میں پکڑتے ہو۔ گاڑی دائیں طرف غلط چلاتے ہو اور اب بھی تم نے غلط کام کیا۔ تمہیں اس بڑھیا کو اٹھا کر باہر پھینکنا چاہیے تھا اور تم نے کتے کو باہر پھینک دیا۔"

نیر انیس۔ ناظم آباد

ارادہ،

دریا میں قطرے کی صورت
گم ہوجاؤں
اپنے آپ سے باہر نکلوں
"تم" ہوجاؤں۔

(امجد اسلام امجد)
انیقہ انا۔ چکوال

دکھ،

دکھ بھی آدمی ہوتے ہیں۔ آکے بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان بیٹھ جاتے ہیں۔ گھروں میں رہنے لگتے ہیں۔ اور رنگ میں بھنگ ڈال دیتے ہیں۔ آنکھوں میں بسیرا کرکے زندگی سے سکون کو نکال دیتے ہیں۔

فوزیہ تمریٹ۔ گجرات

ہار،

ایک پھول والے کی دکان پر کیا خوبصورت جملہ لکھا تھا۔
"انسان ہر قدم پہ جیت چاہتا ہے مگر لوگ میرے پاس آکر "ہار" مانگتے ہیں۔"

ثمرین اکرام۔ میرپور خاص

راز

سیٹھ صاحب ارب پتی تھے۔ انہوں نے غربت میں جنم لیا تھا اور ترقی کرتے کرتے اس مقام تک پہنچے تھے۔ ایک رات ایک اخباری نمایندہ ان سے انٹرویو لینے آیا۔

"سیٹھ صاحب! سب سے پہلے یہ بتلایئے کہ آپ نے اتنی ترقی کیسے کی اور اتنے دولت مند کیسے بنے؟" نمایندے نے انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔" سیٹھ صاحب طویل سانس لے کر بولے۔ "جب تک میں آپ کو یہ کہانی سناتا ہوں۔ تب تک کے لیے کمرے کی لائٹ بجھا کر زیرو کا بلب جلا دیتا ہوں۔ بات چیت کا کیا ہے، وہ تو زیرو کے بلب کی روشنی میں بھی کی جاسکتی ہے۔"

یہ کہہ کر سیٹھ صاحب اٹھے اور انہوں نے کمرے کی لائٹ بجھا کر زیرو کا بلب روشن کر دیا۔

تب اخباری نمایندہ بھی اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے ٹھیک ہے سیٹھ صاحب! میں سمجھ گیا کہ آپ دولت مند کس طرح ہوئے ہوں گے۔ اب آپ کو اپنی آپ بیتی سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ ان سے رخصت ہو گیا۔

نمرہ اقراء۔ کراچی

بولتے لفظ

- انسان کا اللہ سے قریب ترین رشتہ آنسوؤں کا ہے۔
- لوگ دوست کو چھوڑ دیتے ہیں بحث کو نہیں چھوڑتے۔
- زبان وہ بات کہہ ہی نہیں سکتی جو سلوک سے بیان ہوتا ہے۔
- آپ کسی کے الفاظ یا گفتگو سن کر یہ بتا سکتے ہیں کہ وہ کس پیشے سے تعلق رکھتا ہے۔
- جب تک سچے لوگوں کی اکثریت نہیں ہوتی۔ جمہوری فیصلے غلط ہیں۔
- بے بس کی آنکھ سے ٹپکنے والا آنسو کتنی ہی عبادتوں پر فوقیت لے جاتا ہے۔

فوزیہ ثمر بٹ۔ گجرات

آپ بھی پوچھیے

- "کیا تمہیں جانوروں سے محبت ہے؟"
- "جی ہاں اور خاص کر بھنے ہوئے مرغ سے۔"
- "شرم کرو۔ مار کھا کر بھی ہنس رہے ہو؟"
- "جناب آپ ہی تو کہتے ہیں کہ مصیبت کے وقت کو ہنس کر ٹال دو۔"
- "کون سی چیز محنت کے بعد بھی نہیں ملتی؟"
- "میری تنخواہ۔"
- "تم نے کان پر پٹی کیوں باندھ رکھی ہے؟"
- "آپ نے ہی کہا تھا کہ ہم ہر بات ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے نکال دیتے ہیں۔"
- "کسی بے وقوف کے سوال کا جواب بڑے سے بڑا عقل مند بھی نہیں دے سکتا۔"
- "جب ہی تو کل میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکا۔"

امبر گل۔ جھنڈو (سندھ)

بات تو سچ ہے

- سب سے زیادہ جھوٹ اس وقت بولے جاتے ہیں جب فریقین شادی کا معاملہ طے کرتے ہیں۔
- دنیا میں تین ہی وفادار ہوتے ہیں۔ بوڑھی بیوی، پرانا کتا اور وہ روپیہ جو جیب میں موجود ہو۔
- .. [illegible] کی حمایت میں لڑنے والا شخص۔
- اگر کوئی لڑکی کمزور دل ہے تو سب کی محبوبہ اور اگر جرأت مند ہے تو سب کی بہن۔
- انقلاب زمانہ دیکھیے کہ اب لڑکیوں کے بجائے لڑکوں کے رشتے آتے ہیں۔

شبنم شمشاد۔ بزمان

یادوں کی ڈائری

امت الصبوح

امبر گل کی ڈائری سے

آج بہت عرصے کے بعد پروین شاکر کی یاد آئی ہے اور میرے ہاتھوں نے خوشبو کو تھاما ہوا ہے۔ ان کی ایک بہت ہی پیاری غزل قارئین کی نذر۔

تتلیوں کی بے چینی آبسی ہے پاؤں میں
ایک پل کو چھاؤں میں اور پھر ہواؤں میں

جن کے کھیت اور آنگن ایک ساتھ اجڑتے ہیں
کیسے حوصلے ہوں گے ان غریب ماؤں کے

آنسوؤں میں کٹ کٹ کر کتنے خواب گرتے ہیں
اک جوان کی میت آ رہی ہے گاؤں میں

اب تو ٹوٹی کشتی بھی آگ سے بچاتے ہیں
ہاں کبھی تھا نام اپنے بخت آزماؤں میں

ابر کی طرح ہے وہ یوں تو چھو سکوں لیکن
ہاتھ جب بھی پھیلائے کھو گیا دعاؤں میں

کوچ کی تمنا میں ہاتھ پاؤں تھک گئے لیکن
سمت طے نہیں ہوتی پیارے رہنماؤں میں

اپنی غم گساری کو مشتہر نہیں کرتے
اتنا ظرف ہوتا ہے درد آشناؤں میں

اقصیٰ مریم کی ڈائری سے

جب درد مجھے زندگی کا حصہ بن جائیں، مایوسی اور دکھوں کی پرچھائیاں ہر طرف رقصاں ہوں، زندگی کے کشکول کے چند سکے بھی ازل سے ابد کی طرف بڑی رفتار سے چلنے لگیں۔ اس کیفیت کو محسن نقوی نے کیا خوب پیش کیا ہے۔ تو چلیے آپ بھی پڑھیے۔

آوارگی میں محسن اس کو بھی ہنر جانا
اقرار وفا کرنا پھر اس سے مکر جانا

جب خواب نہیں کوئی کیا زندگی کا کرنا
ہر صبح کو جی اٹھنا ہر رات کو مر جانا

ایسا نہ ہو دریا میں تم بادِ گراں ٹھہرو
جب لوگ زیادہ ہوں کشتی سے اتر جانا

سقراط کے پینے سے کیا مجھ پہ عیاں ہوتا
خود زہر پیا میں نے تب اس کا اثر جانا

جب بھی نظر آؤ گے ہم تم کو پکاریں گے
چاہو تو ٹھہر جانا، چاہو تو گزر جانا

خبریں و بیگل

از صفہ سہیل

سوچ

ہالی ووڈ کی مشہور اداکارہ 56 سالہ شیرون اسٹون نے ایک امریکی رسالے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ "پلاسٹک سرجنز" کے مابین دوڑ لگی ہوئی ہے کہ کون انہیں کاسمیٹک سرجری کے لیے آمادہ کرپاتا ہے۔ اب تک کئی نامی گرامی پلاسٹک سرجن انہیں بڑھتی عمر کے منفی اثرات چہرے سے مٹانے اور جسمانی کشش بڑھانے کے لیے مختلف پیکجز فروخت کرنے کی کوشش کرچکے ہیں لیکن شیرون اسٹون کاسمیٹک سرجری کرانے کو غیر اخلاقی سمجھتی ہیں۔" (کاش یہ خیالات ہماری وہ مارننگ ہوسٹس بھی سن لیں جو اپنے پروگرامز میں ان سب چیزوں کو بڑھاوا دیتی ہیں۔)

شیرون اسٹون نے مزید کہا کہ "ڈاکٹرز اپنے مقدس پیشے میں عملی قدم رکھتے وقت جو حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا کام نہ کریں گے جو مریض کے لیے نقصان دہ ہو جبکہ کاسمیٹک سرجری نقصان کا موجب بھی بن سکتی

مصروفیت

زیبا بختیار کا کہنا ہے کہ ٹی وی فنکاروں کا فلم کی طرف توجہ دینا اور فلم بنانا خوش آئند ہے۔ میں بھی اپنی فلم مکمل کرچکی ہوں اور اب اس کی نوک پلک سنواری جارہی ہے۔ (زیبا کہیں ایسا نہ ہو کہ نوک پلک کے چکر میں فلم ہی ۔۔۔؟) زیبا بختیار نے مزید کہا کہ ڈراما انڈسٹری کو فروغ دینے کے لیے بھی لوگ کام کر رہے ہیں میں ڈراموں میں کام اپنی مصروفیات کے حساب سے کرتی ہوں آج کل میری پوری توجہ اپنی فلم پر ہے کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ فلم اس برس ہی ریلیز ہوجائے (بالکل کہیں ایسا نہ ہو کہ اس موضوع پر کوئی اور ہی فلم بنالے۔)

ہے اس لیے میں اسے غیر اخلاقی اقدام گردانتی ہوں۔" (لیکن ہمارے ہاں تو ڈاکٹرز اور مریض دونوں کو ہی اس کا احساس نہیں۔)

خوش آئند

معروف آرٹسٹ بشریٰ انصاری کراچی میں تھیٹر کی رونقوں کی بحالی کے بارے میں کہتی ہیں کہ کراچی میں تھیٹر کا دوبارہ اِن ہونا خوش آئند ہے کیونکہ تھیٹر سے کئی بڑے فنکار انڈسٹری میں آئے ہیں اور انہوں نے اتنا اچھا کام کیا کہ اپنے کام کے باعث دھوم مچادی جو کہ قابل دید ہے۔ ہمارے پاس آئیڈیاز اور ٹیلنٹ کی کمی نہیں ہے بس ان کو صحیح رخ پر استعمال کی ضرورت ہے۔ اگر ان کا درست استعمال کیا جائے تو ہمیں آگے جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ بشریٰ نے مزید کہا کہ ڈرامے کے اعتبار سے تو ہم آج بہت بہتر ہوچکے ہیں جو تھوڑی بہت خامیاں ہیں وہ بھی دور ہوجائیں گی۔ (کیسے بھلا! جب آپ جیسے ڈراما آرٹسٹ میوزک کی خامیاں، خوبیاں بتانے بیٹھ جائیں گے تو پھر کیا گلوکار ڈرامے کی خامیاں درست کریں گے؟)

شاہکار

میوزک کے متوالوں کے لیے ایک خوش خبری ہے کہ جنون گروپ کے علی عظمت، سلمان احمد، برائن اور نصرت حسین ایک مرتبہ پھر شاید اکٹھے ہورہے ہیں۔ (کیونکہ انہیں اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ اکیلے کچھ زیادہ نہیں چل سکتے۔) سلمان احمد نے دس سال بعد علی عظمت سے بات کی کہ چلو پھر مل کر امن اور یگانگت کے گیت بکھیرتے ہیں (شاید سلمان احمد نے پاکستان آئیڈل میں علی عظمت کو دیکھ کر پہچان لیا)

پاکستان کے ابتدائی راک میوزک اور صوفی بینڈز میں پاکستان کی پہچان بننے والے اس گروپ نے سیونی، بے جذبہ جنون اور زمانے کے انداز بدلے گئے جیسے شاہکار گائے، لیکن فنکاروں کے درمیان رنجشوں نے انہیں علیحدہ کردیا اور پھر یہ کوئی انفرادی شاہکار نہ گاسکے۔ سلمان احمد اس سلسلے میں کوشش کررہے ہیں، لیکن علی عظمت نے اس پیشکش کا فی الحال کوئی مثبت جواب نہیں دیا ہے (بھئی علی عظمت ان دنوں پاکستان آئیڈل کے جج بن کر اپنے آپ کو کوئی بڑا گلوکار سمجھ رہے ہیں نا)

کریڈٹ

پچھلے دنوں بھارتی تھیٹر چار روزہ دورے پر اداکار

اوم پوری صاحب کی سربراہی میں پاکستان کے شہر لاہور آیا۔ جس کے ساتھ اداکارہ دیویا دتہ' جنہوں نے فلم ویرزارا' شہید محبت اور وارث شاہ میں پاکستانی کردار کیے ہیں۔ وہ بھی آئیں۔ دیویا دتہ کہتی ہیں کہ لاہور زندہ دلوں کا شہر ہے یہ بات لاہوریوں کی محبت نے ثابت کر دی' لاہور میں داتا دربار' لبرٹی مارکیٹ اور مال روڈ کی شاپنگ میں بہت مزا آیا۔ میں ساری زندگی اس دورے کو نہیں بھولوں گی۔ خاص طور پر لاہور کی سیر کے دوران لاہوریوں نے مجھے بہت سے تحفے بھی دیے ہیں جو میں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی۔ (دیویا کہتے سب ہیں مگر پھر وہاں جا کر بھول جاتے ہیں) لاہور کی سیر کے دوران چٹ پٹے آلو چنے' فروٹ چاٹ اور لڈو کھا کر بہت مزا آیا۔ (یہاں سے وہاں جانے والے بھی وہاں کے کھانوں سے ایسے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں) لبرٹی مارکیٹ سے شاپنگ کے دوران میں نے بہت سے پاکستانی ڈرامے' فلمیں اور ملبوسات خریدے ہیں جو میرے ساتھ جائیں گے اور لاہور کی یاد دلاتے رہیں گے' اس کا کریڈٹ میں اوم پوری جی کو دیتی ہوں کہ انہوں نے انہیں اپنے تھیٹر پلے کے لیے منتخب کیا اور وہ لاہور آسکیں' اور یہاں کی سیر کے دوران عوام کا پیار دیکھ کر انہیں بہت خوشی ہوئی۔ دیویا دتہ نے بتایا کہ ان کی والدہ کا تعلق کراچی سے اور والد کا ڈیرہ اسماعیل خان سے ہے۔ دیویا کا کہنا ہے کہ یہاں کے بازار اور راستے اور لوگ بہت اپنے اپنے سے لگے اور میں اپنی فلموں میں کیے گئے پاکستانی کردار اگر اب کروں تو زیادہ اچھے انداز میں کر پاؤں گی (دیویا چار دن کی محبت میں یہ حال اگر کچھ دن اور مزید رکتیں تو؟)

دُعا

سینئر اداکار قاضی واجد کہتے ہیں کہ پاکستان میں اس وقت ڈراما انڈسٹری اپنے عروج پر ہے۔ اس لیے ہمارے فنکاروں کو چاہیے کہ وہ اپنے فن میں مزید نکھار لانے کی کوشش اور مزید محنت کریں تاکہ پھر کوئی اور (بھئی اسٹار پلس) ہم پر حاوی نہ ہو سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں معین اختر' سلیم ناصر اور خالدہ ریاست جیسے عظیم فنکار پیدا ہوئے ہیں جن کے کام کرنے کا انداز منفرد تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ پرانا دور یاد کرنا اچھا لگتا ہے کہ جب کراچی میں ادبی محافل اور شوبز کی سرگرمیاں عروج پر تھیں ہر طرف اسی حوالے سے گفتگو ہوتی تھی لیکن نجانے اس شہر کو کس کی نظر لگ گئی ہم تو دعا ہی کر سکتے ہیں کہ خدا کراچی پر مہربانی فرمائے۔ (جی قاضی صاحب آپ کی اس دعا پر ہر پاکستانی آمین کہے گا)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ———— نیہا
میک اپ ———— روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافر ———— موسیٰ رضا

میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

حیا بنگش ———— کوہاٹ

نہ ہارا ہے عشق اور نہ دُنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ' ہوا چل رہی ہے

کوثر خالد ———— جڑانوالہ

جن سفینوں نے کبھی توڑا تھا موجوں کا غرور
اس جگہ ڈوبے جہاں دریا میں طغیانی نہ تھی

امبر گل ———— بھڈو (سندھ)

جو ہم سے بخت ہمارے بدل نہیں سکتے
مدار خود تو ستارے بدل نہیں سکتے
ذرا ذرا بھی جو بدلیں بہت غنیمت ہے
جو آپ سارے کے سارے بدل نہیں سکتے

نخبہ اکرم ———— گاؤں کو لیکی

جیسے بہار کے مہمان خالی چھوڑ گئے
وہ اک مکان ابھی تک مکیں کی چاہ میں ہے
یہی وہ دن تھے جب ایک دوسرے کو پایا تھا
ہماری سالگرہ ٹھیک اب کے ماہ میں ہے

رمشا شیخ ———— لاہور

وجہ بتانے کی ضرورت ہی نہ رہی
ہم لہجہ بدلتے گئے وہ اجنبی ہو گئے

طلعت خان ———— کوٹ نفل

اس بے حسی کی دُنیا میں دو سوال میرے بھی
کس طرح سے جیا جائے' کس کے لیے جیا جائے

شازیہ ہاشم ———— کھڈیاں قصور

ہم وادیٔ برف کے مسافر ہیں
آگ سینوں میں جلا کر چلتے ہیں
ہم نہ یوسف ہیں نہ وہ زلیخا
پھر بھی اپنے دامن کو بچا کر چلتے ہیں

فائزہ شیخ عباس ———— کراچی

دشمنی تو خیر ہر صورت ہوتی ہے گناہ
اک معین حد سے آگے دوستی بھی جرم ہے
ہم وفائیں کر کے رکھتے ہیں وفاؤں کی امید
دوستی میں اس قدر سوداگری بھی جرم ہے

ناہید شبیر رانا ———— رحمان گڑھ

وہ میری ہر بات سے اختلاف رکھتا تھا
چھپ چھپ کے میرا طواف کرتا تھا
کہیں کوئی اور میرے قریب نہ ہو جائے
اس لیے وہ سب کو میرے خلاف رکھتا تھا

نمرہ اقراء ———— کراچی

خوشبو سے ہواؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ
موسم کی اداؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ
مل جائیں تو جیون کو سجا دیتے ہیں لیکن
بچھڑیں تو دُعاؤں سے بھی ملتے نہیں کچھ لوگ

کومل ساجد ———— نامعلوم شہر

تیری چاہتوں سے نکل کر بھی نہ نکل سکی ہوں قید سے
کبھی روز و شب کی شکست میں کبھی موسموں کے حصار میں
جو سسک سسک کر فنا ہوئیں وہی تھیں میری خواہشیں
کبھی اپنے ذات کے کنج میں' کبھی اپنے غم کے فشار میں

آمنہ اُجالا ———— ڈہرکی

اب آ گئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے
تم اپنی شمع تمنا کو رو رہے ہو فراز
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

گلوکار کمپوزر

تنویر آفریدی سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"تنویر احمد۔"
2 "پیار کا نام؟"
"تنویر۔"
3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"3جنوری/حیدر آباد سندھ۔"
4 "ستارہ/قد؟"
"کیپری کون/5فٹ10انچ۔"
5 "بہن بھائی/آپ کا نمبر؟"
"6بہنیں اور میں/نمبر پانچ ہے میرا۔"
6 "تعلیمی قابلیت؟"
"میٹرک حیدر آباد سے کیا اور پھر کیمیکل انجینئرنگ پڑھی۔"
7 "شادی/بچے؟"
"جی شادی بالکل ہوئی ہے۔۔۔ چار بچے ہیں۔"
8 "شوبز میں آمد؟"
"پری پلان آیا۔۔۔ چوتھی کلاس میں تھا جب میں نے ریڈیو پاکستان سے اپنا کیریئر شروع کیا۔"
9 "وجہ شہرت؟"
"میوزک ہی ہے۔ میری شہرت کی وجوہات میرے مختلف البمز ہیں۔"
12 "پہلی کمائی کہاں خرچ کی؟"
"تیس روپے اور اپنے اوپر ہی خرچ کردی تھی۔"
14 "شوبز کی برائی؟"
"ہمارے ملک میں جب فنکار کے فن سے معاشرہ کو فائدہ پہنچنے کا وقت آتا ہے تو اس کے فن کو مار دیا جاتا ہے یعنی اسے نظروں سے گرا دیا جاتا ہے۔"
15 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟ اور رات کب ہوتی ہے؟"
"فجر کے بعد ہماری رات ہوتی ہے اور ظہر کے وقت ہماری صبح ہوتی ہے۔"
16 "نہار منہ کیا کھانے کو دل چاہتا ہے؟"
"نہار منہ جی حلوہ پوری کھانے کو دل چاہتا ہے۔ چٹورا آدمی ہوں۔"
17 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"
"گھر والے اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ ہماری جو مصروفیات ہوتی ہیں صرف اور صرف انہی کے لیے ہوتی ہیں' ہم قربانیاں دے کر انہیں آسائش دے رہے ہوتے ہیں۔"
18 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"
"اپنے ملک میں کوئی قانون ہے کیا؟"
19 "قومی تہوار مناتے ہیں؟"
"سب مناتا ہوں اور بھرپور طریقے سے مناتا ہوں۔"
20 "اپنی جسمانی ساخت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"
"ویسے تو اللہ کا شکر ہے کوئی کمی نہیں' لیکن لگتا ہے کہ فزیکلی میں اسپورٹس کے قابل نہیں ہوں۔"
21 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"یہ کیفیت ہوتی ہے کہ کسی بھی دوست کا گھر یا دوکان نظر آجائے تو میں وہاں چلا جاتا ہوں اور کچھ نہ کچھ کھانے کو مانگ لیتا ہے۔"
22 "کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟"
"بارہ ربیع الاول کا۔"
23 "شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے تیار رہتے ہیں؟"
"لانگ ڈرائیو پہ' چاہے کراچی سے پشاور ہی کیوں نہ ہو۔"
24 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتے ہیں؟"
"گھر والوں کو گاڑی میں بٹھاتا ہوں اور گھومتے گھامتے کھانا کھاتے ہوئے گھر آتا ہوں۔ دوستوں سے گپ شپ کرتا ہوں۔ سب کو خوش کر کے خوش ہوتا ہوں۔"
25 "بیرون ملک کس قانون سے متاثر ہوتے ہیں؟"
"میں زیادہ تر انگلینڈ جاتا ہوں اور وہاں صرف میں قانون ہی دیکھتا ہوں اور متاثر ہوتا ہوں۔"
27 "غصے میں کیفیت؟"
"کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ چیختا بھی ہوں یا پھر ہاتھ میں کوئی چیز ہو تو پھینک دیتا ہوں۔"
28 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"
ہنستے ہوئے "خواتین ہماری معصوم ہوتی ہیں اور جس طرح ہمیں بچوں کی باتوں کا برا نہیں ماننا چاہیے اسی طرح خواتین کی باتوں کا بھی برا نہیں ماننا چاہیے۔"
29 "کوئی لڑکی مسلسل گھورے تو؟"
"تقویٰ اختیار کرنے کے بعد اب جو بھی لڑکی گھورتی ہے تو پوچھ لیتا ہوں بیٹا کیا دیکھ رہی ہو۔"
31 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"
"اپنی ماں کے۔"
32 "کوئی چیز جو قبل از وقت مل گئی ہو؟"
"نہیں کوئی نہیں۔"
33 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"
"سنگل۔"
34 "محبت کا اظہار کھل کر کرتے ہیں؟"
"جی بالکل کھل کر کرتا ہوں۔"
36 "شاپنگ میں سب سے پہلے کیا خریدتے ہیں؟"
"پرفیوم۔"
38 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں سوچتا' پیسے کو اپنا دشمن سمجھتا ہوں۔"
39 "کوئی برا وقت جو آپ نے گزارا؟"
"کوئی ایک وقت۔۔۔ بہت برا وقت گزارا ہے۔"
40 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"
"کوئی اچھی کتاب۔"
41 "کس پسندیدہ شخصیت کے ساتھ شام گزارنا چاہتے ہیں؟"
"میری پسند کے تین لوگ تھے اور ان تینوں کے ساتھ میں نے بہت وقت گزارا مثلاً "نثار بزمی' مہدی حسن اور میڈم نور جہاں۔"
42 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"
"کوئی اچھا آئیڈیا کسی کو دیں اور پازیٹو جواب آجائے تو موڈ پر اچھا اثر پڑتا ہے کہ کام میں پیش رفت ہوئی ہے۔"
43 "پسندیدہ پروفیشن؟"
"میوزک۔"
44 "مخلص کون ہوتے ہیں؟"
"میرے کیس میں تو پرائے زیادہ مخلص رہے ہیں۔"
45 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتے ہیں؟"
"گھر پہ اپنے بیڈ روم میں۔"

46 "لباس میں کیا پسند ہے؟"
"شلوار قمیص۔"
47 "اپنی شخصیت کے لیے ایک جملہ؟"
"میں ایک نہایت سوشل' با اخلاق اور یاروں کا یار بندہ ہوں۔"
48 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"
49 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"
"اپنے سینئرز اور بزرگوں کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتا ہوں۔"
50 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"آج کل تو بوریت دور کرنے کے لیے کرنٹ افیئرز دیکھ لیں کسی خاتون اینکر کا اور یہ دیکھیں کہ وہ دو سیاسی بندوں کو کس طرح لڑوا رہی ہوتی ہے۔"
51 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"
"نہیں کبھی نہیں شیخ رشید والی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔"
52 "مہمانوں کی اچانک آمد کیسی لگتی ہے؟"
"بہت اچھی لگتی ہے۔ کوئی بھی آجائے' میں بہت خوش ہوتا ہوں۔"
53 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو کیا کریں گے؟"
"ہمارے یہاں تو پاور والا سب سے زیادہ کمزور ہوتا ہے۔"
54 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"ہوتی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی پرایرٹی جمع کرنے کا شوق ہے۔"
55 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"کر اپنے لیے کچھ کرلو۔"
56 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"
"میری زندگی کا سب سے اچھا دور یہی ہے جو میں گزار رہا ہوں۔"
57 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"کوشش بہت کرتا ہوں مگر ہو نہیں پاتی۔"
58 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"
"جب میرے پاس پیسے ہوتے ہیں تو پھر جو مانگ لے اسے دے دیتا ہوں بخیل اور کنجوس نہیں ہوں۔"
59 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"اپنے لیے کار۔"
60 "کھانے کے لیے بہترین جگہ' چٹائی یا ڈائننگ ٹیبل؟"
"چٹائی بہترین جگہ ہوتی ہے۔"
61 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو کیا لینا پسند کریں گے؟"
"تو میں خدا کی قسم ان کا پہرے دار بننا پسند کروں گا۔"
62 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"بہت زیادہ۔ فیس بک سے تو بہت سے بچھڑے ہوئے دوست ملے ہیں۔"
64 "رنگین مزاج ہیں یا نارمل؟"
"انتہائی رنگین مزاج ہوں۔ اپنی زندگی میں ہر اچھے انسان سے عشق کیا ہے۔"
65 "عورت نرم دل ہوتی ہے یا مرد؟"
"مرد ہوتا ہے' عورت تو بہت سخت دل ہوتی ہے۔"
66 "بہترین کک کون ہوتا ہے عورت یا مرد؟"
"مرد۔۔۔ اور میں خود بہترین کک ہوں۔"
67 "کس شخصیت کو اغوا کرنا چاہتے ہیں اور تاوان میں کیا وصول کرنا چاہتے ہیں؟"
قہقہہ "میرا بس چلتا تو میں آر ڈی برمن کو اغوا کرلیتا اور تاوان کے طور پر میوزک سیکھتا۔"
68 "اگر آپ کو کوئی اغوا کرلے تو گھر والوں کا کیا رد عمل ہوگا؟"
"بہت پریشان ہوں گے کیونکہ گھر والوں کی تمام امیدوں کا مرکز میں ہوں۔ خاندان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔"
70 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"نہایت بزدل۔"
71 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"

"جب کوئی آپ سے خود کو بڑا سمجھے اور یہ احساس دلانے کے لیے آپ کو لیٹ ڈاؤن کرے۔"
72 "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"میں شادی کی رسومات کو بالکل پسند نہیں کرتا اور بہت خلاف ہوں۔ صرف نکاح کے حق میں ہوں۔"
73 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا نہیں؟"
"کیش دینا چاہیے۔"
75 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"علامہ اقبال۔"
76 "اپنا فون نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کیا؟"
"کبھی بھی نہیں کیا۔"
77 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"
"اپنی سیل فون اور والٹ۔"
78 "آپ کی زندگی عام لوگوں کی طرح ہے یا خاص؟"
"بہت عام ہے۔"
79 "پاکستان کے لیے کیا سوچتے ہیں؟"
"پاکستان زندہ باد سوچتا ہوں۔"
80 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتے ہیں؟"
"بالکل کرتا ہوں۔ سینہ ٹھوک کے کرتا ہوں۔ معافی مانگنے میں ایک لمحہ نہیں لگاتا۔"
81 "آپ کی اچھی اور بری عادت؟"
"اچھی تو یہ ہے کہ غرور و تکبر نہیں ہے مجھ میں۔ الحمدللہ ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزارتا ہوں اور بری بھی یہی ہے۔"
82 "قلم ہاتھ میں آجائے تو کیا لکھتے ہیں؟"
"آج کل تو جن کے پروجیکٹ کر رہا ہوں ان ہی کو لکھنا شروع کردیتا ہوں۔"
83 "کب منہ سے گالیاں نکلتی ہیں؟"
"یہ سوال اس طرح ہونا چاہیے تھا کہ کب نہیں نکلتیں ٹریفک میں جب لوگ غلط گاڑی چلاتے ہیں تو پھر۔۔۔"
84 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"بہت مرتبہ' کھانے سے اٹھ جاتا ہوں کہ بس اب نہیں کھانا۔"
87 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا چیزیں رکھتے ہیں؟"
"آج کل تو میرے اسکرپٹ پڑے ہوئے ہوتے ہیں۔"
88 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"خوب صورت مناظر اور خواتین۔"
90 "ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں؟"
"نہیں۔۔۔ انگریزوں نے ماں کے لیے' باپ کے لیے' اور پیار کے لیے ایک دن رکھا ہے' جبکہ ہمارے یہاں تو ہر دن پیار کا دن ہوتا ہے۔ میں ان بکواس باتوں کو نہیں مانتا۔"
91 "زندگی کب بدلی؟"
"والد کے انتقال پر۔"
92 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"اٹھ جاتا ہوں۔ اگر واقعی کسی کام سے اٹھایا گیا ہو تو۔"
93 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں؟"
"جب میرا دل خوش ہو۔"
95 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"پانی پیوں' پھر چائے اور پھر ٹی وی دیکھوں۔"
96 "جس دن موبائل سروس آف ہوتی ہے اس دن؟"
"خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔"
97 "کون سے چینلز شوق سے دیکھتے ہیں؟"
"جوں جوں عمر بڑھ رہی ہے' نیوز چینل اچھے لگنے لگے ہیں۔"
98 "گداگروں کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"
"ایک روپے سے لے کر ہزار روپے تک۔"
99 "اچانک چوٹ لگنے پر کیا منہ سے نکلتا ہے؟"
"انا للہ وانا الیہ راجعون؟"
101 "آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"عروج کب آیا ہے۔"

بقیہ سروے

میں بتا نہیں سکتی' بالکل ایک خواب کی طرح تھا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو خوشی میں نے اپی ای کے چہرے پر دیکھی' صرف اور صرف اپنی اس چھوٹی سی تحریر کی وجہ سے وہ میرے لیے سب سے بڑی پذیرائی اور کامیابی تھی۔ اللہ ان کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر قائم رکھے۔ آمین۔

3 ۔ خواتین کی طویل تحاریر مجھے بے حد پسند ہیں' رائٹر چاہے کوئی بھی ہو۔ راحت جبیں' رخسانہ نگار عدنان' عنیزہ سید' عالیہ بخاری' آسیہ مرزا' نگہت عبداللہ' شازیہ چوہدری' ہما ملک سب کی تحاریر مجھے اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ لیکن شازیہ چوہدری اور راحت جبیں ان دونوں کو میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ شازیہ چوہدری کی ڈوبتہ کا سن کر میں آج بھی درد سا محسوس کرتی ہوں دل میں۔ وہ میری دعاؤں میں شامل ہیں اور رہیں گی ہمیشہ۔

4 ۔ خواتین کے علاوہ مجھے اشفاق احمد' ہاشم ندیم' اسلامی تاریخی کتب اور ابن صفی کی عمران سیریز بے حد پسند ہیں۔ اگر اپنے پسندیدہ رسالے جلدی ختم کرلوں تو ان کتابوں سے ضرور مستفید ہوتی ہوں۔ پسندیدہ کتابوں میں پیر کامل' عبداللہ' شازیہ چوہدری کا شہر دل کے دروازے (جو کئی بار پڑھ چکی مگر دل نہیں بھرا) اور بانگ درا شامل ہیں۔

5 ۔ یہ سوال تھوڑا مشکل لگ رہا ہے۔ اپنے متعلق بس اتنا ہی کہ ایک عام سی ہاؤس وائف ہوں اور وہی عام مصروف سی روٹین۔

صبح نماز کے بعد قدرت کو محسوس کرنا بے حد اچھا لگتا ہے۔ اس کے بعد معمول کی تمام تر ذمہ داریوں سے نبرد آزما ہونے کے بعد ایک گھنٹہ جب دو سالہ پریٹی سو جاتی ہے تو مطالعہ کرتی ہوں۔

بچوں اور میاں کے آنے کے بعد دوپہر کے کھانے کی تیاری' پھر بچوں کا ہوم ورک' اماں کے ساتھ (میری ساس) لوڈو کھیلنا یا ان کے ماضی کے قصے سننا میرا بہترین مشغلہ ہے۔ پھر رات نو بجے تک بھی گھر کے کام ہی چلتے ہیں۔

نو بجے کے بعد سب سے الگ بیٹھ کر قلم سنبھال لیتی ہوں یا پھر کوئی کتاب اٹھا لیتی ہوں۔

میں ٹی وی پر فلم نہیں دیکھتی' میوزک تب چھوڑ دیا جب حالات کی وجہ سے اپنا پیارا گھر چھوڑنا پڑا۔ سیر و سیاحت کی بہت شوقین ہوں۔ جب بھی موقع ملے یہ شوق ضرور پورا کر لیتی ہوں۔ بس یہ ہیں میری شب و روز۔

تعلیم شادی کے بعد مکمل کی۔ ہمارے چاچو سوائے اپنی بیٹیوں کے' باقی سب لڑکیوں کی تعلیم کے سخت خلاف ہیں۔ سو میٹرک میں ہی پیا دیس سدھار گئی۔ مگر اللہ بھلا کرے میاں صاحب کا جنہوں نے ہمارے شاندار تعلیمی سرٹیفکیٹس دیکھ کر ہمارا یہ جنون پورا کیا اور اب اللہ کے کرم سے انگلش ادب میں ماسٹرز کر رکھا ہے اور ایجوکیشن میں بیچلر۔ آگے بڑھنے کی ابھی بھی جستجو ہے۔ دیکھیے جو اللہ کو منظور۔

مصباح علی

پہلے تو کامیابی کا بیالیسواں زینہ طے کرنے پر بہت بہت مبارک ہو اور اپنا معیار دن بدن بڑھانے پر مزید مبارک باد۔

جناب! میں تو ہکا بکا رہ گئی جب سروے کے لیے مجھے یعنی مصباح علی کو رائٹر جیسا خطاب ملا۔

آپی! کیا واقعی میں رائٹر ہوں؟ کوئی یقین دلائے یا ہم خود آنکھیں ہی کھول دیں۔ میرا خیال ہے بند آنکھوں سے اس حسین خوش فہمی کو بڑھنے دیں۔

بہرحال جناب عالیہ! فدویہ مودبانہ عرض کرتی ہے۔

1 ۔ پہلی بار جو تحریر بھجوائی تھی' یقین مانیں! صرف اور صرف ایک شرط کے تحت' میری پیاری سی خالہ اور آپ کی بہت پوزیسو بہت پرانی قاری خالدہ ہاشمی صاحبہ کے ساتھ ان کی ازلی بھانجی میں نے شرط لگائی۔ ایکچولی۔ ہم دونوں فون پر محو گفتگو تھے اور سامنے ٹی وی آن تھا۔ بس کسی سین پر ایسے ہی میں نے کہہ دیا۔

"لو بھلا' کسی نے سسرال کی ڈیفی نیشن سنی ہو تو' مجھ سے بہتر کون بتا سکتا ہے۔"

"ہاں تو بتا دے۔" خالہ نے قہقہہ لگایا تھا۔

"لکھنا اتنا آسان نہیں ہے' بڑا مشکل کام ہے۔"

"تو اس میں کون سا ہل چلانا ہے' پنسل ہی چلانی ہے' دماغ تو پہلے ہی بہت چلتا ہے۔"

"خالہ دیکھ لو چیلنج نہ کرنا۔" میں تن گئی۔

"چل کر دیا۔" انہوں نے جان چھڑائی۔

اب ایسے میں کیا فیلنگز ہوں گی یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ کو موصول بھی ہوگا اور پڑھا بھی جائے گا۔ ہاں البتہ ایک خیال تھا کہ پڑھنے والی ایک بار تو میری لکھائی پر اور الفاظ پر روئے گی' پھر وہ حرف بھیج کر یہ توقف ضرور کرے گی مگر سینہ خوب پھولا ہوا تھا خالہ کے سامنے۔

2 ۔ پہلی کہانی شائع ہونے پر کیفیت یار! جو سب لکھاری بہنوں کی ہوتی ہوگی وہی' بے تحاشا حیرت اور خوشی کہ اتنے بڑے ادارے میں جہاں خط شائع نہ ہونے پر شکوے کیے جائیں۔ جو مارکیٹ میں بعض اوقات ملنا مشکل ہوتا ہے' اس میں جگہ مل جانا امیزنگ یار! منہ سے بے اختیار نکلا۔

"I cant belive this" آنکھیں پھٹ گئیں اور منہ کھلا رہ گیا۔

جب پہلی کہانی (اجنبی کے نام) شائع ہونے کی خبر صباحی نے دی میرا گول مٹول پیارے جیسا چہرہ پھول کر پرلت جتنا تو ہو گیا تھا۔ ہاں ایک فیلنگ باقی لکھاری بہنوں سے مختلف ضرور تھی چھپانے کی' جی چاہ رہا تھا کہ کسی کو پتا نہ چلے۔ مجھے خدشہ تھا کہ بہت مذاق اڑائیں گے' اور کچھ سے ڈر تھا کہ اگر انہیں پتا چل گیا تو وہ مذاق نہیں' مجھے اڑائیں گے۔ اف یہ شامت!

3 ۔ آپ نے پذیرائی کی بات کی تو کہیں نا کہیں ہم میں سراہے جانے کی خواہش دبی ہوتی ہے' خطوط بار بار پڑھ کر بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ کسی نے مجھے پڑھا اور پھر اس کو سراہا۔ زبردست بھئی' شکریہ' نوازش اور ایک پیاری بہن نے لکھ دیا کہ "جنون قلب" کا سحر کچھ عرصہ جکڑے رکھے گا" آپی! آپس کی بات ہے کان پاس لائیں۔ مجھے بالکل امید نہیں تھی لیکن اس پیاری بہن کا شکریہ۔ یہ تو بہت زیادہ پذیرائی ہے' میں کہاں سنبھال سکتی ہوں' ہاں یاد آیا ایک افسانے پر بیسٹ افسانہ بھی کسی نے لکھ دیا' بھئی بڑی نوازش کورنش بجا لاتے ہیں۔ لیکن میں شاید اتنی توقع پر پوری نہ اتر سکوں۔ بہت کمی ہے مجھ میں' اتنا اچھا نہیں لکھ سکتی سر درد بنی ہوئی ہوں۔

4 ۔ آپی! حقیقت یہی ہے کہ میں بہت پرانی قاری نہیں ہوں' اس لیے کچھ اندازہ نہیں کہ کون کیسا' خوبصورت لکھتا رہا' کیا بے مثال لفظ ان کے قلم نے تخلیق کیے۔ یہ میری بد قسمتی کہہ لیں کہ میں نے نہیں پڑھا۔ ہاں البتہ خالہ اور آپی سے بہت تعریفیں سنی ہیں شازیہ چوہدری کی۔ راشدہ صاحبہ' نگہت عبداللہ' ہما کوکب' عنیزہ سید اور بے شمار نام لیتی ہیں وہ۔ ویسے میں نے فرحت آپا اور بشریٰ سعید' نایاب جی' اور نمرہ احمد' کو ہی پڑھا ہے وہ بھی ابھی۔ ان سب میں زیادہ نایاب جی کو پڑھا ہے۔

فیورٹ بک تو ہر مسلم کی قرآن پاک ہی ہے' لیکن اس کتاب کی تعریف تو اس خط اور سروے سے بہت اوپر کی بات ہے۔ ہاں دیگر کتابوں میں خلیل جبران کی "سحر ہونے سے پہلے' روح کے آئینے اور اس نے کہا"

ہاں جاوید چوہدری کی "زیرو پوائنٹ" زبردست ہے اور اشفاق احمد صاحب کی "زاویہ" بہت بہت پسند ہے' کسی

اور ادارے کی رائٹرز کو ابھی تک پڑھا نہیں۔

اس کے علاوہ میری خاص ہابی ڈریس ڈیزائننگ ہے۔ مجھے بچپن سے شوق تھا مختلف' زبردست اور باپردہ کپڑے پہننے کا اور اس ہابی کے ہاتھوں بڑی مار کھائی ہے۔ امی سے۔ مجھے سجنے سنورنے کا بھی بہت شوق ہے اور گھنٹوں کے حساب سے سونا۔

5۔ اور جناب اب بات سب سے مشکل پوچھ لی۔ بھئی بات صاف' تعلیم کی کوئی سرحد نہیں ہوتی۔ اس کا تعلق ڈگری سے نہیں ہوتا ذہنی اختراع سے ہوتا ہے' بعض اوقات ہم ماسٹرز کرکے بھی صورت سے مار کھانے والے شاگرد ہی لگتے ہیں اور میں تو شکل اور عقل دونوں سے ایسی ہی لگتی ہوں۔ میری تعلیم کا اندازہ اس بات سے لگالیں جب پہلی تحریر شائع ہوئی تو میرا چھوٹا لاڈلا بھائی عمر منہ پر ہاتھ رکھے پھس پھس کرکے گھنٹہ ہنستا تھا اور بہنیں ایک دوسرے کو فون کرکے یقیناً" پندرہ منٹ تو ہنسی ہوں گی اور باقی بہنیں میری جرات کو ڈسکس کرکے۔

ویسے آپ کہہ رہی ہوں گی مجال ہے جو ایک بات کا بھی سیدھا جواب دیا ہو' تو بھئی میں ایسی ہی ہوں بے تکی سی۔ آخر میں اس آنس میں جب بھی جس کسی سے بھی بات ہوئی۔ کمال ہیں بھئی۔ آواز' انداز' لہجہ کیا کوئی خاص ٹریننگ دی جاتی ہے؟

رشک حبیبہ

1 ۔ بس بھجوادی تھی۔ قسمت آزمائی کی خاطر۔ اپنے قلم پہ بھروسا تھا ضرور' مگر اتنا نہیں۔ الحمدللہ میری پہلی کاوش کی ہمت بندھائی گئی اور خوشی سے چہرہ چمک اٹھا تھا۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے لکھنا میرا خواب تھا۔ میری منزل کا ایک اہم پڑاؤ۔ ساتھ ساتھ ایک بات اور میئر کرتی چلوں۔ میں نے بہت لوگوں سے سنا تھا کہ تحریریں کسی اور کے نام سے شائع ہوجاتی ہیں نیز (گستاخی معاف) اپنے عزیز واقارب اور جان پہچان کے لوگوں کی تحریروں کو جگہ دی جاتی ہے' خود میرے ابو کا بھی یہی کہنا تھا کہ کسی کے تھرو تحریر بھجواؤ اس طرح تو شاید موقع نہ دیا جائے مگر مجھے اتنی خوشی ہوئی جب میری کہانی' میرے اپنے نام سے بغیر کسی سفارش کے شائع ہوگئی۔ اور پھر مزید خوشی ہوئی یہ سوچ کر کہ میری طرح ہر نئی لکھاری کی ہمت افزائی کی جاتی ہوگی یقیناً"۔ دیر بے شک ہوجائے اشاعت میں لیکن بے ایمانی نہیں ہوتی۔ یہ میرا دعوا ہے اور میں سب کی اس غلط فہمی کو دور کرتی رہتی ہوں۔

2 ۔ نہیں تھی۔ اور سچ کہوں تو ابھی اتنی پذیرائی ملی بھی نہیں اور۔ اور۔ اور کی خواہش کبھی ختم تو نہیں ہوتی۔ میری خواہش ہے کہ میں بہت اچھا لکھوں۔ جتنا عمیرہ احمد' نمرہ احمد' نایاب ملک' رخسانہ نگار عدنان وغیرہ لکھتی ہیں۔ یہاں عنیزہ سید اور ان جیسی بہت بہت بیسٹ لکھنے والی رائٹرز کا نام نہیں لیا۔ میں نے کہ میں کتنا بھی اچھا لکھ لوں۔ ان جیسا نہیں لکھ پاؤں گی۔ کوشش البتہ جاری ہے' اپنی بساط سے بڑھ کر محنت' مطالعہ اور مشق شاید مجھے بھی ایک دن بڑی اور بہترین رائٹرز کی قطار میں کھڑا کردے۔ ان شاء اللہ۔

3 ۔ پچھلے سوال میں ان مصنفین کا نام لے لیا جن کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہوں۔ اب ثمینہ عظمت کے افسانے شوق سے پڑھتی ہوں۔ عمیرہ احمد اور نمرہ احمد دونوں کی تحریریں لازمی پڑھتی ہوں۔ میں رہ ہی نہیں سکتی ان کو پڑھے بغیر۔ عمیرہ کی تمام کتابیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے مجھے۔ میں انہیں اپنے لیے رول ماڈل مانتی ہوں۔ آسیہ رزاقی بہت پسند ہیں۔ شفقت کی بہت خوب صورت مہک بستی ہے ان کی تحریروں میں۔ یا مجھے محسوس ہوتی ہے اور بھی بہت سی ہیں۔ سب کا ذکر کرنے بیٹھوں تو طوالت کے باعث قارئین شاید اکتاہٹ کا شکار ہوجائیں اس لیے مختصر یہ کہ "خواتین" کی تحریریں تمام اور مصنفین تمام ہی بیسٹ ہیں۔

4 ۔ راجہ گدھ' بہت پسند ہے۔ میں بار بار پڑھتی ہوں اسے۔ اور اس وقت تک پڑھتی رہوں گی جب تک وہ مجھے پوری طرح سمجھ میں نہ آجائے۔ اس کے علاوہ علیم الحق حقی کو پڑھا' میرا من اور منٹو کی کچھ تحاریر زیر مطالعہ ہیں۔

آج کل "آگ کا دریا" زیر مطالعہ ہے۔ مگر فہم سے بالاتر۔ اتنی دقت مجھے کسی ناول کو پڑھتے ہوئے نہیں ہوئی' مگر میں نے بھی خود سے ضد باندھ رکھی ہے۔ پڑھ کر رہوں گی اور سمجھ کر بھی۔

5 ۔ یہ سوال تو طویل جواب کا متقاضی ہے۔ پھر بھی کوشش کرتی ہوں مختصر پیرائے میں بھرپور جواب۔ تحریر کروں۔

تعلیم اگر نصابی پوچھیں تو بی اے میں ابھی ابھی ایڈمیشن لیا ہے' لیکن غیر نصابی تعلیم ماشاء اللہ بہت حاصل کی جس کی کوئی ڈگری نہیں ہوتی۔ مجھے بہترین اردو شاعرہ سال 2010ء کا ایکسی لینس ایوارڈ مل چکا ہے۔

روز و شب کی تفصیل یہ ہے کہ صبح کسی بھی وقت ہوجاتی ہے۔ رات کے کسی بھی وقت اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ کرنے کو بہت کام ہوتے ہیں' لکھنے' پڑھنے کے اور مجھے لکھنے اور پڑھنے کے لیے رات کا وقت ہی بہت پسند ہے۔ دنیا کی جیتی جاگتی ہلچل میں میرا دماغ بھٹک بھٹک جاتا ہے' رات کے وقت یکسوئی سے کام کرتی ہوں۔ شاید آپ کو حیرانی ہو میں رات سات سے آٹھ بجے تک کھانا کھالیتی ہوں اور نو بجے تک سو جاتی ہوں۔ کراچی جیسے شہر میں رہنے کے باوجود۔ ٹی وی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ کبھی دل چاہے تو دیکھ لیتی ہوں ورنہ ٹی وی دیکھنا روٹین کا حصہ نہیں۔ صبح گھر کی صفائی ستھرائی اور کچن میں برتن وغیرہ صاف کرنے کی ذمہ داری میری ہے۔ بہت زیادہ کام گھر کے نہیں کرتی۔ چار بہنوں میں سب سے چھوٹی ہونے کے باعث تھوڑی بہت رعایت حاصل ہے مجھے۔ ویسے تو دو بڑی بہنیں اپنے گھر کی ہوگئیں' لیکن جو ایک مجھ سے بڑی بہنا ہے' وہ بھی مجھے کچھ کام وام نہیں کرنے دیتی۔ لہٰذا اس طرف سے اطمینان ہے فی الحال۔ باقی سارا وقت لکھنے پڑھنے میں صرف ہوتا ہے۔

لکھنے کے علاوہ' مجھے اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔ فنون لطیفہ سے بہت لگاؤ ہے۔ شوق کے باوجود سیکھا نہیں' مگر پھر بھی بہت اچھی اسکیچنگ آتی ہے۔ فارغ اوقات میں شوق پورا کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ تجوید سے قرآن پاک پڑھاتی ہوں۔ ہاتھ کی کڑھائی بہت اچھی آتی ہے۔ سینے پرونے کا شوق رکھتی ہوں' مگر موقع بہت کم ملتا ہے۔ اسی لیے "ٹی وی بہت کم دیکھتی ہوں۔ چند ایک ڈرامے وہ بھی عمیرہ احمد یا کسی اچھی رائٹر کے دیکھ لیتی ہوں۔ باقاعدہ نہیں' کیوں کہ جلدی سونے کی عادت ہے مجھے۔ شاید قارئین کو تھوڑی بکھری بکھری روٹین لگ رہی ہوگی' مگر کیا کروں جناب۔ میں ایسی ہی ہوں۔۔۔

(باقی ان شاء اللہ اگلے ماہ)

نادیہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

مریم، یاسمین اور ثوبیہ۔۔۔ نامعلوم شہر

ہم پہلی بار خط لکھ رہی ہیں اور وجہ یہ ہے سائرہ رضا کی کہانی "اب کر میری رفوگری" سے ہم بہت متاثر ہوئی ہیں۔ اکثر لوگ ہم سے تعریف سننے کے لیے ترستے رہتے ہیں مگر کمال ہے ہماری استقامت کا جو کبھی منہ سے تعریف کا ایک لفظ بھی پھوٹا ہو۔ مگر آپ کے خواتین ڈائجسٹ کی بات ہی نرالی ہے۔ کیا کمال ڈائجسٹ ہے! بلے او بلے۔۔۔ کی کہنے!

ج : مریم، یاسمین اور ثوبیہ! واہ جناب! واقعی بڑی بات ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے لیے آپ نے تعریفی کلمات لکھے۔ لیکن آپس کی بات ہے کہ اچھی چیز کی تعریف کرنے میں کبھی بھی کنجوسی نہیں کرنا چاہیے۔ بہت دیر کی آپ نے خط لکھنے میں۔

عدیلہ شہزاد۔۔۔ 90 میل

بہت سال پہلے سے شاید 6th ۔۔۔ 7th سے یہ ڈائجسٹ پڑھنا شروع کیا۔ اسکول میں ٹیچرز نے پکڑ بھی لیا۔ لمبا چوڑا لیکچر ملا، ساتھ مس شہناز نے کہا۔ پڑھا کریں، اچھی بات ہے، پر پوزیشن لیں۔

میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔ ہر کہانی ہماری ہی کہانی تو ہوتی ہے، بہت سے مسائل میں مدد ملتی ہے۔ حدیث نبوی سے لے کر باورچی خانے تک سب کچھ ہی تو ہوتا ہے اس میں۔

کوکنگ کا مجھے بہت شوق ہے، اتنے اچھے سلسلے کے لیے آپ کا بہت شکریہ! ہم جیسے لوگ جو دور دراز دیہات میں رہتے ہیں، جنہیں کوکنگ کلاسز لینے کی سہولت نہیں ہے۔ ان کے لیے یہ ایک انسٹیٹیوٹ کا درجہ رکھتا ہے، پلیز ڈھوکلے اور گجراتی دال کی ترکیب ضرور شامل کریں، پلیز کوئی بیسٹ ڈش مقابلہ شروع کریں۔

ج: پیاری عدیلہ! آپ کی فرمائش نوٹ کرلی ہے۔ جلد پوری کریں گے۔ کھانا پکانے کا آپ کو اتنا شوق ہے تو یہ بتائیں کہ دور دراز دیہات میں وہ تمام چیزیں دستیاب ہوتی ہیں جو مختلف کھانوں میں استعمال ہوتی ہیں۔۔۔ گیس اور اوون کی سہولت کے بغیر آپ اپنا شوق کیسے پورا کرتی ہیں؟

آپ کی استاد نے آپ کو بہت اچھی نصیحت کی۔۔۔ ہر معاملے میں مثبت پہلو کو سامنے رکھنا چاہیے تب ہی زندگی سنور سکتی ہے۔

رافیہ اور میمونہ۔۔۔ دائرہ دین پناہ

مجھے جس کہانی نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے، وہ ہے عفت سحر طاہر کی "بن مانگی دعا" جس کا نام اتنا خوب صورت ہے، اب آتے ہیں عنیزہ سید کے "جو رہ کے تو کو گراں تھے ہم"، پلیز آپ سعد بلال کو اور مزید مت الجھائیں اور جلدی سے ماہ نور اور سعد کو ملا دیں۔

ج : پیاری رافیہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید صرف سلسلہ وار کہانیوں پر تبصرہ اور کسی افسانے یا ناولٹ کا ذکر تک نہیں؟ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

مقدسہ، مدیحہ۔۔۔ فیصل آباد

میں بہت زیادہ خوشی میں خط لکھ رہی ہوں۔ کیونکہ میری فیورٹ رائٹر نے اتنے عرصے بعد لکھا جی ہاں! تنزیلہ ریاض۔ آپ یقین کریں میں اتنے عرصے سے آپ کی تحریر کی منتظر تھی۔ ابتدا تو بہت اچھی ہے۔ ٹائٹل بہت خوب صورت تھا، خصوصاً" ٹائٹل گرل کی مسکراہٹ زبردست تھی قسط وار ناولز میں سب سے پہلے اپنی فیورٹ تحریر پڑھی "جو رہ کے تو کو گراں تھے ہم" بہت ہی زیادہ پیاری کہانی ہے "ماہ تمام" بہت اچھا جارہا ہے۔ پلیز شفا کو تقی کے ساتھ ہی رہنے دیں۔ "بن مانگی دعا" بھی بہت اچھی تحریر ہے۔ سارا ادریس کا مکمل ناول "محبت موم کا گھر ہے" موضوع پرانا تھا لیکن طرز تحریر اچھا تھا۔ کیا یہ نئی رائٹر ہیں؟ افسانے سارے ہی بہت ہی اچھے تھے۔ خصوصاً" "عظیم عورت" اور "تانک جاری ہے" "بھابھی کٹوتی" اور "ڈرامہ ختم" بھی اچھی تحریریں رہیں۔ انٹرویوز سے کوئی دلچسپی نہیں کیونکہ نہ ہمارے گھر ٹی وی ہے اور نہ ہی ہم شوق رکھتے ہیں۔ عدنان بھائی بہت ہی اچھے مشورے دیتے ہیں۔ اللہ ان کو جزائے خیر دے۔

آپی پلیز، راحت جبیں اور کنیز نبوی سے لکھوائیں۔ ہم بہت شدت سے منتظر ہیں۔

ج: مقدسہ اور مدیحہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ تنزیلہ ریاض کے واپس آنے کی آپ کو جتنی خوشی ہے اس سے زیادہ ہمیں خوشی ہے۔ کنیز نبوی نے بھی ناول مکمل کر لیا ہے۔ آپ جلد ان کی تحریر پڑھ سکیں گی۔ راحت جبیں بھی لکھ رہی ہیں۔ دعا کریں کہ جلد مکمل کرلیں۔

سارا ادریس کے بارے میں آپ کا اندازہ درست ہے نئی مصنفہ ہیں، لیکن تحریر سے نہیں لگتا۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف پہنچائی جارہی ہے۔

مومنہ افضل راؤ۔۔۔ سیالکوٹ

خط بابا جان کے ساتھ پوسٹ کرنے گئی۔ اب بابا نے کہا کہ ٹی سی ایس سے بھیجتے ہیں جلدی جائے گا۔ "بن مانگی دعا" کے اینڈ نے ہمیشہ کی طرح سسپنس میں ڈال دیا۔ دعا ہے کہ ایبہا کسی مشکل میں نہ آجائے۔ مجھے یہ واضح کردیں کہ ایبہا کا نکاح امتیاز انکل کے ساتھ ہوا ہے یا معیز کے ساتھ، بہت کنفیوژن ہے۔

"ماہ تمام" بہت ہی اچھا لکھا گیا۔ ہمیشہ کی طرح اینڈ تک دلچسپی برقرار رہی اور میری تو دعا ہے کہ مہک کو بھول ہی جائے تقی۔ "اب کر میری رفوگری" سچ بتاؤں تو اسی تحریر کے ہاتھوں مجبور ہو کر خط لکھا۔ سائرہ رضا میں دنگ ہوں انسان اتنا زبردست بھی لکھ سکتا ہے۔ ایسا انداز بیان۔ اللہ اکبر۔ تاباں نے انتہائی قدم اٹھایا۔ مگر وہ غلط بھی تو نہیں ہے اس قدر عجیب اور ظالم رشتہ دار۔ بس عجیب دکھ میں لپٹی تحریر مگر بہت متاثر کن۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے بہت خوشی ہوگی کہ میں نے خواتین ڈائجسٹ سے اتنا کچھ سیکھا ہے کہ زندگی کے بہت سے خطرناک موڑ صرف ایک اس مہربان ساتھی کی وجہ سے بہت اچھی طرح گزر گئے۔ اب آئندہ آنے والی نسلوں کی تربیت بھی اسی نہج پر کریں گے۔ ان شاء اللہ۔ اللہ پاک آپ کی اس نیک کاوش کو آپ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین۔

ج : پیاری مومنہ! تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ قارئین خواتین ڈائجسٹ پر اعتماد کرتی ہیں، اس میں شائع ہونے والی تحریریں ان کی سوچ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تحریروں کے انتخاب میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔ ہمیں احساس ہے کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ دعا ہے کہ ہم اس ذمہ داری کو ثابت قدمی سے نبھا سکیں، آمین۔

ماریہ سحر۔۔۔ احمد پور شرقیہ

میں خواتین ڈائجسٹ کی دیوانی ہوں۔ اس رسالے نے میری زندگی میں بہت سے نئے پہلو اجاگر کیے ہیں۔

ج : پیاری ماریہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاعری کے لیے معذرت۔

کومل ساجد۔۔۔ کوٹ بلوچ

خواتین میں ایسا کچھ نہیں ہوتا جو چھپانا پڑے، کبھی کبھار تو میں خود کوئی افسانہ اپنے میاں کو پڑھنے کو دیتی ہوں۔ اب آتے ہیں خواتین کے مستقل سلسلوں کی طرف۔ جن میں سب سے پہلے تو کرن کرن روشنی ہے۔ اک ایسا

سلسلہ جس نے میری اور بہت سے میرے جیسوں کی راہنمائی کی۔ یہ وہ سلسلہ ہے جس کا ہر لفظ سچا ہے۔ ایمان والے آنکھیں بند کرکے اس کے حرف حرف پر یقین کرتے ہیں، پھر ذرا سا پردے کو سرکا کر ابن انشاء کی باتیں۔ خاتون کی ڈائری بھی اچھا سلسلہ ہے۔ مجھ سے ملیے میں شاہین بہت خوب صورت لوگوں کا حال احوال بتاتی ہیں۔ بن مانگی دعا بھی ٹھیک جارہا ہے۔ ماہ تمام تو بہت ہی زیادہ ٹھیک جارہا ہے، عدنان کا کالم بھی بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا باورچی خانہ میں جو کچن کی تصاویر ہوتی ہیں انہیں بار بار دیکھتی ہوں اور جی بھر کر دیکھتی ہوں۔ سب سے آخر میں نمبون "کوہ گراں تھے ہم" سعد سلطان کھاری اور آپا رابعہ ہمیشہ یاد رہیں گے۔ باقی سارا خواتین ویری گڈ ہے۔ سائرہ رضا تو اس کہکشاں کا سورج ہیں اور سمیرا حمید چاند کے مرتبے پر فائز ہیں۔ سمجھ نہیں آتا کہ سائرہ کی تاباں کو برا کہوں یا قصور وار تاج ہاؤس کے مکین ہیں۔ ضوفی کا دکھ دل چیرتا ہے۔ بہرحال یہ جو بھی ہوا شدت پسندی کی وجہ سے ہوا۔ اسلام نے اسی وجہ سے رشتے کرنے کے لیے ذات برادری کی شرط نہیں رکھی۔ مگر جو جانتے بوجھتے اللہ کے احکام سے روگردانی کریں پھر ان پر ذلت مسلط کردی جاتی ہے۔ اللہ سب کو معاف کرے (آمین) "دائم الحبس" "بوند بوند تماشا" کی یاد دلا گیا۔

ج : کومل! طوالت کی وجہ سے ہم آپ کا پورا خط شائع نہ کرسکے۔ آپ نے بہت خوب صورت الفاظ میں خواتین ڈائجسٹ کی تعریف کی ہم اس کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں۔ "آپ کا باورچی خانہ" میں ضرور شرکت کریں۔ بلکہ دوسرے سلسلوں کے لیے بھی اپنا انتخاب بھجوائیں۔

فہمیدہ گل۔۔۔ لاڑکانہ

بہت ہی محنت سے ایک مکمل ناول اور ایک افسانہ لکھا ہے جو کہ ایک فائل کی صورت ہے، آپ کو کیسے بھجواؤں۔ بن مانگی دعا اور ماہ تمام کا انتظار جس شدت اور بے چینی سے میں کرتی ہوں، وہ بس میں جانتی ہوں، عفت جی ویل ڈن لیکن آپ یہ دکھانے کی کوشش نہ کریں کہ ہماری پڑھنے والی بہنیں یہ سوچتی ہیں کہ ایبھا کا نکاح امتیاز احمد سے ہوا ہے یا معیز سے۔ ہمیں پتا ہے معیز سے ہوا ہے اور آمنہ جی! تقی کو آخر کب عقل آئے گی جس طرح اس نے شفا کو سمیر سے شادی کا مشورہ دیا تو سچ مانیے میری بھی آنکھیں بھر آئیں۔ کیا تقی واقعی اتنا بدھو ہے۔ مکمل ناول دونوں بہت اچھے تھے، افسانے بھی لاجواب اور سبق آموز تھے۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں احادیث اور کرن کرن روشنی سے آپ بے شمار ثواب اجر اور نیکیاں کمارہے ہیں۔ خدا آپ کا ہمیشہ مددگار ہو۔

ج : پیاری فہمیدہ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہوسکے۔

کہانی کیسے لکھیں، کیسے بھجوائیں، ہر خط میں اور فون پر یہی بات پوچھی جاتی ہے۔ جبکہ ان صفحات میں ہم بارہا اس سوال کا جواب دے چکے ہیں۔ اس ماہ ہمارے نام کے سلسلے میں یہ تمام تفصیل شائع کی جارہی ہے۔ خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

لاریب، ماہ زیب۔۔۔ چونیاں ضلع قصور

ٹائٹل پہ گپلو سی ماڈل اپنی خوشگوار مسکراہٹ اور بہار رنگ پیرہن سمیت بہت اچھی لگی۔ کرن کرن روشنی ادارے کے اراکین کے لیے صدقہ جاریہ ہے۔

"بن مانگی دعا" موضوع کے لحاظ سے ایک آسان اور عام فہم سی کہانی ہے اور اسے زیادہ لمبا بھی نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو جلد سمیٹ کر "چراغ آخر شب" کے پائے کا کوئی ناول شروع کروائیے۔

ماہ تمام شفا اور تقی کی جوڑی کو سلامت رہنا چاہیے۔
"کوہ گراں تھے ہم" میں بلی تھیلے سے باہر آگئی ہے۔ سعد کی ماں کا قاتل طیفا لائرہے لیکن آلہ قتل بلال سلطان کے ہاتھ میں دیکھ کر فضل حسین غلط فہمی کا شکار ہوگیا ہے۔

فائنہ رابعہ نے اپنی والدہ کا (بعد از مرگ) تعارف اتنے اچھے انداز سے کرایا کہ مجھے لگا میں بھی ان سے مل چکی ہوں۔ اتنی نیک ہستی کے دنیا سے چلے جانے کا دکھ ہوا۔ شاعر نے تو کہا ہے کہ۔

بعض اوقات جانے والوں کی
واپسی کی خوشی نہیں ہوتی

لیکن ہمیں تنزیلہ ریاض کی واپسی کی بے حد خوشی ہوئی ہے انہوں نے کتنا اچھا لکھا ہے یہ بتانے کے لیے کہانی کا عنوان ہی کافی ہے۔

خواتین میں مصنفین سے ملاقات کا ایک سلسلہ تھا (ان روز و شب میں) وہ کیا ہوا؟ پلیز اسے دوبارہ شروع کیجیے

اس کے بعد "تصویر سی بناتے جائیں" بھی آیا اور غائب ہوگیا، کیوں؟ سالگرہ نمبر میں کنیز نبوی، فرحت اشتیاق اور فائزہ افتخار کو کہیں سے ڈھونڈ لائیں۔

ج : لاریب اور ماہ زیب! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ "تصویر سی بناتے جائیں" مستقل سلسلہ نہیں تھا سالگرہ نمبر کا خصوصی سروے تھا "ان روز و شب میں" جلد ہی دوبارہ شروع کردیں گے۔ فرحت اشتیاق اور فائزہ افتخار ٹی وی میں مصروف ہیں۔ کنیز نبوی کا ناول آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

انیقہ انا۔۔۔ چکوال

سرورق خوب پسند آیا، کھلا کھلا سا، دل کو سکون دیتا۔ شکوے شکایات بے شمار تھیں۔ مگر یہ لفظ بھی کیسے جادوگر ہوتے ہیں، میلوں کے فاصلے پر رہنے والوں کو باہم باندھ دیتے ہیں، جیسے آپ اور ہم.... آپ نے سچ کہا "خواب" ٹوٹنے کے لیے ہوتے ہیں، تعبیریں ہمیں خود تلاشنی پڑتی ہیں۔ "مگر میں بھی سوچتی ہوں" انسان تدبیر و تقدیر کے مابین بے بس ہے اور تدبیر کے ناخن سے تقدیر کی گرہیں نہیں کھلتیں۔ "لیکن آپ سے یہ ضرور کہوں گی کہ میں جو باتیں اپنی کسی دوست یا بہن سے نہیں کہہ سکتی تھی، وہ میں نے آپ سے کہہ دیں۔ آپ نے مجھے سمجھایا، تسلی دی۔ اس کا بہت شکریہ۔

ایک طویل مدت کے بعد "تنزیلہ ریاض" کا نام فہرست میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ناول کا عنوان ہی کہانی کے عمدہ ہونے کی نشاندہی کررہا ہے۔ ناول کا آغاز۔ جو کرداروں کے ادھورے تعارف اور ابتدائیے پر مشتمل تھا۔ پسند آیا۔ ویسے کہانی کی پسندیدگی کے لیے "عمر" (نام) کا ہونا ہی کافی ہے (ہاہاہا)

"ماہ تمام" پر تبصرہ محفوظ ہے۔
سمیرا حمید نے ایک اور خوب صورت تحریر لکھی۔
سعدیہ عزیز آفریدی ان کا ایک ناولٹ تھا۔ چچا بھتیجے والا (ایک کا نام صائم تھا) غضب کا ناول تھا۔ سعدیہ جی جلدی

سے ایک اور ایسا ہی ناول لکھ ڈالیے۔

ج : پیاری انیقہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ افسانے مل گئے ہیں۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ آپ نے ہماری بات کا مان رکھا اور افسانے لکھے۔

انیقہ! یہ سچ ہے کہ تدبیروں سے تقدیریں نہیں بدلتیں' لیکن ہمیں تو کوشش اور عمل کا حکم ہے۔ باقی نتیجہ تو اس کے ہی ہاتھ میں ہے اور ہم اس کی رضا میں راضی بہ رضا۔ لیکن یہ اطمینان بھی تو کم نہیں ہے کہ ہم نے کوشش کی۔ آپ بھی حوصلہ نہ ہاریں۔ کوشش کرتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔

انعم و کلثوم۔۔۔ لاہور

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کی سب سے بڑی وجہ عنیزہ سید کا ناول جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم' بے بن ماگی دعا' بس سو سوئے' ماہ تمام اور بھابھی کنوتی اچھی تحریریں تھیں' پڑھ کر مزا آیا اور عہد الست کہانی بھی اچھی لگی۔ ہم سب شعاع اور خواتین بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ہم چھ بہنیں اور تین بھائی ہیں ہماری تین شادی شدہ بہنیں بھی خواتین اور شعاع پڑھتی ہیں۔

ج : انعم اور کلثوم! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہد آفریدی کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

نخبہ اکرم۔۔۔ گاؤں گوٹیکی ضلع گجرات

خوب صورت لفظوں کے پیراہن میں لپٹا خواتین ڈائجسٹ جب بھی ملتا ہے تو خوشی کی انتہا نہیں رہتی میں بہت چھوٹی تھی تو اکثر دیکھا کرتی تھی' اپنی بڑی آپی سعدیہ کو ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے۔ گرمیوں میں جب لائٹ چلی جاتی تو آپی موم بتی کی روشنی سے ڈائجسٹ پڑھتی ہیں ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے کبھی آپی کو ہنستے اور کبھی روتے دیکھا تھا اب پتا چلا کہ آپی ڈائجسٹ میں اتنی مگن کیوں ہوتی تھیں۔ خواتین ہے ہی ایسا اس کی جو کہانی بھی پڑھو دل کرتا بار بار پڑھنے کو۔

ج : پیاری نخبہ! ہمیں افسوس ہے کہ خواتین ڈائجسٹ آپ تک اتنا لیٹ پہنچتا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ خواتین آپ کو جلد مل سکے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جاسکتے ہیں۔ تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2۔ افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کرسکتے ہیں۔

3۔ ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4۔ کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5۔ مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں۔ ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر کی واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6۔ تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7۔ خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے' خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب' اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

ادارہ خواتین۔ 37 اردو بازار کراچی۔

آپ کی دعوت... ہمارے ہاں

صبا ساحر

کھانا پکانا اتنا مشکل کام نہیں ہے' جتنا یہ فیصلہ کرنا کہ "کیا پکایا جائے؟" اور یہ کام اس وقت اور بھی مشکل ہو جاتا ہے' جب گھر میں دعوت ہو اور جب دعوت کا اہتمام و انتظام گھر میں ہی کرنا ہو تو مشکل ترین۔ "کیا پکایا جائے اور کیسے پکایا جائے" کے لیے ہم ہمیشہ آپ کے معاون' آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر آج خواتین ڈائجسٹ کی بیالیسویں سالگرہ کے موقع پر آپ قارئین ہماری طرف مدعو ہیں۔ ہماری دعوت قبول کرکے ہماری اور اپنی خوشیوں کو دوبالا کردیں۔

کیک

ضروری اجزا :

انڈے	چار عدد
آئسنگ شوگر	ڈھائی کپ
میدہ	تین چوتھائی کپ
فریش کریم	ڈیڑھ کپ
اسٹرابری ایسنس	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
مکھن' اسٹرابری پیوری	دو' دو کھانے کے چمچے

ترکیب :

ایک پیالے میں انڈوں کی زردی' آدھی آئسنگ شوگر اور اسٹرابری ایسنس ڈال کر خوب اچھی طرح پھینٹ لیں کہ آمیزہ مکھن کی طرح ہوجائے۔ علیحدہ پیالے میں سفیدی میں ایک چٹکی نمک ڈال کر اتنا پھینٹیں کہ آمیزہ جھاگ دار ہوجائے۔ بقیہ آئسنگ شوگر ڈال کر دوبارہ پھینٹیں۔ اس کے بعد زردی والا آمیزہ ملا کر پھینٹیں۔ میدہ (دو' تین دفعہ چھان لیں) ڈال کر ایک بار پھر اتنا پھینٹیں کہ آمیزہ گاڑھا اور یکجان ہوجائے۔ سانچے میں مکھن لگا کر بٹر پیپر بچھائیں۔ اس پر بھی تھوڑا سا مکھن لگائیں۔ پھر یہ آمیزہ پھیلا دیں۔ پہلے سے خوب گرم توے پر یہ سانچہ رکھ کر آنچ دھیمی کردیں۔ بیس منٹ بعد چھری ڈال کر چیک کریں۔ چھری صاف نکل آئے تو سمجھیں کیک پک گیا۔ ورنہ مزید پانچ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ کیک مکمل بیک ہوجائے تو اتار کر ٹھنڈا کریں' پھر بیچ میں سے چھری کی مدد سے دو حصے میں کرلیں۔ ایک حصے پر کریم اور اسٹرابری پیوری ڈال کر دوسرا حصہ ڈھک دیں۔ کریم

سے کیک کو چاروں طرف اچھی طرح کور کریں۔ تازہ اسٹرا بیری سے اس کی سجاوٹ کریں اور فریج میں ٹھنڈا کر کے پیش کریں۔

چکن تکہ بریانی

ضروری اجزا:

چکن — ایک کلو
دہی — ایک کپ
چاول — آدھا کلو
پیاز، ٹماٹر — [illegible]
تکہ مسالا، سرکہ — تین تین کھانے کے چمچے
نمک، تیل — حسب ذائقہ ضرورت

ترکیب:

سرکے میں نمک، پسی سرخ مرچ، پسا گرم مسالا، لہسن اورک پیسٹ، چکن تکہ مسالا اور زردے کا رنگ مکس کرکے گوشت پر پلیٹیں اور رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد تیل گرم کرکے مسالے سمیت گوشت ڈال دیں۔ گل جائے تو ایک دہکتا ہوا کوئلہ رکھ کر دم پر رکھ دیں۔ الگ پتیلی میں پیاز سنہری کرکے ٹماٹر، سرخ مرچ، ہلدی ڈال کر بھونیں۔ مسالا روغن چھوڑ دے تو تھوڑا سا ہرا دھنیا، پودینہ اور چار ہری مرچیں بھی ڈال دیں۔ چاول کو نمک اور تھوڑا سا ثابت گرم مسالا ڈال کر ابال لیں۔ الگ پتیلی میں چاول، مسالے اور چکن کی تہ لگائیں اور دم پر لگادیں۔ مکس کرکے رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔

مٹن روسٹ، چکن تکہ

ضروری اجزا:

چکن بریسٹ، لیگ — چار عدد
لہسن ادرک پیسٹ — دو کھانے کے چمچے
یلو فوڈ کلر — ایک چٹکی
زیرہ، سرخ مرچ — ایک ایک چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا، سرکہ — ایک، دو چائے کے چمچے
نمک، تیل — حسب ذائقہ وضرورت

ترکیب:

چکن پر چھری سے کٹ لگائیں۔ تمام مسالوں کو تین چمچے تیل میں اچھی طرح مکس کرکے تکوں پر لگائیں اور چار، پانچ گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پھر یا تو اوون میں بیک کرلیں یا باربی کیو کرلیں۔ کوئلے کا دھواں دے کر پودینے اور املی کی چٹنی اور لچھے دار پیاز کے ساتھ پیش کریں۔

مٹن لیگ روسٹ کرنے کے لیے لیگ پیس کو دھو کر کٹ لگا کر خشک کرلیں، پھر ایک کپ دہی میں نمک، لہسن اورک پیسٹ، جائفل جاوتری پاؤڈر، کچری پاؤڈر، سیاہ زیرہ، پسی سیاہ مرچ، چاٹ مسالا مکس کرکے لیگ پیس پر لگائیں اور چھ گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ بڑے پتیلے میں آدھا کپ تیل گرم کرکے لیگ پیس رکھ دیں اور ڈھکن ڈھک کر پکائیں۔ کچھ دیر بعد ران پلٹ دیں۔ گل جائے اور تیل الگ ہوجائے تو ڈش میں نکال لیں۔ لیموں کا رس چھڑک کر سلاد اور نان کے ساتھ پیش کریں۔

کھویا چکن

ضروری اجزا:

چکن — ایک کلو
پھیکا کھویا — تین کھانے کے چمچے
ٹماٹو پیسٹ — آدھا کپ
پیاز پیسٹ — ایک چوتھائی کپ
مرچ، ہلدی، پسا دھنیا — آدھا، آدھا چائے کا چمچہ
نمک، تیل — حسب ذائقہ وضرورت

ترکیب:

کڑاہی میں تیل گرم کرکے پیاز کا پیسٹ سنہری کریں، پھر کھویا کے علاوہ تمام مسالے چکن کے ساتھ ڈال کر بھونیں اور ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پانی نہ ڈالیں۔ چکن گل جائے تو اتنا بھونیں کہ روغن اوپر آجائے، پھر آدھا کپ پانی شامل کرکے پانچ منٹ پکائیں۔ کھویا، پسا گرم مسالا اور باریک کترا ہوا ہرا دھنیا چھڑک کر مزید پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

مٹن دہی کڑاہی بنانے کے لیے گرم تیل میں ایک کلو بکرے کا گوشت ڈال کر فرائی کریں۔ پانچ منٹ بعد سرخ مرچ، نمک، ہلدی، دہی کے ساتھ ڈالیں۔ تھوڑی دیر بھوننے کے بعد دو گلاس پانی ڈال کر گوشت گلانے کے لیے رکھ دیں۔ پانی خشک ہوجائے تو بڑی والی ہری مرچ ڈال کر بھونیں۔ حسب ضرورت شوربے کے لیے پانی شامل کریں اور بھنا زیرہ اور ثابت دھنیا کوٹ کر چھڑک دیں اور دم پر لگا دیں۔

مغلئی موتیا

ضروری اجزا:

سیلا چاول — آدھا کلو
چینی — آدھا کلو
کھویا، دودھ — آدھی، آدھی پیالی
پستے، بادام، کشمش — آدھی پیالی
الائچی، لونگ — چھ، چھ عدد
کیوڑہ — چند قطرے
گھی، اشرفیاں — ایک، ایک پیالی

ترکیب:

تین گھنٹے بھگو کر چاول ابال لیں اور نتھار کر کھلے برتن میں پھیلا دیں۔ سارے میوے باریک کاٹ کر دو چمچے گھی میں فرائی کرکے نکال لیں۔ اسی گھی میں لونگ اور الائچی کڑکڑائیں۔ پھر چاول کی ایک تہ لگائیں۔ تھوڑی سی چینی پھیلائیں۔ تھوڑا سا دودھ اور تھوڑا سا میوہ چھڑکیں۔ پھر چاولوں کی تہ لگادیں اور گھی، میوہ، چینی اور دودھ کی ایک اور تہ لگائیں، پھر آخری تہ چاول کی لگادیں۔ چاول کے اوپر کھویا اور کیوڑہ پھیلائیں اور دم پر لگادیں۔ پیش کرتے وقت مکس کرلیں۔

بیف اسٹک کباب

ضروری اجزا:

قیمہ — آدھا کلو
کارن فلور — دو کھانے کے چمچے
انڈا — ایک عدد
زیرہ، دھنیا — آدھا، آدھا چمچہ
نمک، تیل — حسب ذائقہ وضرورت

ترکیب:

باریک پسے قیمے میں نمک، لہسن اورک پیسٹ، پسا گرم مسالا، زیرہ، دھنیا، کارن فلور، باریک چوپ کی ہوئی ایک پیاز، کترا ہوا ہرا دھنیا، ہری مرچ اور انڈا ملا کر تھوڑی دیر فریج میں رکھ کر گولا کباب بنائیں۔ اب یا تو آپ اسے باربی کیو کریں یا ڈیپ فرائی کرکے اسٹک لگا کر لچھے دار پیاز اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

چکن فرائیڈ اسٹک کے لیے ایک کلو بون لیس چکن کو دھو کر خشک کرلیں۔ پیالے میں نمک، دو چمچے تیل، سفید مرچ پاؤڈر، سیاہ مرچ، دو کھانے کے چمچے دہی، لہسن اورک پیسٹ، لیموں کا رس اور ہری مرچوں کا پیسٹ ڈال کر مکس کریں اور بوٹیوں پہ لگا کر رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد لکڑی کی سیخوں پہ لگا کر گہرے گرم تیل میں فرائی کریں۔ گولڈن ہوجائیں تو ٹشو پیپر پہ نکالیں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

فرائیڈ فش

ضروری اجزا:

ثابت مچھلی — ایک کلو
میدہ — چار کھانے کے چمچے
زیرہ، اجوائن — ایک، آدھا چمچہ
لیموں — دو عدد
چاٹ مسالا، گرم مسالا — آدھا، آدھا چمچہ
نمک، تیل — حسب ذائقہ ضرورت

مچھلی پر چھری سے کٹ لگائیں۔ پیالے میں لیموں کے رس کے ساتھ سارے مسالے اور سرخ مرچ ڈال کر مچھلی پر اچھی طرح لگائیں اور رکھ دیں۔ ایک گھنٹے بعد گہرے تیل میں تل لیں۔ پلیٹ میں نکال کر چاٹ مسالا چھڑکیں اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

چاکلیٹ کرنچ قلفی

ضروری اجزا:

دودھ — ایک کلو
کھویا — ایک پاؤ
چاکلیٹ کنڈینسڈ ملک — آدھا کپ
چینی — آدھا کپ
فریش کریم — ایک کپ

ایک برتن میں چینی ڈال کر پگھلا لیں اور کسی چکنی تھالی میں پھیلا دیں۔ ٹھنڈی ہو کر جم جائے تو موٹا موٹا کوٹ لیں۔ کرنچ تیار ہے۔ بچے ہوئے دودھ میں کھویا، چار کھانے کے چمچے چینی اور کنڈینسڈ ملک ڈال دیں۔ گاڑھا ہوجائے تو اتار لیں اور فریش کریم ملا کر خوب پھینٹیں۔ پھر اس میں فریش کریم (چاہیں تو چاکلیٹ چپس بھی) ملا کر سانچوں میں بھر لیں۔ سات سے آٹھ گھنٹے فریزر میں رکھ کر جمائیں۔ پیش کرتے وقت اوپر سے مزید کرنچ اور چاکلیٹ چھڑک دیں۔

کردار کی مضبوطی اور پختگی خود اعتمادی کی جانب پہلا قدم ہے۔

اگر آپ کا کردار مضبوط ہے اور آپ حق حلال اور محنت' ایمان داری کی روزی کماتے ہیں۔ اگر آپ اپنے کام کے معاملے میں بددیانت نہیں ہیں۔ اگر آپ ناجائز کاروبار نہیں کرتے' اگر آپ اپنے کاروبار یا کام کے سلسلے میں دیانت دار ہیں اور آپ اپنے کردار کو بے داغ رکھے ہوئے ہیں یا بے داغ بنا لیتے ہیں تو خود بخود اعتمادی آپ کے قدم چومے گی۔

اگر آپ بے ایمانی نہیں کرتے تو آپ سے جب بھی حساب لیا جائے گا۔ آپ بے دھڑک پیش کردیں گے۔ ایک بات یہاں اور عرض کردوں کہ برائی میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ چھپی نہیں رہتی' جلد یا بدیر سامنے آکر رہتی ہے۔

مشورہ یہ ہے کہ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی اپنے کردار کو اتنا مضبوط بنالیں۔ اسے برائیوں سے پاک کرلیں خود اعتمادی کے لیے ایک بات اور ضروری ہے کہ لباس اچھا اور صاف ستھرا پہنئے اور اپنی چال ڈھال کو درست رکھیے۔ اچھے لباس سے مراد قیمتی لباس نہیں ہے۔ بلکہ صاف' اجلا اور آپ کے جسم کے مطابق۔

ن۔ا۔ ساہیوال

آپ نے ٹی وی ڈراموں اور فلموں کو بھی مات کردیا۔ آپ کے خط سے پتا چلتا ہے کہ آپ ایک سمجھ دار ذی ہوش لڑکی ہیں' لیکن آپ نے ایسی احمقانہ بات لکھی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ زندگی تلوار کی دھار ہے کہ ذرا پھسلے اور گرے۔ زندگی نہایت سنبھل سنبھل کر گزارنا چاہیے۔ کسی کی تصویر دیکھی اور زندگی حرام کرلی۔ ویسے تو آپ نے لکھا ہے کہ اس کی شکل و صورت بھی زیادہ اچھی نہیں۔ حسن اور خوب صورتی خالی دیکھنے یا چاہنے کی چیز نہیں ہوتی۔ اخلاق' کردار بھی اہم چیزیں ہیں۔ جب کہ آپ اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں اور وہ تو بیرون ملک میں ہے نہ جانے کیا خوبیاں یا خرابیاں ہوں گی اور اس کا فیصلہ ویسے بھی والدین کو کرنے دیں۔

دوسری بات آپ نے ہاتھ کی لکیروں کے بارے میں لکھی ہے۔ مجھے نہیں پتا جس شخص نے آپ کا ہاتھ دیکھا ہے' وہ کتنا علم جانتا ہے۔ یہاں بڑے بڑے ہاتھ دیکھنے والوں نے بڑے بڑے لوگوں کے ہاتھ دیکھے' لیکن وہ ان کو یہ نہ بتا سکے کہ ان سے مستقبل میں کیا غلطیاں سرزد ہوں گی جو انہیں پھانسی کے پھندے تک لے جائیں گی' تاج و تخت سے محروم کردیں گی یا کسی اور دوسرے ذریعے سے زندگی سے ہاتھ دھونے ہوں گے یا زندگی میں خوفناک سزاؤں سے واسطہ پڑے گا لہٰذا آپ اس ہاتھ دیکھنے والے کی احمقانہ بات کو جانے دیں اور زندگی میں سوچنے اور کرنے کا انداز بدل کر پرسکون زندگی گزاریں۔

☼ ☼ ☼

ر۔ش۔ لاہور سے لکھتی ہیں

س۔ کسی بھی لڑکی کا حسین ترین دور وہ ہوتا ہے جب اس کی شادی ہوتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہو بھی سکتا ہے کہ یہ حسین ترین دور نہ ہو

لیکن۔۔۔

برا ترین دور وہی ہوتا ہے جب اس کے لیے رشتے کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ نئے نئے لوگوں کا آنا' کھانا' دیکھنا۔ کچھ کا اسی وقت انکار اور کچھ کا دو' چار دن انتظار کی سولی پر لٹکانے کے بعد انکار۔ کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ سب۔ شاید لڑکی کی اپنی ماں بھی نہیں سمجھ سکتی۔

لڑکا چاہے جیسا بھی ہو کالا' موٹا' گنجا' جاب لیس یا پھر ہوم لیس' مگر لڑکی پری ہونی چاہیے یہ ہے ہمارے معاشرے کی سوچ۔

پہلی' دوسری' تیسری اور مسلسل آٹھ' دس مرتبہ ریجیکٹ ہونے کے بعد بھی کیا کوئی لڑکی آئینہ دیکھ کر مسکرا سکتی ہے۔ کیا اس کا اعتماد باقی بچے گا؟ کیا اسے یہ خوش فہمی ہوگی کہ وہ پیاری نہیں تو کم از کم قبول صورت تو ہے ہی۔۔۔ نہیں نا۔۔۔

ہم تین بہنیں ہیں۔ باقی دونوں سے ہمیشہ یہی سنا کہ میں ان سے زیادہ پیاری ہوں اور میں بے وقوف ساری زندگی اسی خوش فہمی میں رہتی اگر جو آنے والے نت نئے لوگ مجھے میرا آئینہ نہ دکھاتے۔ میری اوقات نہ بتاتے۔

میرا مسئلہ شادی نہیں ہے' میری خواہش بھی شادی نہیں ہے' مگر پھر بھی میں چاہتی ہوں' جتنی جلدی ممکن ہو یہ کام ہوجائے۔ میری جان چھوٹ جائے یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جان عذاب میں ہوجائے۔ (خیر وہ بعد کی بات) جب بھی انکار ہو' میری آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔ انکار پر نہیں اپنی ذات کی نفی پر نہیں۔ اس لیے کہ اب پھر سے چائے کی ایک ٹرے اور۔۔۔ تنگ آکر میں نے بہن سے کہا جیسا ہے کردو' مگر وہ نہیں مانی اور بات بھی ٹھیک ہے اس کی۔ کون دیتا ہے کسی ایسے ویسے کو اپنی بیٹی۔

پھر میں نے کہا ابھی کرنی نہیں شادی۔ اب کی مرتبہ میری بات ٹھیک ہے۔ ابھی میری صرف 23 سال ہے۔ دو' چار سال صبر کرلیں تو کیا جائے گا ان کا (میرے گھر والوں کا)

اب آگے ہمارے حالات کچھ بہتر ہونے کی امید ہے۔ سب کی پڑھائی ختم اور کام شروع ہوگیا ہے۔ چند سال میں حالات بہتر ہوجائیں گے۔ ہوسکتا ہے تب کچھ بہتر صورت نکل آئے۔ اتنی بات تو آپ بھی مانیں گے گھر اور حالات کا بہتر ہونا اس طرح کے معاملات میں کس قدر اثر انداز ہوتا ہے۔ انٹر تک پڑھا ہے ٹیوشن پڑھاتی ہوں' ضرورتیں امی' ابو پوری کردیتے ہیں۔ خواہشیں اپنی کمائی سے پوری کرلیتی ہوں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ کم از کم تین سال اپنی مرضی سے جینا چاہتی ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں نا "فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا" والی زندگی۔

ج۔ اچھی بہن! آپ کا خط پڑھ کر خوشی بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ خوشی اس بات کی کہ آپ سمجھ دار ہیں اور آپ نے جو سوچا ہے' وہ بھی بالکل درست ہے۔ آج کے دور میں ایک باشعور اور ذہین لڑکی کو اسی طرح سوچنا چاہیے۔ شادی کب ہونا ہے؟ کہاں ہونا ہے؟ کس سے ہونا ہے؟ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جو لوگ آپ کو دیکھنے آئے اور ناپسند کرگئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ میں کچھ کمی تھی۔ آپ کی صورت اچھی نہیں تھی۔ یا آپ کے گھر والے ان کے جہیز کی ڈیمانڈ پوری نہیں کرسکتے تھے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے اور آپ بھی یہ بالکل نہ سوچیں۔

اگر شادیاں صورت شکل' تعلیم اور پیسے کی بنیاد پر ہوتی تو ساری غریب معمولی صورت کی لڑکیاں اپنے والدین کے گھر پہ بیٹھی ہوتیں۔ لیکن آپ اپنے اردگرد دیکھتی ہوں گی کہ ان لڑکیوں کی شادیاں ہوتی ہیں اور وہ اپنے گھر میں خوش و خرم زندگی گزارتی ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس کے ساتھ آپ کی شادی ہونا ہے۔ وہ ابھی آپ تک نہیں پہنچا ہے اور جو آپ کے لیے شادی کا وقت اللہ تعالیٰ نے مقرر کیا ہے۔ وہ ابھی نہیں آیا۔ آپ اطمینان اور اس یقین کے ساتھ زندگی انجوائے کریں کہ آپ کے حصے کی خوشیاں آپ کو ضرور ملیں گی۔ جب وقت آئے گا تو شادی بھی ہوجائے گی۔ آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کی سوچ مثبت ہے۔ اپنی سوچ کو مثبت ہی رکھیں اور اپنا اعتماد بھی قائم رکھیں۔

شازیے ..... جام پور

س ۔ باجی! میرے ساتھ بہت سارے مسائل ہیں۔ پلیز ان سب کے حل بتائیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بال بڑھتے نہیں ہیں۔ کچھ ایسا بتائیں کہ میرے بال لمبے اور گھنے ہو جائیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ہاتھ اور پاؤں باقی جسم کے مقابلے میں بہت کالے ہیں۔ باجی! میرے گال بھی بہت پچکے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے چہرہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میں چاہتی ہوں میرے گال بھرے بھرے ہو جائیں اور پلکیں بھی لمبی اور گھنی ہو جائیں۔ میری آنکھیں بھی اکثر زردی سی رہتی ہیں۔ باجی! کچھ ایسا ٹوٹکا بھی بتائیں کہ میرے ہونٹ پتلے اور گلابی ہو جائیں۔ میری عمر چھبیس سال ہے۔ نسوانی حسن کی بھی بے حد کمی ہے۔

ج ۔ شازیے! بال لمبے اور گھنے ہونے میں اچھی صحت کا بہت دخل ہے۔ اپنی صحت کا خاص خیال رکھیں۔ ناریل یا سرسوں کے تیل کی مالش کریں۔ بہتر ہو گا' مساج سے قبل تیل گرم کرلیں۔ سر دھونے سے قبل بالوں کی جڑوں میں لیموں کا رس لگائیں۔ پھر کسی اچھے صابن یا شیمپو سے سر دھولیں۔ یہ سکری کے لیے بے حد مفید ہے۔ ریٹھا' آملہ اور سکا کائی کا پیسٹ بنا کر سر پر لگائیں۔ ایک گھنٹے بعد سر دھولیں۔

ہاتھ پاؤں کا رنگ صاف کرنے کے لیے لیموں کے چھلکوں سے دس منٹ تک روزانہ رات کو مساج کریں۔ خیال رہے لیموں کا مساج دن میں کرکے دھوپ میں نہ نکلیں۔ اس سے جلد جھلستی ہے۔

چار چمچے عرق گلاب۔ دو چمچے گلیسرین اور آدھا لیموں کا رس ملا کر محلول بنالیں۔ چہرے' گردن' ہاتھ اور پاؤں پر نرم ہاتھوں سے روزانہ مساج کریں۔

ایک چمچہ چنبیلی کے تیل میں ایک چمچہ لیموں کا رس ملا کر چہرے پر مساج کریں۔ رخسار بھرے بھرے ہو جائیں گے۔

پلکوں پر زیتون کا تیل یا روغن بادام لگائیں۔

ہونٹ گلابی کرنے کے لیے کچے دودھ میں زعفران ملا کر لگائیں۔

آنکھوں پر کھیرے کے قتلے رکھا کریں اور دن میں کئی مرتبہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں۔ گاجر کھائیں۔

نسوانی حسن میں اضافے کے لیے پنیر بہت مفید ہے۔ روزانہ ایک چھٹانک پنیر ——— استعمال کریں۔